

<https://famousurdunovels.blogspot.com/>

چراغ شام سے پہلے



ہما و قاص

<https://primenovels.blogspot.com/>

چراغِ شام سے پہلے

بقلم: ہما و قاص

مکمل ناول

یہ ہے سن 1986 اور یہ اندھیرے میں ڈوباد نیاپور کے قریب کا ایک نواحی گاؤں مٹھن ہے، جہاں کچی مٹی کی دھول اڑاتی من من مٹی سے بھری گلیوں میں کچے مکان زیادہ اور پکے مکان کم ہیں پر انہی مکانوں میں اونچائی پر رکھ کر بنائی گئی ایک حویلی حاکم قصر کے نام سے مشہور پورے گاؤں میں اپنی مثال آپ ہے۔

یہ خوبصورت شاہی طرز کی حویلی گاؤں کے لمبر دار اور نائیب ناظم چوہدری حاکم دین کی حویلی ہے اگرچہ بجلی تو گاؤں کے بیشتر گھروں میں گزشتہ تین برس سے آچکی تھی پر پھر بھی اکثر جب جاتی تو پھر دورانہ کئی گھنٹوں سے کبھی کبھار دنوں پر مشتمل ہو جاتا تھا۔

حاکم قصر کا لکڑی کا بنا پھاٹک نما گیٹ بہت بڑا تھا جس کے دونوں پٹ تو کبھی سالوں بعد حویلی کی کسی بڑی تقریب پر ہی کھلتے تھے اس کے باہر لمبی راہداری کے گرد بڑے بڑے مہمان خانے تھے جہاں چوڑے پائے والی اور موٹے بانس والی چارپائیاں جگہ جگہ سجی تھیں جہاں دن میں حاکم دین سے ملنے ملانے والوں کو ہجوم لگا رہتا تھا۔ اس راہداری سے اور کھلے برانڈوں کے مہمان خانوں سے آگے داخلی بھورے رنگ کا بڑا پھاٹک تھا جس پر لوہے کے بڑے بڑے ابھارتھے اس میں داخل ہونے کے لیے ایک چھوٹا سا گیٹ رکھا گیا تھا جو صبح روشنی پھیلنے سے قبل فجر کی اذان کے ساتھ ہی کھل جاتا تھا اور پھر مغرب کے بعد اندھیرا ہونے اور تمام مکینوں کے گھر آجانے پر بند ہوتا تھا۔

گیٹ کھلتے ہی سرخ اینٹوں کی قدرے چوڑی روش تھی جو ایک گیلری کی صورت میں گھر کے اندر پردہ پڑنے کی غرض سے رکھی گئی تھی اس سے آگے گزرتے ہی ایک کشادہ سرخ اینٹوں کا صحن تھا۔ اینٹوں کی رگڑائی اس سلیقے سے کئی گئی تھی کہ کوئی اینٹ بھی اونچی نیچی نہیں تھی۔ صحن میں تین جگہ بڑے بڑے درخت تھے دو نیم کے اور ایک پیپل کا، درختوں کے پیچھے اینٹوں کو تھکون رخ زمین میں گاڑ کر باڑ کی شکل دی گئی تھی اور پیچھے لان بنایا گیا تھا جہاں گھاس کے بجائے زیادہ سبزیاں ہی اُگی ہوئی تھیں۔

صحن کے بلکل وسط میں ایک بڑا سا فوارہ تھا جس میں اس وقت ایک بڑی سی لالٹین لٹک رہی تھی۔ یہ قندیل حویلی کی سب سے بڑی قندیل تھی اس لیے مغرب کے بعد اندھیرا ہوتے ہی تاری بو اس کو فوارے کی نوک کے ساتھ لٹکا دیتی تھی۔ قندیل کے گرد مچھر اور پتنگے قندیل کے بند شیشے سے ٹکرا کر فوارے کے خالی فرش پر گر رہے تھے۔ تاری بو حویلی کی پرانی ملازمہ تھی جو اپنی دو بیٹیوں، شمو اور سکینہ کے ساتھ حویلی کے پچھلے حصے میں ڈالے گئے چھوٹے سے کچے مکان میں رہتی تھی جہاں وہ بس سونے کی غرض سے ہی جاتی تھی باقی کا سارا وقت تو یہیں حویلی میں گزرتا تھا۔

فوارے پر لٹکتی لالٹین کی روشنی لگ بھگ پورے صحن کو روشن کرتی تین زینے کی اونچائی پر کمرے کے آگے بنی لمبی اٹاری کو بھی روشن کیے ہوئے تھی۔ زینے چڑھ کر لمبائی رخ بنی اس لمبی دہلیز میں حویلی کے تمام مکینوں کے کمرے تھے۔ اور اٹاری کے دونوں اطراف چھت کو جاتے زینے تھے۔

چوہدری حاکم دین جدی پشتی زمیندار اور لمبردار تھے۔ پاک و ہند کی تقسیم کے وقت وہ ان خوش قسمت مسلمانوں میں شمار ہوئے تھے جو پہلے سے ہی پاکستان کے رہائی لیتی تھے۔

ہندوستان کو ہجرت کر جانے والے مٹھن گاؤں کے ایک خاندان کے تمام افراد ہلاک ہو گئے تھے مسوائے ایک بارہ سالہ بچی کے جسے اس وقت چوہدری حاکم کے والد اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے اور پھر اسے دائی رہ اسلام میں لانے کے بعد اسے خدیجہ کا نام دے کر اپنے اکلوتے سپوت حاکم دین کی زوجیت میں دے دیا تھا۔ چوہدری حاکم نے خدیجہ کے بعد اپنی سابقہ مینگیتر عصمت آرا سے بھی شادی کی تھی جو ایک بیٹے نوازش کی پیدائش کے بعد ہی انتقال کر گئی تھی۔ خدیجہ سے چوہدری حاکم کے تین بچے تھے۔ جن میں سے بڑا بیٹا نقیب

حاکم، عصمت آرا کی کوکھ سے جنم لینے والے نوازش حاکم سے بڑا تھا۔ خدیجہ کے سب سے بڑے بیٹے نقیب حاکم کے بعد دو بیٹیاں، اریب اور زیب تھیں۔

اگلی پڑھی میں نقیب حاکم کے تین بچے تھے جن میں تقی نقیب سب سے بڑا تھا اس سے چھوٹی منہا نقیب اور سب سے چھوٹا بیٹا تقی نقیب تھا۔ نوازش حاکم کی تین بیٹیاں رمناء، مالا اور رملہ تھیں۔ خدیجہ بیگم کی بڑی بیٹی اریب بیگم بھی شروع سے اپنے شوہر سمیت حویلی میں ہی رہتی تھیں جن کے دو بچے تھے بیٹی فرزانہ اور بیٹا فرہاد۔ سرخ اینٹوں کے اس بڑے سے صحن کے اوپر چڑھتے ہی یہ لمبی اٹاری جس میں ایک کے بعد دوسرا کمرہ تھا اس کا فرش اس وقت کے جدید چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پتھروں کا بنا تھا اور فرش پر جگہ جگہ پتھروں کو مختلف پھولوں کی صورت بنایا گیا تھا۔ اس اٹاری میں کل ملا کے سات ستون تھے جو گول تھے اور گھر کے بچے اکثر ان کے گرد باہیں ڈال کر جھولتے پائے جاتے تھے۔

ان سارے کمروں کے کواڑ کے آگے سفید رنگ کے ململ کے پردے ڈالے گئے تھے اور دوپٹ والے لکڑی کے کواڑ اندر کو کھلتے تھے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے اور یہ وقت مسوائے تقی نقیب کے حویلی کے تمام مکینوں کے لیے آدھی رات کا وقت تصور کیا جاتا تھا اس لیے سب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ تقی نقیب کے کمرے کے کواڑ پر جھولتا ململ کا سفید پردہ پہلی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک لکڑی کے پلنگ کے ساتھ کرسی اور میز رکھی گئی تھی میز پر نہایت سلیقے سے کتابیں سجی تھیں اور وہیں بڑی سی موم بتی جل رہی تھی اور خود انیس سالہ میاں تقی نقیب کرسی پر براجمان اپنی کتاب پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سفید کرتا جس کے گلے پر تارکشی تھی پہنے ہوئے سلیقے سے بال بنائے ہلکی سی مونچھوں والا تقی خاندان بھر میں ایک ذہین و فطین اور میٹرک کے بعد تعلیم حاصل کرنے والا واحد چشم و چراغ تھا۔ وہ پڑھائی کا اتنا شوقین تھا کہ

میٹرک کے بعد اب آگے تعلیم کے لیے گاؤں سے شہر جاتا تھا۔

وہ اریب پھپھو کی بیٹی فرازنہ کو چھوڑ کر عمر میں گھر کے تمام بچوں سے بڑا تھا، سنجیدہ مزاج ہر وقت پڑھائی میں ڈوبا
تقی نقیب صبح کالج کے لیے نکلتا اور پھر شام عصر کے وقت واپس آتا تھا۔ اور پھر رات نو بجے تک وہ جاگ کر پڑھتا
تھا۔

اب بھی وہ کتاب پر جھکا محو تھا جب کوڑے کے پردے کے پیچھے سایہ لہرایا اور پردہ دھیرے سے ہلاتی نے ذرا کی ذرا
گردن کو خم دیا۔

”آ جاؤ۔۔۔۔“

بھاری سی مردانہ آواز اس کی بارعب شخصیت کا خاصہ تھی، پردے کے پیچھے کا سایہ پردہ سر کا کر نمودار ہوا۔ رونا
کتاب سینے سے لگائے کھڑی تھی۔

رمنانوازش، نوازش کی سب سے بڑی بیٹی جس کی عمر لگ بھگ پندرہ برس تھی، رمنان کی پیدائش کے بعد حویلی کے
حالات میں سوتیلے بھائی یوں کے درمیان کشیدگی کے باعث ایسا بھونچال آیا تھا کہ نوازش حاکم ناراض ہو کر حویلی
اور اپنی بیوی بچی چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پھر آٹھ برس بعد جب گھر لوٹے تو چوہدری حاکم نے دونوں بھائی یوں
کی سنگینی ختم کرنے کے لیے تقی اور رمنان کی نسبت طے کر دی تھی۔ نسبت کی یہ تقریب حویلی کی سب سے شاندار
تقریب تھی۔ تقی کو ناصرف خود پڑھنے کا شوق تھا بلکہ گھر بھر کی نئی پیڑھی کو وہ اپنے جدی پشتی رسم و رواج سے
نکالنے کے لیے پڑھانا چاہتا تھا۔ اور اب یہی وجہ تھی اس سے چھوٹی رمنان جس کو چوہدری حاکم کے حکم پر آٹھویں
جماعت کے بعد ہی گھر بیٹھا لیا گیا تھا اب تقی نقیب نے اسے میٹرک کروانے کی ٹھان لی تھی۔

رمنان کتاب کو سینے سے لگائے آگے بڑھی اور پھر گردن موڑ کر پیچھے دیکھا غزالہ بیگم دروازے کے پاس رکھی کر سی
پر بیٹھ رہی تھیں۔

”بولو تیاری کیسی ہے پیپر کی؟“

تقی نے اپنے سامنے کھلی کتاب کو بند کیا اور پریشان سی کھڑی ر منا کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر رقم تاثر صاف صاف بتا رہے تھے کہ وہ صرف تقی کی ضد پر آگے تعلیم جاری کئیے ہوئے ہے۔

”ہاں کر لیا ہے، تقی سنو داجی کو کیا حویلی میں کسی کو خبر تک نہیں کہ میں نویں جماعت کے امتحان میں بیٹھنے لگی ہوں، کیا یہ سب ٹھیک ہے مجھے تو رہ رہ کر ڈر آتا ہے“

ر منانے بچارگی سے سامنے کر سی پر بیٹھے تقی کی طرف دیکھا، تقی نے اس کے روز کے بولے ہوئے راگ پر غصے سے گھورا

”پڑھنے کا شوق ہے نا بولو پھر کیوں ڈرتی ہو، تم فکر نا کرو بس چچی جان کو کہنا وقت پر سارے کام نمٹالیں اور تیار رہنا تم لوگ“

تقی نے ماتھے پر بل ڈالے اسے صبح جانے کا سارا منصوبہ گوش گزار کیا۔ گاؤں کا سکول مل تک تھا جس کی وجہ سے میٹرک کے امتحان دینے کے لیے اس کا سینٹر پاس کا گاؤں بنا تھا۔

”بہادر کو کیا کہیں گے بولو، تقی کیوں پنگے لے رہے ہو سب سے اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ پیپر کوئی ایک روز تھوڑی نا ہے“

ر منانے بچارگی سے اس کی طرف دیکھ کر اور ڈرائی پور کا نام لیا جو روز تقی کو شہر کالج لے کر جاتا تھا اور پھر واپس لاتا تھا۔

”پنگے نہیں لے رہا ہوں بس تمہیں پڑھانا چاہتا ہوں تم اچھی ہو پڑھائی میں نہیں چاہتا حویلی کے ماحول میں پس کر ان پڑھ رہ جاؤ“

تقی نے فکر مندی سے کہا

خوشخبری

اگر آپ لکھ سکتے ہیں اور اپنے اندر کے لکھاری کو باہر لانا چاہتے ہیں تو لکھاری آن لائن میگزین آپ کو اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے بہت اچھا پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔ لکھاری آن لائن میگزین کا حصہ بنئے اور آج ہی اپنی تحریر (افسانہ، ناول، ناولٹ، کالم، مضامین، شاعری) اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ آپ کی کوئی بھی تحریر ضائع نہیں کی جائے گی اور ایک ہفتے کے اندر ہمارے سب ویب بلاگز (ویب سائٹس) اور سوشل میڈیا گروپس اور پیجز پر پبلش کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے ابھی رابطہ کریں۔

Wats app No :- 03335586927

Email address :- aatish2kx@gmail.com

Facebook ID :- www.facebook.com/aatish2k11

Facebook Group :- FAMOUS URDU NOVELS AND DIGEST

SEARCH AND REQUEST FOR NOVELS, NOVELS DISCUSSION

”تم بہت عجیب ہو تھی، سنو اماں مجھے کہہ رہی تھیں تھی کو اتنا ہی شوق ہے تمہیں پڑھانے کا تو شادی کے بعد پڑھا لے گا کچھ سالوں میں شادی تو ہو ہی جائے گی تم دونوں کی“

ر منانے پھر سے منت سماجت کے لہجے میں اس سے گزارش کی۔

”نہیں۔۔۔ کل ہم پیپر دینے جارہے ہیں بس اور اگر تمہیں اپنی من مانی کرنی ہے تو کرو میں ویسے بھی ہوتا کون ہوں تمہارا“

تقی نے پل بھر میں منہ پھلایا تھا، غصہ تو جیسے ناک پر دھرا رہتا تھا جناب کے اور بغاوت تو وہ جیسے لے کر پیدا ہوا تھا خون میں۔

”اچھا بابا دے رہی ہوں پیپر، ناراض تو مت ہو، بس جلدی سے یہ تھوڑا سا سمجھا دو اماں کو آج نیند بہت آرہی ہے زیادہ دیر باہر نہیں بیٹھیں گی“

ر منانے کتاب کھول کر میز پر رکھتے ہوئے کہا، تقی نے ماتھے پر پڑے بل سیدھے کیے اور کتاب کو اپنی طرف گھسیٹا اسی طرح وہ پورا سال رات کو چھپ کر تقی سے پڑھتی رہی تھی اور غزالہ اس سب اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ کمرے کے باہر پڑی لکڑی کی کرسی پر اونگھ رہی تھی۔

تاری تھپ تھپ بھاگتی صحن میں آئی تھی اور پھر نوارے کے گرد پانچ سالہ ننھے سے وجود کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ وہ بالوں کی دو چٹیا لہراتی پھر تیلی سی لڑکی پورے صحن میں تاری کو اپنے پیچھے بھگائے ہوئے تھی، دونوں ہاتھوں کی بند مٹھیوں کو زور سے بند کر رکھا تھا جس سے چینی کے ذرے زمین پر گر رہے تھے۔

”شمو پکڑ اس بد ذات کو۔۔۔ مجھ سے نہیں پکڑی جاتی یہ آفت“

تاری بوانے صحن میں بنے چبوترے پر برتن دھونے کے لیے بیٹھی اپنی بیٹی کو آواز لگائی جو پہلے ہی اس سارے منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور یہ سب تو آئے دن کا ماجر تھا اس گھر میں، تاری کے غصے سے گھورنے پر شمو ایک جھٹکے سے اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اٹھی۔

”ارے تاری بوا کیوں واویلا مچا رکھا ہے صحن میں سویرے سویرے، چاشت کی نماز بھی ڈھنگ سے ناپڑھنے دی“ خدیجہ بیگم اپنا پان دان سنبھالے اٹاری کے ستون کے پاس آئی، اور صحن میں چیختی ہانپتی تاری کو دیکھ کر ہانک لگائی۔ آج جمعہ کا دن تھا اور گھر میں مرد حضرات کے آکر جمعہ کے لیے غسل کرنے سے پہلے ہی کام نمٹانا ہوتا تھا پر یہاں تو کام بڑھ گیا تھا۔

”بی جی مت پوچھیے اس آفت کی پرکالانے آج پھر چینی کی صندوقچی پر حملہ کر دیا، پتہ نہیں نگوڑی کیا کرتی ہے صندوقچی الٹ ڈالی سارا باورچی خانہ چینی کا ریگستان بنا ہوا ہے“

تاری بوانے روہانے لہجے میں ہاتھ مڑوڑتے ہوئے خدیجہ بیگم سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

”کس نے مالانے؟۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ ستیاناش، چھوٹی بہو۔۔۔۔۔ چھوٹی بہو۔۔۔۔۔“

خدیجہ بیگم نے خود ہی سوال کا جواب دے کر غزالہ کو اونچی آواز میں ہانک لگائی۔ بیتل کی صندوقچی میں تقریباً چھ ماہ کی چینی بھر دی جاتی تھی جسے ایک لوہے کے بنے جنگلے پر رکھ دیا جاتا تھا۔

مالا بیٹھے کی بے حد شوقین تھی وہ جو جنگلے پر پاؤں دھر کر صندوقچی کو کھول رہی تھی تو صندوقچی ہی الٹا ڈالی

”آئی بی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“

غزالہ حواس باختہ بغل میں رملاکو دبائے کمرے سے باہر آئی تو سامنے اٹاری میں لگے تخت کی طرف بڑھتی خدیجہ بیگم نے شکن آلودہ پیشانی کے ساتھ گھورا

”جی۔۔۔۔۔ کیا ہوا بی جی“

غزالہ کا اوپری سانس اوپر اٹک گیا تھا، خدیجہ بیگم اتنے غصے میں جب آتی تھیں تو پھر سمجھو کسی کی شامت تو پکی تھی

”یہ لڑکیوں کی بس فوج ہی پیدا کرنی آوے ہے تجھے سنبھالنا نہیں آتا کا،“
خدیجہ بیگم اتنے غصے سے چیخ رہی تھیں کہ پان منہ کے کناروں سے باہر کونکھنے لگا تھا۔
”کیا۔۔۔ کیا؟۔۔۔ مالانے“

غزالہ نے چھاتی پر ہاتھ دھرے رونے جیسی صورت بنائی، آئے دن کوئی نیا تماشہ اس لڑکی کا ہی ہوتا تھا اس لیے بن بتائے ہی وہ سمجھ گئی تھی یہ حرکت اس کی منجھلی بیٹی ملا کی ہے۔
”چینی کی بھری مٹی الٹ دی ہے، جا کر دیکھ لو باورچی خانہ اگر یقین نا آئے مجھ قسمت ماڑی پر“
تاری بوا تو دل برداشتہ ہوئے کھڑی تھیں، ہوتی بھی کیوں ناب ساری صاف صفائی انہیں ہی تو کرنی تھی اور ساتھ باقی کام بھی

”اب کہاں کو گئی ہے، تاری بوا وہ“

غزالہ کی سہمی سی آواز نکلی تھی۔ اور آنکھیں چرا کر آگ بگولہ کھڑی خدیجہ بیگم کو دیکھا
”شمو پیچھے بھاگی ہے پر کہاں ہاتھ آنے کی برساتی پر چڑھ گئی ہوگی“

تاری بوا نے چھت کی طرف اشارہ کیا، غزالہ تیزی سے برانڈے کے زینے اترتی تاری بوا تک آئی
”تاری بوا یہ رملہ کو گود میں لینا کچھ دیر کو، میں دیکھتی ہوں اس کو“

غزالہ نے دھپ سے دو سالہ رملہ کو تاری بوا کے بازو پر دھر اور خود تیزی سے زینے کی طرف بھاگی تھی چہرہ غصے سے لال بھوکا ہو رہا تھا جیسے آج تو مالا کو جان سے ہی مار ڈالے گی۔

”مالا۔۔۔۔۔ مالا۔۔۔۔۔“

زینہ چڑھتے ہی اوپر چھت پر آکر چیختی ہوئی چھت کی برساتی کے قریب کھڑی شمو کی طرف بڑھی۔ شمو بھی سورج کی روشنی سے بچنے کو ماتھے پر ہاتھ کی آڑ بنائے برساتی کی طرف چہرہ اوپر کیے کھڑی تھی اور وہ پورے گھر کو سویرے ہی پریشانی میں ڈالے اب برساتی پر کھڑی شمو کو زبان نکال رہی تھی۔

”اففف مالا اتر نیچے۔۔۔“

غزالہ نے گال پھاڑ کر کہا اور بازو لمبے کیے اسے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ دور دھوپ میں بیٹھی رہنا بھی اب گردن اچک اچک کر تماشہ دیکھ رہی تھی۔ وہ چھپ کر اوپر پڑھنے کو بیٹھی تھی۔ وہ نویں جماعت کے امتحان دینے اور پاس ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اب دسویں جماعت کی تیاری کر رہی تھی۔

”اماں آپ ماریں گی میں نیچے نہیں آؤں گی“

باریک سی آواز میں وہ نیچے آنے سے انکار کیے مٹھی کو منہ تک لے جا کر چینی چاٹ رہی تھی۔ رہنا کتابیں تکیے کے نیچے چھپا کر اٹھی۔

”جب کام ایسے کرے گی تو مار تو کھائے گی نا اتر جائیے مجھ سے کھالے نہیں تو شام کو اپنے ابا سے کھائے گی“

غزالہ غصے کے مارے دانت کچکچا رہی تھی۔ رہنا اب ان کی طرف آرہی تھی اور بانس کی بنی کچی مٹی کے لیپ والی برساتی پر کھڑی مالا زور زور سے نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔

”اچھا اماں پیچھے ہو کر کھڑی ہو تھوڑا پھر اترتی ہوں“

مالا نے بلا کی معصومیت چہرے پر طاری کیے اپنی خواہش ظاہر کی۔ غزالہ نے ایک نظر مالا کی طرف دیکھا پھر سر ہلا کر شمو کی طرف دیکھا

”شمو اب کے بھاگنے ناپائے وہاں زینے کے آگے کھڑی ہو جاؤ، آج تو میں اس کمبخت ماری کا گلا ہی دبا دوں گی“

غزالہ نے شمو کو آہستہ آواز میں حکم دیا اور پھر خود مالا کے کہنے کے مطابق کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔

”جی باجی جی۔۔۔“

شمو فوار حکم کی تعمیل کرتی زینے کی طرف چل دی۔ مالا جو اترنے کے لیے قدم بڑھا رہی تھی شمو کو زینے کی طرف جاتا دیکھ کر پھر رک گئی۔

”مالا اتر نیچے۔۔۔۔“

غزالہ اس کے رک جانے پر پھر سے چیخی تھی سانس غصے سے تیز تیز اندر باہر انڈیل رہی تھی

”اماں تو مارے گی جانتی ہوں میں“

مالا نے کمر پر ہاتھ دھرے تیکھی سی آواز میں کہا وہ اماں کے تیور بھانپ گئی تھی۔ اور پھر سے مٹھی میں بھری چینی کو منہ میں ڈالا

”اماں کیا شور ڈالا ہے، پتا بھی ہے یہاں چھپ کر پڑھتی ہوں میں“

رمنانے قریب آکر اماں کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”ارے پتا ہے سب پر یہ منحوس ماری ناک میں دم کیے رکھتی ہے پہلے بیٹیوں کی لائی ن لگانے کے طعنے ملتے ہیں

اوپر سے یہ جان کا عذاب بن بیٹھی ہے“

غزالہ نے سوکھے ہونٹوں پر تاسف سے زبان پھیرتے ہوئے دکھڑا رویا

”مالا نیچے آمت تنگ کر اماں کو اچھی بہن ہے نامیری“

رمنانے پچکارا

”آپا اماں بہت پیٹے گی“

مالا نے تیکھی سی آواز میں انکار کیا اور گردن زور زور سے نفی میں ہلا دی

”نہیں پیٹے گی میں ہوں نا“

رمنانے لاڈ سے کہا

”رمنانے پر جا کر لے کر آسے یہ ایسے ہاتھ نہیں آنے کی میرا تو بلڈ چڑھ رہا ہے“

غزالہ نے سر پر ہاتھ دھرے ضبط سے کہا

”مالا نیچے آجاشا باش نہیں مارتی اماں، میں بچاؤں گی تمہیں“

رمنانے برساتی کے ستون سے نکلی اینٹوں پر قدم رکھے تھوڑا سا اوپر ہو کر مالا کو پچکارا۔ مالا نے ننھی سی مٹھی میں بند چینی منہ میں ڈالی اور ہاتھ جھاڑے بنا رمنانے کی طرف بڑھا دیے۔

رمنانے جیسے ہی اسے نیچے اتار غزالہ نے اسے گردن سے ہی دبوج لیا پھر تو پاؤں کی چپل اتارے اسے پیٹتے ہوئے نیچے آ رہی تھی سارا غصہ اسی پر تو اتارنا تھا اور وہ بھی اب گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی۔

اس کے گلا پھاڑ کے رونے کا یہی تو فائ دہ ہوا اسے، تقی نیند سے جاگ کر صحن میں آیا تھا۔ اس کی تو یہ لاڈلی تھی مجال ہے وہ کسی کو اس کی شرارتوں پر اسے ہاتھ بھی لگانے دیتا ہو۔

”چیچی۔۔۔۔۔چیچی جان رک جائے“

تقی ننگے پاؤں صحن میں آیا تھا اور پھر ایک جھٹکے سے غزالہ کے ہاتھوں سے مار کھاتی بلکتی مالا کو چھڑا کر گود میں اٹھا لیا۔

پل بھر میں ہی صحن اور اٹاری حویلی کے مکینوں سے بھر گئی تھی جو اپنا کام دھندا چھوڑ کر اب صحن میں لگے تماشے کو تاک رہے تھے۔

رمنانے پر زینے کے جنگلے کو تھامے ہوئی تھی پاس ہی شمو کھڑی تھی، تارے بوا بوا رچی خانے کا کواڑ تھا مے باہر کو آ گئی تھی جواب چینی کے لگے ڈھیر کے اوپر سے چینی اٹھا اٹھا کر پھر سے ڈرم میں بھر رہی تھی۔ خدیجہ بیگم اٹاری

میں لگے تخت پر بیٹھیں تھیں جہاں پاس ہی بلقیس جو خدیجہ بیگم کے لیے پان لگارہی تھی، واحد غزالہ کو ترسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اریب، فرزانہ، فرہاد اور منہاٹاری کے ستون کے پاس کھڑے تھے۔

”چھوڑ تقی اس کی عقل ٹھکانے لگا دینے دے آج مجھے، اس نے میری زندگی عذاب بنا رکھی ہے“

غزالہ سرخ چہرے کے ساتھ چیختی ہوئی تقی کی گود میں پکڑی مالا کی طرف جھپٹی۔

”ہوا کیا ہے؟ بھئی کیا کیا ہے اس نے؟ کیوں سب اس معصوم جان کے پیچھے پڑے ہوتے ہو ہر دوسرے روز“

تقی نے غزالہ کے بازو کو ہاتھ آگے کیے روکا جو مالا پر جھپٹنے کو بڑھاتا تھا اور پھر مالا کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے سب کی طرف حیرت سے دیکھا، وہ ننگے پاؤں سرخ اینٹوں والے صحن میں کھڑا تھا۔

”معصوم جان۔ ن۔ ن۔ ن، اللہ رے توبہ، یہ اگر معصوم جان ہے تو شیطان تو پھر منہ چھپا کر روتا ہوگا، نیں۔۔۔“

اریب نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے سارے تماشے میں غزالہ کا خون جلانے کو اپنا حصہ ڈالا آخر کو نند ہونے کا حق ادا کرنا تھا۔ غزالہ جو پہلے ہی لال بھوکا ہوئے کھڑی تھی بیٹی کی ایسی عزت افزائی پر اور جل بھن گئی۔

”تقی چھوڑ دیو اس چنڈال چو کڑی کی سردار کو، آج چٹری ادھیڑ دیوے اس کی اماں“

خدیجہ بیگم نے تخت سے ایک پاؤں نیچے اتار کر ہاتھ نچا کر تقی کو حکم صادر کیا اور پھر غصے سے منہ کا پان تھوک دان میں تھوکا، چاندی کا تھوک دان جو ہر صبح چمکا کر خدیجہ بیگم کے تخت کے گاؤ تکیے کے بالکل پاس رکھا جاتا تھا اب پہلی پچکاری پر سرخ دھبوں سے رنگ گیا۔

”چھوڑ تقی۔۔۔۔۔ چٹری کیا اسکا تو آج گلا دبا کے میں قصہ ہی تمام کروں“

غزالہ لال بھوکا خدیجہ بیگم کی بات پر تپاک سے آگے بڑھی، آواز غم و غصہ میں کانپ رہی تھی۔ ارد گرد کا سارا غصہ مالا پر ہی اتارنا تھا جس کی وجہ سے باتیں سننے کو ملتی تھیں۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ دبا دیو ہمارے سر چڑھ کر، بس بدھی متی دیو اس کُتامہ کو“

تقی نے غزالہ کا ہاتھ جھٹکا اور پھر مالا کو ساتھ لگائے چند قدم پیچھے ہوا۔۔۔ کسی کو تقی کے اس جوش پر حیرت نہیں ہوئی مالا اس کا پسندیدہ بچہ تھی جسے وہ بچپن سے ہی لاڈ کرتا آ رہا تھا۔ مالا جیسے جیسے بڑی ہونے لگی آئے دن حویلی میں کوئی نا کوئی ہنگامہ برپا ہونے لگا اور پھر جس دن تقی گھر پر ہوتا تو یونہی بیچ میں ٹپک کر اسے مار سے بچا لیتا تھا۔

”تقی۔۔۔ مجھے آپے کمرے میں لے جاؤ۔۔۔“

”لو۔۔۔ سن لو اور۔۔۔۔۔ چھٹانک بھر کی لڑکی کی، اتنے برس بڑے کو تقی۔۔۔ تقی لگے ہے منہ پھاڑ کر، یہ بُدھی یہ تمیز دیوے ہے لڑکی کو“

غزالہ کی آواز رونے کی وجہ سے بھاری ہو رہی تھی، مالا اتنی زور کے چماٹ پر بلبلاتا ٹھی اور پھر سے گلا پھاڑ کر رونے لگی، تقی نے فوراً پیچھے ہو کر روتی ہوئی مالا کو ساتھ لگائے اس کے چہرے کا رخ پیچھے کی جانب موڑ دیا۔

”ہٹیں۔۔۔ ہٹیں سب میں سمجھا دوں گا اس کو“

تقی سب کے درمیان سے نکلتا تیزی سے برانڈے کے زینے چڑھتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، باقی سب کی نگاہوں نے دونوں کو کمرے تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیا۔

”بھئی مانو مانو۔۔۔ تقی نے بگاڑ رکھی ہے، اور وہ بے شرم ہے کہ ایسی تقی تقی۔۔۔ لو بھلا پوچھو“

اریب نے ناک چڑھا کر ہاتھ ہوا میں کرتے ہوئے جلا کٹا جملہ اچھالا اور تخت پر جا کر خدیجہ بیگم کے برابر بر اجمان ہوئی، جو پہلے ہی ہوا میں سر مارتی بڑبڑا رہی تھیں۔

باقی سب بھی غزالہ کے بجائے آہستہ آہستہ کونوں کھدروں میں گھسنے لگے۔ اب فوارے سے کچھ دور وہ ہی رونی صورت بنائے کھڑی تھی، سکینہ جو رملہ کو اپنی کمر پر اٹھائے کھڑی تھی آگے بڑھی اور پھر رملہ کو غزالہ کی طرف بڑھا دیا جس نے آنسو پونچھے رملہ کو تھاما اور اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

تقی نے اپنے کمرے میں جا کر ہچکیوں کی صورت روتی مالا کو پلنگ پر بیٹھایا اور خود دوزانو اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”مالا۔۔۔ مالا چپ۔۔۔ بالکل چپ۔۔۔ اچھا میری طرف دیکھو“

تقی نے پیار سے اس کے دونوں بازو تھامے، وہ مٹھیاں آنکھوں پر رکھے ان سے آنکھوں کو مسلتے ہوئے ریں ریں روئے چلے جا رہی تھی۔

تقی نے ہاتھ ہٹائے اور محبت سے اس کے معصوم سے چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کیا جہاں جگہ جگہ برساتی کی مٹی، چینی اور آنکھوں سے بہہ جانے والے کاجل کے نشان تھے۔

”گڑیا۔۔۔ میٹھی چیزیں کھاتے ہیں، چینی نہیں، جیسے کہ پتاشے، مٹھائی، اچھا چلو ایک وعدہ کرو اب سے چینی کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی میں تمہارے لیے شہر سے مٹھائی لایا کروں گا“

تقی نے اسے پچکارا اور اپنے انگوٹھے سے اس کے ننھے گال صاف کیے جس کی ہچکیوں میں اب ٹھہراؤ آگیا تھا۔

”وعدہ۔۔۔ چلو پھر اب پتاشے لینے چلیں“

* * * * *

”نہیں۔۔۔۔۔ام۔۔۔۔۔ام۔۔۔۔۔ماں۔۔۔۔۔“

ہچکیوں میں جملے کا ربط بھی نہیں رہا تھا

”چل بول کے دکھا اب تقی بھائی۔۔۔“

غزالہ نے گھورتے ہوئے کہا

”ت۔۔۔ت۔۔۔تقی۔۔۔ب۔۔۔بھ۔۔۔بھا۔۔۔بھائی“

مالا نے ہچکیوں میں غزالہ کے کہے الفاظ دہرائے غزالہ نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔ وہ سسکتے

ہوئے ماں کے ساتھ لگ کر اور رو دی۔

”چل اب چپ کر۔۔۔، شہزادی میری۔۔۔“

غزالہ نے اس کے ہلتے جسم کو خود سے لگا کے اس کے سر پر بوسہ دیا، اسے خود سے الگ کیا، سر کو سہلایا اور منہ کو

دیوانہ وار بوسے دیے پھر اس کے طمانچوں سے سرخ ہوتے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں لیا

”آج میں سوچی کا حلوہ بنا کر دوں گی اپنی گڑیا کو کھائے گی نا؟“

غزالہ نے محبت سے پچکارتے ہوئے کہا، مالا کے روتے چہرے پر ایک دم سے رونق آگئی زور زور سے سر کو اثبات

میں ہلایا، جب کے گال پر اب بھی ننھے سے آنسو چمک رہے تھے۔

”اماں اس میں انڈے بھی ڈالنا“

فوراً مار بھول کر چہکتے ہوئے فرمائی ش کر ڈالی، غزالہ بے ساختہ مسکرا دی

”ڈنڈے ناکھلاؤں تجھے“

غزالہ نے محبت سے اس کے کانوں کو مڑوڑتے ہوئے کہا اور پھر کھکھلا کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

پھاٹک کے آگے روش کو عبور کرتے ہی منیر نے کندھے پر سے منڈاسا اتار، دوپہر اب شام میں بدل رہی تھی، چکی کی کو کو کی آواز سُر یلا ساراگ آلاپ رہی تھی۔

منیر ایک ہاتھ میں پھلیک تھامے اب صحن کے فوارے کے پاس پہنچ گیا تھا جہاں اٹاری میں لگے تخت پر بیٹھی حقے کے کش لگاتی خدیجہ بیگم اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔

منیر احمد، اریب کے شوہر تھے اگرچہ اریب بیگم، نقیب حاکم سے چھوٹی تھیں پر شادی ان کی نقیب سے پہلے ہوئی تھی۔ منیر چھوٹا موٹا بیوپار کرتا تھا پھر رشتہ ہونے کے بعد وہ چوہدری حاکم کے ساتھ مل کر بیوپار کرنے لگا، جس میں وہ گاؤں سے کھیس اور مٹی کے برتن لے کر شہر جاتا تھا اور پھر دو، تین دن وہیں لگ جاتے تھے، اریب کو یوں بچوں کے ساتھ چھوڑنا بہتر ناگرددانتے ہوئے وہ اریب کے ساتھ خود بھی حویلی میں ہی رہائی پزیر ہو گیا تھا، اس طرح اب وہ آرام سے کچھ دن شہر کاٹ آتا تھا۔

منیر دہلیز کے زینے چڑھتا سیدھا خدیجہ بیگم کی طرف بڑھا، آتے ہی پھلیک ایک طرف تخت پر رکھا۔ پھلیک کھجور کے سوکھے پتوں سے تیار کیا گیا تھیلہ تھا جس میں ساز و سامان رکھا جاتا تھا۔

”آداب بی جی۔۔۔۔“

منیر نے خدیجہ کے آگے سر جھکایا، خدیجہ بیگم نے حقے کی نلی کو ایک طرف کیے اس کے سر پر پیار دیا۔

”جگ جگ جیو پتر۔۔۔۔ اریب۔۔۔۔ اریب۔۔۔۔ منیر میاں آئے ہیں، لسی کا پیالہ بھر کے لائیو“

خدیجہ نے دعادی اور ساتھ ہی اپنی بیٹی کو بھی ہانک لگائی۔ منیر اب پاس رکھی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ گرمی کا دور ابھی بس شروع ہی ہوا تھا، رات کو ہلکے پنکھے چلنے لگے تھے اور چائی کی لسی کا دور شروع ہو چکا تھا۔

صبح ہی لسی کو بنا کر چائی میں ڈال کر باورچی خانے کے باہر پانی کے مٹکوں کے پاس رکھ دیا جاتا تھا جہاں سے جس کا دل چاہتا لسی پیتا اور جس کا دل چاہتا پانی پیتا۔

” اور منیر میاں کیسا جارہا ہے بیو پار اس دفعہ تو ہفتہ ہی لگا دیا شہر میں “

خدیجہ بیگم نے حقے کی نلی کو منہ میں ڈالے کش لگایا اور سوالیہ نگاہیں منیر پر گاڑ دیں جو منڈ اسے سے اب اپنے کندھوں کو جھاڑ رہا تھا

” بی جی اس دفعہ سامان زیادہ لے گیا تھا، اس لیے دن زیادہ لگ گئے، لڈن میاں کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا، وہ ایسا ہی بھلکڑ ہے بتانے نہیں آیا ہوگا “

منیر نے بھنویں اچکائے تشویش ظاہر کی اور لڈن کے ہاتھ پیغام بھجوانے کا بتایا جو حویلی کا خاص الخاص ملازم تھا وہ سیدھا سا تھا اس لیے اسے حویلی کے اندر آنے کی اجازت تھی البتہ مسوائے خدیجہ بیگم کے سب پردے کی غرض سے کمروں میں چلی جاتی تھیں، اریب سر پر دوپٹہ درست کرتی شرمائی سے لسی سے بھرا بڑا سا پیتل کا گلاس تھامے، اٹاری کے زینے چڑھی،

” اسلام علیکم۔۔۔ “

محبت سے منیر کو سلام کیا اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا منیر نے گلاس تھاما اور مڑ کر پاس پڑے پھلیک کو اریب کی طرف بڑھایا

” اس میں ایک جوڑا بی جی کا بھی ہے، منٹن کے جوڑے لایا ہوں “

منیر نے آبرو چڑھائے غرور سے بتایا اور پھر گردن اکڑائے خدیجہ بیگم کی طرف دیکھا، منٹن کپڑا نیا آیا تھا اور اس وقت کا قیمتی کپڑا تھا۔ خدیجہ بیگم کی آنکھیں تو چمک اٹھیں۔

” ارے۔۔۔۔۔ متی کیا کرو لال یہ سب۔۔۔۔۔ جگ جگ جیو، پھولو پھلو “

خدیجہ بیگم تو پھولے ناسمائی اور پاس بیٹھے اپنے داماد کی بلائیں اتار لیں۔ جبکہ اریب اب آنکھیں گھماتی پھلیک کے اندر جھانک رہی تھی۔ خدیجہ کے اشارہ کرنے پر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

تقی سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا جب کمرے کے کواڑ پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اس کے سر اٹھانے سے پہلے ہی فرزانہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

دونوں ہاتھوں کو پیچھے کمر کی طرف کیے اب وہ تقی کے میز کے پاس آئی تھی۔

”پڑھائی کر رہا ہے میرا ویر“

محبت سے اس کی کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے بے تکاسا سوال پوچھا، جس پر تقی نے گہری سانس لے کر کتاب بند کر دی۔ فرزانہ اس سے دو سال بڑی تھی اور ہمیشہ سے اس سے چھوٹے بھائی یوں کی طرح محبت کرتی تھی اس کی عادتیں اپنی والدہ اریب سے یکسر مختلف تھیں۔

”جی آپا پڑھ رہا تھا، آئی یں آپ کھڑی کیوں ہوگئی یں وہاں، بیٹھیں“

تقی فوراً سیدھا ہوا اور اشارہ میز کے پاس پڑی کرسی کی طرف کیا۔ شام کے چھ بج رہے تھے اور حویلی کے مکین اب سونے کی تیاریوں میں تھے۔ صبح اٹھ جانے والے چھوٹے تقی اور رملاتو کب کے سو بھی چکے تھے۔

”بس بیٹھنا نہیں ہے، ایک کام تھا تجھ سے“

فرزانہ نے ہاتھ گھما کر آگے کیئے اور سکوں سے بھری مٹھی کھولی اور کل پانچ روپے کے سکے لکڑی کی کے میز پر تقی کے سامنے ٹک ٹک کی آواز سے ڈھیر کر دیے۔ جن کو دیکھتے ہی تقی مسکرا دیا۔

”آپا بت کریم ختم ہوگئی ہے نا؟“

تقی نے شرارت سے لب بھینچے سوال کیا، فرزانہ نے جلدی سے لبوں پر انگلی رکھے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں اور کل یاد سے شہر سے لوٹتے ہوئے لے کر آنا“

فرزانہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور انگلی کو لبوں سے ہٹا کر ہوا میں ہلاتے ہوئے اسے تنبیہ کی

”آپا آپ کی یہ لاڈلی تبت اب سے سات روپے کی ہوگئی ہے لگتا ہے آپ اب اخبار نہیں پڑھتی ہیں“
 تقی نے سکے گنتے ہوئے بھنویں اٹھا کر فرزانہ کو تبت کریم کے مہنگے ہونے کی خبر سنائی
 ”ارے۔۔۔ باپ رے۔۔۔ اتنی مہنگی کب سے ہوگئی، دیکھو تو پکڑ کر پورے دو روپے مہنگی کر دی کبختوں نے“

فرزانہ کی تو حیرت کی انتہا نہ رہی منہ اور آنکھیں دونوں ہی کھل گئی ہیں، اور ہاتھ کو توبہ کرنے کے انداز میں
 کانوں سے لگایا
 ”تقی ابھی اس مہینے کی خرچی سے تو بس پانچ روپے ہی بچے ہیں میرے پاس، دو روپے مجھے ادھار دے دے اگلے
 مہینے چکا دوں گی“
 فرزانہ نے انگلی منہ میں دبائے منت کی، اس کی شادی کے دن قریب آنے والے تھے اور اسی لیے وہ دن رات اپنے
 رنگ و روپ کو سنوارنے میں لگی تھی۔
 ”ارے آپا میں تو مزاق کر رہا تھا آپ سے اور یہ رکھیں اپنے پانچ بھی، کل تبت آجائے گی آپ کی“
 تقی نے لب بھینچے سکے میز پر سے اکٹھے کیے اور فرزانہ کی طرف بڑھا دیے، فرزانہ کی آنکھیں خوشی سے چمک
 اٹھیں۔

”ہائے۔۔۔ میرا ویر۔۔۔ اپنی شادی کے بعد بھی تیرے گرتے کاڑھ کاڑھ بھیجوں گی“
 فرزانہ نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر تقی کی بلائی یں لیں، تقی اس کے ایسے خوش ہو جانے پر بے ساختہ ہنس دیا۔
 ”نہیں آپا حسن میاں ناراض ہو جائی یں گے“

تقی نے شرارت سے آنکھیں نچائی یں، وہ ایسا مزاق بہت کم کرتا تھا ہاں پر فرزانہ سے اکثر کر جاتا تھا
 ”چل ہٹ۔۔۔ بے شرم کہیں کا، ان کا ذکر یہاں کہاں سے آگیا“

فرزانہ تو ایک پل میں گلنار ہو گئی دوپٹے کے پلو کو منہ میں دبائے تفتی کے کندھے پر زور کی چپت لگائی، حسن، فرزانہ کا پھپھوزاد تھا جس سے بچپن میں ہی فرزانہ کی نسبت طے ہو گئی تھی اور اب جب وہ اکیس کی ہو گئی تھی تو شادی کو بہت دیر سمجھی جا رہی تھی۔

”بڑا آیا مجھ سے چھیڑ خانی کرنے والا۔۔۔ تو بتانا ذرا۔۔۔؟ رمنہ کو بھی لا کر دیتا ہے نابت کریم“

فرزانہ نے جھٹ توپوں کا رخ تفتی کی طرف کرنا چاہا

”آپا اسکو نبت کی ضرورت کہاں۔۔۔“

تفتی نے جھینپ جانے کے بجائے پر اعتماد انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو فرزانہ کا منہ کھل گیا اور آنکھیں سکڑ گئیں

”آئے۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ بڑا ہی کوئی مینا ہے تو قسم سے اوپر سے کیسا کڑک بنا پھرتا ہے“

فرزانہ نے اس کے کندھے پر چٹکی کاٹ کے ہنستے ہوئے کہا تو جو ابا وہ بھی کھکھلا دیا۔ وہ لاکھ سنجیدہ مزاج اور سخت تھا پر رمنہ کا دلکش سراپا اور معصوم سے لب و لہجہ کی وجہ سے وہ اپنے دل کے نرم گوشوں میں اس کے لیے جذبات رکھتا تھا۔

مغرب کی اذان کے فوراً بعد ہی برانڈے میں تخت کی بائیں طرف رات کے کھانے کا دسترخوان بچھ جاتا تھا، سردی ہو یا گرمی دسترخوان کی یہی جگہ مخصوص تھی جہاں چوہدری حاکم کی موجودگی میں حویلی کے تمام مکین ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

اور اب بھی دسترخوان پر رات کے پکوان سبجے تھے، مٹی کی ہانڈی جس سے بھاپ اڑ رہی تھی اس میں بکرے کا گوشت تھا، اوپر ادراک کے لچھے اٹھتی بھاپ کے باعث بمشکل نظر آرہے تھے، چاندی کے بڑے سے گول تھال

میں مٹروالے چاول اور ایک طرف بھاپ اڑاتی مسور کی دال جس پر سبز دھنیہ سجا تھا، سالن روز دوپہر اور شام کو تازہ پکتا تھا اور ہفتے میں دو بار چاول پلاؤ بنتا تھا۔ ناشتہ سب پر اٹھے اور چائے، اچار اور انڈوں کے ساتھ کرتے تھے۔ چاندی، پیتل اور سٹیل کے برتن بڑے سلیقے سے دسترخوان پر سجے تھے۔ صحن میں باورچی خانے کے قریب کچی مٹی سے بنے چبوترے پر تندرو سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

شمو تندرو میں بازو لمبا کیے تھپ تھپ روٹیاں لگاتی جارہی تھی اور تاری بواتندرو سے گرم گرم روٹیاں ایک لمبے سے کھونٹے میں پھنسا پھنسا کر نکالتی اور چپاتیا میں رکھتی جاتی، جہاں سے یہ روٹیاں بلقیس اور غزالہ دسترخوان تک لے جا رہی تھیں۔

سب لوگ باری باری اپنے کمروں سے نکل کر ہاتھ دھونے کے بعد آکر بیٹھے تو بلقیس نے غزالہ کو دسترخوان پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا اگرچہ اس کا نفی بھی ابھی صرف تین سال کا تھا پر وہ غزالہ کا اسی طرح خیال رکھتی تھی، شمو اور تاری کے آجانے کے بعد ہی بلقیس دسترخوان پر بیٹھتی تھی کیونکہ پھر تاری بوا اور شمو مل کر ضرورت کی چیزیں دسترخوان پر لاتی تھیں۔

”اس دفعہ کی فصل میں سے فرزانہ کے داج کے پیسے نکالنے کے بعد گودام بھرنے ہیں“
چوہدری حاکم نے دسترخوان پر بیٹھے نقیب حاکم اور نوازش حاکم کی طرف دیکھتے ہوئے حکم صادر کیا۔
”جی ابا جی۔۔۔“

دونوں کی ایک ساتھ جی نکلی تھی، مڈوب سے وہ سر ہلا کر رہ گئے، منیر میاں نے تشکر آمیز نگاہوں سے چوہدری حاکم کی طرف دیکھا مگر وہ کھانا کھانے میں مشغول تھے۔

چوہدری حاکم کے سیاہ اور سفید امتزاج کے بال تھے جن کے اوپر وہ سارا دن سفید لٹھے کی کلف زدہ پگڑی پہن کر رکھتے تھے اور رات کے کھانے سے کچھ دیر پہلے ہی اتار دیتے تھے۔ بارعب مونچھوں اور پروقار داڑھی والے حاکم دین اپنی عمر کے اس ادوار میں بھی مضبوط اور توانا ہونے کی وجہ سے اپنی عمر سے کہیں کم عمر نظر آتے تھے۔

چپ۔۔۔۔۔چپ۔۔۔۔۔فرہاد کے کھانے کی آواز دسترخوان کی خاموشی میں خلل ڈال رہی تھی۔ جس دن بھی بکرے کا گوشت بنتا کچھ ایسا ہی حال ہوتا۔

نقیب کے بالکل پاس بیٹھے تقی نے باپ کو ٹھوکا نقیب حاکم نے اس کی طرف دیکھا تو تقی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ دراصل وہ اپنی داخلہ فیس مانگنا چاہتا تھا جس کے لیے وہ اب باپ کو اشارے کر رہا تھا۔ کہ وہ چوہدری حاکم سے بات کریں۔

نقیب حاکم نے ایک نظر چوہدری حاکم پر ڈالی اور پھر جھکا دی، تقی دل مسوس کر رہ گیا۔ اور پھر خود نگاہ اٹھائے چوہدری حاکم کی طرف دیکھا۔

”داجی۔۔۔۔۔وہ میری اس دفعہ کی داخلہ فیس“

تقی نے باپ سے ناامید ہو کر خود ہی ہمت دکھائی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی فیس کے ساتھ رمناک بھی فیس اسی پیسوں سے ادا کرتا تھا۔ چوہدری حاکم نے اُس کی آواز پر اس کے بجائے پہلے نقیب کی طرف دیکھا تھا۔

چپ۔۔۔۔۔چپ۔۔۔۔۔فرہاد گوشت چبانے میں مصروف تھا۔

”یہ تو کلیکٹر لگ کے ہی ہماری جان چھوڑے گا“

چوہدری حاکم نے ایک آبرو چڑھائے ذرا کی ذرا تقی کی طرف اور پھر دوبارہ نقیب کی طرف دیکھا جواب نادم سانگا ہیں چر رہا تھا۔ چوہدری حاکم کو تقی کی پڑھائی سے عجیب سا ہی بیر تھا، ان کو لگتا تھا یہ زیادہ پڑھ لکھ کر اپنی جدی پشتی

چپ۔۔۔ چپ۔۔۔ چپ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ آواز فرہاد کے منہ سے مسلسل آرہی تھی۔
”نقیب، اس سے پوچھ کر اس کو دے دینا داخلہ فیس“

پیشانی پر بل ڈالے اونچی آواز میں اسے ڈپٹا، فرہاد نے سہم کر آواز بند کی، بد قسمتی سے وہ آج چوہدری حاکم ذرا قریب بیٹھ گیا تھا، اس کے پاس بیٹھے منیر میاں نے سٹیٹا کر فرہاد کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ اریب تو اپنے بیٹے کی اس عزت افزائی پر پہلو بدل کر رہ گئی۔

”اباجی فرہاد نے بھی آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا ہے“

منیر نے جلدی سے پوری باچھیں کھلائے چوہدری حاکم کے سامنے اپنے نمبر بنانے کی ناکام کوشش کی۔ چوہدری حاکم نے بغور فرہاد کی طرف دیکھا جواب آہستہ آہستہ منہ ہلارہا تھا۔

”لگتا ہے اگلی ساری پیڑھی باپ دادا کی سیاست، بیوپار اور زمینداری چھوڑ کر غلامیاں ہی کرے گی“

چوہدری حاکم نے استہزایہ مسکراہٹ لبوں پر سجائی، خدیجہ بیگم نے دوپٹے کا کونا درست کیا اور پھر کچھ دور چوکی پر بیٹھی تیری بوا کی طرف گردن موڑی

”تاری بوا۔۔۔ میٹھالے آئے اب۔۔۔“

”ہائے او۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا یار با!!!!!!“

غزالہ کا ہاتھ جو نوالہ بنائے اس کے منہ کو جا رہا تھا ہوا میں ہی رک گیا۔ وہ رملہ کو کھلا کر اب جلدی جلدی خود کھانے میں مصروف تھی۔ غزالہ نے گڑبڑا کر اپنی دائیں طرف دیکھا جہاں مالا کو ہونا چاہیے تھا پر وہاں مالا نہیں تھی۔

”مالا۔۔۔۔۔۔“

خود کلامی کے ساتھ ہی نوالہ پلیٹ میں دھر کر وہ باورچی خانے کی طرف دوڑی۔ اور ڈر سچ ثابت ہوا تھا مالا کھیر کا پتلا
الٹائے کھڑی تھی جو شائ دتاری بوانے بڑی چوکی پر رکھا ہوا تھا۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ غزالہ اس کی طرف بڑھتی
مالا تیر کی سی تیزی سے باورچی خانے سے باہر نکل چکی تھی۔

* * * * *

میرے نہر سے آج مجھے آیا یہ پیلا جوڑا۔۔۔ یہ پیلا جوڑا۔۔۔ یہ ہری ہری چوڑیاں۔۔۔۔۔

ڈھولک اور تالیوں کی تھاپ کے سنگ نسوانی آوازوں میں گیت گونج رہا تھا، جس کی آواز پھاٹک کے باہر براندوں میں بھی ہلکی ہلکی سنائی دے رہی تھی۔ پھاٹک کا ایک کواڑ کھلا تھا آج اور چھن چھن، چم چم اور کھی کھی کرتی خواتین بھاٹک سے اندر صحن میں داخل ہو رہی تھیں۔

میرے نبہر سے آج مجھے آپا یہ پیلا جوڑا۔۔۔ یہ پیلا جوڑا۔۔۔ یہ ہری ہری چوڑیاں۔۔۔۔۔

حویلی برقی قمقوں سے سبھی تھی باہر کی دیواریں، پھاٹک، بیرونی راہداری، باہر کے کھلے برانڈے ان کے ستون، پھر پھاٹک سے اندر داخل ہو کر چھت کی سامنے کی دیوار، صحن کے درخت، فوارہ اور اٹاری کے ستون جن کے گرد گول گول گھما کر قمقوں کو لگایا گیا تھا، غرض کے حویلی برقی قمقوں میں نہائی ہوئی تھی۔

آج فرزانہ کے مایوں کی تقریب تھی جو شادی سے سات روز پہلے رکھا گیا تھا۔ دور والے تمام عزیز، ناتہ دار حویلی میں جمع ہو چکے تھے جن کو اب سات دن تک حویلی میں شادی تک قیام کرنا تھا۔ پورے صحن میں چارپائی یاں ڈالی ہوئی تھیں جہاں ٹولیوں کی شکل میں عمر رسیدہ خواتین کرن لگے دوپٹے سروں پر اوڑھے خوش گپوں میں مگن تھیں، حقوں اور پان کا دور دورہ وقفے وقفے سے چل رہا تھا۔ جب کے جوان لڑکیاں اور کچھ خواتین اٹاری میں تخت کے قریب بچے قالین پر بیٹھی ڈھول پیٹ رہی تھیں۔ بچے پوری حویلی میں بھاگتے دوڑتے اور روتے دھاچو کڑی مچائے ہوئے تھے۔

خدیجہ بیگم باورچی خانے کے کواڑ کے پاس اور تاری بوا کواڑ تھا مے اندر کھڑی تھیں، شمو باورچی خانے میں چوکی پر بیٹھی پیالیوں میں چائے ڈال رہی تھی۔ ہلکے سے گندمی رنگ کی چائے پیالیوں اور کپوں سے بھاپ اڑتی الائی چچی کی خوشبو کو پورے باورچی خانے میں بکھیرے ہوئی تھی۔

”لڈو مہمانوں کو چائے کے ساتھ دے کر لڈو والی ڈرمی کو یاد سے تالا لگا دیجیو۔۔۔“

خدیجہ بیگم نے اپنی قمیض کے اطراف پر بنے کھیسے میں سے ڈرمی کی چابی نکال کر تاری بوا کی طرف بڑھائی، تاری بوا نے سر ہلاتے ہوئے چابی ہاتھ سے پکڑی۔

ہاتھ سے تیار کیے ہوئے موتی چور کے لڈو خود حویلی کے صحن میں تیار کروائے جاتے تھے اور پھر ان سے ایک ڈرمی بھری جاتی تھی اور پوری شادی کے دوران مہمانوں کو چائے کی پیالی کے ساتھ لڈو پیش کیے جاتے تھے۔

”بے فکر ہو جائے بی جی میں کنجی اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لوں گی“

تاری بو انے چابی کو اپنے دوپٹے کے ایک کونے کو اٹھا کر باندھتے ہوئے کہا

”ہممم، بہت اچھا کرے گی، نہیں تو وہ ہے نا ایک چھوٹی سی چندال میٹھے کی دشمن ہڑپ کر جائے گی سارے“

خدیجہ بیگم نے ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے تاری بو کو مالا سے خبردار کیا پھر جانے کے لیے قدم بڑھائے پر رُک کر

پر سوچ انداز میں پلٹیں

”دو وقت لڈو دیجیو مہمانوں کو، صبح کے ناشتے کی چائے کے ساتھ اور شام کی چائے کے ساتھ“

خدیجہ بیگم سمجھانے کے انداز میں تاری بو کو حکم صادر کرتیں باہر نکل گئیں اور تاری بو اسر ہلاتی لڈو کی ڈرمی کی طرف پلٹ گئی۔۔۔

ہلکے سے سبز رنگ کے جوڑے پر ٹشو کپڑے کا سنہری کناری والا دوپٹہ اوڑھے، ر مناکرے میں داخل ہوئی تو

سامنے پیلے جوڑے میں پلنگ پر بیٹھی فرزانہ کو دیکھ کر آنکھیں پوری کھل گئیں۔

فرزانہ اپنی سہیلیوں کے جھمگٹے میں پیلا جوڑا پہنے بیٹھی تھی اور ایک طرف خدیجہ بیگم کی سب سے چھوٹی بیٹی زیب

ٹانگ ہر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔

وہ جب بھی گھر آتی اس کے ٹھاٹھ ہی الگ ہوتے تھے، زیب کی شادی شہر میں ہوئی تھی جو چوہدری حاکم کے کسی

دوست کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تھی جو شہر میں ایک متوسط طبقے کا نایاب ناظم تھا اور نیا نیا شہر میں رہائش پزیر

ہوا تھا۔

”ہائے فرزانہ آپا کتنی خوبصورت لگ رہی ہو“

ر منا محبت سے ستائی شئی جملہ ادا کرتی فرزانہ کے قریب پلنگ کے پاس آئی جو اباً فرزانہ بھی محبت سے مسکادی۔
مائیوں کا جوڑا فرزانہ پر بیچ رہا تھا۔

”ارے نظر لگائے گی کیا، بے عقل کہیں کی ماں جیسی۔۔۔ ماشاء اللہ بولتے ہیں ساتھ“

زیب نے ماتھے پر بل سجائے ایک ہی پل میں ر منا کو جھاڑ دیا جو اس طرح جھاڑنے پر روہانسی ہوئی، کیونکہ زیب کے یوں پل بھر میں جھاڑ دینے پر کمرے میں موجود سب لوگ ایک ساتھ ر منا کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔
”زیب خالہ۔۔۔۔“

فرزانہ نے ر منا کا اتر اچہرہ دیکھا تو گھور کر زیب کی طرف دیکھا جو لا پرواہی سے ہاتھ ہوا میں چلا چکی تھی۔
”معافی چاہتی ہوں زیب پھپھو آئی بندہ دھیان رکھوں گی“

ر منا جو کچھ دیر پہلے چہک رہی تھی مریل سی آواز میں کہتی پلنگ چوکی پر سے اٹھی، دل ایک دم سے بجھ گیا تھا۔
”سنو نسیم میرا بھی کر دو تھوڑا سے یہ موامیک اپ شیک اپ، اسلم میاں خوش ہی ہو جائیں گے“

زیب نے گردن کو دائیں بائیں جنبش دیتے ہوئے شرما کر فرزانہ کی ایک سہیلی سے کہا جو دوسری کا سنگھار کرنے میں مصروف تھی، پاس بیٹھی فرزانہ کی تمام سہیلیاں منہ پر ہاتھ رکھے کھی کھی کرنے لگیں۔

ر منا اداس اور نادام سی صورت لیے کمرے سے باہر نکل آئی یونہی اتری صورت لیے اب اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی جب اچانک تقی کی آواز پر قدم تھم گئے۔

”کیا ہوا۔۔۔؟ منہ کیوں لٹکا ہوا ہے“

محبت اور اپنائیت بھرا لہجہ تھا، ر منا نے نگاہیں چرائیں۔ وہ گرتے کے آستین اوپر کو موڑے ہاتھ میں تھیلا تھامے کھڑا تھا جس میں شئی دفرزانہ کی سہیلیوں کے لیے گجرے تھے۔

”کچھ بھی تو نہیں اور منہ کب لٹکا، گردن پر ہی تو لگا ہے“

رمنانے زبردستی مسکراہٹ سجائے بات کو گول کرنے کی کوشش کی
 ”بات سنو، اریب پھپھونے کہا کچھ یازیب پھپھونے؟“

تقی نے آنکھوں سے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی سوال پوچھا، رمنانے جزیسی ہوتی خود کو سنبھال پائی اور
 پھر اس کے پیچھے کمرے میں چل دی۔ تقی نے گجرے کے تھیلے ایک طرف میز پر رکھے اور پھر سیدھا ہوا۔ یہ تقی کا
 ہی کمرہ تھا جہاں کسی بھی مہانوں کو آنے کی قطع اجازت نہیں تھی کیونکہ اس کی کتابیں میز پر ہی سچی تھیں۔

”کسی نے کچھ بھی نہیں کہا تقی بس تھکی ہوئی ہوں نیند نہیں پوری ہوئی شائی د“
 رمنانے آہستگی سے جواب دیا، جبکہ آواز ابھی بھی رندھی ہوئی تھی۔

”جھوٹ نام بولا کرو، خاص طور پر مجھ سے، اچھا اب یہ بتاؤ تیاری کیسی ہے امتحان میں بس دو مہینے ہی باقی ہیں“
 تقی نے خفگی سے ڈپٹ کر پوچھا، رمنانے جواب دینے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ پیچھے سے منہا کی آواز پر
 چپ ہونا پڑا

”او۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔ ملاقاتیں ہو رہی ہیں“

منہانے شرارت سے کہا اور پھر شوخ ہوتے ہوئے تقی کو اور رمنانہ کو دیکھا اگرچہ وہ رمنانے سے تین سال چھوٹی تھی پر
 اس سے بے تکلفی بہت تھی۔ اور تقی تو ویسے ہی اس کا بھائی تھا تو دونوں میں نوک جھونک مزاق مستی چلتی ہی رہتی
 تھی۔ وہ بالکل رمنانہ کی طرح کا جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھا۔

یہ ایک تھان سے لایا گیا کپڑا تھا جس سے گھر بھر کی تمام بچیوں رمنانہ، منہا، مالا اور ملا کے ایک جیسے جوڑے بنائے
 گئے تھے۔

”جیسی شکل ہے ہمیشہ ویسی بات کرنا تم تو، یہاں تمہیں ملاقات لگ رہی ہے، اس کو دیکھو زیب یا اریب پھپھو کا
 شکار ہوئے منہ لٹکائے کھڑی ہے“

تقی نے گھور کر اس کی چھیڑ خانی پر تگڑا جواب دیا جواب تقی کو منہ چڑا کر فکر مندی سے رونا کو کندھوں سے پکڑ کر ساتھ لگا چکی تھی۔ دونوں کے درمیان بچپن سے ہی بے حد دوستی تھی۔ کمرے میں کوئی داخل ہوا تھا۔

”تقی بھائی آجائیں۔۔۔ پھر سے لسٹ تھما دی ہے زیب خالہ نے“

فرہاد مصروف سے انداز میں ایک ہاتھ میں پرچہ تھامے اور دوسرے ہاتھ سے کواڑ کے آگے ڈالے پردے کو پیچھے کیے اندر داخل ہوا تھا۔

”ایک تو یہ خواتین کی چیزیں۔۔۔۔ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی ہیں“

تقی نے پیشانی پر بل ڈالے بیزاری ظاہر کی، جس پر رونا اور منہا ایک ساتھ منہ پر ہاتھ رکھے ہنس دیں۔ زیب تین دن پہلے ہی حویلی آئی تھی اور خریداری شای داب کر رہی تھی۔

”ما۔۔۔ م۔۔۔ منڈی۔۔۔۔ ارے تقی بھائی منڈی ہی منگوالی اس دفعہ تو زیب خالہ نے“

فرہاد نے بمشکل زیب خالہ کے لکھائی پڑھتے ہوئے لسٹ کے اوپر لکھی سب سے پہلی چیز بتائی

”بدھو یہ منڈی نہیں مہندی لکھا ہوگا، بہت نکلے ہو تم“

رمنانے فرہاد کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر پاس کھڑی منہا کی طرف دیکھا اب دونوں اس پر کھی کھی کر رہی تھیں۔

فرہاد تقی سے چھوٹا پر رونا اور رونا اور منہا دونوں سے بڑا تھا۔

”تم تو بڑی جیسے اُستانی لگ گئی ہونا، آٹھویں تو میں نے بھی اس دفعہ پاس کر لی ہے اور بہت جلد نویں جماعت میں جا کر تم سے آگے نکل جاؤں گا“

فرہاد نے کالر چڑھا کر تڑی لگائی، وہ تین دفعہ فیل ہونے کے بعد آٹھویں جماعت میں پاس ہوا تھا اس کا رونا اور منہا سے بیرہی رہتا تھا۔

”یہ منہ اور مسور کی دال“

اب کی بار منہانے کہا اور پھر سے ر منا اور منہا کی کھی کھی کمرے میں گونجی تھی
 ”چل۔۔۔ بڑی آئی تو ر منا گوی کی چچی۔۔۔ اپنی ناک دیکھی چپٹی سی۔۔۔ تقی بھائی ڈاکٹر بن کر سب سے پہلے اس کی
 ناک پر تحقیق کرنا کہ سانس کیسے لیتی ہے یہ بیجاری“

فرہاد نے جل کر منہا کے ناک پر چوٹ کی اور پھر تقی کو مشورہ دیتا ہوا خود ہی اپنی بات پر قہقہہ لگا گیا
 منہا اس کی بات پر بھنا کر دانت پیستے ہوئے آگے ہوئی تو تقی جھنجلا کر ان کے بیچ میں آیا۔
 ”ارے بس کرو تم سب کیا تماشا لگا رہا ہے، چلو فرہاد بہادر کو کہو گاڑی نکالے“

تقی نے منہا اور ر منا کو زبان نکال کر منہ چڑاتے فرہاد کا کندھا تھام کر حکم دیا اور پھر دونوں باہر نکل گئے۔ اور
 منہا نے ر منا کا پھر سے اداس ہوتا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔
 ”پتا ہے تقی بھائی کا دل کیوں نہیں چاہ رہا تھا جانے کو“

منہا نے شریر سے لہجے میں ر منا سے دیکھ کر پوچھا جو ایک دم سے اس کی بات کا اشارہ سمجھ کر جھینپ گئی اور پھر
 اس کے کندھے پر زور کی چٹکی کاٹی جس پر وہ مصنوعی چیخ اٹھی۔۔۔۔۔
 اسی لمحے پلنگ کے نیچے کھٹ پٹ ہوئی تو دونوں نے ایک ساتھ دوزانو بیٹھ کر نیچے دیکھا مالا لڈو کی بھری پلیٹ لیے
 پلنگ کے نیچے بیٹھی تھی۔

دیگیوں میں چیخ زور زور سے چل رہے تھے جن سے کھٹ، کھن۔۔۔۔۔ جیسی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں اور حویلی
 سے باہر برانڈوں میں لگے چارپایوں پر کہیں پیاز کٹ رہا تھا تو کہیں لہسن چھیلا جا رہا تھا۔
 ایک طرف بڑی بڑی پراتوں میں گوشت دھو دھو کر لایا جا رہا تھا۔ دیگیوں کے نیچے جلتی لکڑیوں کا دھواں دور دور
 تک پھیلا ہوا تھا اور مسالوں کی خوشبو پھاٹک تک پھیلی ہوئی تھی۔

گاما پیچھے کمر پر ہاتھ باندھے دیگوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ چوہدری حاکم کی زمینوں کے حساب کرنے والا منشی تھا۔ آج فرزانہ کی بارات تھی جس کے لیے صبح ہوتے ہی دیگیں چڑھادی گئی تھیں تاکہ دوسرے گاؤں سے براتیوں کے آنے سے پہلے کھانا تیار ہو جائے۔ گاما یونہی ہاتھ باندھے برانڈے میں داخل ہوا تو لڈن میاں کو اخبار تھامے پریشان حال دیکھ کر اس کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”اوہ۔۔۔ اللہ بس بچالے آنے والی آفت سے۔۔۔ اللہ تو ہی بچانے والا ہے“

لڈن میاں نے اخبار کو گود میں رکھے ہاتھ اوپر اٹھائے رقت آمیز لہجے میں اللہ سے دعا گو تھا۔ لڈن میاں سال میں دس مہینے گنج ہی کروائے رکھتا تھا اسے سر کے بالوں سے عجیب ہی چڑھتی۔

”کیا ہوا لڈن میاں ایسی کیا خبر دیکھ لی پرچے میں، ہمیں بھی تو پتا چلے“

گامے نے تجسس سے ناک پر عینک درست کرتے ہوئے پوچھا، لڈن میاں شائ دکل کی اخبار لیے بیٹھا تھا

”بس الٹ گئی ہے کہیں پریاڑ، تصویر ہی دیکھی ہے پڑھنا تو آتا نہیں مجھے، ڈڑا پڑھ کڑ تو بتا کہاں۔۔۔ کدھر کڑ کے الٹی ہے بس“

پریشان حال لڈن میاں نے اخبار گامے کے آگے کرتے ہوئے پوچھا، گامے نے جھک کر اس کے ہاتھوں میں تھامے اخبار کی طرف دیکھا

”بس۔۔۔ تو تیرے دماغ میں ہی الٹی ہے لڈن“

گامے نے ایک نگاہ ڈالتے ہی کہا اور ہنسنے لگا، لڈن اور پریشان ہوا، گامے کا تو ہنسنا بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”مطلب کیا تیری بات کا یہ کون سی جگہ جو لڈن کے دماغ کے نام پر رکھ دی سرکار نے“

لڈن لبوں پر انگلی رکھے پریشان حال ہو گیا۔

”جگہ کوئی نہیں ہے ایسی، تو نے پرچہ ہی الٹا پکڑا ہے، سیدھا پکڑ بس الٹی نہیں ہے، سیدھی کھڑی ہے“

گاما لگاتار ہنس رہا تھا، اور لڈن میاں اب اخبار کو سیدھا کیے کھسیانی ہنسی ہنس کر گامے کا ساتھ دے رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ گنج پر خارش کر رہا تھا۔

حویلی میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا، کچھ دیر میں ہی مہمانوں کو ولیمے کی تقریب کے سلسلے میں دوسرے گاؤں کے لیے نکلنا تھا۔ حویلی کے تمام مکین مدعو کیے گئے تھے۔ رمناپڑ مردہ سا چہرہ لیے تقی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”تقی۔۔۔ سنو۔۔۔“

رمنانے عجلت میں تیار ہوتے تقی کو پکارا وہ مضطرب سی تھی۔ اور اس کا یہ انداز پچھلے سات دن سے تھا۔

”ہاں کیا ہوا ایسے کیوں گھبراہٹ ہوئی ہو بولو“

تقی نے بالوں میں کنگھی چلاتے ہوئے مصروف لہجے میں پوچھا، وہ کمرے میں لگے آئی نے کے سامنے کھڑا تھا۔

”تقی تم سے بات کرنی ہے بہت ضروری ہے“

رمنانے اضطراب کی کیفیت میں دونوں ہتھیلیوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے کھڑی تھی۔

”ہاں تو کرو“

تقی نے کھڑی کو پاؤں میں پہنتے ہوئے پوچھا، وہ آج بھی سب لوگوں کے بعد تیار ہو رہا تھا اور کچھ دیر بعد جب جانے کا شور برپا ہونا تھا پھر جو تیار نہیں ہوا وقت پر سبھی کو اعباب کا شکار ہونا تھا

”نہیں وہ بات یوں یہاں کرنے والی نہیں ہے، آس پاس اتنے مہمان ہیں، میں چھت پر جا رہی ہوں تم اوپر آ جانا کچھ دیر میں۔۔۔ میں انتظار کر رہی ہوں تمہارا“

رمنانے الجھے سے لہجے میں اسے اوپر آنے کا کہا، تقی نے اس ساری بات چیت کی دوران پہلی دفعہ سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ واقعی پریشان لگ رہی تھی۔

ہلکے سے گلابی جوڑے میں اسکی دودھیارنگت زرد سی لگ رہی تھی۔
”تقی۔۔۔۔۔ بات سننا ذرا کی ذرا“

باہر سے زیب کی آواز ابھری جو شائ دپھر سے کسی کام کے لیے تقی کو پکار رہی تھی۔
”ایک تو یہ زیب پھپھو۔۔۔“

تقی نے جھنجلا کر کہا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے جواب کے انتظار میں کھڑی ر منا کی طرف دیکھا
”تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔۔ اور جہاں تک مجھے شک ہے تو میں جانتا ہوں تم کیا کہنے والی ہو“
تقی نے آبرو چڑھائے افسردہ سی مسکراہٹ سجائی وہ جانتا تھا یقیناً ر منا سے یہی کہے گی کہ وہ میٹرک کا امتحان نہیں
دینا چاہتی ہے۔

”نہیں تقی۔۔۔ تمہیں نہیں معلوم مجھے کیا بات کرنی ہے، میں پریشان ہوں“
ر منا نے زرد چہرے کا ساتھ التجا کی، تقی ذرا کی ذرا مضطرب ہوا کو اڑدھاڑ سا بجا اور زیب پھپھو غصے سے منہ پھلائے
کمرے میں داخل ہوئی یں
”تقی سن لے آکربات کتنی منتیں کر دئے گا، تیرے اسلم پھپھو بلا رہے ہیں“
زیب نے ناگوار سی نگاہ ر منا پر ڈالی جو تیزی سے زیب کے پہلو سے نکلتی اب چھت کے زینے کی طرف جارہی تھی

سب لوگ ویلیمے کی تقریب کے لیے نکلنے کو بلکل تیار کھڑے تھے، خواتین سے حویلی کا صحن بھرا ہوا تھا۔ باہر ایک
بس کھڑی تھی اور چند گاڑیاں۔ حویلی کا پھاٹک آج پورا کھلا تھا۔

.....ط

— — —

* * * * *

”نقیب۔۔۔۔۔نوازے۔۔۔۔۔ے۔۔۔۔۔ے“

"رَمْناءِ ا-ا-ا-ا-ا-ا-ا-ا-ا-ا رَمْناءِ ا-ا-ا"

مالا کی نگاہیں جمیں تھیں جہاں ایک سیاہ مکھی بٹن سے قریب ہاتھ پر بیٹھی تھی۔ پھر غزالہ نے رمناکے وجود کو جھنوڑا
تھا۔ مکھی اڑگئی تھی یر بٹن وہیں تھا۔

حویلی کے پھاٹک سے کتنے ہی سیاہ کھیڑیاں پہنے قدم حویلی کے صحن کی طرف آرہے تھے۔ اور پھر سب کے جھمگٹے سے میں سے آوازیں ابھریں۔

”هٹوسب۔۔۔ پیچھے ہٹو۔۔۔ منا۔۔۔ منا پُتر“

نقیب حاکم دوزانور منا کے پاس بیٹھ گئے تھے اور گال تھپتھپا رہے تھے۔ نوازش تو لڑکھڑاسا گیا جسے پیچھے کھڑے منیر میاں نے تھام کر گرنے سے بچایا تھا۔

بہت دیر ہو چکی تھی اس کی ناک کے نتھنے سے بھی خون کی لمبی لکیر اب بہہ کر اس کے ہونٹوں تک آرہی تھی۔

بے جان کھلی آنکھیں چیخ چیخ کرتا رہی تھیں کہ جسم سے روح پرواز کر چکی ہے۔ سارے رشتہ دار گول دائی رے

کی شکل میں جھکے ہوئے تھے منہ پر ہاتھ تھے۔ اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی، شذر۔۔۔

مالانے آہستگی سے رمناکا ہتھیلی میں سے بٹن کو اٹھایا بلکہ شریقی رنگ کا بٹن تھا جس پر چھوٹی چھوٹی سیاہ لمبی لائی نیں

تھیں۔ ایک جھٹکے سے کسی نے ر منا کو گود میں اٹھایا تو ملا کی گال سے ر منا کا بے جان ہاتھ ٹکرا گیا تھا ایسے جیسے اس

نے مالا کے گال کو چھوا ہو۔

کسی کا دھکا لگا تھا مالا کو۔۔۔ شاید کسی کے پاؤں کا دھکا۔۔۔ بٹن ہاتھ سے چھوٹا اور گرا۔۔۔ لڑھکتا
 لڑھکتا۔۔۔ لڑھکتا۔۔۔ دوسرے اینٹوں کے درمیان رک گیا، مالا نے ننھے سے ہاتھ بڑھائے اور دوانگی کی
 پوروں میں بٹن کو پھر سے اٹھالیا۔

”بہا۔۔۔ در۔۔۔ تقی۔۔۔ جلدی۔ گاڑی نکالو کوئی“

نقیب نے رونا کو باہوں میں اٹھایا ہوا تھا اور نوازش دلخراش چیخوں سے پکار رہا تھا۔ سب پیچھے پیچھے ہو کر جگہ دے
 رہے تھے نقیب سولہ سالہ رونا کو بازوؤں میں ڈالے آگے بڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ سفید لٹھے کی مانند چہرہ لیے
 نوازش چل رہا تھا۔

”ہائے۔۔۔ میری بچی۔۔۔ کیا ہو گیا۔۔۔ رونا۔۔۔ رونا۔۔۔ ا۔۔۔ ا۔۔۔ ا۔۔۔ اٹھ جا میری بچی“
 غزالہ بے حال بنا دوپٹے پیچھے بھاگ رہی تھی ناجانے ہجوم میں کب کسی کے پاؤں کے نیچے دوپٹہ دب گیا تھا۔ مالا
 بٹن مٹھی میں لیے نا سمجھی سے سب کو تاک رہی تھی سب رو رہے تھے چیخ رہے تھے۔

”بلقیس غزالہ کو پکڑ۔۔۔ پکڑ۔۔۔ اس کو لے کر آ۔۔۔ ہائے۔۔۔ لے کر آ اس کو“

خدیجہ بیگم کی کانپتی سی آواز پر بدحواس کھڑی زیب اور بلقیس بھاگی تھیں۔ خدیجہ بیگم سینے پر ہاتھ دھرے ڈھنکے کو
 تھیں جن کو اریب نے تھام رکھا تھا، بلقیس اور زیب غزالہ تک پہنچی جب تک بہت سی خواتین غزالہ کو تھام چکی
 تھیں وہ ان کے ہاتھوں سے اپنا آپ چھڑا رہی تھی تڑپ رہی تھی۔

”رونا۔۔۔ ا۔۔۔ ا۔۔۔ ہائے میری شہزادی آنکھیں کیوں نمیں کھول ری۔۔۔ ہائے۔۔۔ او میرے ربا“
 وہ دہائی دے رہی تھی پیٹ کے اندر ناف پھڑپھڑانے لگی تھی۔۔۔۔۔ دل کے اندر اٹھتے ہچکولے پتادے رہے تھے
 ۔۔۔ وہ موئی کوکھ سے جنی اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔

حویلی کے پھاٹک پر ہجوم بڑھ گیا تھا۔۔۔ چوہدری حاکم کی بوڑھی ٹانگیں کانپ اٹھیں ایسے کانپ رہی تھیں کہ پاس کھڑا گاما اگر ناسہارا دیتا وہ گر جاتے۔

اسلم کی جیب میں تقی نقیب کے ساتھ مل کر رونا کو جیب کی پچھلی سیٹ پر لٹا رہا تھا۔ ہجوم ایسا تھا کہ جیسے پورا گاؤں اٹھ آیا ہو گھڑی پل میں، تقی بدحواس کھڑا بار بار خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتا کانپتے ہاتھوں سمیت پیچھے ہوا، عقل دنگ تھی، چہرہ زرد تھا۔۔۔ اور دل دھڑکنام کر چکا تھا۔

نوازش جلدی سے دوسری طرف سے گاڑی میں بیٹھا تھا اور رونا کا خون سے لت پت سراپنی گود میں دھر لیا۔ اسلم اب گاڑی سٹارٹ کر رہا تھا، نقیب فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا۔
”جلدی بیٹھ تقی اپنے چچا کے ساتھ جلدی کر۔۔۔“

پیچھے سے نقیب نے اس کی پیٹھ پر دھکامارا تھا وہ جو بے حال سا کھڑا تھا ہل گیا۔ اور پھر اسی طرح بے جان سار مناکے پاؤں اپنی گود میں دھر کے بیٹھ گیا، اس کے پاؤں ٹھنڈے تھے۔۔۔ ٹھنڈے۔۔۔ جیب چلنے لگی تھی تقی کی نگاہیں اس کے پاؤں پر جمی تھیں، جو اس کی گود میں ہل رہے تھے، گلابی ایڑیوں والے ٹھنڈے پاؤں

”رنا۔۔۔ رنا۔۔۔ رنا پتر۔۔۔ اٹھ۔۔۔ پتر۔۔۔“

نوازش کی کانپتی سی آواز ہچکولے کھاتی جیب میں ابھر رہی تھی۔ اسلم جیب کو جتنا تیز چلا سکتا تھا چلا رہا تھا۔ گاؤں میں کوئی ہسپتال نہیں تھا ایک چھوٹی سی ڈسپنسری تھی اس لیے رونا کو سیدھا شہر لے جایا جا رہا تھا۔ نوازش نے اپنا منڈا سار مناکے سر کے نیچے بہتے خون پر رکھا ہوا تھا

”رنا۔۔۔ رنا۔۔۔ رنا۔۔۔ پتر۔۔۔“

[illegible]

* * * * *

حویلی کے بیرونی برانڈوں میں مرد چٹائی یوں پر سفید کپڑے ڈالے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چارپائے سبھی ایک طرف ایک دوسرے کے اوپر نیچے کھڑے کر دیے گئے تھے۔

آج رونا کے انتقال کے تیسرے روز قُل تھے۔

فسوں میں ڈوبی حویلی اور ہر مکیں کا پڑ مردہ چہرہ اس موت ناگہانی کا منہ بولتا ثابت تھا۔ رمناکے چھت کے گر جانے کو ڈاکٹر نے بھی حادثاتی موت قرار دیا تھا۔ ہر کوئی اس کے چھت پر ہونے کے الگ الگ قیاس لگا رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا مالا کو تلاش کرنے گئی ہوگی، کوئی کہہ رہا تھا چھت میں کھیلنے بچوں کو اتارنے گئی ہوگی کہ چلو بسیں نکلنے کو تار ہیں۔

حویلی کا پھاٹک کھلتے ہی پکی اینٹوں کی روش سے آگے صحن میں نیم اور پیپل کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ جو ہوا چلنے سے کبھی ادھر تو کبھی ادھر پورے صحن میں گھوم رہے تھے۔ آدھے صحن میں دھوپ آچکی تھی، چڑیاں درختوں سے اڑ کر فوارے تک آتیں اور پھر فوارے کے فرش پر سے سوکھاتیکا اٹھا کر اڑ کر پھر سے درخت کی طرف چلی جاتیں، درختوں کے نیچے چار پائی لگی تھیں جن پر کچھ بزرگ خواتین نیم دراز سستار ہی تھیں، کچھ بیٹھیں آہستہ آہستہ محو گفتگو تھیں اور کچھ حقے کے کش رلگ رہی تھیں۔

اور بلکل سامنے حویلی کے لمبے برانڈے میں سفید چادریں بڑے سلیقے سے بچھی تھیں۔ اور ان سفید چادروں پر جگہ جگہ کھجور کی خشک گٹھلیوں کے ڈھیر لگے تھے۔

میز پر پڑی چاندی کی پیالی میں سوکھے آٹے میں دھنسی تین اگر بتیوں کے دھویں سے تین دھاری دار لائی نیں اوپر کواٹھ رہی تھیں اور کچھ انچ کے فاصلے پر جا کر ہوا میں گھل رہی تھیں۔ اگر بتیوں کی معطر خوشبو اٹاری کیا تمام کمروں میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔

اگر بتیوں کے بلکل پاس میز پر سفید کپڑا ڈال کر قرآن پاک اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔ سفید بچھی ہوئی چادروں کے ارد گرد آلتی پالتی مارے، سروں پر دوپٹے ڈالے خواتین آگے پیچھے وجود کو حرکت دیتے ہوئے قرآن پڑھ رہی تھیں اور کچھ کھجور کی گٹھلیوں کو ہاتھ میں مڑوڑے پہلے کلمے کے ورد کے بعد ٹک۔۔ ٹک کی آواز کے ساتھ کھجور کی گٹھلی اپنے سامنے پڑے چھوٹے سے گٹھلیوں کے ڈھیر پر پھینک رہی تھیں۔ گٹھلیوں کی ٹک ٹک کرنے کی آوازوں کے ساتھ خواتین کی باتوں کی مدھم سرگوشیاں ارد گرد سے ابھر رہی تھیں

”چھت پر تھی، دیوار بھی چھوٹی ہے وہاں سے نیچے گری ہے سیدھا سر پکے فرش پر آکر لگا بس۔۔۔“ کوئی عورت کسی دوسری عورت کو رمناء کے انتقال کا سبب بتا رہی تھی۔

غزالہ خشک آنکھوں کی پتلیوں کو سامنے غیر مرئی نقطے پر مرکوز کیے سر کو دیوار کے ساتھ لگائے ان سب کے درمیان خاموش بیٹھی تھی۔ سر آدھا دوپٹے سے ڈھکا تھا آدھا ننگا تھا جسے پاس بیٹھی عورت نے دیکھا تو کھینچ کر اس کا دوپٹہ آگے کر دیا اور خود پھر سے ہلتے ہوئے قرآن پڑھنے لگی۔ دوپٹے کے ساتھ غزالہ کے بالوں کی کتنی لٹیں بھی منہ پر آگری تھیں جن سے وہ بے پرواہ کسی مجسمے کی طرح بیٹھی تھی، تین دن سے متواتر رونے سے آنکھوں کے اوپری پپوٹے سوزش لیے ہوئے تھے ہونٹ خشک تھے جن پر سیاہ سپرٹی جمی تھی۔

”آہ۔۔۔۔۔ اللہ رے توبہ۔۔۔۔۔ جوان اولاد کا دکھ۔۔۔۔۔ رب کسی کو نادکھائے“

کسی نے غزالہ کو دیکھ کر آہ بھری تھی۔

” اتنی خوبصورت تھی بچی، یہ۔۔۔۔۔ بھاگی پھر رہی تھی اپنی بوا کی بیٹی کی شادی پر بس نظر کھا گئی بیچاری کو“
 ” یہ نوازش کی وہی والی بیٹی تھی ناجو تلی کی منگ تھی“ کانوں میں کی ہوئی سرگوشیاں تھیں پر ارد گرد سب کو سنائی دے رہی تھیں۔

” چوہدری حاکم نے حویلی اتنی پیاری بنائی ہے چلو بندہ چھت کے پردے بھی اونچے کر دے بچوں والا گھر ہے،
 جوان جہان پتری گنوا دی“

” ارے بھئی جو قسمت میں لکھی کون ٹال سکتا۔۔۔۔۔ بس کیا کر سکتے ہیں اللہ کی چیز تھی اس نے لے لی“
 خواتین کی کھسر پھسر بڑھتی بڑھتی مکھیوں کی بھنبناہٹ جیسی آواز ابھرنے لگی۔ ایک معزز خاتون نے چہرہ اوپر اٹھایا اور ناک پر دھرے چشمے کی اوٹ سے کاناباتی کرتی خواتین کو گھورا۔
 ” باتیں کم کیجیے۔۔۔ قرآن پاک پڑھیے بچی کی روح کو بخشیں۔۔۔ پتہ نہیں گٹھلی پر گٹھلی گرا رہی ہیں سب، کرباتیں رہی ہیں“

خاتون نے تمام باتیں کرنے والی خواتین کو تنہیہ کیا تو سب ایک دم شرمندہ ہوئی یں، باتیں چھوڑ کر پڑھائی کرنے لگیں، لیکن کچھ دیر بعد پھر وہی حال تھا۔

حاکم قصر کے صحن میں موجود بڑے نیم کے پتے ہوا کے جھونکے سے سرسراہٹ کا شکار ہوتے تو ایک مخصوص سی آواز فضا میں ترنگ سا بجاتی اور پھر تھم جاتی۔ دوپہر عروج پر تھی اور حویلی کے تمام مکین کمروں میں سستانے کو لیٹے تھے۔ نیم کے درخت کے نیچے لگی چارپائی پر تاری بوا آنکھوں پر ایک بازو دھرے خراٹے مار رہی تھی۔

اور کچھ دور کرنے میں مالا اور سکینہ بیٹھی کھیل رہی تھیں، سارا گھر دوپہر کو سُستاتا تھا لیکن مجال ہے کہ وہ دونوں گھڑی پل کو بھی لیٹتی ہوں ساری دوپہر یونہی نیم کے درخت کے نیچے کھیلتی رہتی تھیں، غزالہ مارپیٹ کر اگر مالا کو ساتھ لیٹا بھی لیتی تو وہ کچھ دیر بعد ہی غزالہ سے آنکھ بچا کر نکل آتی۔ اور آجکل تو ویسے ہی غزالہ کو کچھ ہوش نہ تھا، ر منا کے انتقال کو ابھی ہفتہ بھر ہی تو ہوا تھا وہ تو ہر وقت سر کو دوپٹے سے باندھے رکھتی یا پھر کونے کھدرے میں گھس کر روتی رہتی۔

مالا نے پاس پڑی گڑیا اٹھائی، یہ سفید کپڑے میں روئی بھر کر بنائی گئی گڑیا تھی، جس کی آنکھیں، ناک، منہ اُون کے دھاگے سے کڑھائی کاڑھ کر بنائے ہوئے تھے ناک اور آنکھیں کالے دھاگے سے اور ہونٹوں کے لیے ایک باریک سی لائی ن سرخ دھاگے سے بنائی ہوئی تھی کانوں کی جگہ بس ایک ایک موتی لگایا ہوا تھا۔ گڑیا کو چمچماتا سُرخ غرار اور چھوٹی سی تنگ قمیض پہنار کھی تھی، اور گلے میں موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کے ہار بھی پہنایا ہوا تھا۔ یہ گڑیا مالا کو فرزانہ نے بنا کر اس کی سالگرہ پر تحفے میں دی تھی۔ ویسے تو مالا کے پاس ایسی بہت سی کپڑے کی گڑیاں تھیں پر مالا کو یہ والی سب سے زیادہ عزیز تھی۔

مالا نے گڑیا کے دھاگے سے بنے بالوں کی ننھے ہاتھوں سے چٹیا بنائی اور پھر ربن باندھنے کی غرض سے پاس پڑی ماچس کی ڈبی کو کھولا۔ جیسے ہی ماچس کی ڈبی کو کھولا نظر ربن کے بلکل پاس پڑے بٹن پر تھم سی گئی۔ بٹن اٹھایا اور پاس بیٹھی سکینہ جو مٹی کے برتن میں پتے توڑ کر ڈال رہی تھی اس کو پکارا ”یہ دیکھ سکینہ آپا کا بٹن جب چھت سے چھلانگ لگائی تھی آپا نے، اس کے ہاتھ میں تھا“

مالا نے آنکھیں سیڑ کر مسکراتے ہوئے بٹن سکینہ کے آگے کیا، سکینہ تار کی بوا کی چھوٹی بیٹی اور مالا سے ایک سال بڑی تھی ویسے تو اس کا زیادہ کام نقی اور رملہ کو اٹھائے رکھنا ہوتا تھا پر جیسے ہی وہ سوتے تو وہ جھٹ سے مالا کے ساتھ کھینے کو پہنچ جاتی۔

” دکھا۔۔۔ مجھے۔۔۔ مالا یہ تو مردانہ بٹن ہے“

سکینہ نے بٹن کو مالا سے پکڑ کر اپنے ہاتھ میں لیا اور دائیں بائیں گھماتے ہوئے آنکھوں کو سکوڑے بٹن پر نگاہیں جمائے مالا کو بٹن کے متعلق آگاہی دی، وہ تار ی بوا اور شمو کے ساتھ کام کر داتی تھی اس لیے اس طرح کی باتوں میں اس سے سیانی تھی

” وہ کیا ہوتا ہے؟ مُردانہ۔۔۔ لادے۔۔۔ جھوٹی کہیں کی یہ تو میری آپا کا ہے، آکر ڈانٹے گی مجھے“

مالا نے اچک کر سکینہ کی دو انگلیوں کے بیچ دبو چاہو ابٹن چھینا، اور پھر سے ماچس کی ڈبی میں احتیاط سے رکھ دیا

” تیری آپا اب کبھی نہیں آئے گی مالا، وہ اوپر آسمانوں میں چلی گئی ہے اللہ میاں کے پاس“

سکینہ کی بات پر دونوں نے ایک ساتھ چہرہ اوپر اٹھائے آسمانوں کی طرف دیکھا تھا۔ مالا نے ایک ہاتھ سے چہرے پر آئے بال ہٹائے اور جھوٹی سی ناک چڑھائی

” اچھا۔۔۔ تو پھر جب آئی گی، تب تو پوچھیں گی نا، بتا مالا میرے ہاتھ سے جو بٹن اٹھایا تھا وہ کہاں ہے، دے مجھے نہیں تو اماں کی طرح پیٹ ڈالوں گی تجھے“

مالا نے ایک ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے اور دوسرا کمر پر دھر کر ر منا کی طرح ادکاری کی

” ارے۔۔۔ بدھو کہیں کی، اللہ پاس جو چلا جاتا ہے، وہ پھر کبھی واپس نہیں آتا ہے بس وہیں رہ جاتا ہے اوپر آسمانوں میں“

سکینہ نے اس کی عقل پر اپنا ننھا ساما تھا پیٹ لیا، جبکہ وہ اب پیشانی پر بے یقینی کے بل ڈالے اسے گھور رہی تھی۔

” تجھے کیسے پتا اتنا کچھ۔۔۔ بتا۔۔۔ چلا کو بٹن نہیں دوں گی تجھے پھر بھی“

مالا نے خفگی سے گھورتے ہوئے اس سے پوچھا، اور ماچس کی ڈبی اٹھا کر اپنے پیچھے چھپائی

”مجھے چاہیے بھی نہیں گنداسا بٹن ہے، میرے ابا بھی تو اللہ پاس ہیں میری اماں نے بتایا ہے مجھے یہ سب کہ بس ہم کو جانا ہو گا ایک دن، وہ نہیں آسکتے جی“

سکینہ نے منہ پھلائے اسے ساری بابت بتائی اور پھر دنوں لبوں کو دائی یں بائی یں خفگی کے اظہار کے طور پر گھمایا

”اچھا چل مان لی تیری بات پھر میں چلی جاؤں گی اللہ کے پاس تب دوں گی یہ بٹن آپا کو، اماں سے کہوں گی مجھے جانا ہے وہاں“

مالا نے بڑی احتیاط سے ڈبی کھول کر بٹن کے پاس پڑے ربن کو اٹھایا ڈبی کو بند کیا اور پھر گڑیا کے بالوں میں ربن باندھنے لگی۔ سکینہ نے بھی مٹی کے برتن میں پتے توڑ کر پھینکنے شروع کر دیے۔

”جلدی کر تیرا سالن ہی نہیں بنا بھی تک میری گڑیا تیار بھی ہوگئی ہے“

مالا نے پاس پڑے شاپر میں سے چنے ایک طرف کرتے ہوئے میٹھے سفید پتاشے اٹھا کر منہ میں ڈالے۔ سکینہ اب زور زور سے مٹی کے بنائے چھوٹے سے پتیلے میں مٹی کا چیچ چلا رہی تھی۔۔۔

شمو دھلے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے چھت کا زینہ اتر رہی تھی، سیاہ رنگ کی قینچی چیل کے اگلے سرے پر چمڑے سے گانٹھ لگی تھی جو اب تقریباً کھلنے کو تھی گھسی ہو چمڑے کی چیل بمشکل وہ پاؤں میں پھنسائے ہوئے تھی۔

زینے اتر کر نیچے آئی اور پھر کپڑوں کا ڈھیر درخت کے نیچے لگی چارپائی پر رکھا جہاں تار ی بو ا جلدی جلدی اب جوڑوں کو الگ کر رہی تھی مردوں کے تمام جوڑے استری کے لیے باہر جانے ہوتے تھے، اس لیے ان کو الگ کیا جاتا تھا۔ شمو بھی تار ی کی مدد کر رہی تھی ہلکے سے بھورے شربتی رنگ میں کاٹن کی مردانہ قمیض پر مٹی کا دھبہ تھا جس پر شمو کی نظر پڑی۔

”اماں۔۔۔ یہ قمیض دھلا نہیں کیا چھت پر سے تو دھلے کپڑوں میں تھا“

شمو نے داغ لگے مردانہ قمیض کو اوپر اٹھایا، قمیض ایک دم سے گھل کر سیدھا ہو گیا قمیض پر ناصر ف داغ تھا بلکہ اس کے سامنے کی جیب پھٹ کر لٹک رہی تھی۔

”یہ کس کی قمیض ہے؟۔۔۔۔۔ اماں دیکھ تو جیب پھٹی ہے ویسے نئی قمیض ہے“

شمو پھٹی جیب کو دیکھ کر اور حیران ہوتے ہوئے تاروی بو اسے پوچھ رہی تھی اب کی بار تاروی بو انے ماتھے پر بل ڈالے قمیض پر غور کیا۔

”اللہ جانے۔۔۔ شادی پر اتنے مہمان تھے، سب نے نئے جوڑے بنوائے تھے اب موئی یہ کس کی قمیض ہے شامی دکنی مہمان کی رہ گئی ہو یہاں“

تاروی بو انے حیرت ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھ کر شمو کے ہاتھ سے قمیض کو تھاما اور الٹ پلٹ کرنے لگی

”لے بھلا بتائی قمیض ہے جیب بھی پھٹی ہے اور بازو کا بٹن بھی ٹوٹا ہے“

تاروی بو انے ایک نیا انکشاف کیا

”اماں دکھا باجی جی سے پوچھ کر آتی ہوں۔۔۔ کسی مہمان کا رہ گیا تو بھجوا دیں“

شمو نے ماں کے ہاتھ سے قمیض لیا اور برانڈے کی طرف قدم بڑھا دیے، ٹوٹی چپل بس ساتھ چھوڑنے کو ہی تھی جسے گھسیٹ گھسیٹ کر وہ اٹاری کے زینے تک پہنچی، اریب عجلت میں اپنے کمرے سے نکلی اور شمو کو دیکھ کر دانت پیستے ہوئے آگے بڑھی

”شمو۔۔۔ کہاں مصروف ہو تم اور تاروی بو آج۔۔۔ جلدی کر ٹفن بنادے تیرے بھائی جی کو نکلنا ہے شہر کے لیے“

اریب غصے میں بھری اس کے سر پر آئی اور عجلت میں شمو کو حکم صادر کیا

”باجی جی کپڑے الگ کرنے کو بیٹھے تھے، آپ پریشان ناہوں میں ابھی کیے دیتی ہوں کام“

شمنونے جلدی سے اریب کے غصے کو کم کرنے کے لیے صفائی دی اور باورچی خانے کی طرف قدم بڑھائے پھر یک دم قمیض کا یاد آجانے پر پلٹی جوا بھی تک اس کے ہاتھ میں تھا

”باجی جی۔۔۔ یہ قمیض نا پچان میں آئے کس کا ہے۔۔۔“

شمنونے قمیض اریب کی طرف بڑھایا اریب نے آنکھیں سکوڑے قمیض تھاما بھی ہاتھ میں ہی لیا کہ پیچھے سے منیر کی ہانک پر گڑبڑا کر پلٹی۔ زینے چڑھتے ہی قمیض تخت پر پھینکا اور اپنے کمرے کے طرف دوڑ لگا دی جہاں سے منیر بار بار آوازیں دے رہا تھا۔ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی وہ جھنجھلا کر گویا ہوا

”اریب جلدی کر دو بھئی، بس نکل جائے گی کب سے کہہ رہا ہوں“

منیر منڈاسے کو بڑے سلیقے سے کندھے پر رکھ رہا تھا، وہ کنگھی بھی کر چکا تھا اب بس ٹفن کو پھیلک میں رکھنا تھا اور روانہ ہونا تھا۔

”بس ابھی آپ باہر کو آجائیے بی جی سے سلام دعا کیجیے میں ٹفن تھیلے میں رکھواتی ہوں“

اریب نے پلنگ پر پڑے پھیلک کو اٹھایا اور تیزی سے داخلی دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ تخت پر دھرے قمیض سے بے نیازی برتنی وہ اٹاری کے زینے اتر کر باورچی خانے کی طرف جارہی تھی۔

خدیجہ بیگم تھوک دان تھا مے کمرے سے باہر آکر جیسے ہی تخت پر بیٹھنے لگیں سب سے پہلے نظر قمیض پر گئی۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”اری او۔۔۔ سکینہ۔۔۔ اٹھایہ موا پیر ہن یہ کوئی جگہ ہے جہاں پھینکا ہوا“

خدیجہ بیگم نے ستون کے گرد باہیں ڈالے جھولتی سکینہ کو آواز دی وہ بھاگتی ہوئی آئی تو خدیجہ بیگم نے اسی طرح گٹھڑی صورت قمیض اٹھا کر سکینہ کے بازوؤں پر دھر دیا۔ سکینہ قمیض بازو پر ڈالے بھاگی چلے جارہی تھی جب بلقیس کی آواز پر قدم تھمے۔ بلقیس روتے نقتی کو اٹھائے کھڑی تھی۔

”سکینہ۔۔۔ رُک رُک۔۔۔ یہ نقی کو پکڑ، روئے چلے جا رہا ہے جھولے پر لے جا اسے، مجھے اور بھی سو کام ہیں“
 بلقیس نے گود میں اٹھائے روتے بلکتے نقی کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

”باجی جی یہ قمیض رکھنے کو بولا ہے بی جی نے“

سکینہ نے نقی کو تھامنے کے بجائے ہاتھ آگے کیا، جس پر قمیض رکھا تھا

”رکھ دے کسی بھی الماری میں جان چھڑا، جلدی آنقی کو پکڑ“

بلقیس نے قمیض کو دیکھے بنے بلکتے نقی کو جھلاتے ہوئے مگن سے انداز میں حکم دیا، سکینہ نے فوار سر ہلایا اور ساتھ ہی کمرے میں گھسی اور بھاگ کر جاتے ہی الماری کے کواڑ کھول کر قمیض وہاں ایک کونے میں رکھ کر بھاگتی ہوئی واپس آئی۔ بلقیس کے ہاتھوں سے بلکتے نقی کو تھاما اور درختوں کے تنے سے رسیوں کے ساتھ ٹائی ربا ندھ کر بنائے گئے جھولوں کی طرف بڑھ گئی۔۔۔

کمرے میں ملگجاساندھیرا تھا نقی بیڈ پر چت لیٹا تھا اور ایک بازو موڑے آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ گرتے کی آئی ستین ہمیشہ کی طرح آگے سے موڑ کر تھوڑے اوپر چڑھا رکھے تھے۔

کمرے میں پلنگ کے سرہانے لگے لکڑی کے میز پر پڑی کتابوں پر گرد کی مہین سی تہہ جی تھی، کرتی بھی کیا یہ بے جان کتابیں ان کو چھوئے مہینوں بیت گئے تھے۔ کتابیں جمع کرنا ان کو پڑھنا اور پھر یوں سنبھال کر رکھنا نقی کا مشغلہ تھا، پھر وہ ان پڑھی ہوئی کتابوں کو بھی بار بار پڑھتا تھا۔

اسے عام کتابیں رسالے نہیں اچھے لگتے تھے وہ تحقیق، سائی نس، اسلامک تاریخ پر لکھی گئی کتب پڑھنے کا شوقین تھا لیکن اب رونا کے جانے کے بعد تو جیسے وہ کتابوں سے روٹھ گیا تھا اور کتابیں اس پر فقط نالاں گرد کی چادر اوڑھے ہوئے تھیں۔

ان کتابوں کو کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت بھی تو نہیں تھی شمو تمام کمروں میں جھاڑو کے بعد جھاڑ پونجھ بھی کرتی تھی پر یہاں تقی کی قیمتی کتابوں کی وجہ سے جھاڑ پونجھ اور دیگر صفائی سختی سے منع تھی وہ خود جب چاہتا تھا ان کو صاف کرتا تھا۔ پر اب تو چھ ماہ سے وہ خود اپنا خیال کم رکھتا تھا تو ان کتابوں کی گرد کو کیسے صاف کرتا۔

ر منا کو گزرے چھ ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا پر جہاں تقی کی یہ حالت تھی وہاں گھر کے اور مکین بھی ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں آئے تھے لیکن ان کے زندگی کے معاملات پھر بھی چلنے لگے تھے۔ لیکن تقی تو جیسے بس کمرے کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اب بھی کمرے کو اڑ، کھڑکی بند کیے پر دے گرائے وہ پلنگ چوکی پر نیم دراز تھا۔ کہیں دور دماغ میں کچھ آویں اور یادیں اور کچھ گزرے لمحے ابھر رہے تھے مند مل ہو رہے تھے۔

یار کے غم کو عجب نقش گری آتی ہے
پور پور آنکھ کی مانند بھری جاتی ہے

بے تعلق نہ ہمیں جان کہ ہم جانتے ہیں
کتنا کچھ جان کے یہ بے خبری آتی ہے

اس قدر گوندھنا پڑتی ہے لہو سے مٹی
ہاتھ گھل جاتے ہیں پھر کوزہ گری آتی ہے

کتنا رکھتے ہیں وہ اس شہر خموشاں کا خیال

روز ایک ناؤ گلابوں سے بھری آتی ہے

زندگی کیسے بسر ہوگی کہ ہم کو
صبر آتا ہے نہ آشفۃ سری آتی ہے

کواڑ ہلکی سی دستک کے بعد کھلا اور پھر کسی کے قدموں کی چاپ قریب آرہی تھی پر تقی نے ناتواز و آنکھوں پر سے ہٹایا اور نادیکھنے کی زحمت کی جو کوئی بھی تھا اب اس کے پلنگ کے پاس بالکل پاس کھڑا تھا۔ ایسے گھر کے مکین اکثر آتے تھے کمرے میں بس اس کو سویا دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔

وہ کھانا کھانے یا گھر کے دوسرے معاملات کے لیے کمرے سے باہر جاتا تھا اور پھر واپس کمرے میں ہی بند رہتا تھا، ایک واحد ملا تھی جو کبھی کھیلتی ہوئی یا پتاشے کھانے کی ضد لیے اس کے پاس آ جاتی تو پھر وہ اسے ٹال نہیں پاتا تھا۔ پلنگ کے پاس کھڑے فرہاد کی بھاری سے آواز نے کمرے کی خاموشی کو توڑا تھا۔

”تقی۔۔۔ تقی سن فرزانہ آپا بلارہی ہیں باہر بس کچھ ہی دیر میں نکلنے والی ہے گھر کو، ملنا نہیں ہے کیا ان سے؟“
فرہاد نے دھیمی سی آواز میں اس کا بازو تھام کر اسے فرزانہ کی واپسی کی خبر سنائی، تقی نے اُس کے یوں بازو ہٹانے پر کسلمندی سے آنکھیں کھول کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ سو رہا تھا، پھر بکھرے سے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سر کو آہستگی سے اثبات میں ہلا دیا۔

چادر جو پاؤں سے لے کر کمر تک تانے ہوئے تھا خود سے اتار کر وہ ابھی سیدھا ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ کواڑ پر پھر سے آہستہ سے دستک ہوئی۔ فرزانہ چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی، فرہاد اور تقی نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ وہ غور سے تقی کا اور کمرے کا جائزہ لے رہی تھی ہاتھ میں خاکی پیپر میں کچھ لپٹا پکڑا ہوا تھا۔

”فرہاد تو چل ذرا باہر مجھے تقی سے بات کرنی ہے“

فرزانہ نے فرہاد کی طرف گردن کا رخ تھوڑا سا موڑ کر اسے حکم دیا وہ فوراً حکم کی تعمیل کرتا ہوا سر ہلا کر باہر نکل گیا۔
”کیسی ہو آپا اور حسن میاں کیسے ہیں؟ آئے ہیں کیا ساتھ تمہارے؟“

تقی نے اس کی کھوجتی نگاہوں سے نظریں چراتے ہوئے کتنے ہی سوال ایک ساتھ پوچھ ڈالے، وہ کل رات سے آئی ہوئی تھی اور اب شام ہونے کو ہی تھی، تقی کا یوں نادم ہونا بجا تھا، وہ تاسف سے سانس باہر انڈیلتی اب میز کے پاس پڑی کرسی کو پلنگ کے قریب گھسیٹ رہی تھی۔

”کتابد تمیز ہے ناتو، چلو میری بات اور سہی ل

ملنے نہیں نکلا کمرے سے پر یہ حسن میاں۔۔۔ حسن میاں۔۔۔ بھائی کہا کر بہنوئی ہے تیرا“

فرزانہ نے مصنوعی خفگی سے شکوہ کیا وہ جان بوجھ کر اس کے ساتھ یوں متوازن سارویہ رکھ کر بات کر رہی تھی، جس پر تقی کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ کرسی پر بیٹھ چکی تھی اور پیپر میں لپٹا جو کچھ بھی وہ ساتھ لائی تھی گود میں رکھ لیا۔

”تقی کیا حالت بنالی ہے میرے ویر، دیکھ جانے والے جاتے ہیں ان سنگ جا نہیں سکتے ہم“

فرزانہ کے لہجے میں درد تھا اور تقی کی اس حالت پر دکھ بھی تھا۔ وہ عجیب اداس آنکھیں لیے بیٹھا تھا۔ کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ لا پرواہ ہر وقت پڑھنے والا تقی بھی رمناکے لیے ایسے جذبات رکھتا تھا کہ ناصرف چھ ماہ سے وہ کمرے کا ہو کر رہ گیا تھا بلکہ اپنے سارے خواب بھی پس پشت ڈال چکا تھا۔

”آپا جیسے وہ گئی ہے ایسے کوئی ناجائے، آپ کچھ نہیں جانتی۔۔۔۔۔ کچھ نہیں جانتی آپ۔۔۔۔۔“

کھوئے سے لہجے میں وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے خود ساختہ سرگوشی کر رہا ہو، فرزانہ نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

”دیکھ تقی، چھ ماہ ہونے کو آئے ہیں تو نے زندگی کو وہیں روک دیا ایسا غلط ہے۔۔۔ کیا تو سب بھول گیا تجھے تو آگے پڑھنا ہے، ڈاکٹر بننے کا وہ خواب کہاں گیا بول“

فرزانہ نے آنکھیں اوپر اٹھائے تیوری چڑھا کر سوال کیا، تقی کچھ دیر لب بھینچے خاموش رہا پھر بالوں میں ہاتھ پھیرتا سیدھا ہوا جواب کافی بڑھ چکے تھے۔

”اسی کے ساتھ دفن ہوگئے خواب سارے آپا“

تقی کی آواز میں تھکاوٹ، تاسف، کرب جھلک رہا تھا، فرزانہ نے افسوس سے سر کو ہوا میں جنبش دی

”کیوں ہوئے دفن وہ کہاں ایسا چاہتی تھی بول۔۔۔۔۔ وہ تو خود پڑھائی کی اتنی شوقین تھی، اور دیکھ اس دن اگر ہمارے گاؤں میں کوئی ہسپتال ہوتا تو ثنائی داس کی جو چند سانسیں باقی تھیں انہی کے بل بوتے پر وہ لوٹ آتی۔۔۔۔۔“

فرزانہ نے جھک کر اس کے جھکے سر کے نیچے مضطرب چہرے کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر کو ہلارہا تھا۔

”تمہیں جانا ہے میں کچھ نہیں سنوں گی، لاہور میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لے تجھے ڈاکٹر بن کر واپس آنا ہے اس گاؤں میں ہسپتال بنانا ہے“

فرزانہ اسے ان خوابوں کی یاد دلارہی تھی جو اس نے اپنے اندر ہی کہیں دفن کر لیے تھے۔ وہ رونا، فرزانہ آپا، فرہاد اور منہا سے اکثر اپنے ان بڑے بڑے خوابوں کا ذکر کرتا تھا، وہ ڈاکٹر بنے گا پھر یہاں ہمارے گاؤں میں ایک ہسپتال ہو گا بڑا سا۔

”آپا۔۔۔۔۔ لیکن“

تقی نے منہ سے الفاظ نکالے ہی تھے کہ فرزانہ نے فوراً بات کاٹ دی

”بس چپ کچھ نہیں سنوں گی ایسے کمرے میں بند رہ کر آگے ناپڑھنے کا فیصلہ کر کے، تو خود کو تو مار ہی رہا ہے ساتھ اس کی روح کو بھی تکلیف دے رہا ہے جو ہمیشہ تیار ہر کام میں ساتھ دیتی تھی، دیکھ ہم سب کو وہ بہت پیاری تھی منہا کو دیکھ جس کے سنگ سنگ رہتی تھی ہر وقت، غزالہ ممانی جس کی بیٹی تھی پر اب سب اپنی زندگی کے مصروفیت میں ہنستے بھی ہیں بولتے بھی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی تمہاری طرح مجنوں نہیں بن بیٹھا جو زندہ ہیں وہ بھی تیری توجہ اور محبت کے حقدار ہیں“

فرزانہ بول کم ڈپٹ زیادہ رہی تھی، اور یہ سب کرنے کے لیے اسے بلقیس نے ہی کہا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں وہ فرزانہ سے ناصرف پیار کرتا ہے بلکہ بڑی بہن کی طرح اس کی ہر بات بھی مانتا ہے۔

”اور یہ دیکھ اس دفعہ میں تیری پسند کے رنگ کا گر تا کاڑھ کر لائی ہوں“

فرزانہ نے ہاتھ میں پکڑا خاکی لفافہ ایک طرف کیا اور اس میں لپٹا ہلکے نیلے رنگ کا قمیض شلوار آگے کیا جس کے گلے پر نفاست سے کڑھائی کی ہوئی تھی۔

”شکریہ آپا۔۔۔۔“

تقی نے آہستگی سے کہا، اور پھر جوڑا ہاتھ بڑھا کر فرزانہ کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ بہت خوبصورت کڑھائی کرتی تھی اور سب چھوٹوں کو ہمیشہ مختلف تحفے تحائف دیتی رہتی تھی۔

”شکریہ نہیں چاہیے تمہارا مجھے تو بس یہ چاہیے کہ تو واپس آجائے زندگی کی طرف“

فرزانہ نے مسکراتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا، تقی بھی مسکرا دیا۔

”اچھا چل آجا باہر جلدی سے، تیرے حسن بھائی بس جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔“

فرزانہ نے مسکراتے ہوئے اسے اٹھنے کا کہا تو وہ بھی جوڑا ایک طرف رکھے سر ہلاتا ہوا پلنگ سے اٹھ گیا اور پھر فرزانہ کے پیچھے چل دیا۔ فرزانہ کی باتوں کا واقعی بہت اثر ہوا تھا کہ رات کو وہ قندیل جلائے اپنی میز کی صفائی کر رہ تھا۔

مالا باورچی خانے میں دبے پاؤں آئی تھی، بھوک کم بیٹھے کی طلب زیادہ ہو رہی تھی جو اسے یوں رات کے اندھیرے میں بھی باورچی خانے تک کھینچ لائی تھی۔ جیسے ہی باورچی خانے میں داخل ہوئی وہیں دروازے پر ہی قدم تھم گئے باورچی خانے میں موجود قندیل کی ہلکی سی روشنی کے باعث وہ بمشکل دیکھ پا رہی تھی باورچی خانے کے کونے میں کوئی لڑکی گھٹنوں میں منہ دیے رو رہی تھی بال کندھوں سے نیچے کمر تک بکھرے ہوئے تھے، اس کی سسکیاں پورے باورچی خانے میں گونج رہی تھیں۔

مالا نے قدم آگے بڑھائے وہ ننگے پاؤں تھی شای داسی لیے روتی ہوئی لڑکی کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ کوئی باورچی خانے میں آیا ہے اور اب اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

”کون ہو کیوں رو رہی ہو“

مالا نے پاس جا کر تھوڑا سا جھکتے ہوئے پوچھا، لڑکی کا وجود آہستہ آہستہ ہل رہا تھا، مالا کی آواز پر اس کا رونا ایک لمحے کے لیے بند ہوا، لڑکی نے سر اوپر اٹھایا سفید لٹھے جیسے رنگت سیاہ آنکھیں جن میں سفید پتلی نہیں تھی گالوں پر بہتے آنسو اور ناک سے بہتا خون وہ رونا تھا۔۔۔

”آپا۔۔۔۔۔۔“

مالا نے حیرت سے کہا اور پھر جھٹ سے رونا کے گھٹنے تھام کر اس کے بالکل پاس بیٹھ گئی

”آپا۔۔۔ تم آگئی؟۔۔۔ کہاں گئی تھی آپا؟، اللہ نے بھیج دیا کیا واپس؟ مٹی کے نیچے سانس کیسے لیتی تھی؟“

کتنے ہی سوال اس نے رمناسے پوچھ ڈالے تھے جو ان چھ ماہ میں اس کی قبر دیکھ لینے کے بعد اس کے معصوم ذہن میں پنپتے رہے تھے۔ رمناسے بالکل خاموش تھی بس آنسو بہہ رہے تھے۔

”آپا بولو تو۔۔۔۔۔ کچھ تو بولو نا۔۔۔“

مالا نے ہاتھ آگے کیے محبت سے اس کی ٹھوڑی کے نیچے اپنا ہاتھ رکھا رمناسے آنسو آنکھ سے نیچے گرا اور مالا کی ہتھیلی پر گرتے ہی بٹن بن گیا وہی بٹن جو مالا کو اس کی مٹھی میں سے ملا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔ آپا یہ تمہارا بٹن ہے۔۔۔ اس دن تمہارے ہاتھ میں تھا نا“

مالا نے جھٹ اس بٹن کو پہچان لیا

”مجھے معاف کر دو آپا یہ میں نے اپنی گڑیا کے گلے میں ہار بنا کر ڈال دیا تھا“

مالا نے ڈرتے ہوئے رمناسے معافی مانگی، رمناسے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے تھے۔

”آپا رومت یہ لے لو اپنا بٹن۔۔۔ آپا لے لو اپنا بٹن“

مالا ہاتھ آگے بڑھائے بار بار رمناسے کو بٹن دے رہی تھی، اچانک رمناسے کی گود میں گری تھی۔ اور اس کی پیٹھ کے پیچھے خنجر پیوست تھا۔ جس میں سے خون نکل رہا تھا۔

مالا نے چیخ ماری تھی، اتنی بھیانک چیخ کہ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ خواب سے جاگ کر وہ کانپ رہی تھی اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ خنجر کارمناسے کی پیٹھ میں پیوست ہونا اس کے لیے اس دن رمناسے کے گرجانے سے زیادہ خوفناک منظر لگا تھا کیونکہ خنجر، چھری ان چیزوں سے وہ بکروں اور مرغیوں کو زخم ہوتے اکثر دیکھتی تھی۔

کمرے میں دوسرے کمرے کی قندیل کی مدھم سی روشنی تھی کچھ دور لکڑی کے جھولے میں رملابے خبر سو رہی تھی، یہ کمرہ پہلے اس کا اور رملاب کا تھا اور اب رملاب کا جھولا اس کمرے میں آگیا تھا۔
مالانے آہستگی سے پاؤں زمین پر اتارے وہ اب بھی کانپ رہی تھی گردن اور ماتھے پر پسینہ تھا جلدی سے اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی بتی کو جلیا اور پھر ایک طرف پڑے جوتے کے ڈبے کی طرف بڑھی جس میں اس نے اپنی گڑیا اور سامان کو رکھا ہوا تھا۔

زمین پر بیٹھ کر ڈبہ کھولا تو اس میں گڑیا کے گلے میں بٹن موجود تھا جو اس نے ایک دھاگے میں باندھ کر اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ کچھ دیر یونہی گڑیا کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ آکر پھر سے بستر پر لیٹ گئی تھی پر عجیب سا خوف تھا جو سونے نہیں دے رہا تھا۔ مالا کی سسکیاں پھر سے سنائی دے رہی تھیں اسے بہت کم خواب آتے تھے۔ اور آج کا خواب۔۔۔ خواب کم حقیقت زیادہ لگ رہا تھا وہ سرپٹ دوڑی اور اپنے کمرے سے ملحقہ کمرے میں داخل ہوئی جہاں غزالہ اور نوازش پلنگ پر سو رہے تھے۔ وہ پلنگ پر چڑھی اور پھر غزالہ اور نوازش کے درمیان میں لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

یہ چوہدری حاکم کی بیٹھک تھی جو حویلی کے بیرونی برانڈوں کے ساتھ بنائی ہوئی تھی۔ یہ بیٹھک کم ہال زیادہ تھی۔ اس میں لکڑی کے بہت سے صوفے لگے تھے اور ان کے آگے لکڑی کے میز پڑے پڑے تھے۔ جن کے اوپر بڑی نفاست سے میز کو رکھا ہوا تھا۔

ایک طرف دیوار میں بڑی سی الماری تھی جس میں دو کواڑ والے دروازے لگے تھے پر اس کے ایک طرف ویسے ہی دیوار میں سلیب بنائی گئی تھیں جہاں مختلف سجاوٹی پیس رکھے ہوئے تھے اور کچھ پینٹنگز دیوار سے لٹک رہی تھیں۔ سلیب پر بھی سفید کپڑے پر کڑھائی کیے ہوئے کو رکھا کر سجاوٹی پیس رکھے گئے تھے۔

الماری کے ساتھ ہی چوہدری حاکم کے حقوں کی قطار لگی تھی، چھوٹے بڑے کتنے ہی حقے تھے جو برانڈوں میں ہونے والے اجتماع کے وقت سلاسلگا کر مہمانوں کے آگے پیش کیے جاتے تھے۔ ایک طرف لکڑی کا پلنگ لگا تھا جس پر بہت سارے چمکتے ہوئے گاؤتکیے پڑے تھے سنہری رنگ کے چمکتے گاؤتکیوں پر نیلے حروف میں شادی مبارک لکھا تھا۔

چوہدری حاکم اس وقت پلنگ پر لیٹے تھے ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر چڑھا رکھی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا جب وہ کچھ دیر آرام کی غرض سے بیٹھک میں سے سب کو رخصت کر دیتے تھے۔

اب بھی وہ نقیب حاکم کے بیٹھک میں آنے سے پہلے ہلکی سی غنودگی میں ہی تھے جب نقیب حاکم نے کسی ضروری بات کہنے کی غرض سے اجازت طلب کی اور جو ضروری بات نقیب حاکم نے کی تھی اس پر چوہدری حاکم کا تو پارہ چڑھ گیا تھا۔

”دیکھ نقیب حاکم، تیرے پتر نے مجھے کہا داجی بس دسویں جماعت کروں گا بس پھر ابا اور آپ کے ساتھ آجاؤں گا“

چوہدری حاکم کی پیشانی پر بل پڑے تھے اور ان کی بارعب آنکھیں جن کے گرد جھیریاں آنے کے بعد بھی ان کا رعب اور دبدبا نہیں گیا تھا غصے سے سُکڑ کر شیر کی آنکھ جیسا تاثر دے رہی تھیں۔ وہ اب اٹھ کر پلنگ پر ہی بیٹھ چکے تھے جبکہ نقیب پاس پڑی کر سی پر مڑو دبا انداز میں بیٹھا تھا۔

اس نے چوہدری حاکم سے تقی کی خواہش کا اظہار کیا تھا جو دراصل دل میں دبی ان کی اپنی بھی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنے۔ پر چوہدری حاکم کے تیور بتا رہے تھے ان کو یہ بات بہت ناگوار گزری ہے۔

”اس کے بعد وہ دسویں سے آگے ضد پر آگیا بارہویں تک پڑھوں گا بس داجی شہر جانے دیں، اور اب کہتا ہے ڈاکٹری مکمل کرے گا“

چوہدری حاکم نے ہوا میں ہاتھ کھول کر استہزایہ گھمایا، نقیب نے جلدی سے سر نیچے جھکایا
 ”اباجی چھوٹے ہوتے سے بس یہ ہی خواب دیکھا اس نے ڈاکٹر بنے گا گاؤں میں ہسپتال بنائے گا“
 نقیب نے سر جھکائے ہی اپنی بات مکمل کی۔

”او۔۔۔۔۔ رہنے دے نقیب حاکم، یہ سب باتیں ہیں ایک دفعہ وڈے (بڑے) شہر گیا بس ہاتھ سے نکل گیا سمجھا،
 پھر یہ کہے گا مجھے ملک سے باہر جانا ہے اور بس پھر میں اور تم بیٹھے رہیں گے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نقی کے جوان
 ہونے کے انتظار میں“

چوہدری حاکم نے ہتک آمیز لہجے میں نقیب کو آئی نہ دکھایا۔ یہ ان کے دل کے دسو سے تھے جو وہ نقیب حاکم پر ظاہر
 کر رہے تھے۔

”نہیں۔۔۔ اباجی تقی بالکل نہیں ایسا کرے گا وہ ڈاکٹری بھی کرے گا اور گاؤں میں رہے گا بھی، یہاں لمبرداری کا
 بھی سب سنبھالے گا اس نے خود کہا ہے مجھ سے“

نقیب نے التجائی لہجے میں بیٹے کی سفارش کی، چند پل کے لیے بالکل خاموشی رہی پھر چوہدری حاکم کی آواز گونجی
 ”تو پھر ایک شرط ہے میری بھی، اگر وہ یہ چاہتا (چاہتا) ہے کہ میں اس کی بات مان کر اسے لاہور بھیج دوں اور
 ڈاکٹری کی تعلیم (تعلیم) کا سارا خرچ اس کا اٹھاؤں تو پھر اس کو کہہ میری ایک بات مان کر اس پر عمل کر کے جائے
 “

چوہدری حاکم ایک جھٹکے سے پلنگ پر سے اٹھے تھے اور اب سیدھے کھڑے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے
 ”کیا۔۔۔ شرط اباجی“

نقیب نے پر تجسس لہجے میں پیشانی پر افقی رخ بل ڈالتے ہوئے پوچھا

چوہدری حاکم کالجہ اچانک ہی رعب سے نرمی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ اب سنجیدگی سے غیر مرئی نقطے کو گھور رہے تھے۔

”تم جانتے ہو اس کی صحت بھی اتنی ٹھیک نہیں رہتی اور پھر رب نے اولاد زینہ نہیں دی، اور اب تو جوان اولاد کا غم۔۔۔ آ۔۔۔ ہ۔۔۔ ہ۔۔۔ ہ۔۔۔“

چوہدری حاکم کے دل سے جیسے ٹیس اٹھی تھی اپنے بیٹے کو یوں اداس دیکھنا سوہان روح تھا ان کے لیے، وہ اپنی دوسری بیوی عصمت آرا سے بے پناہ محبت کرتے تھے باپ نے لوگوں کی طعنوں سے بچنے کے لیے گھر میں پناہ دی ہوئی خدیجہ سے شادی کروادی تھی حالانکہ اس وقت خدیجہ ان سے بڑی بھی تھی، بعد ازاں ان کو خدیجہ سے بھی بے پناہ الفت ہو گئی تھی پر عصمت آرا کی جگہ اپنی تھی اس لیے عصمت آرا جب نوازش کی پیدائی ش پر ہی ان کو چھوڑ گئی تو وہ بہت دکھی ہوئے تھے اور اب عصمت آرا کی آخری نشانی نوازش سے بھی ان کو وہی محبت تھی۔

”تو اباجی۔۔۔ آپ جانتے ہیں رونا اور تنہی کے رشتے پر میں اور بلقیس کیا تنہی خود بھی دل سے راضی تھا“

نقیب نے ان کے یوں پریشان اور اداس سے لہجے کے پیش نظر وضاحت دی

”ہممم جانتا ہوں یہ سب۔۔۔ پر اب میں یہ چاہتا ہوں تقی کی شادی مالا سے ہو جائے“

چوہدری حاکم نے پیچھے ہاتھ باندھے لب بھینچ کر اپنا فیصلہ سنایا، دوسری طرف نقیب حاکم کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں

”ا۔۔۔ا۔۔۔با۔۔اباجی۔۔مالا۔۔؟“

نقیب کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ چوہدری حاکم یہ شرط رکھیں گے
 ”ہاں مالا۔۔۔ اسے کہو مالا سے عقد کرے اور جائے پڑھ لے جتنا پڑھنا چاہتا ہے“

چوہدری حاکم نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا، نقیب کے توچکے چھوٹ گئے تھے
 ”پ۔۔۔ پر اباجی مالا بہت چھوٹی ہے۔۔۔ نکاح۔۔۔“

نقیب حاکم حیرت زدہ تو تھا ہی اب پریشان بھی ہو گیا تھا

”ہاں تو عقد ہی کرے گا ناب، رخصتی تو مالا کے جوان ہونے پر کریں گے نا جب یہ پڑھائی سے فارغ ہو کر نو سال
 بعد آئے گا تب ہی کریں گے مالا جب بیس، بائی یس کی ہو جائے گی“

چوہدری حاکم نے پیچھے باندھے ہاتھ میں سے ایک ہاتھ باہر نکال کر سیدھا کھڑا کیا اور وثوق سے اپنی بات کہی
 ”ابا۔۔۔ جی لیکن۔۔۔“

نقیب حاکم نے الجھ کر ڈرتے ہوئے کہنا چاہا وہ جانتا تھا تقی کسی صورت ایسے رشتے پر راضی نہیں ہو گا اور ناہو اتو سمجھو
 اپنے خواب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا

”لیکن ویکن کچھ نہیں، اگر تم یہی سوچ رہے ہو کہ تقی نہیں مانے گا تو ٹھیک ہے نامانے پر یہ بھی ہو سکتا ہے کچھ
 سالوں بعد جب مالا جوان ہو جائے تب بھی میرا فیصلہ اس کے لیے یہی رہے، پھر تو نا وہ ڈاکٹر بن سکے گا اور نا۔۔۔“
 چوہدری حاکم کا لہجہ پھر سے بارعب اور گرج دار ہو گیا تھا، نقیب بس خاموش کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

یہ تقی کا کمرہ تھا جہاں اس وقت وہ غصے میں سرخ چہرہ لیے میز کے پاس کھڑا تھا اور سامنے بلقیس اور خدیجہ بیگم
 کھڑی تھیں۔

”مجھے حیرت ہے آپ سب کی ذہنیت پر مالا چھ سال کی ہے اور میں بیس کا ہوں“

تقی کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی، اس نے تاسف سے سامنے کھڑی بلقیس کو اور بی جان کو دیکھا

”بلقیس پیچھے ہو ذرا کی ذرا“

خدیجہ بیگم نے بلقیس کو کندھے سے تھام کے پیچھے کیا جو بیٹے کی بچا رگی پر اب پگھلنے کو تھی۔ نقیب حاکم کے بہت سمجھانے پر بھی جب وہ مالا کے ساتھ نکاح پر نہیں مانا تو اب خدیجہ بیگم اور بلقیس اسے سمجھا رہی تھیں۔

”تو جب پڑھ کر واپس آوے گا تو وہ کیا چھ سال کی عمر پر ہی رک جاوے گی، یہ لونٹھے کی طرح جوان ہووے گی اگلے تین چار سال میں“

خدیجہ بیگم نے آنکھیں سکیڑی تھیں۔ بلقیس نے ہاتھ مڑوڑتے ہوئے تقی کی طرف دیکھا جو شکن آلودہ پیشانی لیے کھڑا آج پہلی دفعہ بی جان کو بھی گھور رہا تھا۔

”تو بی جان میں بھی تو بیس سال پر ہی نہیں رک جاؤں گا نا، ویسے بھی ر منا نہیں ہے تو کیا مالا ہی ہے بس“

تقی بہت کاٹ دار لہجہ اپنائے ہوئے تھا، غصے کا توازل سے ایسا ہی تھا اب اس افتاد نے تو سوانیزے کو چھونے پر مجبور کر چھوڑا تھا موئے کو

”ہاں بس مالا ہی ہے، مت اتنی بحث کر مت کر نہیں جاسکے گا پڑھنے“

بلقیس نے گڑبڑا کر بی جان کے غصے کے پیش نظر بات کو سنبھالا

”بہو۔۔۔ پڑھنے نہیں بھی جاوے گا چوہدری حاکم شادی پھر بھی اس کی مالا ہی سے کروائی یں گے، دماغ متی خراب کیجیو اپنے لال کا“

خدیجہ بیگم نے گھور کر بلقیس کو دیکھا جواب نگاہیں چراہ ہی تھیں، کوڑکا پٹ ایک دھماکے سے دیوار میں لگا تھا اور وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ بھاگتی ہوئی آکر تقی کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹ گئی، اس آفت کے پرکالا کی آمد پر سب یکایک کھلے منہ سے اب اسے تاک رہے تھے۔

”مالا۔۔۔۔۔مالا۔۔۔۔۔“

غزالہ جو اس کے پیچھے چیختے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی یں تو ایک دم سے خدیجہ بیگم کو وہاں دیکھ کر دروازے میں ہی قدم جم گئے، عجلت میں کھینچ کر دوپٹہ سر پر درست کیا جو مالا کے پیچھے بھاگنے میں سر پر سے سرک گیا تھا، سانس بھی پھولی ہوئی تھی۔

”تقی بھائی بچاؤ اماں جان مارتی ہیں“

معصوم سی باریک آوازیں وہ تقی کے ٹانگوں کے پیچھے چھپی اس کی کمر کے گرد بازو ڈالے کھڑی مدد طلب کر رہی تھی، خدیجہ بیگم جواب تک منہ کھولے کھڑی تھیں گڑبڑا کر گویا ہوئی یں

”غزالہ پکڑ اس کو کیسے چمٹی کھڑی ہے تقی کے ساتھ بے شرم کہیں کی“

خدیجہ بیگم نے غزالہ کو گھوری ڈالی وہ بدحواس سی آگے بڑھیں

”بی جی چھوٹی ہے“

بلقیس نے جلدی سے غزالہ کی شرمندگی کم کرنے کو خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا

”زیادہ بھاشن متی دیو مجھے پکڑ لڑکی کو“

خدیجہ بیگم نے غصے سے کہا، غزالہ اب مالا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور مالا تقی کی ٹانگوں کے گرد گرفت مضبوط کرتی جا رہی تھی

”تقی بھائی اماں جان منہ دھلوا رہی ہیں مجھے نہیں دھونا ہے“

مالا نے چہرہ اوپر اٹھائے معصومیت سے تقی کی طرف دیکھ کر کہا
”چچی جان۔۔ چچی جان چھوڑیے“

تقی نے غزالہ کے ہاتھ سے مالا کا بازو چھڑوایا اور خود نیچے بیٹھ کر مالا کو کندھوں سے تھام لیا۔
”مالا منہ دھونا اچھی بات ہے ناجاؤ اماں خفا ہوں گی اور میں پھر مٹھائی نہیں لاؤں گا سمجھی“
تقی نے ملائی م سے لہجے میں مالا کے گال پر ہاتھ رکھے سمجھایا تھا
”تقی بھائی آپ دھلوادو منہ“

وہ تقی سے منہ دھلوانے کی فرمائی ش کر بیٹھی تھی اور باقی نفوس ہکا بکا دیکھ رہے تھے۔ اس کی چہرے پر جگہ جگہ
چھپچھاہٹ کے نشان تھے جن پر اب مٹی چپکی تھی، مالا کی اس نوکھی فرمائی لیش پر خدیجہ بیگم کی پیشانی مزید شکن
آلودہ ہوئی۔

”غزالہ پکڑ لڑکی کو لے جا کرے میں، بے شرم بھائی بھائی لگی ہے اس کو، کل اس سے نکاح ہو جاوے گا سمجھا اس
کو بھائی مت بولے“

خدیجہ نے ماتھے پر سوبل ڈالے غزالہ کو گھورتے ہوئے مالا کو الگ کرنے کا حکم دیا، غزالہ گڑبڑا کر آگے بڑھی اور
پھر مالا کو زبردستی کھینچتے ہوئے باہر لے گئی جو باہر جاتے ہوئے بھی گلا پھاڑے رورہی تھی۔ جیسے ہی غزالہ کمرے
سے باہر نکلی تقی بے زار سا اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”آپ لوگ ایسا کریں مالا کو چھوڑیں، رملہ سے ہی شادی کروادیں میری اور جب تک وہ جوان ہوگی میں شادی اس
دنیا سے ہی رخصت ہو جاؤں، کب ختم ہوں گی یہ دقیانوسی روایات“

تقی ضبط کے آخری دہانے پر تھا ایسا لگ رہا تھا ابھی پھٹ جائے گا۔ مالا کے رونے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ خدیجہ بیگم نے تقی کے یوں بھڑک اٹھنے پر غصیلی نگاہوں سے گھورا

”بک بک بک۔۔۔ کرے ہی جاوے ہے گھوڑا کہیں کا، بلقیس اپنے لال کو اچھے سے سمجھا دیو اس کا بیاہ مالا سے ہی ہووے گا، میں جارہی ہوں مجھ سے نابرداشت ہووے اس کی یہ طوفانِ بد تمیزی“

خدیجہ بیگم نے ہاتھ ہوا میں معلق کیے کہا اور سارا کچھ بلقیس کے کندھوں پر منتقل کرتی خود توبہ توبہ کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔ بلقیس نے ابھی نگاہ اٹھا کر تقی کی طرف دیکھا ہی تھا کہ وہ جھنجلا کر گویا ہوا

”اماں عجیب جاہلانہ بات ہے یہ، چلیں میرا کسی کو خیال نہیں مگر وہ کتنی چھوٹی ہے یہ کیا اس پر ظلم نہیں؟“

تقی خدیجہ بیگم کے جاتے ہی ماں پر برس پڑا تھا، بلقیس محبت سے آگے بڑھیں اور تقی کو کندھوں سے تھام لیا

”حضرت عائشہ جب نبی پاک ﷺ کے زوجیت میں آئی تھیں آپ بہت چھوٹی تھیں اور پیارے نبی کی عمر پچاس برس سے زیادہ تھی، ہمارے مزہب میں شادی کے لیے عمروں کی کوئی قید نہیں ہے ہمارے نبی مثالیں ہمارے لیے ہی قائم کر گئے ہیں، یہ تو محبت کے ناطہ ہے بس میں بھی تو تیرے ابا سے بارہ سال چھوٹی ہوں، کیا کمی ہے ان کے اور میرے رشتے میں“

بلقیس بیگم بہت شائستگی سے اسے سمجھا رہی تھیں مگر لہجے میں کہیں نا کہیں التجا ضرور تھی، تقی نے ان کی بات پر بچا رگی سے دیکھا اس کے سارے کے سارے دلائل بلقیس کی اس مثال کے آگے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

”اماں۔۔۔۔۔۔“

الچھے سے لہجے میں کہتا وہ بات کو درمیان ہی چھوڑ گیا وہ لوگ کسی بات کو نہیں سمجھ رہے تھے۔ یہاں حویلی میں انسانوں کا حال بھی بھیڑ بکریوں جیسا تھا جب چاہا جس بھی کھونٹے سے باندھ دیا۔

”مان جا پتر۔۔۔۔۔ نا اپنے باپ کا سر نیچا کر اپنے داجی کے سامنے، معاملہ اور ہے داجی بس نوازش کی عادت سے گھبراتے ہیں، پہلے بھی آٹھ برس اس کے بغیر بہت مشکل سے کاٹے انہوں نے“

بلقیس اب اس کی منت سماجت پر اتر آئی تھی، جواب بھی ایسے کھڑا تھا جیسے اس کو عمر قید کی سزا سنائی گئی ہو۔

تقی نے بے حال ہو کر ہاتھوں میں سر جکڑ لیا

”اماں بات صرف اتنی سی نہیں ہے، وہ جب بڑی ہوگی میں بڈھا ہوں گاتب کیا اس کے دل میں ایسا کچھ نہیں آئے گا، اور میرے دل میں وہ ایک چھوٹی سی بچی کا مقام رکھتی ہے میں اسے وہ مقام۔۔۔۔۔ کیا بکواس ہے اماں یہ“

تقی نے زور سے بازو نیچے ڈھلکائے، بھنویں اوپر چڑھائے ماں سے ایک اور مسیٰ لہ پیش کر دیا

”مرد چالیس کا بھی ہو تو جوان ہی ہوتا ہے، اور تو ماشا اللہ اتنا پیارا ہے مالا تو بہت محبت کرے گی تجھ سے دیکھ لینا تو“

بلقیس نے بے اختیار اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں بھر لیا، خوب تو وہ تھا ہی، ناک نقش ایسے کہ کوئی ایک نظر ڈالے تو پھر مڑ کر ضرور تاکے، قد کا ٹھہ رنگ و روپ اچھا تھا پر تھوڑا دبلا تھا وہ بھی اپنی عمر کے لحاظ سے، بلقیس اس کے ماتھے پر بو سے دے رہی تھی اور وہ ماں کے لیے نیچے کو جھکا بس بے زار کھڑا تھا۔

حویلی مہمانوں سے بھری ہوئی تھی، کیا اٹاری کیا صحن سب جگہیں قریبی رشتہ داروں سے کچا کھج بھری ہوئی تھی، وہ سب کے سب آج دس ماہ بعد پھر سے حویلی میں جمع تھا بس اس دفعہ کوئی گانا بجانا اور شور و غل نہیں تھا جیسے فرزانہ کی شادی پر تھا۔

اور ویسے بھی یہ تو صرف نکاح کی تقریب تھی جس میں نکاح کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلا کر فارغ کر دینا تھا۔ صحن میں دھوپ تھی پر نیم کے گھنے درختوں کے نیچے چھاؤں میں چارپائی یاں ڈال کر کئی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔

کمرے میں مالا کو سرخ جوڑا اور گوٹے والا دوپٹہ پہنایا کر بٹھایا ہوا تھا۔ جوڑا غزالہ نے نیا سلائی کیا تھا اس کا ہر دوپٹہ اس کی شادی کا ہی تھا جو اس نے مالا کو اوڑھادیا تھا، وہ چھوٹی سی پورے دوپٹے میں ڈھک گئی تھی۔ وہ بار بار دوپٹے سے الجھ کر اسے سر سے اتار رہی تھی۔ غزالہ جو سامنے کھڑی اسے چپ بیٹھنے کی نصیحت کر رہی تھی، نظر بھر کے مالا کو دیکھا تو آنکھیں بھر آئی ہیں۔

وہ ویسے بھی آج صبح سے کونوں کھدروں میں گھس گھس کر کتنی دفعہ روچکی تھی رونا بہت یاد آرہی تھی جو ان بیٹی چاہے اپنے دل کی بات ماں سے ناکہ پر ماں اس کے جذبات سے باخوبی واقف ہوتی ہے اور غزالہ جانتی تھی رونا تنہا کے نام پر ہی گلال ہو جایا کرتی تھی۔

اب بھی مالا کو یوں رونا کی جگہ سرخ جوڑے میں دیکھ کر ایسے دل میں ٹیس اٹھی کے وہ نگاہیں چراتی باہر اٹاری کے ستون کے پاس آکر بھیگی آنکھیں پونچھنے لگی۔ کتنے ہی پل رونا کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے پل آنکھوں کے آگے سے گزر گئے، وہ یونہی دوپٹے کے پلو سے نم آنکھوں کو صاف کر رہی تھی جب پیچھے سے اسے آواز سنائی دی۔

”آپا۔۔۔ مالا کہاں گئی؟ مولوی صاحب (صاحب) نکاح پڑھانے آرہے ہیں ادھر کو ہی“

غزالہ کی چچا زاد بہن نے آکر غزالہ کا کندھا جھنجھوڑ دیا، وہ پریشان حال تھی۔ غزالہ جلدی سے اس کے سنگ آگے بڑھی تھی کہ منہ تیز تیز قدم اٹھاتی غزالہ تک آئی

”چچی۔۔۔ چچی۔۔۔ وہ مالا وہاں درخت کے نیچے سکینہ کے ساتھ کھیل رہی ہے میں اگر لانے کی کوشش کر رہی ہوں تو مار رہی ہے مجھے“

—

”مالا۔۔۔۔مالا۔۔۔۔چل۔۔۔چل کمرے میں“

”میرا جس دن نکاح تھا تو وہ جو بڑا کڑا ہایا ہوتا اس میں کھیل رہی تھی، اماں آکر جوتے مارتی لے کر گئی ایسے ہی رو رہی تھی میں بھی، اماں مرحومہ بتایا کرتی تھیں۔۔۔“

بوڑھی ہنتے ہوئے اپنے نکاح کا واقع دوسری سے گوش گزار کر رہی تھی۔ اور جھری زدہ بوڑھی آنکھیں شائی دوہ پل جی رہی تھیں۔

غزالہ اس کو زبردستی کمرے میں لائی، جلدی سے اس کے سر پر دوپٹہ سجایا۔
مالا پھر بار بار جھنجلا کر گوٹے کناری والا دوپٹہ سر سے اتار رہی تھی جسے غزالہ اس کے سر پر درست کر رہی تھی۔
اتنی دیر میں ہی نوازش، نقیب اور منیر کے ہمراہ مولوی صاحب کمرے میں ہلکی سی دستک کے بعد داخل ہوئے سب خواتین جو اس وقت کمرے میں موجود تھیں کھینچ کر سروں پر دوپٹے لیے
نکاح خواں نے نکاح پڑھانا شروع کیا اور جب قبول ہے پوچھا تو پاس بیٹھی غزالہ کی بہن نے مالا کا سر پکڑ کر اثبات میں جھکا دیا۔

چھ سال مالا نوازش پل بھر میں ہی زوجہ تقی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ خواتین ایک دوسرے کے گلے مل رہی تھیں اور جسے خبر بھی نہیں تھی اس کے ساتھ کیا ہوا اسے بس باہر جا کر کھینے کی پڑی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا، حویلی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے کمروں میں تھا۔ مالا ننگے پاؤں اپنے کمرے سے چہکتی ہوئی باہر نکلی، وہی مخصوص انداز میں کندھوں تک آتے بالے جو بکھرے ہوئے تھے، چھوٹی سی فراک کے نیچے چست پا جامہ پہنے، ایک ہاتھ کی مٹھی زور سے بند کر رکھی تھی۔

اسی طرح بھاگتی ہوئی وہ تقی کے کمرے میں داخل ہوئی اور پردہ ایک ہاتھ سے پیچھے کیا، تقی سامنے میز پر کتابوں کا ڈھیر لگائے کھڑا تھا اور اپنی کتابوں میں سے کتابیں نکال کر ایک بیگ میں بھر رہا تھا۔ اچانک مالا کے یوں کمرے میں داخل ہونے پر ایک نگاہ اٹھائے اسے دیکھا اور پھر عجیب طرح سے نادام ہوا۔ وہ تقی کے دیکھنے پر فوراً مسکراتی ہوئی

آگے بڑھی جبکہ تقی نے اس سے نگاہیں چرائی تھیں۔ اور جلدی سے اب وہ پلنگ پر رکھے بیگ میں میز سے کتابیں اٹھا کر رکھنے لگا تھا۔

نکاح کو چار روز گزر چکے تھے اسے آج شام شہر کے لیے نکلنا تھا اور پھر وہاں سے لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا۔
”تقی بھائی۔۔۔ تقی بھائی۔۔۔“

مالا اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔ وہ پلنگ کی طرف جاتا تو مالا بھی پلنگ کی طرف جاتی وہ میز کی طرف جاتا تو مالا بھی میز کی طرف آتی۔

تقی اس کو دیکھ بھی نہیں پارہا تھا، وقت اور حالات کی ستم ظریفی ہی ایسی ہوئی تھی کہ کل تک جس مالا کی بات سننے کے لیے وہ دوزانو اس کے سامنے بیٹھ کر اس جتنا ہو کر اس کی بات سنتا تھا آج اس سے نگاہ تک نہ ملا پارہا تھا۔
ملاتا بھی کیسے اس بے عقل کو تو پتا بھی نہیں تھا کل ہو جانے والے نکاح میں وہ اس کا بھائی نہیں رہا بلکہ اس کا شریک حیات بن گیا ہے۔

”تقی بھائی۔۔۔ سن بھی لو اب دیکھو تو میری طرف یہ اماں نے پیسے دیے ہیں مجھے پتاشے لینے ہے ان پیسوں سے، مجھے دوکان پر لے چلو ساتھ“

مالا نے چہک کر اپنی ہتھیلی آگے کی جس پر دس پیسے کا سکہ پڑا تھا۔ تقی نے جلدی سے رُخ موڑا، وہ زندگی میں پہلی دفعہ مالا سے یوں بے اعتنائی برت رہا تھا۔

”مالا جاؤ یہاں سے۔۔۔ اپنی اماں پاس جاؤ“

تقی نے سختی سے چہرہ موڑے اسے جانے کے لیے کہا جو تیکھی سی آواز میں بس اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔
”نہیں۔۔۔ داجی باہر بیٹھے ہوں گے مجھے اور سکینہ کو جانے نہیں دیں گے دوکان پر، آپ لے چلو مجھے ساتھ۔۔۔“

مالا کو اس کے بدلے رویہ کی کہاں سمجھ تھی وہ تو بس اپنا ہی راگ آلاپے جارہی تھی۔ اور اب تو باقاعدہ اس کے ہاتھ کو پکڑ کر جھول رہی تھی اور بضد تھی کہ جو جھٹ سے اس کو لے کر چل پڑتا تھا آج کیا ہوا اسے ایسے کیوں کر رہا ہے ایک وہی تو پوری حویلی میں اسے پیار کرتا تھا باقی تو کسی کے لیے وہ چنڈال تھی تو کسی کے لیے شیطان کی نانی۔

”مالا۔۔۔ مالا چھوڑو مجھے، جاؤ فرہاد پاس وہ لادے گا“

تقی نے جھنجلا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا تھا جو بات کو سمجھ نہیں رہی تھی اور اس کی برداشت آزمایا ہی تھی پتہ نہیں حویلی کے سارے مکین کہاں چھپے ہوئے تھے جنہیں یہاں مالا نظر نہیں آرہی تھی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ آپ چلو۔۔۔ بس چلو آپ۔۔۔ تقی بھائی چلو نا“

وہ بچی تھی تو بچوں کی طرح ہی ضد لگا بیٹھی تھی، اور تقی کا ضبط اب ختم ہونے کو ہی تھا اور پھر وہ ایک دم سے مڑا اور چٹاخ کی آواز کے ساتھ ایک زوردار تھپڑ مالا کے گال پر رسید کیا

”تمہیں ایک دفعہ کی ہوئی بات سمجھ کیوں نہیں آرہی۔۔۔ جاؤ نکلو۔۔۔ میرے کمرے سے۔۔۔ نکلو۔۔۔ اور خبردار دوبارہ میرے پاس آئی ہو تو“

تقی کا لہجہ اور آواز کی کرخنگی مالا کو تھپڑ سے زیادہ تکلیف دے گئی تھی وہ جس کے منہ سے اس نے اپنے لیے ہمیشہ محبت بھرے الفاظ سنے تھے، اس کا ہاتھ جس سے اس نے ہمیشہ پیار بھرا لمس پایا تھا آج ایسا وحشیانہ سلوک مالا کے ننھے سے دل کو دہلا گیا تھا۔

وہ کانپ گئی تھی اور وہیں حیرت زدہ کھڑی تھی ہاتھ سرخ ہوتے گال پر رکھا ہوا تھا، آنکھوں میں انتہا درجے کی بے یقینی تھی۔

”جاؤ۔۔۔ و۔۔۔ و۔۔۔ و۔۔۔ و۔۔۔“

تقی پھر سے اونچی آواز میں دھاڑا تھا اب کی بار تو وہ بلبلاتا اٹھی اور پھر زار و قطار روتی سرپٹ دوڑی تھی ننگے پاؤں
تھپ تھپ فرش پر مارتی اپنے کمرے کی طرف جہاں سے کچھ دیر پہلے وہ چمکتی ہوئی نکل کر آئی تھی۔

فرہاد نے سنگترہ ہاتھ میں پکڑے غور سے نیم کے نیچے لگی چارپائی پر بیٹھی منہا کو دیکھا جو گود میں کتاب رکھے سامنے
غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔

فرہاد باورچی خانے سے سنگترہ لے کر باہر نکلا تھا جب اس کی نظر منہا پر پڑی اور پھر قدم ہمیشہ کی طرح خود بخود اس
کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ عصر ہونے کو تھی دھوپ اب حویلی کی دیواروں کو ٹاپ رہی تھی۔ ہلکے ہلکے ہوا کے
جھونکے جہاں نیم کے پتوں اور ٹہنیوں کو دایں بائیں جھلا رہے تھے وہاں کھوئی سی بیٹھی منہا کی ایک آوارہ لٹ
کو بھی بار بار اڑا رہے تھے۔

وہ جازب نظر تھی، سانولی رنگت ناک تھوڑی بیٹھی سی تھی پر اس کے گول کشادہ چہرے پر خوب جچتی تھی، وہ بالکل
زیب پھپھو جیسی تھی اور فرہاد کو وہ کب پھینی پکوڑی سے دلکش و حسین لگنے لگی تھی خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔
بظاہر تو وہ اس سے ہر وقت چھیڑ چھاڑی ہی کرتا رہتا تھا، پر دل میں ایک گدگدی سی رہتی تھی جب بھی کبھی وہ سامنے
آتی بات کرتی کچھ بھی کہتی دل عجیب طرح سے گدگدانے لگتا، لڑکپن سے جوانی کا دور دورہ تھا اس لیے دل میں
جذبات کا اچھا ایک فطری عمل تھا۔

وہ درخت کے پاس پہنچ چکا تھا نیم کے پتے اور نبولیاں جگہ جگہ زمین پر گری ہوئی تھیں جواب فرہاد کے جوتے کے
نیچے دب دب کر پچک رہی تھیں صبح تڑکے تارے بو اور شمول کر صحن میں جھاڑو لگادیتی تھیں پر عصر ہوتے ہی
صحن کا حال پھر سے درختوں کے پتوں اور پھلوں سے برے حال میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی وہ منہا کے پاس آیا
وہ جو خیالوں میں کھوئی ادا اس سی بیٹھی تھی نگاہ کتاب پر جمادی۔

”تمہارا منہ لٹکا ہے۔۔۔ کہتی ہو گی مالا مجھ سے چھوٹی ہے اس کی شادی ہو گئی ہے میری نہیں ہوئی
ہا۔۔۔ہا۔۔۔ہا۔۔۔“

فرہاد نے سنگترے کے کش کو منہ میں ڈالتے ہوئے منہا کو چھیڑا جواب تیوری چڑھائے اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔
”تمہاری گھٹیا سوچ ہے کیا کہا جاسکتا ہے، اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے میرا کوئی منہ لٹکا نہیں ہوا“
منہا نے جھنجلا کر کہا اور اس سے بے اعتنائی برتی پروہ تو ازل کا ڈھیٹ تھا۔
”لٹکا تو ہوا ہے۔۔۔ مانو نا مانو“

فرہاد نے ڈھیٹ پن سے دانت نکالتے ہوئے اسے اور چڑانے کی کوشش کی۔ سنگترے کے ایک کش کو اس کی
طرف بڑھایا منہا نے برا سامنہ بنا کر انکار کر دیا
”فرہاد میرا دماغ مت کھاؤ اور جاؤ یہاں سے پہلے ہی پڑھا نہیں جا رہا“

منہا نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھاماتھا اور کتاب پر نگاہ جمادی تھی اس سال گاؤں میں نویں جماعت بھی بیٹھ
گئی تھی، تقی نے منہا کے انکار کے باوجود نقیب اور بلقیس سے لڑ کر اس کا نویں جماعت میں داخلہ کروایا تھا۔
”ہائے۔۔۔ ایک تو بیچاری کا یہ غم۔۔۔ تقی بھائی زبردستی پڑھا رہے ہیں اوپر سے ہے بھی تو نکمی سی رونا جیسی
لائی ق ہوتی تو اور۔۔۔۔“

فرہاد کو اندازہ ہی نہیں ہوا وہ باتوں ہی باتوں میں رونا کا نام لے گیا تھا اور منہا کے چہرے پر رونا کا نام سنتے ہی اداسی کا
سایہ لہرا گیا تھا۔ رونا کی موت سے گہرے صدمے میں جانے والوں میں اس کا بھی شمار تھا بچپن سے ایک ساتھ پلی
بڑھی تھیں گہری دوستی تھی۔

”منہا۔۔۔ معاف کر دو۔۔۔ میں تو بس ایسے ہی بکواس کر دیتا ہوں“

فرہاد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ گھر والے غزالہ، تقی اور منہا کے سامنے رونا کا ذکر کم ہی کرتے تھے کیونکہ یہ وہ افراد تھے جو اسے اب تک یاد کر کے روتے تھے۔ اور وہ تو ویسے بھی اب منہا کے چہرے پر اداسی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رونا کے انتقال کے بعد منہا جب بہت بیمار ہوئی اور گم صم رہنے لگی تھی فرہاد کو تب ہی احساس ہوا تھا کہ اس کا چہکتا اور کھکھلاتا چہرہ اس کے لیے کتنا معنی رکھتا تھا اور رونا جب زندہ تھی دونوں ہر دم ہنستی اور کھکھلاتی ہی تو رہتی تھیں۔

”میں بھائی کے جانے سے اداس ہوں، پہلے رونا چھوڑ کر چلی گئی اور اب بھائی پڑھنے کے لیے لاہور جا رہے ہیں، اماں کہہ رہی تھی سال میں بہت حد ہے دو ہی چکر لگایا کرے گا وہ“

منہا نے اداس سی صورت بنائے اسے اپنے لٹکے منہ کا سبب بتایا، فرہاد نے اس کے لیے نرم مسکراہٹ کو لبوں پر آنے سے روکا۔

”پگلی تو خط لکھا دیا کرنا تقی بھائی کو“

فرہاد نے جھٹ حل پیش کیا تھا اسے

”تو پوسٹ کر آیا کرے گا نا“

منہا نے مسکراتے ہوئے پوچھا

”ہاں کر آیا کروں گا بس کرایہ لگا کرے گا“

فرہاد نے ایک آبرؤ چڑھائے اسے معاوضے کا بتایا اور مسکراہٹ شرارت سے دبائی

”تم جیسے کمینے سے مجھے بس یہی توقع ہے اور کر بھی کیا سکتے ہو تم“

منہا نے دانت پیس کر اسے دیکھا اور پھر ناک بھیچے سر کتاب پر جھکا دیا، وہ منہا کو ابھی مزید تنگ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا پر اریب کی آتی آوازوں پر منہ بسور کر دہلیز کی طرف چل دیا جہاں اریب کمر پر دونوں ہاتھ دھرے اسے غصے سے گھور رہی تھی۔

کمرے میں سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی، مالا غزالہ کے آگے کھڑی تھی اور غزالہ پلنگ پر بیٹھی تھی۔ غزالہ سو کر اٹھی تو مالا کہیں بھی نظر نہیں آئی اس کو ہی تلاش کرتی اپنے کمرے سے ملحقہ بچوں کے کمرے میں آئی تو وہ گھٹنوں میں چہرہ چھپائے سک رہی تھی۔ اور اب غزالہ اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے رونے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔

”اماں تقی بھائی بہت گندہ ہے۔۔۔ مجھے مارا ہے انہوں نے“

مالا نے سسکیوں میں بمشکل اپنے رونے کی وجہ بتائی، غزالہ اس کے گال پر تقی کی انگلیوں کے نشان دیکھ کر کچھ پل کو ساکن رہ گئی۔

پر دل جانتا تھا تقی نے بلا جواز مالا کو نہیں مارا ہو گا، وہ تو نکاح کے بعد سے کسی سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کر رہا تھا یقیناً مالا اسے تنگ کر رہی ہو گی جو اس نے اس طرح کا رد عمل ظاہر کیا لیکن مالا شائے اس سے اس طرح کے کسی بھی عمل کی توقع نہیں رکھتی تھی اس لیے بری طرح دہل گئی تھی۔

بچوں کی نفسیات ہوتی ہے جو ان سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہیں بچے ان کی سختی اور مار کو زیادہ محسوس کرتے ہیں نسبتاً ان کے جو ان سے شروع سے سختی برتتے ہوں اور یہی مالا کے ساتھ ہوا تھا۔ تقی نے شروع سے ہی اس سے لاڈ اور نرمی کا رویہ روار کھا تھا اور اب یوں اچانک کٹیلا لہجہ اور ساتھ تھپڑ جڑ دینا مالا کے کچے ذہن پر پکی اور گہری چھاپ چھوڑ رہا تھا۔

غزالہ نے آہستگی سے اسے اپنے قریب کیا اور اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا، دائیں گال سرخ تھی جہاں آنکھ کے قریب سے لے کر پوری گال پر تقی کے مضبوط ہاتھ اور انگلیوں کے نشان تھے اس کی جلد شامی دہشت نازک تھی کے باقاعدہ انگلیاں چہرے پھر چھپ گئی تھیں اور پھر آنکھ کے قریب پوٹا بھی سوزش کا شکار تھا۔

”اماں تقی بھائی نے کیوں مارا مجھے، وہ گندہ ہے بہت میں کبھی بات نہیں کروں گی ان سے“

وہ مسلسل ہچکیوں میں رو رہی تھی اور آنسو متواتر گال سے بہہ رہے تھے جنہیں وہ آج صاف کرنے کی بھی زحمت نہیں کر رہی تھی۔

”مالا۔۔۔ وہ تیرا بھائی نہیں ہے اب سے، اسے صرف تقی بولنا ہے بیٹا، اور تو اسے تنگ کر رہی تھی نا۔۔۔ ہے نابول؟؟“

غزالہ نے محبت سے اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا اور اپنا چہرہ سوالیہ انداز میں ہلاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ مالا ایک لمحہ کو رونا بھولی پر پھر فوراً بولی

”میں۔۔۔ میں تنگ کب کر رہی تھی تقی بھ۔۔۔ تقی نے خود بولا تھا جب بھی پتاشے لینے ہو مجھے کہا کرو“

مالا نے اپنی صفائی پیش کی اور ماں کے گھورنے پر تقی کے بعد بھائی کے لفظ کو ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں تو اب سے تو اسے پتاشے لینے کا نہیں کہے گی، اور ویسے بھی وہ تو جا رہا ہے پڑھنے نا یہاں ہو گا نا تجھے پتاشے لا کر دے سکے گا“

غزالہ نے تقی کی بات کی تائی ید کی مالا کے آنسو تھم گئے تھے، پر تقی کے جانے کا سن کر وہ اب نا سمجھی سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک دم کچھ سوچ کر گویا ہوئی

”مجھے ڈر لگتا ہے میں اب کبھی نہیں جاؤں گی ان کے کمرے میں، کبھی بات نہیں کروں گی جیسے بی جی سے نہیں کرتی ہوں، اماں وہ گندے ہیں“

مالا نے جیسے اپنا آخری فیصلہ سنایا ہو، اور پھر غزالہ سے اپنا چہرہ چھڑوا کر ایک طرف چل دی۔ اور غزالہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اسے کسی بات کو اب سمجھنا بہت غلط تھا اور ویسے بھی چوہدری حاکم نے سختی سے تمام گھروالوں کو تنبیہ کیا تھا کہ جب تک مالا بالغ اور عاقل نہیں ہو جاتی کوئی بھی گھر کا فرد اس کے اور تقی کے رشتے کے بارے میں اسے نہیں بتائے گا۔

گہرے بھورے رنگ کا گھوڑا ٹپ ٹپ پاؤں مارتا تار کول میں لپٹی سڑک پر دوڑ رہا تھا اس کے گردن پر موجود بال دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے، گھوڑے کے پیچھے بگی نمادو بڑے پہیوں والی گاڑی تھی جسے گھوڑے کے ساتھ چمڑے کی بلٹوں کی مدد سے باندھا گیا تھا اور گھوڑا اس دو پہیوں اور آگے پیچھے دو سیٹوں والی بگی نما گاڑی کو اپنے ساتھ کھینچے ہوئے تھا۔ اس کو چلانے والا آدمی کچھ دیر بعد لگام کو کھینچتے ہوئے گھوڑے کو چابک مار رہا تھا۔ لوگ اسے تانگہ یا یکہ کہتے تھے، یکے کے پیچھلی نشست پر تقی اور بہادر بیٹھے تھے بہادر نے گود میں تقی کا سازو سامان دبوچ رکھا تھا جبکہ وہ تانگے کو ایک طرف سے تھامے خاموش بیٹھا تھا۔

بہادر اس کے ساتھ لاہور آیا تھا، یہاں انہیں پہلے منیر میاں کے ایک دوست کے پاس جانا تھا جس نے تقی کی لاہور میڈیکل کالج اور ہاسٹل میں داخلے کے سلسلے میں مدد کرنی تھی۔

لاہور شہر میں لودھراں اور دنیا پور کی نسبت زیادہ موٹر گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ لوگ بھی اس وقت کے جدید لباس میں ارد گرد مگن سے گھومتے نظر آرہے تھے دوکانیں اور عمارتیں سب پکی اینٹوں سے بنی تھیں اور چھوٹے شہر کی نسبت بڑی تھیں۔

سٹیشن سے باہر آتے ہی انہوں نے منیر میاں کے دوست کے گھر کا پتہ تانگے والے کو سمجھا دیا تھا اور اب تانگہ اسی رستے پر رواں دواں تھا۔

نیا شہر نئے لوگ اور بالکل الگ ماحول ایسا نہیں تھا کہ وہ لاہور زندگی میں پہلی دفعہ آیا تھا بچپن سے لے کر اب تک وہ کئی دفعہ لاہور آچکا تھا کبھی نقیب حاکم کے ساتھ کبھی منیر میاں کے ساتھ پریوں یہاں آٹھ نو سالوں کی پڑھائی کے لیے اور اپنے خواب پورے کرنے پہلی دفعہ آیا تھا۔

اس کے ساتھ بیٹھا بہادر منہ کھولے حیرت سے ارد گرد دیکھ رہا تھا وہ پہلی دفعہ لاہور آیا تھا اور اب بے انتہا خوش تھا ، پکی چوڑی سڑکیں ، جگہ جگہ موٹر گاڑیاں اور سیاہ برقعے کے بنا گھومتی جدید طرز کے فیشن سے لیس خواتین سب اس کے لیے بالکل الگ دنیا جیسا تھا۔

چوہدری حاکم نے اسے صرف سفر میں ترقی کا خیال رکھنے کی غرض سے بھیجا تھا اب اس کی دودن بعد ہی واپسی تھی۔

گورنمنٹ گرلز ہائی سکول چک مٹھن گہرے سبز رنگ کے بورڈ پر سفید رنگ سے یہ حروف پینٹ کیے ہوئے تھے ۔ یہ عمارت گاؤں میں موجود لڑکیوں کے واحد سرکاری سکول کی تھی جو اس سال ہی مڈل سے ہائی تک ترقی کر چکا تھا۔

گہرے میرون اور سرخ ملے جلے رنگ کی دیواریں جن کا اوپری حصہ سفید رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا اتنی چھوٹی تھیں کہ باہر سے گزرتے لوگ سکول کے اندر کا منظر اچک اچک کر دیکھ سکتے تھے۔

سکول کے اندر سفیدہ ، نیم ، پیپل ، برگد کے درخت زیادہ اور کمرہ جماعت کم تھے یہی وجہ تھی بہت سے استانیات درختوں کے نیچے سن کے بنے ہوئے کپڑے جنہیں ٹاٹ کہا جاتا ہے بچھا کر ان پر بچوں کو قطار در قطار بٹھائے ہوئی تھیں۔

دوسری جماعت کا تختہ سیاہ بھی دیوار کے بجائے ایک درخت کے موٹے تنے کے ساتھ لٹکایا گیا تھا اور تختہ سیاہ سے کچھ ہی آگے مس نسیم آنکھوں پر چشمہ ٹکائے، لکڑی کی کرسی پر براجمان بچوں کی کاپیوں کو گود میں رکھے چیک کر رہی تھیں۔

اور سامنے دو قطاروں میں بچے ٹاٹ پر بچیاں بیٹھی لکڑی کی بنی تختیوں پر لکھ رہی تھیں ہر بچی کے ہاتھ میں پتلے سے بانس کو تراش کے بنائے ہوئے قلم تھے جسے وہ چھوٹی چھوٹی دوات نامی سیاہ سیاہی کی ڈبیوں میں بھگو بھگو کر تختی پر لکھ رہی تھیں۔

ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا سالانہ امتحانات کے بعد پہلی جماعت کی بچیاں دوسری جماعت میں آئی تھیں۔ اور مس نسیم کو اس سال پہلی بار دوسری جماعت سے پالا پڑا تھا۔

”مالا۔۔۔ مالا کھڑی ہو جاؤ“

لکڑی کی کرسی پر براجمان مس نسیم نے عینک کو ناک کے اوپر درست کیا اور ہاتھ میں پکڑی کاپی سے نگاہ اٹھائے سامنے بیٹھی مالا کو پکارا۔ مالا جو تختی پر لکھنے میں مصروف تھی نام سن کر چونکی اور پھر فوراً تختی کو ایک طرف رکھتے ہوئے احتیاطاً پاس پڑی کتاب کو اٹھائے کھڑی ہوئی کہ شئی دمس نسیم نے اسے سبق سنانے کے لیے بلایا ہے۔

”جی مس جی“

مس نسیم کے قریب آکر تیکھی سی آواز میں مؤ دبانہ کہا، دل ہولے ہولے لرز رہا تھا سبق تو ہر روز کی طرح آج بھی نہیں آتا تھا اور مس نسیم نے آج سب سے پہلے اسے بلایا تھا۔

”مالا تمہاری کاپی آج پھر خالی ہے، تم گھر جا کر پڑھتی کیوں نہیں ہو، جو کام تمہیں لکھنے کو دیتی ہوں وہ کیوں نہیں کر کے آتی تم؟؟“

مس نسیم نے سختی سے پوچھا، وہ کافی دن سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ ہوم ورک کے لیے یا تو کھڑی ہو جاتی تھی یا پھر خالی کاپی ان کے میز پر دھر جاتی تھی۔ مالا مس نسیم کا غصہ دیکھ کر ایک دم گڑبڑا گئی۔

”مس جی پڑھتی تو ہوں“

مالا نے حد درجہ معصومیت سے جواب دیا اور ہاتھ میں پکڑی کتاب کو سینے سے لگا کر اس کے کونے کو انگلیوں سے مڑوڑا۔ مس نسیم کی اچانک نگاہ کتاب پر پڑی۔

”یہ تمہاری کتاب ہے؟“

مس نسیم کو حیرت کا شدید دھچکا لگا تھا مالا کے ہاتھ میں پکڑی کتاب انتہائی بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ مالا نے مس نسیم کے سوال پر گھبرا کر کتاب کی طرف دیکھا

”چوہدری حاکم کی پوتی ہو کر ایسی کتاب؟“

مس نسیم کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی، پورے گاؤں میں وہ لوگ مالدار زمیندار تھے، مالا کے کپڑے جوتے اس کی امارات کا پتہ دیتے تھے۔ وہ ٹاٹ پر بیٹھی سب بچیوں میں نمایاں ہوتی تھی صاف ستھری دھلی ہوئی، رابن نیل سے چمکتی سکول کی وردی، ہلکے سے تیل لگے دو چٹیوں میں باندھے بال جن کے نیچے سرخ ربن کو پھول کی شکل میں باندھا ہوتا تھا اگرچہ سکول سے واپسی تک وہ اپنا حلیہ بگاڑ لیتی تھی لیکن پھر بھی وہ یہاں بیٹھی تمام بچیوں میں نمایاں ہوتی تھی۔ پہلی ہی قطار میں بیٹھی ایک بچی تیر کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی

”مس جی۔۔۔۔۔ مس جی۔۔۔۔۔ میں بتاؤں؟، یہ اس کی کتابیں تھوڑی ہیں، یہ تو شازیہ کی کتابیں ہیں، اس نے اس سے اپنی نئی کتابیں دے کر اس کی پرانی کتابیں لے لی ہیں“

تیز طرار سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے بچی صبا نے کھڑے ہو کر مس نسیم کو حقیقت سے آسانہ کیا تو وہ منہ کھول کر اب حیرت سے سوالیہ نگاہیں مالا پر جما چکی تھیں جو اس باختہ کھڑی تھی اور صبا نامی بچی گردن اکڑائے مس نسیم کو دیکھ رہی تھی۔

”شازیہ کی کتابیں اس سے لے لیں!!!!۔۔۔ مالا یہ کیا چکر ہے کیوں دی تم نے اپنی نئی کتابیں اس کو، بولو۔۔۔؟“
مس نسیم نے بازو سے پکڑ کر مالا کو اپنے قریب کیا تو مالا ہل گئی اور نگاہیں نیچی کر لیں، مس نسیم نے فوار شازیہ کو گھورا، شازیہ ہمیشہ اپنی بڑی بہن کی استعمال شدہ کتابیں استعمال کرتی تھی جو اس دفعہ مالانے اس سے لے لی تھیں۔
”شازیہ تم اٹھو ادھر آؤ اور بتاؤ کیا ہے ماجرا سارا“

مس نسیم نے سخت آواز میں شازیہ کو حکم دیا تو وہ فوراً تعمیل کرتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر مس نسیم کے پاس آئی جہاں مالا پہلے سے سر جھکائے کھڑی تھی۔

”مس جی وہ کیا ہے اس نے مجھے کہا مجھے روز دو گلاب جامن لا کر دینا اپنے ابا کی دوکان سے میں تمہیں اپنی نئی کتابیں دے دیتی ہوں اور تمہاری پرانی کتابیں خود رکھ لیتی ہوں“
شازیہ نے معصومیت سے مالا کے بیوپار سے آگاہ کیا تو مس نسیم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا پھر آنکھوں کو غصے سے سکوڑ کر انہوں نے مالا کی طرف دیکھا جو اب بھرپور معصومیت چہرے پر طاری کر چکی تھی۔

شازیہ کا والد گاؤں کا ایک چھوٹا سا حلوائی تھا اور مالا رہی بیٹھے کی شیدا ئی ایک دن شازیہ کو دیکھا کہ وہ روز سکول کی ادھی چھٹی کے دوران روٹی کھانے کے بعد کبھی ایک گلاب جامن کھاتی تھی تو کبھی برنی کھاتی تھی جو اس کی اماں اس کے کھانے میں رکھ دیتی تھی تو بس پھر مالا کے ننھے سے ذہن نے اس سے لین دین کے بارے میں سوچ لیا پڑھائی تو وہ ویسے بھی سرے سے نہیں کرتی تھی تو کتابیں نئی ہوں یا پرانی اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

”تم کیا پاگل ہو مالا، بتاؤں میں اب تمہارے گھر جا کر چوہدری صاحب کو یہ سب؟۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔“
 مس نسیم نے جھنجھوڑتے ہوئے اس سے پوچھا، وہ تو اور سہم گئی جلدی سے نفی میں سر ہلادیا آنکھوں میں آنسو تیر گئے، پہلے جب تقی گھر ہوتا تھا تب سب چھوٹے بچوں کی کتابیں اور ان کی پڑھائی کا دھیان رکھتا تھا اب تو مالا کو یہ فکر بھی نہیں تھی غزالہ ویسے بھی ننھے مہمان کے آنے کی خوشخبری کی وجہ سے بے حال سی رہتی تھی اس لیے کبھی اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتی تھی۔

”شازیہ بیٹے دو مالا کو اس کی کتابیں واپس اور تم کل سے اس کے لیے کوئی گلاب جامن نہیں لاؤ گی سمجھی“
 مس نسیم نے غصے سے شازیہ کو ڈپٹا اور پھر مالا کی ساری کتابیں شازیہ کے بستے سے اس کے بستے میں منتقل کر دیں۔
 ”مالا۔۔۔ یہ آخری دفعہ تمہیں خبردار کر رہی ہوں کل سے اگر تم نے گھر کا کام اپنی کاپیوں پر نہیں کیا تو میں خود تمہارے گھر آ جاؤں گی سمجھی۔۔۔۔۔“

مس نسیم نے مالا کے کان کو مڑوڑتے ہوئے اس تنبیہ کیا جو کان کی تکلیف سے منہ کا زاویہ مکمل بگاڑ چکی تھی پھر سر جھکا کر اثبات میں ہلایا

”چلو اب جاؤ اپنی جگہ پر بیٹھو جا کر“

مس نسیم نے غصے سے اسے جانے کا حکم صادر کیا تو وہ کچھ دور بیٹھی صبا کو خفگی سے گھورتی ہوئی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ جبکہ صبا اب آگے کے دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کی نمائی ش کرتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

تقی کتابیں ایک ہاتھ میں تھامے کمرہ جماعت میں داخل ہوا تھا۔ لکڑی کا داخلی دروازہ تھا اور لمبائی رخ کلاس میں بہت سی کرسیاں لگی تھیں جہاں بہت سے لڑکے اور لڑکیاں براجمان تھیں۔ اس کا آج پہلا دن تھا داخلے اور ہاسٹل کے انتظامات میں تقریباً پندرہ دن لگ گئے تھے۔

سفید گرتاشلوار میں ملبوس بالوں کی سلیقے سے ایک طرف مانگ نکالے وہ جیسے ہی کمرہ جماعت میں داخل ہوا کتنی ہی کاجل سے اٹی آنکھیں ستائی لیشی اس پر اٹھی تھیں اور کچھ لڑکے منہ پر ہاتھ رکھے ہنس پڑے تھے پوری جماعت میں ایک وہ واحد گرتا پا جامہ پہنے ہوئے تھا باقی سب تو پتلون اور شرٹ میں ملبوس تھے۔

یہ لاہور کا مشہور میڈیکل کالج تھا جس میں تقی کا ڈاکٹری میں داخلہ ہو گیا تھا، منیر میاں کے دوست کے یہاں اچھے اثر رسوخ کے سنگ تقی کے بہت اچھے نمبر تقی کو آج اس کے خوابوں کی ڈگری تک لے آئے تھے۔

وہ سب کی ستائی لیشی اور استہزیایہ نگاہوں سے بے اعتنائی برتا رہا دگر دلی کرسیوں کے بیچ میں سے گزر کر پہلی قطار میں موجود خالی کرسی پر براجمان ہوا وہیں ساتھ والی کرسی پر ایک لڑکا بیٹھا تھا جو اس کو اب دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

”نئے ہو۔۔۔ جماعت کو شروع ہوئے تو پندرہ دن ہو چکے ہیں“

بلال نامی لڑکے نے شائی سنگی سے سوال کیا، تقی نے کتابیں لکڑی کی کرسی کے بازو پر رکھیں اور توجہ ساتھ بیٹھے لڑکے کی طرف مبذول کی

”جی نیا ہوں پتہ ہے پندرہ دن ہو چکے ہیں، میں بیس دن کا پہلے سے ہی پڑھ کر آیا ہوں“

تقی نے بھی دوستانہ مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا اور پھر یونہی سوال و جواب کا سلسلہ چلتے چلتے پہلے ہی دن اس کی بلال انجم نامی اس لڑکے سے اچھی سلام دعا ہو گئی ازاں بعد جماعت کے اختتام پر بلال نے اسے اپنے دو اور دوستوں سے متعارف کروایا، منیر اور طلحہ بھی تقی کے ساتھ خوشدلی سے ملے تھے۔ تقی کے نمبروں نے انہیں کافی متاثر کیا تھا۔

اس طرح وہ پہلے ہی دن اپنی سحرانگیز شخصیت اور ذہانت کے باعث دوست بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

سات سالہ مالا نیم کے درخت کے موٹے تنے پر بیٹھی ٹانگیں نیچے لٹکائے جھلار ہی تھی اور ساتھ ساتھ نبولیاں کھا رہی تھی، بال کندھوں سے نیچے جانے لگے تھے، قد کاٹھ بھی ایک سال میں ڈبل ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ دور تنے کے دونوں اطراف میں ٹانگیں کیے سکینہ بیٹھی سامنے رکھی کاپی کے سفید صفحات پر پنسل سے لکھ رہی تھی۔

”اچھا اچھا لکھ کیسے لکھ رہی ہے، تیرا اپنا کام ہوتا تو کیا ایسے لکھتی تو، مس نسیم چڑی ادھیڑ دے گی میری“ مالانے پاؤں سکینہ کے پاؤں پر مارا تھا، سکینہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا جو بڑے مزے سے ٹانگیں ہوا میں مارتی اسے کام اچھا کرنے کا کہہ رہی تھی اور سکینہ اس کے سکول کا کام کر رہی تھی وہ اس کا کام آج پہلے دن نہیں کر کے دے رہی تھی بلکہ سال ہونے کو آیا تھا اس کا کام سکینہ ہی اسے کر کے دیتی تھی اور وہ مزے سے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ دوسری جماعت کے سالانہ امتحانات نزدیک تھے اور وہ سارا سال کھیل کود اور مستی میں گزار چکی تھی۔

”مالا دیکھ تمیز سے بات کر ایک تو تیرا کام کر کے دے دیتی ہوں روز اوپر سے تو باتیں سناتی ہے مجھے“ سکینہ نے منہ پھلا کر مالا سے شکوہ کیا جو درخت کے تنے پر بڑے مزے سے بیٹھی نبولیاں کھا کر ان کی گھلیوں کو پھونک مار کر نیچے زمین پر پھینک رہی تھی

”اے اے اے۔۔۔ ہے۔۔۔ تجھے جو شوق چڑھا رہتا تھا میری کتابیں اٹھا کر بیٹھی رہتی تھی تو چل تیرا شوق پورا کر دیا اور کیا تو سمجھ رہی ہے میں کام چور اور نالائق ہوں؟“

مالانے گردن ہلاتے ہوئے سارا ملبہ اس پر گرا دیا، سکینہ پہلی جماعت کے بعد سے ہی سکول سے اٹھالی گئی تھی، جب تک اس کے ابا زندہ تھے وہ سکول جاتی تھی پھر اس کے بعد تاروی بوانے گھر بیٹھا لیا اب مالا کی دوسری جماعت کی کتابیں وہ چوری چھپے پڑھتی رہتی تھی۔

سکینہ نے مالا کی بات پر سر کو تاسف سے ہوا میں مارا اور پھر سے اس کا کام لکھنے لگی تھی کہ پر سوچ بیٹھی مالا ایک جھٹکے سے گویا ہوئی

”اے اے۔۔۔ سن سکینہ۔۔۔ جیسے تو نے صرف پہلی جماعت پڑھی پھر گھر بیٹھ گئی اور بھی کتنی لڑکیاں سکول چھوڑ دیتی ہیں میں ایسا کیا کروں کہ اگلے سال سے سکول ہی ناجاؤں داجی کہیں گھر بیٹھ جا مالا بس دو جماعتیں بہت ہیں“

مالا نے چمکتے ہوئے سکینہ سے پوچھا آنکھیں ایک دم سے چمک اٹھیں اور نبولیاں قمیض کے دامن سے نیچے فرش پر گر گئی تھیں

”اس کا تو ایک ہی حل ہوتا ہے فیل ہو جانا“

سکینہ نے کاپی پر سر جھکائے مگن سے انداز میں اسے جواب دیا اور پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا جو خوش ہو گئی تھی اس مشورے پر

اچھا چل بتا فیل ہونے کے کیے کیا کیا کرنا ہو گا“

مالا نے ہاتھ کو درخت کے تنے پر دھرتے ہوئے آگے ہو کر جوشیلے انداز میں پوچھا اور سکینہ جو اس کو اچانک یہ مشورہ دے کر اب پریشان صورت بنائے بیٹھی تھی۔ تھوک نکلا اور اس کے جوش سے گھومتے ڈیلوں کو دیکھا جو انوکھی سی چمک لیے ہوئے تھے۔

”بتانا۔۔۔ کیا منہ میں گول گپہ ڈال کر بیٹھ گئی ہے، بول جلدی کیا کرنا پڑے گا مجھے کہ بس اماں ابا گھر میں بیٹھا لیں“

مالا نے حواس باختہ بیٹھی سکینہ کے بازو کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا، اس نے بے بسی سے مالا کی طرف دیکھا جو جواب کی بے تابی سے منتظر تھی

”مالا تجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا“

سکینہ نے آہستگی سے سچ اگلا، اور وہ تو چہک اٹھی

”سچی بتا۔۔۔ شکر ہے شکر ہے۔۔۔ میں سوچ رہی تھی اب فیل ہونے کو پتا نہیں کیا کرنے پڑے گا، ہائے مزے

سے گھر رہوں گی ارحمہ کے ساتھ کھیلوں گی“

مالا نے کھوئے سے لہجے میں سارے خواب بُن لیے تھے، رملہ کے بعد نوازش اور غزالہ کے گھر پھر سے چوتھی بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی جس کا نام ارحمہ نوازش رکھا گیا تھا۔ مالا کی اپنے سے دو سال چھوٹی رملہ سے تو ایک پل نابتی تھی اسے تو مارتی رہتی تھی پر ارحمہ میں تو جیسے اس کی جان بستی تھی۔ وہ بھی تین ماہ کی تھی اور مالا تو ساری گڑیا کوڈبوں میں دفن کیے سارا دن اس کے چاولاڈ کرتی رہتی تھی۔

وہ اب سارے منصوبے بنا رہی تھی کہ جب وہ سارا دن گھر رہا کرے گی تو کیا کچھ کیا کرے گی اور سکینہ بس تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جسے ہر سہولت میسر تھی اور وہ پڑھنا نہیں چاہتی تھی اور ایک وہ تھی جسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔

یہ لاہور میڈیکل کالج کا کشادہ لان تھا جس کے فرش پر سبز گھاس قالین صورت بچھی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ طلبہ ٹولیوں کی صورت بیٹھے کتابوں پر سر جھکائے پڑھائی میں مگن تھے انہی ٹولیوں میں اونچے سے جوڑے بنائے اور آنکھوں میں کاجل کے کنارے باہر کنیسیٹوں تک نکالے اور جوڑوں میں سے نکلی لٹوں کو کانوں کے پاس گولائی میں لا کر موڑے تین جدید فیشن سے لیس دوشیزائیں گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں پاس ہی کتابوں کا ڈھیر لگا تھا جس سے بے نیاز وہ کاناباتی میں ہی مگن تھیں۔ اچانک ان میں سے ایک کی نگاہ سامنے راہداری پر اٹھی اور وہ جوش سے آگے ہوئی

”شیریں۔۔۔ وہ دیکھ۔۔۔ وہ دیکھ۔۔۔ آگیا وہ جس کے انتظار میں کھلی جا رہی تھی تو“

سدرہ نے شرارت سے ہنستے ہو شیریں کو ٹھوکا جس نے راہداری پر سے کچھ دیر کے لیے ہی نگاہیں ہٹا کر کتاب پر جما تھیں اور جیسے ہی کتابیں پر جمائیں وہ آگیا تھا جس کا وہ کب سے انتظار کر رہی تھی۔

تقی بلال کے ساتھ کالج کے گیٹ میں داخل ہو رہا تھا، وہی سحر انگیز، بارعب شخصیت جس کو دیکھ کر کتنی ہی پلکیں جھپکنا بھول جائیں، شیریں کے لب دلکش انداز میں مسکا اٹھے تھے۔

پہلے سال کے امتحانات ہونے والے تھے، سب لوگ سارا سارا دن پڑھائی میں مگن رہتے تھے اور تقی نقیب تو کالج میں ہی کم نظر آتا تھا۔

”آہستہ۔۔۔ سدرہ سن لے گا وہ“

شیریں نے سامنے دیکھتے ہوئے کھوئے سے لہجے میں کہا اور زور کی چٹکی سدرہ کے بازو پر بھری، جو تڑپ کر بازو سہلانے لگی،

شیریں بلا کی خوبصورت لاہور شہر کی رہائی یشی امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھنے والی دوشیزہ تھی، جماعت میں بہت سے لڑکے اس کے آگے پیچھے گھومتے تھے پروہ تھی کہ بری طرح تقی کی شخصیت کے سحر میں جکڑی جا چکی تھی پورا سال وہ یونہی تقی کو چھپ چھپ کر دیکھتی رہی تھی اور وہ تھا کہ کسی بھی لڑکی سے کبھی بات نہیں کرتا تھا۔

وہ جماعت کا قابل طالب علم تھا اور ہر وقت دھیان بس پڑھائی کی طرف ہی رہتا تھا پر شیریں کی طرح بہت سے دل اس کی ایک نگاہ خود پر اٹھ جانے کے بس منتظر ہی رہتے تھے۔ باقی سب لڑکیاں تو تقی کے اس سنجیدہ رویے سے مایوس ہو گئی تھیں لیکن شیریں بی بی تو بری طرح دل ہار بیٹھی تھیں۔

”تو کیا ہے۔۔۔ ارے بھئی سننے دو نا سال بھر ہونے کو آیا ہے، اب موصوف کو پتا چلنا چاہیے کوئی ہے اسے کا

چاہنے والا جو اس کی ایک جھلک کے لیے دم بھرتا ہے“

صبا نے لہک لہک کر شیر سے لہجے میں لجائی سی شیریں کو مزید تنگ کیا، شیریں نے خفگی سے گھورا ”خبردار۔۔ جو کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کی ہو تو، ایک تو پہلے سے ہی اتنا اڑو ہے وہ اور پھر ایک سال بعد جو ہمت کی ہے بات کرنے کی وہ بھی جاتی رہے گی“

شیریں نے دونوں کو دو ٹوک لہجے میں تنبیہ کیا، اور وہ پھر بھی کھی کھی کرنے میں مگن تھیں کیونکہ آج شیریں کو اپنے اس منصوبے پر عمل پیرا ہونا تھا جو وہ کتنے دن سے تقی سے بات کرنے کے لیے بنا رہی تھی۔ تقی اور بلال کچھ ہی دور لان میں درخت کے نیچے لگے پتھر کے بیچ پر بیٹھ گئے تھے اور تقی اب سامنے پتھر سے ہی بنے میز پر کاغذ رکھے کچھ لکھ رہا تھا اور بلال اس کے ساتھ سر جھکائے بیٹھا کاغذ پر دیکھ رہا تھا۔

”چلو اب اٹھو دونوں چلو میرے ساتھ اور ادھر جا کر میں بات کروں گی صرف، تم دونوں خاموش رہو گی بس“

شیریں نے دونوں کو ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے سمجھایا اور پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی، کپڑے اور بال بڑے ناز سے درست کیے۔ بند چاک اور سامنے پلیٹ والی تنگ قمیض جو بمشکل گھٹنوں تک آتی تھی، نیچے گھیرے دار شلوار جس سے پاؤں میں پہنا جوتا بھی ڈھک رہا تھا اور کرب کپڑے کا باریک سا دوپٹہ جو گلے میں جھول رہا تھا زیب تن کیے شیریں غضب ڈھا رہی تھی۔

اور پھر تینوں سہج سہج گھاس پر پاؤں رکھتیں بلال اور تقی کے قریب آ کر کھڑی ہو چکی تھیں۔ بلال اور تقی نے ایک ساتھ ان کی طرف دیکھا۔ بلال تو خوش ہو گیا تھا جبکہ تقی کے چہرہ اسپاٹ تھا ایک سرسری نگاہ ڈال کر ہی وہ نظریں پھیر چکا تھا

”اسلام علیکم کیسے ہو بلال؟“

شیریں نے مسکراتے ہوئے سلام کیا اور ایک چورنگہ تقی پر ڈالی جو ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر اب پھر سے اپنے سابقہ کام میں مشغول ہو چکا تھا۔

بلال نے مسکراہٹ دبا ئے ایک نظر تفتی پر ڈال کر جواب دیا، بلال کی سارا کالج شیریں کی تفتی کے لیے بے تابی کے بارے میں آگاہ تھا۔

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں تقی کے نوٹس چاہیں، سرطیب نے بہت تعریف کی تھی اگر مل جاتے تو؟؟؟ اور اگر تھوڑا گائیڈ کر دے تقی ہمیں اس میں۔۔۔“

شیریں نے اپنی بات بمشکل پوری کی اور وہ بات بلال سے کر رہی تھی مگر دیکھ بار بار تفتی کی طرف رہی تھی جو پہلے سے ہی قلم روک چکا تھا اور یقیناً ان کی بات سن چکا تھا پر سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا ابھی تک نہیں تھا۔ ایک دو سکینڈ کے لمحے یو نہی گزر جانے کے بعد تفتی نے گہری سانس لیے سر اوپر اٹھایا چہرے پر گہری سنجیدگی کے آثار رقم کسے گویا ہوا

”میں آپ کو نوٹس دے دیتا ہوں، لیکن گائیڈ میں نہیں کروں گا، بلال اور نمیر کو وہ سب میں سمجھا چکا ہوں میں، آپ ان دونوں سے مدد لے سکتی ہیں، نوٹس کل میں دے دوں گا آپ کو“

تقی نے بے حد سنجیدگی سے بات کا جواب دیا اور پھر شیریں کے جربز ہوتے چہرے سے بے اعتنائی برتتے ہوئے بلال کی طرف متوجہ ہوا جو پوری باچیس کھلائے لڑکیوں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

”بلال میں جارہا ہوں، تمہیں جانا ہے ابھی یا۔۔۔؟“

تقی نے اس کے یوں یک ٹک لڑکیوں کو تکتے پر معنی خیز جملا اچھالا جس پر وہ گڑبڑا کر کھڑا ہوا۔

”نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ اچھا لپڈیز پھر کل ملتے ہیں نوٹس کے ساتھ“

بلال نے گردن کھجاتے ہوئے پوری بتیسی نکال کر تینوں سے اجازت طلب کی جس پر شیریں کا بس نہیں چل رہا تھا اس کا سر ہی پھوڑ دے۔ تلقی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اب جا رہا تھا اور بلال بھاگ بھاگ کر اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

سدرہ نے شیریں کے کندھے پر ہاتھ دھرے کان میں سرگوشی کی، شیریں نے ہاتھ کی انگلیاں مڑوڑتے ہوئے گہرے سانس اندر باہر انڈیلے

”تو مت اٹھائے۔۔ منظور ہے مجھے یہ بھی میں اٹھالوں گی اس کے نخرے“

صبا نے تاسف بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اپنا ماتھا پیٹ لیا
 ”مقبرہ بنا گے اس کا اور کچھ نہیں“

* * * * *

حویلی کے بیرونی برانڈوں میں دوپہر کے باعث اب قدرے خاموشی تھی، چوہدری حاکم کے پاس آنے والے لوگوں کی آمد اب تقریباً دوپہر کے بارہ بجے ختم ہو چکی تھی۔

چوہدری حاکم کی بیٹھک کے باہر ہی چند لکڑی کی کرسیاں میز لگائی گئی تھیں جن پر اکثر گاما بیٹھ کر حساب کتاب کرتا تھا اور اس وقت بھی چوہدری حاکم کے بیٹھک میں جانے کے بعد وہ بیٹھا بڑے سے رجسٹر پر سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا جب لڈن چوہدری حاکم کی ٹانگیں دبا کر باہر نکلا، وہ اس وقت تک چوہدری حاکم کی ٹانگیں دباتا رہتا تھا جب تک وہ گہری نیند میں نہیں چلے جاتے تھے۔

لڈن اداس سی صورت بنائے گامے کے پاس لگی کرسی پر آکر براجمان ہوا وہ ہر وقت قمیض اور تہبند میں ملبوس رہتا تھا اب بھی تہبند سمیٹا وہ اپنے مخصوص انداز میں کرسی پر سمٹ کر بیٹھ گیا اور غیر مرئی نقطے پر بے حد سنجیدگی سے گھورنے لگا جو اس پر گامے کو بالکل جیتی ہوئی محسوس ناہوئی آخر کار اس نے زبان پر ہونے والی کھجلی کے باعث لڈن سے پریشانی کا سبب پوچھ ہی لیا۔

”کیا ہوا لڈن میاں بڑا اداس بیٹھا ہے“

گامے نے اپنے حساب کتاب کے بڑا رجسٹر بند کیا اور ایک طرف رکھتے ہوئے لڈن کو غور سے دیکھا، لڈن گہری سانس لے کر گامے کی طرف متوجہ ہوا

”تقی میاں بہت یاد آرہے ہیں، دیکھو تو سال ہونے والا ہے ان کو گمے ہوئے، کیا رونقیں ہوتی تھیں ان کے ہونے سے، باہر آتے تھے مجھے تنگ کرتے تھے ہنسی مزاق چلتا تھا اب تو بور ہو جاتا ہوں“

لڈن نے اداس لہجے میں اپنی افسردگی کا سبب بتایا، تقی لڈن کو اس کے بھول پن کی وجہ سے اکثر بہت ستاتا تھا اور پھر یونہی ہنسی مزاق کا دور چلتا رہتا تھا جس میں بہادر اور گاما بھی لڈن کو چھیڑنے میں تقی کا بھرپور ساتھ دیتے تھے

-

”لڈن اتنا اداس مت ہو، کچھ دن بعد عید پر آرہے ہیں تقی میاں ان شاء اللہ“

گامے نے مسکراتے ہوئے اسے خوشخبری سنائی تو لڈن کی تو باچھیں کھل گئیں۔

لڈن ایک دم سے پر جوش ہوا سینہ باہر کو نکالے گامے سے سوال کیا جواب اس کی بات پر خفیف سا قہقہہ لگاتے ہوئے سر کو نفی میں ہلارہا تھا

لڈن نے میاں نے گردن گھماتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا، گامے کو اس کی انوکھی خواہش پر بے ساختہ ہنسی آئی۔

گامے نے بھنویں اچکائے سوال پوچھا

”اونیں میں نے نہیں چھوڑا جی، بس سمجھ نہیں آئی غلطی کہاں ہوئی مجھ سے ڈاکٹر صیبا کو غصہ کس بات کا آیا“
 لڈن نے اپنے سر پر پر سوچ ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا
 ”میں نے ایک دن مشورہ ہی دیا تھا انھیں کہ ڈاکٹر صیبا ایک میٹر نیٹی ہوم مردوں کا بھی بنالو بس ایسے غصے میں آئی
 کے کام سے ہی نکال دیا“

لڈن اپنی بات بتا کر اب بھی پریشان بیٹھا تھا جبکہ گامے ہستے ہوئے لوٹ پوٹ ہو ا جا رہا تھا

تقی اپنے کمرے میں لگے میز کے سامنے پڑی کرسی پر براجمان تھا، ڈھیلا سا سفید گرتا اس پر سلیقے سے بنے بال جو
 کچھ ماتھے پر بکھرے تھے، شہر کی ہوانے اور پڑھائی کے رعب نے شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اس کے بالکل
 سامنے میز کا ایک کونا انگوٹھے کے ناخن سے کھرچتی منہارونی صورت بنائے مجرموں کی طرح کھڑی تھی وہ کل
 رات ہی عید الفطر کی چھٹیوں پر گھر پہنچا تھا اور آج صبح منہا کے دسویں جماعت میں فیل ہو جانے کی خبر نے اُسے
 آگ بگولہ کر دیا تھا۔

منہا چار مضامین میں فیل ہو گئی تھی جو تقی کے لیے ناقابل برداشت خبر تھی۔

”کیوں ہوئی تم فیل وجہ پوچھ رہا ہوں میں بولو“

تقی کا چہرہ غصے سے لال بھوکا ہو رہا تھا اور پیشانی پر بے پناہ شکن تھے، سامنے کھڑی منہا اس کے یوں دھاڑنے پر
 کانپ گئی

”بھائی وہ۔۔ تیاری تو بہت اچھے سے کی تھی پتا نہیں۔۔“

منہا کی روہانسی آواز بمشکل حلق سے برآمد ہوئی تھی، ویسے تو وہ تقی سے ہنسی مزاق بھی کر لیا کرتی تھی لیکن جب
 کبھی تقی غصے میں آتا تو اس کی گھگی بندھ جاتی تھی

”کیا خاک تیاری کی تھی، سکول بھی جاتی تھی استانی جی کے گھر بھی جاتی تھی پھر بھی چار مضمون میں فیل؟“

تقی نے بے یقینی سے اس کے جھکے سر کو دیکھ کر سوال کیا جواب نادم سی ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے کھڑی تھی۔ تقی نے گاؤں میں موجود ایک استانی کے گھر اس کی ٹیوشن بھی لگا رکھی تھی۔ جب وہ یہاں ہوتا تھا تو خود پڑھا لیتا تھا منہا کو پر اپنے جانے سے پہلے وہ اس کی ٹیوشن کا انتظام کر کے گیا تھا۔

”بھائی نہیں ہوتا مجھ سے یاد اور نا سمجھ آتی ہے، دسویں جماعت بہت مشکل ہے“

منہا نے بیچارگی سے کہا جس پر تقی کے جڑے ضبط کے باعث اور باہر کو ابھرے، کمرے کے دروازے پر پردے کے پاس کوئی ہیولہ چوری سے کھڑا محسوس ہو رہا تھا۔

مالا جو ویسے ہی کمرے کے پاس سے گزر رہی تھی تقی کی گرج دار آواز سن کر سہم کر وہیں جم گئی تھی۔

”کوئی مشکل نہیں ہے، اور کان کھول کر سن لو اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ تم فیل ہو گئی ہو تو میں تمہیں پڑھانے کا خواب ادھورا چھوڑ دوں گا تو یہ بھول ہے تمہاری“

تقی نے انگلی ہوا میں معلق کیے منہا کو اپنے سخت ارادوں سے آگاہ کیا، وہ اپنی اکلوتی بہن کو ان پڑھ نہیں رکھنا چاہتا تھا اس کا ماننا تھا لڑکی ہو چاہیے لڑکا ان کو اتنی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے کہ وہ زندگی کے کسی بھی سنگین موڑ پر کسی کے آگے ہاتھ نا پھیلائیں۔ اور منہا کو وہ بارہ جماعتیں پڑھانے کی ٹھان چکا تھا۔

”تم دوبارہ پیپر دے رہی ہو، میں نے سپلی کے لیے داخلہ فارم پُر کر دیا ہے کل استانی جی کو دے آؤں گا“

تقی نے اسے اپنا ٹوٹ فیصلہ سنایا اچانک مالا سے چھوٹی رملانے وہاں آ کر پورا پردہ ایک طرف کر دیا جس کے پیچھے مالا کھڑی تھی، بے ساختہ تقی نے دروازے کی طرف دیکھا مالا نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا، پردہ چھوڑ کر واپسی کے لیے دوڑ لگا دی۔

تقی اسے ایک پل میں ہی پہچان گیا تھا اس کا انداز وہی ایک سال پہلے والا ہی تھا، کچھ دیر ہلتے پردے کی طرف دیکھنے کے بعد وہ پھر سے منہا کی طرف متوجہ ہوا جو اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

”یہ کس کلاس میں ہے؟“

تقی نے بھنویں اچکائے، بنا نظریں ملائے منہا سے سوال کیا، رشتہ جو بھی بن گیا تھا گھر کے باقی بچوں کی طرح اس کی پڑھائی کی فکر اسے آج بھی تھی۔

”تقی بھائی بہت نکمی ہے دوسری میں فیل ہو گئی ہے تو اب آگے سکول نہیں جانے کی ضد کی تو داجی نے کہا گھر بیٹھالو“

منہا نے دھیمے سے متوازن لہجے میں جواب دیا جس پر تقی کی تو آنکھیں پھیل گئیں اس خبر پر اور بے اختیار وہ صدمے سے چیخ اٹھا

”کیا!!!!!!“

آنکھیں پوری کھل گئی تھیں اور غصہ پیشانی کے شکن کا موجب بن گیا تھا، ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے سے باہر قدم نکالے، غزالہ کے لیے متلاشی نگاہیں ارد گرد دوڑائی، بی جی اریب کے ساتھ تخت ہر بیٹھی تھیں، شمو نیچے فرش پر چٹائی بچھائے بی جی کی ہدایت پر کچھ سلائی کرنے میں مصروف تھی، فرہاد کچھ دور موڑھے پر بیٹھا ریڈیو کان سے لگائے گانا سننے میں مصروف تھا، تقی نے نگاہیں صحن میں دوڑائی تو سامنے ہی چارپائی پر بلقیس اور غزالہ سبزی بناتی نظر آئی۔

اور وہ محترمہ دوسری فیل دور نیم کے درخت پر مہرانی کی طرح جھولا جھول رہی تھی ارحمہ کو گود میں بیٹھا رکھا تھا اور رملہ کو جھولا جھلانے پر لگا رکھا تھا۔ وہ غصے میں بھرا اب تیز تیز قدم اٹھاتا صحن میں آیا اور آتے ہی بلقیس اور غزالہ کے سر پر کھڑا ہو گیا

”چچی۔۔۔ مالا کو سکول سے اٹھالیا ہے اور گھر بیٹھالیا ہے کیوں؟“

پیشانی پر بل ڈالے وہ غزالہ سے سوال کر گیا اور وہ اس کے یوں مالا کے متعلق سوال پر گڑبڑا کر اب بلیقیس کی طرف دیکھ رہی تھی جو خود حیران پریشان سی بیٹھی تھی۔

ان کے تو وہم و گمان میں بھی ناتھاتقی یوں مالا کے متعلق ان سے باز پرس کرے گا حیرت میں آنا تو بنتا تھا

”وہ تقی۔۔۔ پڑھائی میں چل ہی نہیں رہی تھی تو گھر بیٹھالیا“

غزالہ نے جزبہ حالت میں کبھی تقی اور کبھی بلیقیس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، ہاتھ میں چھری تھی اور سبزی پر اب مکھیاں بیٹھنے لگی تھیں۔

”تو آپ نے اس کا حل تلاش کرنے کے بجائے اسے گھر میں بیٹھالیا؟“

تقی نے تاسف سے سر ہوا میں گھمایا اور بیزار لہجے میں کہتے ہوئے کچھ دور مزے سے جھولا جھولتی ساڑھے سات سالہ مالا کو دیکھ کر کہا، غزالہ کی تو زبان ہی گنگ ہو گئی تھی کو اتنے غصے میں دیکھ کر

”چچی مالا گھر نہیں بیٹھے گی پڑھے گی جس استانی کے پاس شام کو منہا پڑھنے جاتی ہے یہ بھی جائے گی کل سے ہی، تقی تو اب رعب سے حکم چلانے پر آچکا تھا

”تقی۔۔۔ لی۔۔۔ ے۔۔۔ ک۔۔۔ ن“

غزالہ نے دھیمی سی آواز میں کچھ کہنا چاہا جسے تقی فوراً کاٹ گیا

”لیکن ویکن کچھ نہیں چچی، میں چاچو سے بھی بات کرتا ہوں اور داجی سے بھی، زبردستی بھیجیں اس کو سکول“

تقی نے دو ٹوک لہجے میں کہا اور اسی انداز میں اٹاری کی طرف قدم بڑھا دیے، اور پھر تقی تو عید کے تیسرے روز ہی لاہور واپس روانہ ہو گیا پر مالا کو دو گنے عذاب میں مبتلا کر گیا، سکول سے جان چھڑانے والی مالا اب نا صرف سکول جاتی تھی بلکہ شام کو استانی جی کے گھر ٹیوشن کے لیے بھی جاتی تھی۔ بہت روئی، بہت منت سماجت کی پر سب کو تقی

کا حکم یاد تھا وہ سب کو دو ٹوک کہہ گیا تھا نکاح آپ لوگوں نے زبردستی کیا تھا اب وہ میری منکوحہ ہے خبردار اگر کسی نے اسے سکول سے اٹھایا۔

مالا کو ابھی تھپڑ بھولا نہیں تھا کہ تقی اسے یہ چوٹ دے گیا تھا وہ اندر ہی اندر تقی پر تلملانے لگی تھی۔

یہ حویلی کے بڑے کمروں میں سے ایک کمرہ تھا جو خدیجہ بیگم نے اپنی بڑی بیٹی اریب کو دے رکھا تھا۔ اریب نے بڑے سلیقے سے کمرے کے ایک حصے میں اپنی پٹیاں اور اٹچی اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے جن کے اوپر سرخ رنگ کے کور بڑے سلیقے سے بچھا رکھے تھے اور ایک طرف لکڑی کی پلنگ چوکی اور صوفہ میز پڑے تھے۔ کمرے میں پلنگ کے قریب ایک طرف منیر صوفے پر بیٹھا تھا اور ساتھ اریب غصے سرخ ہوتا چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ اور پلنگ پر فرزانہ بیٹھی تھی۔

فرزانہ نے چوڑیوں سے بھری بازو اوپر اٹھائی اور دوپٹہ سر پر درست کرتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا، وہ آج اریب کے بہت اسرار پر میکے آئی تھی گو کہ اس کا گاؤں اتنا دور نہیں تھا پر اس کا سسرال بہت بڑا تھا کہیں چھ مہینوں میں ایک دفعہ چکر لگاتی تھی اور اب تو ایک سال کا بیٹا بھی تھا جس کے باعث اس کی مصروفیت مزید بڑھ گئی تھی۔

”اب کی بار آئی ہو تو فرہاد کا دماغ سہی سے درست کر کے جاؤ“

اریب نے غصے سے دانت پیستے ہوئے تکیہ کلام جوڑا وہ فرزانہ سے فرہاد کے دکھڑے رور ہی تھیں جو آجکل ماں سے منہا کا رشتہ مانگنے کی ضد لگائے ہوا تھا۔

”اماں تو ایک بات بتائی مجھے اس میں برائی کیا ہے، منہا میں ایسی کیا کمی ہے مان لیں فرہاد کی بات“

فرزانہ نے جھنجھلا کر اپنی ماں کی ضد کی وجہ پوچھی، جس پر اریب جھٹکا کھا کر سیدھی ہوئی

”کی کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ پوچھو کیا کی نہیں ہے اس لڑکی میں، بلقیس نے سرچڑھا رکھی ہے کوئی کام نہیں آتا اس کو، نا سلائی نا کڑھائی نا کچھ پکانا“

اریب نے نخوت سے ناک چڑھاتے ہوئے منہا کی خامیاں گنوائی یں، منیر بس خاموشی سے ماں بیٹی کی گفتگو سننے میں مگن تھا۔

”میں نے کیا ایسی بہولا کر اپنا بڑھا پا غارت کرنا ہے، ایک ہی تو بیٹا ہے میرا“

اریب تو آج جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی، فرزانہ نے باپ کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھا جو کندھے اچکا گیا

”اماں ایسا بھی کیا ہے یہ بھی تو دیکھو کہ تقی اسے پڑھا بھی رہا ہے دس جماعت پاس ہے ماشا اللہ سونی ہے“

فرزانہ نے ماں کو اس کی خوبی گنوائی، منہا دسویں جماعت پاس کر چکی تھی اور اب گھر میں ہی گیارہویں جماعت کی تیاری کر رہی تھی، جس کے لیے وہ مالا کے ساتھ استانی جی کے گھر جاتی تھی مالا اب تیسری جماعت میں تھی۔

”بس کر آئی بڑی تو وکالت کرنے والی تجھے میں نے اپنا ساتھ دینے کے لیے بلایا ہے اور تو اسی کی وکالت کرنے بیٹھ گئی ہے، دیکھ میری طرف سے وہ پڑھ لکھ کر استانی کیوں نا لگ جائے میں پھر بھی اسے فرہاد کے لیے نہیں بیاہ کر لاؤں گی، یہ ساری باتیں اپنے بھائی کے دماغ میں ڈال کر جانا“

اریب جھٹکا کھا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے کا کواڑ زور سے دیوار میں مارتی باہر نکل گئی، فرزانہ تو چچی کے دو پاٹوں میں پس کر رہ گئی تھی۔ فرہاد کہہ رہا تھا اس کے ساتھ دے اور اریب کہہ رہی تھی اس کا ساتھ دے۔

فرزانہ نے گہری سانس لی اور پلنگ پر بے خبر سوتے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

میڈیکل کالج لاہور کے وسیع عریض لان کی گھاس نمیر کے ہاتھوں بے دردی سے زمین سے اُکھڑا کھڑ کر ایک طرف ڈھیر ہو رہی تھی، وہ سامنے نگاہیں جمائے آہیں بھرتا ہوا گھاس پر مسلسل ظلم ڈھارہا تھا ساتھ ہی بلال اور تقی بھی گھاس پر کتابیں سامنے ڈھیر کیے بیٹھے تھے۔

شہر کارنگ ڈھنگ تقی پر کچھ یوں بھی چڑھا تھا کہ وہ اب پتلون اور شرٹ گرتے شلواری کی نسبت زیادہ زیب تن کرنے لگا تھا۔ اور اب بھی چیک والی نیلی شرٹ کے نیچے وہ گرے رنگ کی پتلون پہنے ہوئے سحر انگیز شخصیت کا حامل لگ رہا تھا۔

”یار کاش ہمیں بھی کوئی لڑکی ایسے دیکھا کرے کتنی خواہش ہوتی ہے نا، تقی جتنے خوبصورت نہیں تو کیا ہوا اتنے گمے گزرے بھی نہیں“

نمیر نے گھاس کو زمین سے کھینچتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری تھی، سامنے کچھ دوری پر بیٹھی شیریں، صبا اور سدرہ بار بار ان کی طرف دیکھ کر کھس پھس کر رہی تھیں، جن میں سے شیریں تھی جو محبت سے تقی کو بار بار دیکھ رہی تھی باقی دونوں تو بس شیریں کو چھیڑنے میں مصروف تھیں۔

”تو خود کسی لڑکی کو دیکھنا چھوڑے تو کوئی بیچاری تمہیں دیکھے۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔“

بلال نے آنکھ دبا کر اسے شریر لہجے میں آئی بینہ دکھایا اور پھر خود ہی اپنی بات پر پورا منہ کھول کر فلک شگاف قہقہہ لگا گیا جبکہ پاس بیٹھے تقی نے بس ذرا سا سر اٹھا کر دھیمی سی مسکراہٹ سجائے ان کا ساتھ دیا۔

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ویری۔۔۔ فنی۔۔۔ یہ اپنا بلڈ وزر جتنا منہ بند کر، میری شرافت پر شک ہر گز نا کرنا تمہاری طرح تاڑو نہیں ہوں میں“

نمیر نے خفگی سے گھورتے ہوئے بلال کو انگلی دکھائی

”لوجی دو آنے جتنی شرافت لیے پھرتا ہے، شریف تو ان جیسے ہوتے ہیں دیکھیے ادھر ان محترم کو محترم ڈاکٹر تقی نقیب صاحب“

بلال نے دھیمے سے مسکراتے تقی کی طرف ہاتھ اوپر نیچے نچاتے ہوئے اشارہ کیا،
 ”پورے میڈیکل کالج کی سب سے حسین مورت ان کو تاک تاک کر مجسم ہوئے جاتی ہے، شیریں سے پھکی ہو گئی بیچاری ان پانچ سالوں میں اور یہ ایسے ہیں نگاہ اٹھا کر بھی اسے دیکھنا گوارا نہیں کرتے“
 بلال لہک لہک کر تقی کی شان اور شرافت کے قصیدے پڑھ رہا تھا، جبکہ تقی بس سر نیچے کیے ان دونوں کی حرکتوں پر ہنستے ہوئے تاسف سے گردن ہلا رہا تھا۔ نمیر اور بلال دنوں کی مزاق مستیاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں اور تقی جو پڑھنے بیٹھا تھا ایک لفظ نہیں پڑھ پارہا تھا۔

”میں یہاں پڑھنے کے لیے اور تم دونوں خبیثوں کو پڑھانے کے لیے بیٹھا تھا، پر تم دونوں کی حرکتیں دیکھ کر لگتا ہے پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں میں ہاسٹل جا رہا ہوں“
 تقی فوارا اٹھ کر متوازن لہجے میں کہتا ہوا اب اپنی کتابیں سمیٹ رہا تھا۔ اور تقی کے یوں اٹھ جانے پر بلال اور نمیر سے زیادہ بے چین دور بیٹھی شیریں لگ رہی تھی۔

”ارے۔۔۔ تقی بھائی بات تو سنیں۔۔۔ ہمارا نہیں تو کچھ مس نمکین جی کا ہی خیال کیجیے“

نمیر نے چھلانگ لگا کر تقی کا کندھا تھاما اور شریر سے لہجے میں سرگوشی کی، ان دونوں پر کبھی کبھار یونہی تقی کو چھیڑنے کا دورہ پڑتا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میرے پاس نا کسی شیریں کے لیے وقت ہے اور نا کسی نمکین کے لیے، مجھے چھوڑو اور معاف رکھو اس سب سے“

تقی جلدی جلدی دونوں سے جان چھڑائے آگے بڑھا تھا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ بے اعتنائی سے چہرہ اوپر اٹھائے بے تابی سے دیکھتی شیریں کے پاس سے گزر گیا تھا۔

اُس کی خوبصورتی اس کی یہ تڑپ تقی کو ان سب سے کوئی سروکار نہیں تھا اور نا وہ اس طرف متوجہ ہونا چاہتا تھا۔ اپنے باپ سے اور ماں سے کیا وعدہ اور اپنے ساتھ رشتے میں بندھی مالا کو وہ یوں کسی بھی طرح کا دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا اور سب سے بڑھ کر وہ خود کو کسی کی بھی نظروں میں گرانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اچھے سے جانتا تھا اس کی منزل اس کا گاؤں ہے یہ شہر اس کی چکا چوند اسے اس سب میں اپنا آپ گم نہیں کرنا تھا۔ ان کے گاؤں کو ایک اچھے ہسپتال اور طبعی سہولیات کی اشد ضرورت تھی اور اسے وہاں ہسپتال بنا کر خواب کو حقیقت میں بدلنا تھا۔

حاکم قصر میں آج بہت دن بعد سمبر کی تیز دھوپ نکلی تھی، منڈیر پر کوئے دھوپ سیک رہے تھے تو صحن اور اٹاری میں آتی دھوپ میں حویلی کے مکین دھوپ سیک رہے تھے۔ صحن میں رونق جیسا سما تھا اتنے دنوں کی دھند اور سردی سے دبک کر انگلیٹھی جلا کر کمرؤں میں بیٹھنے والے حاکم قصر کے مکین آج دھوپ سے ہڈیوں کو سیک کر سکون لے رہے تھے۔ فرہاد، مالا، رملہ، تقی اور سکینہ ان سب نے صحن میں دھماچو کڑی مچا رکھی تھی، وہ صحن میں پٹھو گرم کھیل رہے تھے، جس کے لیے صحن کے وسط میں چند چھوٹے پتھروں کو ایک دوسرے کے اوپر نیچے رکھا ہوا تھا اور ایک نفس جس کے ہاتھ میں ربڑ کی گیند تھی اس نے ان پتھروں کا نشانہ باندھ کر گیند سے ضرب لگانی تھی۔ چھٹیوں کے باعث تقی بھی گاؤں آیا ہوا تھا اور اب وہ بھی ایک طرف کر سی ڈالے پڑھنے میں مگن تھا۔ وہ اب گاؤں آتا بھی تو سارا سارا دن پڑھائی میں مگن رہتا تھا جو کہ وہ اس وقت بھی کر رہا تھا۔

برانڈے میں آتی دھوپ میں تخت کو کھینچ لیا گیا تھا جس پر خدیجہ بیگم بیٹھی تھیں، اور تاری بوا گرم زیتون کے تیل سے ان کی ٹخنوں کی مالش کر رہی تھیں۔ بچوں نے کھیتے ہوئے پورا صحن سر پر اٹھا رکھا تھا، خدیجہ بیگم نے ان کے اچانک چنچیں مارنے پر گھور کر صحن میں دیکھا۔

”بس کرو۔۔ کیا حویلی سر پر اٹھا رکھی ہے کمبختوں نے یہ جو مالا چندال ہے یہ تو سدا کی بد تمیز ٹھہری پر اس لونٹھے فرہاد کو دیکھو بڈھا ہو گیا مو ا بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتا ہے“

خدیجہ بیگم منہ میں پان رکھے، صحن میں دھا چو کڑی مچائے بچوں پر چنچیں تھیں پر مجال ہے کوئی سن کے دے رہا ہو۔

مالا کے ہاتھ میں اب گیند تھی، اور وہ آنکھوں کو سکڑے اب اوپر نیچے پڑے پتھروں کا نشانہ باندھنے کے لیے منہ کے زاویے بدل رہی تھی۔ وہ اب بارہ سال کی ہو چکی تھی بال اب کمر کو چھونے لگے تھے جن کو اس نے ایک چٹیا میں باندھ رکھا تھا، وہ قد ایسے نکال رہی تھی کہ ابھی سے اپنے سے بڑی منہا جتنی لگنے لگی تھی۔

”بی جی ساگ کے ساتھ ساری روٹیاں مکئی کی بنانی ہیں یا پھر گندم کی بھی بنانی ہیں“

تاری بوانے ہاتھوں کو اوپر نیچے چلاتے، خدیجہ بیگم کی پنڈلیوں پر مالش کرتے، موؤ دبانہ سوال کیا۔ مالا کی نگاہ پتھروں کی اوٹ سے کرسی پر بیٹھے تقی پر پڑی تھی۔ سادہ سے سفید کرتا شلوار پر سیاہ رنگ کی جرسی پہنے وہ کچھ لکھنے میں مگن تھا۔

”تقی کہاں کھاتا ہے مکئی کی روٹی اس کے لیے گندم کی روٹی پکانا اور باقی تو سبھی کھا لیتے ہیں مکئی کی، مکھن کے ساتھ اچھی طرح چوپڑی بو سخت ناہوں وے ذرا بھی، پچھلی دفعہ چوہدری صاحب ناراض ہو رہے تھے“

خدیجہ بیگم نے ہاتھ اٹھا کر تاری بوا کو تنبیہ کیا جواب دوپہر کھانے کے لیے ساگ کے ساتھ روٹیوں کا پوچھ رہی تھی۔

تقی پر نظر پڑتے ہی، مالا کے ذہن میں کتنے ہی منظر گھوم گئے تھے، تقی کا تھپڑ، اس کا گھورنا، سکول میں زبردستی بھیجنا، ٹویشن اور سکول میں استانی جی کی مار، اسے تقی سے بدلہ لینے کا اس سے اچھا موقع زندگی میں نہیں مل سکتا تھا، وہ جب بھی حویلی آتا سب سے بات کرتا تھا مسوائے مالا کے اسے تو وہ نظر تک اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا، مالا کو اندر ہی اندر یہ بات بہت تکلیف دیتی تھی اگرچہ وہ اپنے اور تقی کے رشتے کے بارے میں ابھی تک نہیں جانتی تھی اس لیے اسے تقی کا یہ عجیب رویہ بہت غصہ دلاتا تھا اور اب وہ پتھروں کے بجائے تقی کے سر کا نشانہ باندھ رہی تھی۔

تاری بوا تیل کی بوتل سمیٹی تخت پر سے اٹھی تھی۔

”اور سن پہلے ملازموں کو روٹیاں اتار کے باہر برانڈوں میں بھیج دینا پھر گھر والوں کی بنانا“

خدیجہ بیگم نے زینے کی طرف جاتی تاری بوا کو پیچھے سے پکار کر اگلا حکم صادر کیا تھا۔ مالا نے زور سے بازو کو جھٹکا دیا تھا اور گیند اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا کو چیرتی ہوئی تقی تک پہنچی تھی اور پھر ٹھک کی آواز کے ساتھ سیدھے تقی کے ماتھے پر لگی تھی۔ مضبوط ربڑ کی گیند اور اتنی زور سے پھینکی گئی تھی کہ تقی ایک جھٹکا کھا گیا تھا۔

”ہائے۔۔۔۔۔ ستیاناش۔ سر پھوڑ ڈالا موئے کا“

خدیجہ بیگم جھٹکا کھا کر تخت پر سے اٹھی تھیں۔ گیند اب تقی کے پاس سے ٹھپا کھاتی ہوئی دور جا رہی تھی۔ سب نے ایک لخت مالا کی طرف دیکھا تھا جس نے چھت کے زینے کی طرف دوڑ لگا دی تھی اور باقی سب نے ماتھے پر ہاتھ رکھے تکلیف کو برداشت کرتے تقی کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

”ہاتھ ہٹا۔ ہاتھ ہٹا آنکھ ہی تو نہیں پھوڑ ڈالی کہیں؟ اس نگوڑ ماری نے، گھوڑی کی گھوڑی ہوگئی ہے عقل ابھی بھی گھٹنوں میں ہی ہے“

خدیجہ بیگم اب غصے میں مالا پر چیخ رہی تھیں۔ اور تقی جو سر کو اب دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا اس کے ہاتھ پکڑ کر نیچے کر رہی تھیں۔

”تقی بیٹا آنکھ بچ گئی ہے نا“

بلقیس نے پریشان ہو کر اس پر جھکتے ہوئے پوچھا، یہی حال پاس کھڑی غزالہ کا تھا وہ بھی پریشانی میں لب کچل رہی تھی۔ جبکہ اریب بیگم جواب کمرے سے نکلی تھی اب برانڈے میں ہی کھڑی اچک اچک کر سارا ماجرا دیکھ رہی تھی۔

”ارے بس کرو آپ سب بس سرپر لگی ہے چوٹ کچھ نہیں ہوا مجھے آپ سب نے کیا شور مچا دیا“
تقی نے سرپر سے ہاتھ اٹھایا، اور بیزاری سے اپنے ارد گرد جھکے ہوئے نفوس کو دیکھا۔ تقی کے ماتھے پر اب پہاڑ نما ابھار بنا ہوا تھا۔

”ہائے۔۔۔ رہا سرپر کون سا کم لگی ہے، گاڑ بن گیا اتنا بڑا سا، تاری بوا چھوڑ سارے کام سیک دینا تقی کے سر کو گرم کر کے لا کوئی پتھر اور تولیے میں لپیٹو اسے“
خدیجہ بیگم نے پاس کھڑی تاری بوا کو عجلت میں حکم صادر کیا، جو سرزور سے ہلاتی باورچی خانے کی طرف بھاگی تھی۔

”غزالہ۔۔۔ کہاں گئی وہ منحوس ماری مالا، عقل دے اسے جا کر کچھ، کب سے کہہ رہی ہوں سب کو بس کرو۔۔۔ بس کرو۔۔۔“

خدیجہ بیگم نے گھور کر پریشان حال کھڑی غزالہ سے کہا، غزالہ جو دوپٹے کے پلو کو ہاتھوں میں گھماتی تقی کے سرپر بنے ابھار کو دیکھ رہی تھی، خدیجہ بیگم کے حکم پر گڑبڑا کر چھت کی طرف بڑھی۔
چھت پر چڑھتے ہی ارد گرد نگاہ دوڑائی تو وہ اپنے مخصوص انداز میں برساتی پر بیٹھی نیچے ٹانگیں لٹکائے ہلا رہی تھی، ہاتھ میں سوکھی کھجوریں پکڑی تھیں جن کو چھت پر چارپائی پر ڈالا ہوا تھا۔

”مالا۔۔۔ مالا۔۔۔ اتنی دفعہ کہا ہے عقل سے کھیلا کر اب لگ گئی نا تقی کے سرپر گیند“

غزالہ نے ڈپٹے ہوئے غصے سے گھورا اور ہاتھ کے اشارے سے نیچے آنے کے لیے کہا۔
 ”کھیل تو بہت دھیان سے رہی تھی بس لگ لگائی تو لگ گئی ان کو کس نے کہا تھا صحن کے بچوں کی کرسی ڈال کر بیٹھ جائیں“

مالا نے کندھے اچکائے، اور مزے سے ٹانگیں ہلاتے ہوئے کھجور کو منہ میں ڈالا
 ”تیرا کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا، قد دیکھ اپنا گھوڑی ہو گئی ہے اب نا کھیلنا کر خاص طور پر جب تھی آیا
 ہوا ہو تو بالکل نا کیا کر ایسی حرکتیں“

غزالہ نے چیختے ہوئے سمجھایا اور پھر افسوس سے سر ہلاتی نیچے کی طرف بڑھ گئی اب کھل کر اسے کچھ بتا بھی
 نہیں سکتی تھیں۔ جبکہ وہ بڑے آرام سے مسکراتے ہوئے کھجور کھانے میں مصروف تھی۔ تھی کو سر پر گیند مار کر
 آج اسے سکون مل گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی جیسے سالوں پرانا حساب چکنا کیا ہوا۔

یہ سکول میں آٹھویں جماعت کا کمرہ تھا جہاں جماعت کی تمام لڑکیاں اپنے ڈسکیوں کو خالی چھوڑ کر اب کمرے کی
 کھڑکیوں کی جالی کے ساتھ ناک منہ چپکائے باہر کا منظر دیکھ رہی تھیں جہاں مس نیلم ان کی جماعت کی ایک لڑکی
 کے منہ پر زور زور سے طمانچہ مار رہی تھیں، اور لڑکی زار و قطار رو رہی تھی اور بار بار ہاتھ جوڑ کر مس نیلم اور پاس
 کھڑی ہیڈ مسٹریس سے معافی مانگ رہی تھی۔

یہ سارا منظر دیکھ کر کھڑکی سے باہر دیکھتی مالا کی بڑی آنکھوں اور لمبی پلکوں کی جھال کے اوپر دراز بھنویں سکڑ
 گئی تھیں وہ اب ساڑھے چودہ سال کی ہو چکی تھی، ایک دفعہ چو تھی اور ایک دفعہ چھٹی جماعت میں فیل ہو جانے
 کی وجہ سے وہ اب دسویں کے بجائے آٹھویں جماعت میں پہنچی تھی اور عمر کا ہر گزرتا سال اس کے جو بن کو خوب
 نکھار سنوار کر بیٹا تھا۔ وہ لمبے قد، لمبے بالوں، بڑی آنکھوں، گھنی پلکوں، گدازوں گالوں، چند رنگ روپ، اور

دلکش سراپے میں تبدیل ہو چکی تھی ان سب خوبیوں میں سب سے منفرد اس کی ہلکے نیلے اور گرے رنگ کے ملاپ والی آنکھیں تھیں جو بقول نواش حاکم ان کی والدہ عصمت آرا پر گئی تھیں مرحومہ خاندان کی خوبصورت ترین ہلکے نیلے رنگ کی آنکھوں والی خاتون تھیں۔

”آئے ہائے کس بے دردی سے مار رہی ہیں مس نیلم اسے، کیا کر دیا اس بچاری نے ایسا بھی؟“
مالا نے جھری جھری لے کر ساتھ کھڑی ثریا سے پوچھا، اس کی آنکھوں میں سامنے کھڑی مار کھاتی اپنی ہم جماعت کے لیے بہت ہمدردی تھی۔

”دیوار ٹاپ (پھلانگ) کر جا رہی تھی مالی بابا نے دیکھ لیا اس کو اور پکڑ کر لے آیا مس نیلم کے پاس“
ثریا کے بجائے پاس کھڑی تبسم نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور پھر ثریا اور تبسم منہ پر ہاتھ رکھے کھسیانی سی ہسنی ہسنے لگیں، مالا نے نا سمجھی سے ان کی طرف دیکھا
”بچاری کو مار پڑ رہی ہے تم دونوں ہنسی جاؤ بد تمیز، مجھے تو ترس آرہا ہے دیکھو تو مس نیلم کا موٹا سا ہاتھ اور اس کے گال“

مالا نے تاسف سے سر کو دائیں بائیں مارتے ہوئے افسوس کیا
”ترس کھانے کی کیا ضرورت ہے بھئی، یہ کونسا اچھے کام کے لیے جا رہی تھی، اپنے اُس سے ملنے کو جا رہی تھی“
تبسم نے نخوت سے ناک چڑھا کر جواب دیا،
”اُس کون۔۔۔؟ کس کو ملنے جا رہی تھی“

مالا کو ان کی باتیں سمجھ میں ہی نہیں آرہی تھیں، قد کاٹھ، رنگ روپ، چاہے بدل گیا تھا پر عقل کے گھوڑے ابھی تک وہ صرف وہیں تک دوڑاتی تھی جہاں تک ضرورت ہوتی تھی، بچوں کے ساتھ کھیل کود کرنا، درختوں پر چڑھنا،

سکینہ کے ساتھ باغ میں جانا پھلوں کو توڑنا، بیٹھے کی مختلف کھانے بنانا کر کھانا بس یہی اس کی زندگی تھی اور یہیں تک وہ سوچتی تھی۔

اور اس لیے اب اپنے ساتھ بیٹھی اپنی سہیلیوں کی یہ معنی خیز بات اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔
”معصوم تو ایسے بن رہی ہے۔۔۔ جیسے کچھ پتا نہیں کس کی بات کر رہے ہم، لڑکے سے ملنے جا رہی تھی یہ لڑکی“
ثریا نے خفگی سے مالا کو گھور کر پوری بات بتائی جس پر تبسم تو اب افسوس سے سر ہلارہا تھی جبکہ مالا ابھی بھی پوری بات کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

”لڑکے کو کیوں ملنے جا رہی تھی“

مالا نے معصومیت سے اگلا سوال داغ دیا، تبسم اور شازیہ نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا
”مالا تیرا نکاح ہوا ہے اور تجھے یہ نہیں پتا کہ لڑکے کو کیوں ملنے جاتی ہے لڑکی اور یہ غلط بات ہوتی ہے“
تبسم نے حیرت سے مالا کو دیکھ کر سوال کیا، اب کتابوں کو امتحانوں کے دنوں میں کچھ دن پڑھنے اور فیل ہو کر پاس ہونے والی مالا کو کیا پتا ان سب باتوں کا۔

”میرا۔۔۔ نکاح۔۔۔ نہیں تو وہ تو میری فرزانہ آپا کی شادی ہوئی ہے بس، منہا آپا کی منگنی ہوئی ہے ابھی صرف“
مالا نے پیشانی پر بل ڈالے انہیں بتایا، منہا کی فرہاد سے منگنی ہو چکی تھی اریب پھپھو کو فرہاد کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے تھے گو کہ منہا بھی اپنی منگنی سے بالکل ناخوش تھی اس لیے مالا نے کبھی اس کو اور فرہاد کو بھی ایک ساتھ نہیں دیکھا تھا غرض کے وہ اپنی دنیا میں مست ملنگ تھی اور گھر والے تو ویسے بھی اس طرح کی باتوں کو اس کے سامنے کرنے سے اجتناب ہی برتتے تھے۔

”تو ڈارمے کس کے ساتھ کر رہی ہے مالا، تقی بھائی تیرے تایا کا بیٹا اس سے تیرا نکاح ہوا ہے بچپن میں کیا تجھے نہیں پتا اس بات کا“

اب کی بار ثریا بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ لوگ بھی نئی نئی لڑکپن سے جوانی کے سفر پر تھیں اس لیے آج پہلی دفعہ اس طرح کی گفتگو کا دور دورہ چل نکلا تھا۔

”کیا۔۔ کیا۔۔ پاگل ہو تم دونوں میرا نکاح تقی سے“

مالا نے حیرت سے منہ کھول کر پوچھا اور سینے پر ہاتھ رکھے تعجب سے پوچھا

”مالا تجھے واقعی نہیں پتا کیا اس بات کا یہ تو پورے گاؤں کو پتا ہے میں نے اپنی اماں کے منہ سے سنا تھا ایک بار حیرت ہو رہی ہے یہ جان کر کہ تجھے پتا ہی نہیں ہم تو سمجھ رہے تھے تجھے پتا ہو گا“

تبسم نے واقعی حیرت سے مالا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا جو یہ ساری بابت سن کر اب دم بخود بیٹھی تھی۔

ذہن میں کتنی ہی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ اسے تقی کو بھائی کہنے سے سب کا منع کرنا، تقی کا اسے نادیکھنا، اس کی اماں کی معنی خیز باتیں ذہن میں ٹھاٹھا کتنے ہی بمب پھوٹ گئے تھے پر ذہن اب بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ تقی سے اس کا نکاح ہو چکا ہے اور وہ اس کا دلہا ہے جیسے فرزانہ آپا کا حسن، شمو کا اللہ دتا، اور منہا آپا کا فرہاد وہ تو ساکن بیٹھی تھی۔

”ہاں تو مجھے بھی پتا ہے، میری پھوپھی جو تم لوگوں کی حویلی کے پاس رہتی ہے اس نے بھی ایک دفعہ بتایا تھا کہ

چوہدریوں کے بڑے پوتے کا نکاح مالا سے کیا ہوا ہے بچپن میں ہوا تھا جب تو چھوٹی تھی“

ثریا بھی اب اسے اپنی معلومات سے آگاہ کر رہی تھی اور ایک وہ تھی جسے پتا ہی نہیں تھا، اور آج پتا چل رہا تھا وہ نکاح شدہ ہے اور منکوحہ بھی کس کی ہے جسے وہ پورے گھر میں سب سے زیادہ ناپسند کرتی ہے۔

چھٹی کی پہلی ہی گھنٹی بجی تھی اور وہ اپنا بستہ اٹھا کر آج ان دونوں کو چھوڑ کر جماعت سے باہر بھاگی تھی۔

”مالا۔۔ مالا۔۔ اسے کیا ہو گیا“

تبسم نے حیرت سے شازیہ کی طرف دیکھا جو کندھے اچکا گئی

حویلی کے پھاٹک کے بعد روش عبور کرتے ہی وہ دوپٹے سے کیے نقاب کوناک پر سے اتار کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ چھوٹی رملہ اور ارجمہ اس کے پیچھے آرہی تھیں جن سے وہ مکمل طور پر بے خبر تھی۔ کمرے میں غزالہ نہیں تھی باہر آئی اور پھر اٹاری کے ستون کے پاس کھڑی ہو کر ارد گرد دیکھا۔

”اماں۔۔اماں۔۔۔۔۔“

چینتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھ کر غزالہ کو بلارہی تھی اور پھر غصے سے پیر پٹختی صحن میں داخل ہی ہوئی تھی کہ غزالہ اس کے یوں پکارنے پر حواس باختہ سی باورچی خانے سے باہر نکلی تھی۔

”کیا ہوا۔۔؟ پاگلوں کی طرح کیوں چلا رہی ہے؟ کیا بھونچال آگیا ہے؟“

غزالہ نے حیرت سے پیشانی پر بل ڈالے اپنے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھا، جبکہ وہ تیر کی طرح غزالہ تک پہنچ کر اب اس کا بازو دبوچ چکی تھی۔

”مالا۔۔مالا۔۔ کیا ہوا بازو چھوڑ میرا۔۔۔“

غزالہ نے اسے بازو دبوچے کمرے میں لے جاتے دیکھ کر حیرت سے اپنا بازو اس کی مضبوط گرفت سے چھڑوانے کی کوشش کی جبکہ وہ اپنی ماں سے بھی لمبی غزالہ کو غصے سے کمرے میں لے جا رہی تھی۔ کمرے میں جاتے ہی مالا نے غزالہ کا بازو چھوڑ دیا تھا جلدی سے کمرے کا کواڑ بند کیا اور غزالہ کی طرف پلٹی

”مالا دیکھ۔۔ اگر اب پھر سکول میں کوئی نیا تماشہ کھڑا کر آئی ہے تو میں اس دفعہ سکول نہیں جاؤں گی“

غزالہ نے اپنے خدشات کے پیش نظر اسے اپنا فیصلہ پہلے ہی سنا دیا، جو سینے پر ہاتھ باندھے چھوٹی سی ناک کے نتھنے غصے سے پھلائے کھڑی تھی

”اماں تقی میرا کیا لگتا ہے؟“

مالا نے ماتھے پر بل ڈالے غصے سے سوال کیا، سوال اور انداز ہی ایسا تھا غزالہ کا ماتھا ٹھنکا

”اماں چپ کیوں ہے جواب دے تقی میرا کیا لگتا ہے؟، سب گھر کے بچے اسے تقی بھائی کہتے ہیں ایک میرے ہی

کہنے پر کیوں پابندی لگادی گئی تھی بتا“

مالا گھور کر اماں کی طرف دیکھ کر سوال کر رہی تھی

”نکاح ہوا ہے تیرا تقی سے“

غزالہ نے آہستگی سے جواب دیا۔

”اماں۔۔۔۔۔ تقی۔۔۔۔۔ مطلب اس اکڑو۔۔۔۔۔ کھڑوس سے“

مالا کا تو اوپر کا سانس اوپر ہی اٹک گیا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں

”تمیز سے بات کر مالا، اور تجھے یہ سب کس نے بتایا آج ہم سب گھر والے تو ذکر تک نہیں کرتے کبھی اس بات کا

تجھ سے“

غزالہ نے الٹا غصہ دکھا کر اس سے سوال پوچھ ڈالا

”پورا گاؤں جانتا ہے اماں اور ایک میں۔۔۔۔۔ اماں مجھے تقی جیسا دلہا نہیں چاہیے، دلہے ایسے ہوتے ہیں کیا“

مالا نے روہانسی آواز میں چیخ کر کہا

”بکو اس نا کر کیسی باتیں کر رہی ہے آج“

غزالہ نے اسے گھور کر ڈپٹا تھا

”اماں میں سہی کہہ رہی ہوں دلہے تو فرزانہ آپا کے دلہے حسن بھائی جیسے ہوتے ہیں یا پھر وہ شمو کا دلہا کتنا خیال کرتا اس کا، تقی جیسا کوئی دلہا ہوتا ہے کیا؟، وہ تو مارے گا ڈانٹے گا ہر وقت مجھے اب بھی اتنے غصے سے دیکھتا ہے مجھے جب بھی آتا ہے“

مالا نے پریشان سے لہجے میں اپنے دل کے وسوسے ظاہر کیے

”مالا بیٹیاں ایسی باتیں کرتی اچھی نہیں لگتیں، تو چھوٹی ہے مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا آج تو مجھ سے ایسی باتیں کر رہی ہے، میں نے تیری ایسی تربیت تو نہیں کی تھی، یہ ضرور اس شہائی لہ کی بیٹی تبسم کی کارنامے ہوں گے جاتی ہوں میں آج اس کی اماں کے پاس“

غزالہ نے خود ہی اس کی دوستوں کا اندازہ لگا کر دانت پیستے ہوئے دھمکی دی

”اماں خبردار اگر میری سہیلیوں کے گھر گئی تو، بس مجھے نہیں پتا مجھے دلہا بدلنا ہے“

مالا نے پاؤں زمین پر مارے معصومانہ ضد کی، غزالہ کا منہ کھل گیا تھا

”مالا۔۔۔ مالا چپ ہو جا عقل کی ماڑی (کم)۔۔۔ کوئی سن لے گا یہ باتیں تیری شرم کر کچھ“

غزالہ نے آواز کو آہستہ رکھتے ہوئے اسے گھور کر چپ رہنے کے لیے کہا، پر وہ تو آج گھرے صدمے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اچانک غزالہ کو اس کی صورت دیکھے ترس آگیا اب وقت آگیا تھا اسے سب سمجھانے کا ماشاء اللہ بڑی ہو گئی تھی غلطی یہ ہوئی کہ اسے یہ سب باہر سے پتا لگا۔

”ادھر بیٹھ۔۔۔ میرے پاس۔۔۔“

غزالہ نے کندھوں سے پکڑ کر اسے اپنے ساتھ پلنگ پر بیٹھایا تھا

”دیکھ بیٹا دلہا تو اللہ نے قسمت میں لکھا ہوتا ہے، جسے آپکے بڑے آپ کے لیے پسند کرتے ہیں، اور رہی تقی کی بات وہ تو بہت اچھا ہے، پورے گاؤں میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا، ڈاکٹر ہے وہ۔۔۔۔ بول ایسا دلہا ہے کسی کے پاس“

غزالہ نے محبت سے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا، وہ اب آنکھوں میں پانی لے آئی تھی اتنا تو جانتی تھی جس سے نکاح ہو جائے اس کے ساتھ ساری عمر گزارنی ہوتی ہے اور تقی وہ شریک حیات ہے یہ خیال ہی سوہان روح تھا اس کے لیے

”اس کے غصے کو کیوں دیکھتی ہے، اس کی عادتوں کو دیکھ کتنا اچھا ہے سب کا کتنا خیال کرتا، تجھ سے جب شادی ہو جائے گی تیرا بھی بہت خیال رکھے گا ابھی اچھا نہیں لگتا کہ وہ تجھ سے بات کرے سب کے سامنے اس لیے نہیں بلاتا تجھے“

غزالہ نے اس کے آنسو گال سے صاف کیے تھے

”اور شمو کامیاں اور فرزانہ آپا کا دلہا ان دونوں سے اچھا ہے تیرا دلہا، بابو ہے، ڈاکٹر ہے، سونا (پیارا) کتنا ہے“

غزالہ اسے ایسے پچکار رہی تھی جیسے تقی اس کا دلہانا ہوا عید کا سوٹ ہو گیا جسے پہننے سے وہ انکاری ہو اور ماں اس کی تعریفیں بگاڑ کر پہننے پر رضامند کر رہی ہو

”چل اب اٹھ۔۔۔ کپڑے بدل شباش۔۔۔ کھانا لگاتی ہوں، اور یہ بات ابھی اور کسی سے نا کرنا اچھا“

غزالہ نے اسے خبردار کیا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔۔۔ اور وہ یونہی دم سادھے بیٹھی رہی، لیکن، تبسم، ثریا اور غزالہ کی باتوں نے ساری رات ناسونے دیا اور صبح سویرے تک وہ جلتی آنکھیں لیے بس سوچتی ہی رہی۔۔۔

لیکن پھر سکول میں تبسم اور ثریا کی چھیڑ خانی نے اس کے دل میں عجیب سے جذبات پیدا کر دیے تھے۔ اور وہ جو کبھی ان باتوں کو سوچتی بھی نہیں تھی چوری چھپے منہا اور فرہاد کی نسبت کی تصاویر میں سے تلقی کی تصویر چوری سے نکال لائی تھی جو اب ہر رات اس کے تکیے کے نیچے ہوتی تھی۔

وہ تلقی کی تصویر کو گھنٹوں دیکھتی تھی۔ پہلے جن باتوں کی طرف اس نے کبھی توجہ تک نہیں دی تھی وہ اب ان باتوں پر غور کرنے لگی تھی ان سب تبدیلیوں میں اس کی سہیلیوں کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ اس سے اپنے قصے بیان کرتی تھیں اور اسے چھیڑنے لگی تھیں، اسے چوری چھپے محبت سے بھری کہانیاں لا کر دینے لگی تھیں نصاب کی کتابیں تو وہ پہلے ہی بہت کم پڑھتی تھی اب تو ان میں رسالے رکھ کر پڑھنے لگی تھی اور ایسا چسکا پڑا تھا کہ بس ہر کہانی میں وہ لڑکے کے کردار میں تلقی کو ہی دیکھنے لگی تھی۔

فرزانہ آپا کے شوہر حسن میاں کی فرزانہ آپا کے لیے والہانہ محبت، شمو کے شوہر اللہ دتے کا شمو کو دیکھنا، فرہاد کا منہا کو چوری چوری دیکھنا یہ سب سے اسے ایک الگ ہی دنیا کا باسی بنا رہا تھا۔
تلقی اچھا لگنے لگا تھا، محبت کے توالف سے بھی وہ واقف نہیں تھی پر اپنے ارد گرد موجود شادی شدہ جوڑوں کی خوبصورتی اسے اندر ہی اندر ایک میٹھی سی خوشی دینے لگی تھی۔

غزالہ کا نوازش کو کھانا دینا، کپڑے استری کر کے دینا، فرزانہ آپا کا حسن میاں کے لینے آنے پر گلال ہوئے پھرنا، فرہاد کا منہا کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھنا، وہ خود کو تلقی کے ساتھ ان سب لمحوں میں رکھ رکھ کر سوچنے لگی تھی اور اب گڑیا سے کھیلنے کے بجائے، اور سکینہ سے اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کے بجائے وہ تلقی کے متعلق باتیں کرنے لگی تھی۔

یہ گاؤں کی رہائی شہی آبادی سے کچھ دور لوگوں کا زمینی علاقہ تھا جہاں کھیت کھیلان اور باغ تھے، چوہدری حاکم کے کھیت اور باغ بھی یہیں موجود تھے جن کی تعداد یہاں موجود باقی لوگوں کی باغوں سے کہیں زیادہ تھی۔

حاکم قصر کے پچھلے صحن میں رکھی گئی بھینسوں، بکریوں کا چارہ روزانہ لڈن یہیں کھیتوں سے کاٹ کر لے جاتا تھا، اور اکثر مالا، سکینہ نقی اور رملہ بھی اُس کے ساتھ بیل گاڑی پر بیٹھ کر یہاں باغوں میں آجاتے تھے اور پھر تازہ پھل توڑ کر کھاتے، ٹویب ویل پر بچے نہاتے اور کچھ دیر رُک کر واپس حویلی چلے جاتے تھے۔

اور آج بھی وہ دوپہر کو لڈن کے ساتھ کھیتوں میں آئے تھے جہاں اب مالا اور سکینہ، نقی، رملہ اور ارحمہ کو ٹیوب ویل پر چھوڑ کر خود لڈن سے آنکھ بچائے کسی اور کے باغ میں آگئی تھیں، یہاں گھنے جھکتے درختوں سے بھرے باغ میں کچی مٹی کی پگڈنڈیاں چلنے کے لیے بنائی گئی تھیں اور جگہ جگہ پانی کے نالے بہہ رہے تھے جن میں گدلہ میٹھا پانی اپنے اندر درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے والے پتوں کو بہائے لیے جارہا تھا، یہ گاؤں کے ماسٹر صاحب کا باغ تھا جہاں وہ دونوں اب چوری چھپے داخل ہوئی تھیں۔

سکینہ نے ماتھے پر سے پسینہ صاف کیا اور ارد گرد چورسی نظروں سے دیکھا، باغ میں مکمل خاموش تھی بس کہیں کہیں چڑیوں کے چچانے کی آوازیں تھیں اور اوپر درخت کے پتوں کے سرکنے کی آوازیں تھیں۔

یہ آم کا درخت تھا جس کے نیچے سکینہ کھڑی تھی اور درخت کے اوپر پندرہ سالہ مالا چڑھی آم توڑ کر ہاتھ میں پکڑے کپڑے کے تھیلے میں ڈال رہی تھی۔

”مالا۔۔۔ مالا۔۔۔ بس کراتر جانچے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اس دفعہ پتا نہیں کیوں“

سکینہ نے چورسی نگاہیں ارد گرد پھر سے دوڑاتے ہوئے مالا کو نیچے اترنے کے لیے کہا جو بڑے مزے سے درخت کے موٹے تنے پر بیٹھی اچک اچک کر ایک کے بعد دوسرا آم توڑ رہی تھی اور پھر تھیلے میں ڈال رہی تھی، سکینہ کی چھٹی حس آج بار بار خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔

مالا نے اسے غصے سے جھاڑا تھا، یہ کچے آم تھے جن کا وہ مر با بنانا چاہتی تھی۔

سکینہ نے غصے سے اوپر دیکھتے ہوئے اس کی اس عادت سے اپنی چڑ کو ظاہر کیا، لیکن وہ اپنے کام میں مگن تھی۔

”تو نہیں سمجھ سکتی۔۔۔ مس سکینہ دوسری پاس۔۔۔ جو مزہ دوسروں کے باغوں میں سے پھل توڑ کر کھانے کا ہے وہ اور کہاں“

”ہاں اور ان کا مزہ میں سے کوئی آگیا نا جو ڈنڈے کھانے کا مزہ ہو گا نا اس کا مجھے بہت پتا ہے جلدی کر اب“

سکینہ نے اسے ان کے باغ میں رہائی شہ پزیر اور باغ کی دیکھ بھال کرنے والے باشندوں سے آگاہ کیا جن کے چھوٹے چھوٹے گھر یہیں باغوں میں بنے ہوتے ہیں۔

مالا نے اس کی بات پر نخوت سے ناک چڑھائے اسے گھورا اور پھر سے آم توڑنے لگی۔

اچانک قریب ہی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی، وہ جو کوئی بھی تھا آم کے سوکھے پتے اس کے پاؤں کے نیچے دب کر آواز پیدا کر رہے تھے، سکینہ کا سانس خشک ہوا اوپر دیکھا تو مالا بے خبر آم توڑے میں مگن تھی۔

”مالا۔۔۔۔۔ کوئی آگیا۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔!!!“

سکینہ نے حد درجہ آواز کو دھیمار کھتے ہوئے خوف زدہ آواز میں ابھی مالا کو آگاہی دی ہی تھی کہ چند قدم سے آنے والی بازگشت نے تو سکینہ کی روح ہی فنا کر دی۔

”کون ہے وہاں۔۔۔ کون ہے؟ کیا کر رہے ہو یہاں؟“

سکینہ نے زبان دانتوں میں دبائے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے ایک چالیس، انتالیس سالہ آدمی غصے سے آنکھیں سکوڑے ان کی طرف آ رہا تھا۔

”مالا اتر۔۔۔ بھاگ“

سکینہ نے چیخ کر درخت پر چڑھی مالا سے کہا اور خود ایک طرف کو دوڑ لگا دی، مالا نے گڑبڑا کر ایک ہی جست میں نیچے چھلانگ لگائی تو نیچے کچی مٹی کی پگڈنڈی پر پاؤں ایسا ڈگمگایا کہ کو وہ ایک طرف کو جھکی اور پاؤں کے مڑتے ہی اس کا اپنا سارا وزن پاؤں پر آگیا اور پھر پاؤں نیچے اور وہ خود اپنے پاؤں کے اوپر آموں کے تھیلے کے ساتھ ڈھیر تھی۔

”آہ۔۔۔ مرگئی۔۔۔ ی۔۔۔ ی۔۔۔ ی۔۔۔ ی۔۔۔“

تکلیف کے باعث ایک ہولناک چیخ ابھری تھی، سکینہ جو اندھا دھند بھاگی جا رہی تھی فوراً پلٹی تب تک مزارعہ بھی مالا تک پہنچ چکا تھا۔ جواب اپنے ہاتھ پر ڈنڈا مارتا ہوا مالا کے سر پر کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

مالا زار و قطار رونا شروع ہو چکی تھی۔ سکینہ نے واپس دوڑ لگائی اور پھر بڑی مشکل سے وہ دونوں معافی تلافی اقر منت سماجت کے بعد، آم واپس کر کے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئی تھیں، سکینہ بڑی مشکل سے مالا کو سہارا دے کر اپنی بیل گاڑی تک لائی تھی جہاں لڈن چارہ کاٹنے کے بعد انہی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

مالا بمشکل بیل گاڑی پر سوار ہوئی، ٹخنے کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور وہ لب بھینچے اسے برداشت کرنے میں لگی تھی۔

غزالہ نے تیزی سے تقی کے کمرے کا کواڑ کھولا اور پھر تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پلنگ تک آئی تھی، وہ جو کچھ دیر پہلے ہی حویلی پہنچا تھا ابھی غنودگی میں ہی گیا تھا، غزالہ کے یوں بدحواس سے انداز میں اندر آنے پر نیند سے بوجھل آنکھیں بمشکل کھولیں۔

”تقی۔۔۔ وہ مالا کو چوٹ آگئی ہے بہت رورہی ہے آکر دیکھنا ذرا“

غزالہ کی آواز اس کے دماغ کے سونے جاگتے پردوں سے ٹھک ٹھک ٹکرائی تھی، وہ پریشان حال تھی، دوپہر کا وقت تھا اوپر سے تپتی دوپہر کے تین بج رہے تھے، حویلی کے سب مکیں کمروں میں پنکھے چلائے لیٹے تھے۔ اٹاری میں سن پڑا تھا۔

تقی بہادر کی شادی کے سلسلے میں حویلی آیا تھا اس کی ڈاکٹری کی پڑھائی تو مکمل ہو چکی تھی لیکن اب وہ لاہور میں ہی ہاؤس جاب کے بعد ہی جاب کر رہا تھا۔ گھر میں کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ بہادر کی شادی پر آنے والا ہے کیونکہ اب کی بار اس کا چکر پورے ڈیڑھ سال بعد لگا تھا۔ بہادر اگرچہ ناصر ف ان کا ڈرائیور تھا بلکہ تقی کے ساتھ ایک دوستی کا بھی رشتہ تھا بس اس کی ناراضگی کے ڈر سے ہی اسے یوں اچانک آنا پڑا تھا۔ اور ابھی آکر کھانا کھانے کے بعد وہ لیٹا ہی تھا جب غزالہ یوں اس کے کمرے میں آگئی تھی۔

”کہاں ہے وہ“

تقی نے بھنویں چڑھائے تھکے سے لہجے میں پوچھا سفر کی تھکان نے چور رکھا تھا۔ وہ بکھرے بالوں اور تھکے سے چہرے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھا۔ غزالہ کی پریشانی بتا رہی تھی کہ مالا کو واقعی زیادہ چوٹ آئی ہے۔

”وہ کمرے میں ہے آکر دیکھنا بیٹا بہت تکلیف ہے اسے روئے جا رہی ہے“

غزالہ کے چہرے پر مالا کی تکلیف کے آثار واضح تھے، تقی فوراً اٹھ کھڑا ہوا، پلنگ کے سرہانے پر لٹکتا گرتا ہاتھ سے کھینچ کر اتارا۔

”چلیں۔۔۔ چوٹ آئی کیسے ہے اسے؟“

غزالہ کی پریشانی کے پیش نظر جلدی جلدی کرتا پہنتے ہوئے متوازن لہجے میں سوال کیا اور گرتے کے بازو اندر کو موڑتے ہوئے غزالہ کی طرف سوالیہ دیکھا

”وہ۔۔۔ کھیت گئی تھی، سکینہ کے ساتھ وہیں کہیں گری ہے“

غزالہ نے بیچارگی سے عجلت میں جواب دیا، مالا کی حرکتوں سے وہ ویسے بھی پریشان رہتی تھیں اور آج تو اس کے رونے سے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

”اچھا چلیں پریشان ناہوں میں دیکھتا ہوں کیا ہوا“

تقی نے غزالہ کے چہرے کی پریشانی کو بھانپ کر تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا اور کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور خود غزالہ کے پیچھے چل دیا۔

وہ جب بھی حویلی آتا تھا چند روز کے لیے آتا تھا اور پھر ان چند روز میں بھی وہ کبھی مالا سے آمناسا منا ہونے پر بھی اسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا، دوسروں سے زیادہ وہ خود اس بات کو معیوب سمجھتا تھا بے شک وہ اس کے نکاح میں تھی لیکن اس کی عمر اور اس رشتے کا پاس تقی جیسے لڑکے کو خوب رکھنا آتا تھا۔ اور اب اتنے سالوں کے بعد یوں باقاعدہ اس کے سامنے جا رہا تھا جس کی وجہ فقط مالا کی چوٹ تھی۔

پلنگ کے سرہانے سے ٹیک لگائے، ٹخنے پر ہاتھ دھرے تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے وہ لب بھینچے ہوئے تھی، پر تکلیف ایسی تھی کہ اتنی برداشت کے باوجود اسکی آنکھوں میں پانی کی تہہ چمکنے لگی تھی۔

ہلکے سے زرد رنگ کے جوڑے میں تکلیف سے چہرہ بھی زرد ہو رہا تھا۔ بالوں میں گالوں پر جگہ جگہ گیلی مٹی ابھی تک لگی تھی جو اس وقت نیچے گرنے پر لگی تھی۔

ٹھک کی آواز سے کمرے کا دروازہ کھلا، مالانے یوں ہی تکلیف سے لب بھینچے نگاہ اٹھائی تو دل دھک سے رہ گیا، ہاتھ ٹخنے پر رہ گیا اور آنکھیں بنا جھپکے پوری کھلی کی کھلی رہ گئی، وہ تصویر سے نکل کر سامنے کھڑا تھا۔
تقی نے ایک نگاہ اس پر ڈالی، دماغ نے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا، یہ تو کوئی اور ہی لڑکی پلنگ پر ٹخنہ تھامے بیٹھی تھی۔

جب وہ کمرے سے نکل کر اس طرف آ رہا تھا پتا نہیں کیوں تین، چار سال پہلے والا اس کا سر پا دماغ میں تصویر بن رہا تھا جب گیند سر میں لگنے پر اس نے اسے بھاگتے ہوئے غور سے اسے دیکھا تھا، پر آج جو سامنے بیٹھی تھی وہ تو کوئی اور ہی تھی۔ بالوں کی لمبی چوٹی جس میں سے جگہ جگہ بال باہر نکلے ہوئے تھے کافی موٹی تھی۔

مالا کی نگاہوں سے ایک دن تصادم ہوا تو تقی نے فوراً نگاہوں کا زاویہ بدلہ اور سنجیدگی سے آگے بڑھا، پر وہ تو مورت بنے بیٹھی اپنی طرف بڑھتے تقی کو دیکھ رہی تھی۔ کتنے مشورے تبسم اور ثریانے اسے دیے تھے اور کتنا کچھ اس نے سوچا ہوا تھا کہ اب کی بار تقی آئے گا تو یہ والا جوڑا پہنوں گی درمیان سے مانگ نکالوں گی پر یہاں تو وہ سر جھاڑ منہ پھاڑ بیٹھی تھی۔

”کس پاؤں میں درد ہے“

تقی نے اس کے ہونق بنے چہرے سے بے نیازی برتتے ہوئے سنجیدگی سے اسے پاؤں کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر سوال کیا، وہ تقی کی آواز پر طلسم سے باہر آئی۔ دل اتنی زور سے دھک دھک کرنے لگا تھا کہ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

ایسا سب تو بس پڑھ رکھا تھا اس نے قصے کہانیوں میں پر محسوسات آج مل رہی تھیں۔ پتا نہیں کیسا عجیب سا احساس تھا کہ وہ اس کے یوں سامنے بیٹھنے پر سمٹ گئی تھی۔ تقی نے اس کے جواب کا انتظار کیا لیکن جواب نداد پھر خود ہی ٹخنے پر دھرے اس کے ہاتھ سے انداز لگایا اور پھر اس کے پاؤں کو تھام کر اپنی طرف سرکایا۔

وہ جو دم سادھے سامنے بیٹھے اپنے اس ساحر کے طلسم میں جکڑی ہوئی تھی اس کے یوں اچانک پاؤں پکڑ کے کھینچنے پر تکلیف سے بلبلا اٹھی اور پھر متواتر اس کے ہر دباؤ پر چیخیں مار رہی تھی۔

سامنے بیٹھے تقی نے ناتوا سے مخمور نگاہوں سے دیکھا تھا اور ناتوا کہانیوں کے ہیرو کی طرح مسکرایا تھا وہ تو سپاٹ چہرہ لیے اس کے ٹخنے کو دبا کر اسے تکلیف دے رہا تھا جس پر وہ بھی خواب سے نکل کر اب حقیقت میں واپس آچکی تھی اور چیخوں کے ساتھ ساتھ بھل بھل آنسو بہنے لگے تھے تقی نے ایک دو دفعہ پاؤں کو موڑ کر اٹھا کر دیکھا اور جتنی دفعہ اس نے یہ عمل دہرایا مالا کی فلک شگاف چیخ ابھری تھی۔

تقی کے کانوں کے پردوں نے بمشکل اس کی اس طوفانی چیخوں کو برداشت کیا تھا، وہ تو صرف قد کاٹھ میں بڑی ہوئی تھی انداز تو سارے وہی تھے پاگلوں والے۔

”چیچی برف ملے گی تھوڑی سی“

تقی نے تھوڑا رخ موڑے پاس کھڑی غزالہ سے پوچھا، غزالہ جلدی سے سر ہلاتی باہر نکل گئی، مالا ابھی بھی ہلکی ہلکی چیخیں مارتے ہوئے رو رہی تھی۔

”کہاں سے گری تھی؟ مطلب کتنی اونچائی سے“

اچانک تقی نے اس سے سوال کیا تو اس کی رونے کو ایسے بریک لگی جیسے مصنوعی رور ہی تھی، وہ اس سے سوال کر رہا تھا، کان تو جیسے دل بن کر دھڑکے تھے۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں کتنی اونچائی سے گری تھی؟“

تقی نے اس کے جواب نادینے پر پھر سے سوال کیا، اب کی بار وہ گڑبڑاگئی۔

”۔۔۔ درخت سے۔۔۔“

”درخت سے گرمی ہو تم۔۔۔؟ وہاں کیا کر رہی تھی؟“

”وہ۔ وہاں۔۔۔۔۔ آم۔۔۔ آم توڑ رہی تھی“

تقی کے یوں گھورنے پر وہ بس گالوں پر پلکیں لرزا رہی تھی، دروازہ ہلکا سا دیوار پر لگا اور غزالہ ایک سٹیل کے پیالے میں برف لے کر اندر داخل ہوئی۔

”تقی ہوا کیا ہے؟“

غزالہ نے برف کا پیالہ ترقی کی طرف بڑھاتے ہوئے پریشانی سوال کیا

”چچی پریشان ہونے کی بات نہیں ہے معمولی سی موج آئی ہے ٹخنہ سوج گیا ہے یہ دیکھ لیں جیسے اب میں برف کی

مساج کر رہا ہوں ایسے آپ کو کرنی ہے دن میں تین چار بار“

تقی نے مالا کے ٹخنے پر برف آہستگی سے رکھ کر مساج شروع کی تو وہ پھر سے چیخ اٹھی تقی نے جھنجلا کر اسے غصے سے گھورا۔

”مالا۔۔۔ صبر کرو“

غزالہ نے پریشان ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دلاسا دیا، جبکہ وہ تو اب خفگی سے تفری کی طرف دیکھ رہی تھی جو متواتر اس کے پاؤں کو پیچھے کھینچنے کو ناکام بنائے برف کی مساج کر رہا تھا۔

”اماں بہت زور سے دبار ہے ہیں“

مالا نے تکلیف دہ آواز میں غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے شکوہ کیا جس پر تقی کے ماتھے پر اور بل پڑ گئے۔ وہ رونا سے کس قدر مختلف تھی رونا بہت شائستگی سے بات کرنے والی اور خاموش طبع سمجھدار لڑکی تھی اور اس کے سامنے بیٹھی یہ لڑکی تو بالکل بچی تھی۔ تقی نے اس کا پاؤں آہستگی سے پلنگ پر رکھا، پاس پڑے دوپٹے سے گیلے ہاتھ صاف کیے اور اٹھ کر کھڑا ہوا گیا۔

”چچی پانی لادیں اسے اور آئی یں آپ کو ایک دوا دیتا ہوں اسے کھلا دیجیے گا تکلیف کم ہو جائے گی“

تقی نے سنجیدگی سے غزالہ سے کہا اور پھر بنامالا کی طرف دیکھے کمرے سے باہر نکل گیا، اور وہ اب روتے ہوئے اس کے رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی ایسا تو کوئی ہیر و نہیں کرتا کسی کہانی میں اپنی ہیر وئی ان کے ساتھ جیسے تقی نے کیا تھا۔

بلقیس منہا کے کمرے میں داخل ہوئی تو اندھیرے میں ڈوبے کمرے میں سسکیوں کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔ مغرب کا وقت تھا جس کے باعث کمرہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ کواڑ کھلنے کی وجہ سے اٹاری میں جلتے بلب کی روشنی کواڑ سے اندر داخل ہو کر فرش پر بلقیس کا سایہ بنا گئی تھی۔

منہا نے آج دوسرے دن بھی رات کا کھانا نہیں کھایا تھا، حاکم قصر میں عصر کے بعد اندھیرا ہونے سے پہلے ہی رات کا کھانا کھالیا جاتا تھا۔ مالا دو دفعہ منہا کو اٹھانے آئی تھی پر وہ باہر سب کے ساتھ دسترخوان پر آج بھی نہیں آئی تھی۔

بلقیس نے ہاتھ بڑھا کر کمرے کی دیوار پر لگے سوئی چ بورڈ پر سے بتی کا بٹن دبایا تو کمرہ ایک دم سے بلب کی پہلی روشنی میں نہا گیا۔ اور پلنگ پر سمٹ کے لیٹی منہا نے ٹانگیں کچھ اور اندر کو سمیٹ لی تھیں۔ وہ بازو سے چہرے کو ڈھکے رو رہی تھی۔

تقی اب لاہور ہسپتال کی جاب چھوڑ کر جاب یہیں دنیا پور کے ہسپتال میں کرنا چاہتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ گاؤں میں ہسپتال کی تعمیر شروع کرنا چاہتا تھا۔

چوہدری حاکم نے حکم جاری کر دیا تھا کہ چار ماہ بعد مالا کی رخصتی اور ساتھ ہی منہا اور فرہاد کی شادی ہوگی۔ پر تقی نے فوراً خط لکھ بھیجا کہ مالا ابھی سولہ کی ہوگی وہ بہت چھوٹی ہے وہ دو سال بعد رخصتی کرے گا، کوئی اس کی اور مالا کی رخصتی کے بارے میں ابھی بالکل نہیں سوچے گا، تقی کی بات بھی جائز تھی اس لیے چوہدری حاکم خاموشی اختیار کر گئے لیکن فرہاد اور منہا کی شادی ملتوی نہیں کی گئی تھی، بس یہ خبر تھی کہ منہا نے دو دن سے رو رو کر اپنا برا حال کر رکھا تھا۔ فرہاد سے رشتے پر وہ پہلے ہی ناخوش تھی اوپر سے شادی بھی اتنی جلدی رکھ دی گئی تھی۔

وہ تو سوچے ہوئی تھے کہ پہلے تقی کی شادی ہوگی بعد میں کہیں جا کر اس کی شادی ہوگی لیکن یہاں تو تقی کی شادی سے پہلے اس کی شادی کی تیاریوں نے عروج پکڑ لیا تھا۔ بلقیس آہستگی سے چلتی ہوئی پلنگ کے پاس آئیں اور منہا کے قریب ٹانگیں نیچے لٹکائے بیٹھ گئی ہیں۔

”منہا دیکھ تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں یہ سب ٹسوے، یہ بہانے بند کر دے بیٹا، بیٹیاں یہ سب کرتی اچھی نہیں لگتی ہیں“

بلقیس نے اپنے ہاتھ منہا کے آگے کرتے ہوئے التجائی لہجہ اپنایا تھا۔ جس پر منہا نے بیزار سی صورت بنائے آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا، آنکھوں کے پپوٹے سوزش زدہ تھے اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔

”اماں۔۔۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے“

منہا کی کل سے بس یہی رٹ تھی، اور ویسے بھی وہ شروع سے ہی اس رشتے کے خلاف منمناتی رہی پر یہاں چوہدری حاکم کے کیے فیصلے کے آگے جہاں تقی کی اپنے نکاح کے وقت لڑکا ہو کر نہیں چلی تھی وہاں منہا کی کیا چلنی تھی منہا کا بس تو بلقیس پر ہی چلتا تھا۔

”کل ہو یا آج شادی تو ہونی ہی ہے، فرہاد بہت اچھا محبت کرنے والا لڑکا ہے، خوش رکھے گا تجھے، دس پڑھا ہے اپنے باپ کے ساتھ بیوپار کرتا ہے“

بلقیس اسے سمجھا رہی تھی جو تین ماہ کے بعد بھی اس رشتے کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھی اور آج یوں اس کے رونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی شادی تقی کی شادی سے پہلے ہی کیوں کرنے لگے ہیں جب اس نے اپنی شادی دو سال بعد کرنے کا حکم دے دیا تھا تو اس کی کیوں کرنے جارہے تھے جبکہ فرہاد، تقی سے چھوٹا تھا۔

ہر کوئی بس یہ دیکھ رہا تھا کہ فرہاد اس سے کتنی محبت کرتا ہے کہ اس نے اریب کی مخالفت مول لے کر اس سے رشتہ کروایا تھا۔ لیکن اس کے بارے میں کوئی ایک فرد بھی نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے اس نے تو فرہاد کے بارے میں کبھی ایسا سوچنا گوارا تک نہیں کیا تھا اس کی مرضی کے بنا زبردستی رشتہ اور اب شادی بھی رکھ دی گئی تھی، اریب پھپھو کا رویہ اس کے ساتھ اب اور سخت ہو گیا تھا وہ اپنے سارے کام اس سے کہنے لگی تھیں جیسے اس کو فرہاد سے نسبت کے بعد سے ہی خرید لیا ہو۔

وہ پھر سے اوندھے منہ بازو کو سر پر تانے سسکیاں بھرنے لگی تھی اور بلقیس کچھ دیر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہنے کے بعد اٹھ آئی تھیں، منہا کا یوں رونادھونا کسی کے لیے غیر معمولی نہیں تھا بہت سی لڑکیاں اپنی شادی سے پہلے یوں روتی دھوتی رہتی تھیں۔ اس لیے بلقیس بھی اسے کچھ دیر چپ کروانے کے بعد وہاں سے اٹھ آئی تھیں۔

وہ ہاتھ میں ایک تحفہ پکڑے تیز تیز قدم اٹھاتا لان کی طرف بڑھ رہا تھا، جہاں شیریں نے اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر شرمانا شروع کر دیا تھا۔ شور و غل ہلکی سی موسیقی اور جدید طرز کے ملبوسات زیب تن کیے لوگ لان میں ٹولیاں بنائے کھڑے تھے۔

وہ آج بھی یہاں موجود تمام لوگوں میں سب سے منفرد تھا، وہی بارعب انداز وہی خوب روچہ اور وہی ساحرا نگیز شخصیت جس نے اسے کالج میں پانچ سال دیوانہ بنائے رکھا تھا۔ پتلون کی ایک جیب میں ہاتھ ڈالے اور دوسرے ہاتھ میں سرخ رنگ کے کاغذ میں لپیٹا تحفہ پکڑے وہ بڑے وثوق سے قدم اس طرف بڑھا رہا تھا۔ میڈیکل کالج لاہور میں یہ ایک بہت بڑی تقریب رکھی گئی تھی جس میں سابقہ طلبہ کو بھی مدعو کیا گیا تھا، ڈاکٹری کی ڈگری پانے کے بعد اب سب پاکستان کے مختلف ہسپتالوں میں ڈاکٹری کے عہدے کے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ اگرچہ تقی نے جان بوجھ کر ہاؤس جاب کے بعد بھی لاہور کے مشہور ہسپتال میں ملازمت بھی کی جہاں شیریں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا وہ اور بلال بھی وہیں اس کے ساتھ ڈاکٹری کے فرائض انجام دیتے رہے تھے، لیکن اب اسے گاؤں میں جا کر اپنے ہسپتال کی بنیاد رکھنی تھی اور ساتھ ہی اس کی تقرری دنیا پور کے سرکاری ہسپتال میں ہو چکی تھی۔

تقی اب بالکل شیریں کے سامنے کھڑا تھا، سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کیے اور ہر طرح کا ہار سنگہار کیے وہ آج بھی محفل کی جان لگ رہی تھی۔ اپنے گھر والوں کو وہ تقی کے لیے راضی کر چکی تھی بس اب تو تقی کی ہاں کی دیر تھی۔ اتنا لمبا عرصہ انتظار بہت تھا اور اسے یقین تھا تقی اسی کا ہے وہ مسرور سی کھڑی تھی۔

”شیریں۔۔۔ میں یہ تحفہ نہیں لے سکتا ہوں“

تقی نے پر سکون لہجے میں کہتے ہوئے سامنے کھڑی شیریں کی طرف تحفہ بڑھایا تھا۔ شیریں کے لبوں پر مزین مسکراہٹ پل بھر میں ہی غائب ہو چکی تھی۔

”پر۔۔۔ تقی میں نے یہ بہت دل سے لیا آپ کے لیے“

شیریں نے ملائی م سے لہجے میں محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا، جاب کے دوران وہ تقی کے ساتھ بہت آرام سے بات کرنے لگی تھی۔

”جی اسی لیے میں اسے بالکل نہیں رکھ سکتا میں آپ کے دل سے لیے اس تحفے کو رکھ کر آپ کے دل میں کسی بھی قسم کی کوئی امید نہیں جگانا چاہتا، آپ یہ رکھ لیجیے پلیز“

تقی نے پاس پڑی کرسی پر تحفہ دھر دیا تھا اور جانے کے لیے قدم بڑھائے، اگرچہ کے ہسپتال جاب میں شیریں سے اچھی بات چیت ہو جاتی تھی لیکن وہ ناتو کبھی اپنی بنائی گئی حدود سے باہر نکلتا تھا اور نا کبھی شیریں کے حوصلے بڑھائے تھے وہ تو خود ہی یہ تصور کیے بیٹھی تھی کہ تقی اس کے حسن سے دل کے قفل کھول ہی چکا ہو گا۔

”تقی۔۔۔ مجھ میں کمی کیا ہے آخر۔۔۔ میں نے دس سالوں سے اس لمحے کا انتظار کیا کیونکہ میں جانتی تھی تم عام لڑکوں جیسے نہیں ہو اس لیے سیدھا میرے گھر رشتہ بھیج دو گے“

شیریں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے تقی کے لیے کیا کچھ کیا تھا وہ جانتی تھی پچھلے تین سالوں سے وہ اپنے کتنے اچھے رشتے ٹھکرا چکی تھی صرف اس لیے کہ تقی کو واپس اپنے گاؤں جانا ہے وہ وہاں جائے گا تبھی اس کے لیے رشتہ بھیجوائے گا لیکن یہاں تو وہ آج بھی دس سال پیچھے کھڑی تھی۔ تقی نے گہری سانس لی تھی پھر پر سکون لہجے میں گویا ہوا

”دیکھیں شیریں۔۔۔ آپ اس بات کو بڑھا رہی ہیں، میں کبھی اپنی پرسنل لائف کسی سے نہیں شیئر کرتا لیکن آج آپ نے مجبور کر دیا ہے، اس لیے میں آپ کو صاف صاف بتا ہی دیتا ہوں میرا نکاح ہو چکا ہے، جب میں یہاں

پڑھنے آیا تھا اس سے بھی پہلے اور ہمارے ہاں ہم ایسے رشتوں کی پاس داری رکھنا خوب جانتے ہیں، امید کرتا ہوں اب آپ بھی اپنا پاگل پن چھوڑ کر سکون میں رہیں گی“

تقی اپنی بات کہہ کر وہاں رکا نہیں تھا اپنے مخصوص انداز میں وہاں سے جا چکا تھا، اور وہ جو دس سال تک تقی کے لیے خواب بنتی رہی تھی وہ یونہی تہی دست کھڑی تھی۔

ملا غسل خانے سے باہر بنے وضو خانے میں وضو کر رہی تھی، وضو کے بعد پانی کا ٹل بند کر کے وہ پلٹی تو احساس ہوا وہ آج ننگے پاؤں ہی وضو خانے میں آگئی تھی عجیب طرح سے الجھن ہوئی جلدی سے وضو خانے سے باہر نکلی ساتھ ساتھ دوپٹہ سر پر نماز کی صورت باندھ رہی تھی۔ وضو خانہ نیم کے درختوں کے پیچھے غسل خانوں سے باہر بنایا گیا تھا، وہ جیسے ہی وضو خانے سے باہر قدم نکالے درختوں تک پہنچی تو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

وہ قضا کر دی میں نے نماز دل میں اداسی سی بھری، مغرب کی نماز پڑھنی تھی اس کو اندھیرا دیکھتے ہی ذہن میں یہی خیال اٹھا تھا، درختوں کی اوٹ سے نکل کر صحن میں پہنچی تو منظر بدل گیا اور قدم تھم گئے۔

انتہائی دلکش منظر تھا، برقی قمقوں سے حویلی سچی ہوئی تھی اور حویلی کے صحن میں فوارے کے بالکل قریب کرسی رکھی گئی تھی اور وہاں کرسی پر سرخ رنگ کے جوڑے میں دلہن بیٹھی تھی۔

ملا کو وہ اتنی دور سے سہی سے نظر بھی نہیں آرہی تھی، منہا آپا کی شادی اور میں ابھی تک تیار بھی نہیں ہوئی۔۔۔

ملا الجھتی سے جیسے جیسے صحن کی طرف آرہی تھی لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اتنے لوگ جمع ہو چکے تھے دلہن کے ارد گرد، کہ اس کے پاس پہنچنے تک دلہن اس ہجوم میں غائب ہو چکی تھی۔

”ہٹو تو پیچھے۔۔ ہٹو بھئی مجھے دلہن دیکھنی ہے۔“

ملا ہجوم میں سے گزرتی آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی پر لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے جڑ کر کھڑے تھے۔ کہ وہ بمشکل آگے بڑھ رہی تھی دل میں یہ بھی احساس تھا کہ سب لوگ اتنے تیار ہیں زرق برق لباس پہنے ہوئے ہیں اور ایک وہ ہے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے، وہ ننگے پاؤں پرانے سے جوڑے میں تھی۔

اچھا منہا آپا کو ایک نظر دیکھ لوں وہ کیسی لگ رہی ہے پھر بدلتی ہوں جوڑا وہ ذہن میں سوچتی آگے بڑھ رہی تھی۔

ایک دم سے لوگوں کے ہجوم سے نکل کر جب وہ فوارے کے قریب پہنچی تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی وہاں کوئی دلہن کرسی پر نہیں بیٹھی تھی بلکہ وہاں تو کفن میں لپٹا جنازہ پڑا تھا اور لوگ اس کے گرد کھڑے رو رہے تھے جو زرق برق لباس میں ملبوس نہیں تھے بلکہ سفید جوڑے تھے۔ اللہ اکبر،،، اللہ اکبر،،، اللہ اکبر،،،

اللہ اکبر کی صدائیں گونج رہی تھیں لیکن لوگ تو بالکل خاموش کھڑے تھے۔

مالا اب گھوم گھوم کر پوری آنکھیں کھولتے ہوئے منظر کے یوں بدل جانے کو دیکھ رہی تھی حویلی میں قمتوں کی جگہ چراغ جلنے لگے تھے۔ جگہ جگہ چراغ پڑے تھے۔

مالا جلدی سے آگے بڑھی کیونکہ کفن میں لپٹا جو کوئی بھی تھا اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ مالانے پاس آکر سفید لٹھے کے کپڑے کو اس کے منہ پر سے اٹھایا تھا۔

کفن میں لپٹی رہنا تھی، سفید چہرہ۔۔۔۔ اور ناک سے بہتی ہلکی سی خون کی لکیر جو آہستہ آہستہ اس کے لبوں تک آ رہی تھی۔

مالا لڑکھڑا گئی تھی جلدی سے ڈر کر پیچھے ہوئی تو رونا کا ہاتھ جو اوپر تھا چارپائی سے نیچے کو لڑکھا اس کی بند مٹھی کھلی اور بٹن نیچے زمین پر گر کر لڑکھٹا ہوا مالا کے قدموں کے پاس آگرا۔

مالانے تجسس سے نیچے جھک کر بٹن اٹھایا

، اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر

صدائی میں ہر طرف گونج رہی تھیں لوگ جنازہ کندھے پر اٹھا رہے تھے اور مالا کے ہاتھ میں بٹن تھا، اچانک بٹن سے خون نکلنے لگا۔ مالا نے ڈر کر بٹن کو پھینکا اور چیخ مارنے کی کوشش کی۔

چیخ نہیں نکل رہی تھی اس کی آواز بند تھی وہ پوری قوت لگا رہی تھی۔ مالا نے پورا زور لگایا ایک جھٹکے سے آنکھ کھلی وہ اپنے بستر پر تھی ساتھ لیٹی سات سالہ ارحمہ اس کے سینے پر بازو رکھے اور پیٹ پر ٹانگ رکھے لپٹ کر سو رہی تھی۔ وہ اس کی ایسی ہی لاڈلی تھی رات کو بھی اس سے لپٹ کر سوتی تھی۔

کمرے میں سرخ رنگ کے چھوٹے سے بلب سے نکلتی سرخ روشنی کے باعث پورا کمرہ ملگجے سے سرخ رنگ میں نہایا ہوا تھا۔ اتنی سردی ہونے کے باوجود وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔

ارحمہ کے بازو کو سینے پر سے اور ٹانگ کو پیٹ پر سے اٹھا کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی گردن کے پسینے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے گہرے سانس لیے آج کتنے سالوں بعد اسے یہ خواب پھر سے آیا تھا، شامی دتیسری دفعہ ایک دفعہ تو وہ بہت چھوٹی تھی پر وہ باورچی خانے کا خواب آج پھر ذہن میں گھوم گیا تھا اور پھر دو سر خواب --- جب وہ استانی جی کے گھر سے ٹیوشن کے لیے واپس آرہے تھے اور کار میں اس کی آنکھ لگ گئی تھی، تب وہ پانچویں جماعت میں تھی اور ایک آج مالا پیشانی پر بل ڈالے بیٹھی تھی۔ اسے بہت کم خواب آتے تھے زندگی میں یہ تین خواب ایسے تھے جو اسے من عن یاد تھے۔ ہر خواب میں ایک بات مشترک تھی، رونا آنا اور بٹن

آج جب وہ سولہ کی ہوئی تھی تو ذہن سارے خوابوں کی کڑی کو ملارہا تھا۔ عجیب سا احساس تھا خوف اور دکھ کا ملا جلا احساس وہ جھٹکا کھا کر پلنگ پر سے اٹھی اور پھر کمرے میں بنی لکڑی کی الماری کے دونوں کواڑ کھولے، پاس پڑے موڑھے کو گھسیٹا، موڑھے پر کھڑے ہو کر مٹی سے اٹا وہ ڈبا اٹھایا جو تین سال پہلے وہ الماری کے سب سے اوپری خانے میں رکھ کر اپنی نئی زندگی جینے لگی تھی۔

گڑیا کے ساتھ کھیلنا اب دل کو نہیں لہاتا تھا اب تو قصے کہانیاں پڑھنا، ریڈیو پر گانے سننا، تفتی کی یادوں میں کھوئے رہنا، دوستوں سے اس کے متعلق باتیں کرنا، آئی سینے کے سامنے گھنٹوں کھڑے ہو کر اپنے آپ کو سنوارنا، نئے کپڑے سلوانا ان کو پہننا یہ سب شوق تھے اب اس کے۔

سفید ڈبے پر مٹی کی ایک دبیز تہہ جمی تھی۔ اس نے مٹی جھاڑے بنا ہی آہستگی سے ڈبے کا ڈھکن اٹھایا۔ ڈبے میں کپڑے کی گڑیا اور اس کے گلے میں بٹن کو دھاگے میں پرو کے بنا ہوا ہار دنوں ویسے ہی تھے۔

مالا نے گڑیا اٹھا کر کانپتے ہاتھوں سے بٹن کو اپنی انگلی کی پوروں کے درمیان میں جکڑا تھا، آپ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو آپ کے بچپن کے کئی پل آپ مکمل بھول چکے ہوتے ہیں اور کچھ خاص پل آپ کے ذہن سے کبھی معدوم نہیں ہو پاتے وہ پل اکثر گہرے غم اور بہت خوشی کے پل ہوتے ہیں۔

اور اس کی آنکھوں کے سامنے بھی آج سے گیارہ سال پہلے کے وہ پل گھوم گئے تھے جب اس نے رونا کے ہاتھ سے یہ بٹن اٹھایا تھا۔

فجر کی اذان گونجتے ہی وہ گڑیا کو ڈبے میں واپس رکھ چکی تھی جسے وہ دو گھنٹوں سے اپنے ہاتھوں میں لیے بے کل سی بیٹھی تھی، تینوں خواب دہرا دہرا کر دماغ کی نسیں دکھنے لگی تھیں اور آنکھیں جلنے لگی تھیں جبکہ لحاف کے بنا یوں کمرے میں بیٹھے جسم برف ہونے لگا تھا۔

مولوی رقت آمیز لہجے میں اذان دے رہا تھا، ساتھ والے کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں ابھرنے لگی تھیں یقیناً نوازش حاکم اور غزالہ نماز کی تیاری میں تھے۔ وہ یونہی موڑھے پر منجمد بیٹھی تھی۔ ناتونیند آرہی تھی اور ناہی دل کی بے چینی ختم ہو رہی تھی۔

اچانک کچھ خیال آنے پر پھر سے گڑیا کو ڈبے میں سے اٹھایا اور کمرے سے ملحقہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولتی جب وہ کمرے میں آئی تو غزالہ نماز کے لیے جائے نماز پر کھڑی ہو چکی تھی اور نوازش بستر پر نہیں تھے اس کا مطلب تھا وہ مسجد جا چکے تھے۔

غزالہ کے جائے نماز کے بالکل پاس وہ پلنگ پر بیٹھ گئی تھی ہاتھ میں وہی گڑیا تھی، اچانک بتی گل ہوئی اور لالٹین کی روشنی کمرے کو ہلکے زرد رنگ کی روشنی بخشنے لگی، غزالہ کو شائ د بجلی جانے کے اس وقت کی خبر ہوتی تھی، کیونکہ روزانہ صبح تڑکے اس وقت بجلی جاتی تھی اسی لیے وہ احتیاطاً لالٹین روشن کر کے نماز کے لیے کھڑی ہوتی تھی۔ غزالہ نے پہلی دو رکعت کے بعد سلام پھیرا۔

”اماں۔۔۔“

مالا نے آہستگی سے پکارا تھا، غزالہ نے جیسے ہی سلام پھیرا تو مالا بالکل اس کے پاس بیٹھی تھی۔ پلنگ پر بنا سویر کے ننگے پاؤں نیچے لٹکائے، ہاتھ میں کپڑے کی گڑیا تھامے

”کیا ہوا۔۔۔ ایسے کیوں بیٹھی ہو یہاں؟“

غزالہ نے پریشان سے لہجے میں سوال پوچھا کیونکہ مالا کے چہرے کی پریشانی اور الجھن عجیب سی تھی۔

”اماں پوری نماز پڑھ لے پہلے مجھے بات کرنی ہے“

آہستگی سے اُسے لہجے میں کہا

”اچھا تو بھی اٹھ نماز پڑھ پہلے اور دور رکھ اس منحوس ماری گڑیا کو، صبح نماز ناقرآن اس بت کو ہاتھ میں لے کر بیٹھی ہے“

غزالہ نے اب ماتھے پر بل ڈال کر ڈپٹا تھا، مالا جیسے ہی وضو کی غرض سے اٹھنے لگی تو چند گھنٹے پہلے کا خواب ذہن میں گھوم گیا، غزالہ پھر سے نماز شروع کر چکی تھی۔ مالا ویسے ہی پریشان حال پاس بیٹھی رہی، غزالہ نے جیسے ہی دو رکت کے بعد پھر سے سلام پھیرا تو غصے سے گھور کر مالا کی طرف دیکھا۔

”جب سے بڑی ہوئی ہے، نماز سے بہت دور ہو گئی ہے تو کسی دن اچھے جوتے لگاؤں گی ناتب جا کر عقل آئے گی“

غزالہ نے اس کی پریشانی اور خوف زدہ چہرہ سے بے اعتنائی برتتے ہوئے غصے سے ڈپٹا۔

”اماں مجھے خواب آیا ہے آج۔۔۔“

کھوئے سے لہجے میں وہ غزالہ کی باتیں سنی ان سنی کر کے گویا ہوا، غزالہ نے سوالیہ انداز میں دیکھا

”کیسا خواب۔۔۔؟“

جائے نماز کا کونہ موڑا اور پاس پڑی تسبیح کو اٹھا کر ہاتھ میں ڈال لیا، تسبیح غزالہ کے ہاتھ میں لڑھک کر سیدھی ہوئی۔ اور چھوٹے چھوٹے گول دانوں والی تسبیح اب غزالہ کے ہاتھوں میں گھومنے لگی تھی۔

”اماں رونا آیا آئی ہے میرے خواب میں“

مالا نے کرب ناک سی آواز میں بتایا اور پھر آہستہ آہستہ وہ غزالہ کو اپنے تینوں خواب اور بٹن کے بارے میں بتاتی چلی گئی۔ اب بٹن غزالہ کے ہاتھ میں تھا، دھاگے میں پرویا ہوا شربتی بٹن جس پر باریک باریک کالے رنگ کی لائی نز لگی تھی۔ غزالہ نے کچھ دیر یو نہی بٹن کو گھورنے کے بعد مالا کی طرف دیکھا جو پریشان حال بیٹھی تھی تسبیح ایک طرف رکھی۔

غزالہ نے بٹن اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔ مالانے بٹن غزالہ کے ہاتھ سے تھاما اور پھر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

”چل اب اٹھ جانا۔۔ نماز کا وقت گزر جا رہا ہے، بہن کو پڑھ کر کچھ بخش دے اسی لیے خواب میں آتی ہے“ غزالہ نے زور سے مالا کا کندھا ہلایا تھا، وہ جو کھوئی سی بیٹھی تھی ہل گئی۔

غزالہ نے جائے نماز سمیٹتے ہو کہا

”اماں۔۔۔ وضو خانے تک چلو میرے ساتھ مجھے ڈر لگ رہا ہے“

مالا نے خوفزدہ لہجے میں غزالہ سے التجا کی، غزالہ نے تاسف سے پیچھے مڑ کر دیکھا

”اچھا چل۔۔۔“

غزالہ نے ٹھنڈی سانس خارج کی، وہ خواب سے ڈرگئی تھی اور ابھی اٹاری اور صحن سب اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ غزالہ کے ساتھ وضو کر کے آئی اور پھر نماز پڑھ کر، دعا مانگ کر دل کو تھوڑا سکون ملا۔۔۔ اب باقاعدگی سے نماز پڑھوں گی اللہ میاں ایک بھی نہیں چھوڑوں گی بس مجھے ایسا کوئی خواب نا آئے دوبارہ اللہ سے گڑ گڑا کر دعا مانگنے کے بعد وہ پرسکون ہوگئی تھی۔

حاکم قصر کی درودیوار نئے رنگ و روغن ہونے پر چمچم کر رہی تھیں، پچھلے دس دن سے حویلی میں معمولی مرمت اور دیواروں پر رنگ و روغن ہو رہا تھا، منہا اور فرہاد کی شادی کو بس ہفتہ بھر باقی تھا۔ باہر مزدور نردبانوں کو دیوار سے ٹکائے اس پر چڑھ کر حویلی کی دیواروں کو رنگ و روغن کر رہے تھے، سارا سامان بکھرا ہوا تھا، کچھ کہیں اور کچھ کہیں، خواتین کمروں میں مزدوروں سے پردہ کیے سارا دن بیٹھی رہتی تھیں اور عصر کے بعد مزدوروں کے جانے پر ہی باہر نکلتی تھیں۔

تاری بوانے شمو کو بھی اس کے سسرال سے بلا لیا تھا، وہ خود تو اب بہت نحیف البدان ہوگئی تھی اس لیے شمو اور سکینہ زیادہ کام کرتی تھیں، شمو، تاری اور سکینہ سارا دن مزدوروں اور گھروالوں کے کاموں کے لیے پھر کی کی طرح حویلی میں گھومتی پھرتی تھیں۔

آج بس یہ رنگ و روغن کا آخری دن تھا اور کل منہا کو مایوں بیٹھانا تھا، اب بھی خدیجہ بیگم کے بڑے کمرے میں زمین پر چادر بچھائے سب لوگ ایک ہی جگہ جمع تھے زیب آج صبح ہی اپنے بال بچوں سمیت حویلی پہنچی تھی، اور اب کمرے میں ایک طرف چٹائی بچھائے مالا، رمل، زیب کی بیٹی انعم منہا کے بازوؤں اور ٹانگوں پر ابٹن ملنے میں مصروف تھیں۔

رنگ برنگی چٹائی پر بازو اور ٹانگیں ارد گرد بیٹھی لڑکیوں کے ہاتھوں میں دیے منہا اداس صورت لیے بیٹھی تھی، آنکھیں سوزش لیے ہوئے تھیں اور ناک سرخ ہو رہا تھا۔

کچھ دور پلنگ پر بیٹھی اریب اور زیب مونگ پھلی کھانے میں مصروف تھیں اور ایک طرف غزالہ اور بلقیس تاری بوا کے ساتھ مل کر لڈو بنا رہی تھیں۔ اریب نے زیب کی طرف کن اکھیوں سے دیکھا وہ متواتر مسکائے جا رہی تھی۔

”تو کیا من ہی من ہنسے جا رہی کیا دیکھ رہی ہے ادھر“

اریب نے زیب کو بازو سے ہلکا سا ٹھوکا تو وہ جو سامنے چٹائی کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی اریب کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور آنکھ کے اشارے سے پہلے اریب کو سامنے چٹائی کی طرف متوجہ کیا پھر اس کے کان کے قریب ہوئے سرگوشی کی

”آپا میں سوچ رہی تھی اللہ کی شان بھی نرالی ہے جوڑ بناتا بھی ہے اور پھر ایسے ان کو تکمیل دیتا، وہ دیکھ ذرا سامنے مالا کہیں سے لگ رہی منہا سے آٹھ سال چھوٹی ہے، یہ قد کاٹھ نکالا ہے، اور وہاں ہمارے تفتی میاں ابھی بھی بیس کے لگتے“

زیب کی سرگوشی پر اب اریب بھی سامنے بیٹھی مالا کو نظروں میں جانچنے لگی تھی، وہ سبز رنگ کے جوڑے میں کھلتا گلابی گلاب لگ رہی تھی، کمر تک آتی موٹی بالوں کی چوٹی آگے کر رکھی تھی، منہا کے کان میں باتیں کر کے ہنستی ہوئی مالا کہیں سے بھی منہا سے چھوٹی نہیں لگ رہی تھی۔

”ارے تفتی اور منہا تو اپنی ماں پر ہیں چوہے۔۔۔ موہے۔۔۔، میرے بیٹے کو پتا نہیں اس سانولی سی منہا میں کیا سُرخاب کے پر لگے نظر آتے ہیں جو یوں دیوانہ ہو گیا اس کے پیچھے“

اریب نے کٹیلے لہجے میں ناک چڑھا کر کہا اور پھر ایسے ٹھنڈی آہ بھری جیسے پتا نہیں کتنے ارمان مرگئے ہوں۔

”ارے آپا۔۔۔ تقی تو اتنا خوبصورت ہے رنگ بھی صاف بلکل اباجی پر ہے وہ بھی تو کہاں لگتے اپنی عمر جتنے، عمر چور ہیں اور یہ مالا تو مرحوم چھوٹی اماں پر گئی ہے ہو بو ہو۔۔۔“

زیب نے مونگ پھلی منہ میں ڈال کر سرگوشی کی، اریب نے گردن کو دائیں بائیں خم دیا۔
 ”اتنا میٹھا کھاتی ہے اللہ رے توبہ۔۔۔ جس رفتار سے یہ قد کاٹھ نکال رہی ہے مان نامان اگلے دو سالوں میں تو تقی کی اماں لگے گی“

اریب نے بے زار سی صورت بنائے مالا کے دلکش سراپے پر ایک نظر ڈالے جل کر اپنے خیالات بتائے جس پر زیب کا توفیقہ اٹھ آیا۔

یہ خدیجہ بیگم کا کمرہ تھا جس کے وسط میں فرش پر بنے پتھروں کے رنگ برنگ پھلوں کے اوپر رکھی گئی انگلیٹھی میں کوئی لے دھک رہے تھے، سیاہ کوئی لوں میں سرخ، نارنجی روشنی اور نارنجی رنگ کے چھوٹے چھوٹے ذرات پٹک۔۔۔ پٹک۔۔۔ کی مدھم سی آواز کے ساتھ ہلکے ہلکے اوپر کو اٹھ رہے تھے۔
 کوئی لے دھکنے کی خوشبو کمرے کے ہر کونے سے آرہی تھی۔ خدیجہ بیگم اپنے پلنگ پر کنخواب کپڑے کے کور والے لحاف میں ٹانگیں چھپائے بیٹھی تھیں اور پلنگ کے پاس رکھے حقے کی نلی کو منہ میں ڈال رکھا تھا۔ پورے کمرے میں گڑ۔۔۔ گڑ۔۔۔ گڑ۔۔۔ کش لگانے کی آواز گونج رہی تھی، پلنگ کے بلکل پاس موڑھے پر غزالہ پریشان حال صورت لیے براجمان تھی۔

منہا اور فرہاد کی شادی کو چار روز باقی تھے، دو دن پہلے تقی اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ حویلی پہنچا تھا اور اگلے ہی روز اس نے شور ڈال دیا کہ مالا کی بھی رخصتی کی جائے منہا اور فرہاد کی شادی کے ساتھ ہی۔ غزالہ کے تو ہاتھ

پاؤں پھول گئے تھے، نا کوئی تیاری نا کچھ پر تقی تھا کہ کسی کی بھی سننے کو تیار نہیں تھا بضد بس کے رخصتی کروا دیں۔

”بی جی آپ بات کریں اسے سمجھائی یں، ابھی سولہ کی ہوئے کو بھی کچھ ماہ گزرے ہیں، پہلے تو کہتا تھا بیس کی ہو جائے اب کیا ہو گیا جو کسی کی سن ہی نہیں رہا“

غزالہ نے التجائی لہجے میں کہا اور پھر ڈرتے ہوئے، سامنے ماتھے پر بل ڈالے بیٹھی خدیجہ بیگم کی طرف دیکھا۔ خدیجہ بیگم نے حقے کو ہاتھ سے گھمایا اور نخوت سے دہانہ ہاتھ اوپر اٹھایا

”میں کیا سمجھاؤں اس نگوڑ مارے کو، تیری چندال بھی تو نہیں رکتی یہ قد کاٹھ، رنگ و روپ نکالا ہے اور پھر اس کے سامنے کبھی ادھر کبھی ادھر، ہزار بار سمجھایا ہے تقی جب آوئے اس کو کہا کر ٹک کر رہے پر نہیں، جو ان خون ہے اب بھگت“

خدیجہ بیگم نے تو کبھی کسی کا لحاظ نہیں کیا تھا نا کہ بھیجے غزالہ کو ہی سنا دیں غزالہ گڑ بڑا گئی۔

”بی جی شادی والا گھر ہے کام کاج اتنے ہیں وہ کون سا جان بوجھ کر تقی کے سامنے جاتی تھی“

غزالہ نے سر جھکائے مالا کی سفارش کی، تقی کے یوں شادی پر بضد ہو جانے کی ساری وجہ مالا کو کہا جا رہا تھا، جتنے منہ

تھے اتنی باتیں کہ تقی نے پہلے دیکھا نہیں تھا دور بیٹھا کڑ دکھا رہا تھا کہ شادی دو سال بعد کرے گا اب آکر ایسا

دیوانہ ہو گیا کہ ایک دو ماہ بعد کے لیے بھی نہیں مان رہا تھا۔

”تو اب مسئی لہ کا ہے کا ہے تجھے، پہلے بھی تو اس کی رخصتی منہا، فرہاد کی شادی کے ساتھ ہی طے پائی تھی نا اب

کا ہے کی فکر کھائے جاوے ہے تجھے؟“

خدیجہ بیگم نے الجھ کر اس کی پریشان حال صورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کیونکہ سب سے زیادہ غزالہ ہی

رخصتی ابھی نا کرنے کا کہہ رہی تھی۔

”بی جی، بھائی جی نے داج بنانا تھا، پہلی بھانجی ہے وہ اب چار دن میں کیسے کریں سب کچھ“

غزالہ نے ہاتھ مڑوڑتے ہوئے اپنی پریشانی ظاہر کی، غزالہ کے دو بھائی تھے، رسم و رواج کچھ ایسا تھا کہ بہن کی سب سے بڑی بیٹی کے داج میں ننھال نے حصہ ڈالنا تھا، اب غزالہ کے میکے والے اس بات کو لے کر پریشان تھے کہ وہ چار دن میں کیسے سب کچھ کریں گے۔

”تجھے عقل اللہ نے ہی کم دی ہے، میں تو تیرے اماں باوا کا قصور سمجھتی رہی، داج کیا بعد میں نابن سکے گا، اللہ کا نام لے اور بیٹی کی رخصتی کی تیاری پکڑ بننا ہے گا داج، پھری سی بدھی کا تقی ہے اب کہہ رہا ہے رخصتی تو کر دیو، پیچھے بھی دولائی ن لگاوے بیٹھی ہیں جن کا کرنا بھی باہر ہووے گا“

خدیجہ بیگم نے دو ٹوک لہجے میں اپنی بات مکمل کی اور حقے کی نلی کو منہ میں دبالیاب غزالہ بس حقے کی گڑ گڑ ہی سن رہی تھی۔ افسردگی سے سرکوا ثبات میں ہلا کر اٹھی اور باہر نکل گئی۔

چمپاتی، برقی قمقوں سے لدی حویلی ہر ذی روح کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی، رشتے، ناٹے والے چھوڑ کر بھی لوگ آج حاکم قصر کی سجاوٹ اور شان و شوکت دیکھنے آرہے تھے۔

آج حویلی میں موجود دونوں جوڑوں کی مہندی کی رات تھی، حویلی اندر باہر سے مہمانوں سے کھچا کھچ بھری تھی دو شادیاں اکٹھی تھیں اس حساب سے مہمانوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔

اریب منہ بنائے کبھی کسی کمرے میں جا رہی تھی تو کبھی کسی کمرے میں، جاڑے کے دن تھے اس لیے ہر کوئی اٹاری اور کمروں میں گھس رہا تھا، جگہ جگہ انگٹھیاں جلائی گئی تھیں جہاں انگلیٹھی دھردی جاتی وہیں ارد گرد مہمان اکٹھے ہو جاتے چائے کا پتیلا تو مانو چولہے سے اتر ہی نہیں تھا۔

جہاں انگلیٹھی ٹھنڈی ہوتی تارے بوا جھٹ چولہے سے دھکتے کوئی لے لا کر انگلیٹھی میں رکھ دیتی، فرہاد تو چہکتا پھر رہا تھا کبھی کہیں بیٹھا شغل لگا رہا ہوتا تو کبھی کہیں جبکہ تقی بیرونی برانڈوں میں گاؤں کے بہت سے سمجھدار بزرگوں کے ساتھ بیٹھا اپنے ہسپتال کی بینا اور جگہ کے بارے میں باتیں کر رہا تھا، کتنی ہی دفعہ باہر پیغام بھجوایا گیا کہ تقی میاں کو اندر بھیج دیں ان کی مہندی کی رسم کرنی ہے، پر تقی میاں نے جواب بھیج دیا یہ کوئی ضروری رسم نہیں ہے اس کے حصے کی مہندی بھی مالا کو ہی لگادی جائے اس کے اس جواب پر جہاں بزرگ خواتین بڑبڑانے لگی تھیں وہاں جوان خواتین اور دوشیزائیں منہ پر ہاتھ دھرے کھی کھی کرتی کاناباتی کرنے لگی تھیں۔

مالا اپنے کمرے کے پلنگ پر، سرخ سفید ملاپ کی گداز ہتھیلیوں اور پاؤں کی ایڑیوں اور انگلیوں پر گیلی مہندی لگائے بیٹھی تھی جو دیکھنے والے کی آنکھوں کو خوشنما اور ٹھنڈک جیسا احساس پیدا کر رہی تھی۔

وہ پیلے جوڑے میں گلال ہوتی، ہوش ربائی کی آخری حدود کو چھو رہی تھی، پیلے دوپٹے کے آگے لگی سنہری کرن چہرے کے چاروں اطراف ڈھال بنائے ہوئے تھی اور اس میں اس کی من موہنی صورت اور چمکتی آنکھیں اس کی خوشی کی عکاسی کر رہی تھیں۔

اُسے تو پرواہ تک نا تھی کہ اس کے ارد گرد موجود حویلی کے مکین اور باقی لوگ کیا کہہ رہے ہیں کیا نہیں اُسے تو بس یہ خبر ہی سرشار کر رہی تھی کہ تقی رخصتی کے لیے بضد تھا اور کل اس کی زندگی کی سب سے حسین رات ہوگی۔ اس کی سہیلیاں اس کے اطراف میں بیٹھی بیٹھی سرگوشیوں کو اس کے کانوں میں انڈیل کر اس کی دل کی دھڑکنیں بڑھا رہی تھیں جس کے سبب وہ کبھی تو شرما کے گلال ہوتی تو کبھی گال تنپنے لگتے۔ پورے کمرے چوڑیوں کی کھنک، اور کھکھی کے ساتھ مہندی کی سوندھی سی خوشبو ناک کے نتھنوں میں گھس کر فرحت بخش احساس دے رہی تھی۔

”مانو مانو۔۔ سارا جادو اس من موہنی صورت کا چلا ہے ڈاکٹر صاحب پر“

تبسم نے بھی مالا کے کندھے پر شرارت سے اپنا کندھا مارتے ہوئے چھیڑا تھا۔ اور وہ مہندی کو بچاتے ہوئے کبھی شرمارہی تھی تو کبھی مسکارہی تھی اپنے ہاتھوں پر لگی مہندی کے خراب ہونے کی فکر اسے کھائے جارہی تھی۔

”ہائے مالا اب تو آگے پیچھے پھریں گے تقی بھائی، یہ نئے نئے جوتے کپڑے ہوں گے تیرے پاس، تو اب ریڈ لپسٹک بھی آرام سے لگا سکے گی“

ثریا کے لہجے میں حسرت بھری تھی، وہ اب غیر مرئی نقطے کو دیکھتے ہوئے اسے حسین خواب دکھا رہی تھی جو اس کے کل شادی کے بعد سے تقی کے سنگت میں حقیقت میں بدلنے والے تھے۔

”اور تجھے تو اب پڑھنا بھی نہیں پڑے گا مالا تیری تو جان چھوٹی قسم سے“

تبسم نے اداس صورت بنائے اسے ایک اور خوشخبری سنائی، شادی کے بعد لڑکیاں بالکل پڑھائی لکھائی چھوڑ دیتی ہیں اور بس بال بچے اور شوہر میں لگ جاتی ہیں یہ بات تو وہ باخوبی جانتی تھیں۔

“اف میری شادی کب ہوگی“

تبسم نے حسرت سے کہا، اور پھر گہری سانس لی جس پر مالا اور ثریا تو کھکھلا دیں۔ ثریا نے بمشکل ہنسی روکی اور تبسم جو خلا میں حسرت سے گھور رہی تھی اس کے کندھے کو ہلایا

[illegible]

ثریانے منہ پر ہاتھ رکھے شرارت سے مالا کی طرف دیکھا، مالا کے تو جیسے پنکھ نکل آئے تھے اور خیالوں میں وہ آسمان تک کی پرواز کر آئی تھی۔

ثریا اور تبسم کی باتوں نے تو اسے ایسے حسین خواب دکھائے کہ اس کی دل کی دھڑکن نے سانس لینا ہی کٹھن بنا دیا۔
”اب بس بھی کرو تم دونوں میرا بھی سے سانس رک رہا ہے“

مالا نے لجا ئے سے لہجے میں جملا ادا کیا اور مسکراہٹ کو روکنے کی ناکام کوشش کی
”ہائے۔۔ دیکھ تو کیسے گلابی ہوئے چلی جا رہی ہے رہبر ناول کی نجمہ کی طرح“

ثریانے شیر سے لہجے میں کہتے ہوئے اسے چھیڑا اور مشہور ناول کی ہیروئن کا نام لیا جس پر کہانی کا ہیرو بری طرح مر مٹا تھا۔ وہ بہت دیر سے یونہی مالا کے گرد بیٹھیں باتیں کر رہی تھیں۔ مالا نے اپنے ہاتھوں کی مہندی کی طرف دیکھا

”اچھا سن ذرا باہر سے مٹھائی لا کر میرے منہ میں ڈال دے“

مالا نے بیچارگی سے ساتھ بیٹھی ثریا سے فرما دی

”لو سن لو ان کو اب بھی مٹھائی کی پڑی ہے میں ہوتی تو بھوک پیاس ہی مر جاتی“

تبسم نے مسکراہٹ دبائے کہا جبکہ ثریا مالا کے پھر سے گھورنے پر اٹھ کر باہر چل دی۔ مالا اپنی مہندی کو دیکھ کر مسکرا نے لگی۔

مسہری کی لڑیاں جو کاغز کے رنگ برنگ کے پھولوں اور سنہری پنوں کی مدد سے بنی ہوئی تھیں اوپر چھت سے جڑی پلنگ کے ارد گرد نیچے لٹک رہی تھیں۔

اور پلنگ پر مالا سرخ رنگ کا جوڑا زیب تن کیے بیٹھی تھی، ریشمی جار جٹ کا قمیض شلوار تھا جسے کے گلے اور پانچوں پر گوٹے کی بس تین تین لائی ن لگی تھیں، سرخ کریب کا دوپٹہ تھا جس پر گوٹے کا کام تھا اور کناروں پر سنہری کرن تھی۔ چار دن کے قلیل وقت میں تیار کیا یہ عروسی جوڑا اس کے پہنتے ہی اپنی قدر و قیمت بڑھا گیا تھا۔

غزالہ کا سونے کا ہار گلے میں اور ماتھے پر بڑا سا ٹیکا لگائے اور ناک میں بلقیس کی دی ہوئی سونے کی باریک سی چوڑی نتھ پہنے ہلکا سا فرزانہ آپا کے ہاتھ سے کیے ہوئے سنگھار نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ شام چار بجے وہ ایک کمرے سے رخصت ہو کر تقی کے کمرے میں آگئی تھی اور یہاں چار بجے سے اب چھ بجے تک عورتوں کا ہی جھمگٹا لگا رہا تھا، پھر مغرب کی اذان کے بعد ہی کھانے اور چائے کے بعد اب سارے اپنے اپنے کمروں میں دبک گئے تھے۔

تاری بوا کچھ دیر پہلے آکر اس کے کمرے میں تازہ کوئی لوں سے دھکتی انگلیٹھی رکھ گئی تھیں جس سے اب کمرہ کافی حد تک گرم محسوس ہو رہا تھا۔

کمرے سے باہر اب کافی خاموشی ہونے لگی تھی کچھ دیر پہلے بلقیس کمرے میں آکر اس کے دوپٹے کو آگے کرتے ہوئے گھونگھٹ نکال گئی تھی کہ بس تقی اب کمرے میں آنے والا ہے۔ اس کو ساتھ لگا کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

گھونگھٹ جیسے ہی چہرے کے آگے آیا ہلکا سا اندھیرا سا چھا گیا گوٹے کے کام سے لد اسرخ دوپٹہ تھا جس کے باعث باہر کمرے کی پیلی روشنی اب سرخ رنگ کی ملگجی سی روشنی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ پوری آنکھیں کھولے ڈیلے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی کہ اسی لمحے تقی کمرے میں داخل ہوا، سفید گرتا اور شلوار پہنے بالوں کو سلیقے سے اطراف کی مانگ میں سجائے وہ مخصوص سنجیدہ سی صورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ مالا اب گھونگھٹ کی اوٹ سے دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے اس کو دیکھ رہی تھی۔

کمرے کا دروازہ بند کیے وہ آگے بڑھا تو اس کے ہر قدم کے ساتھ مالا کی دھڑکن کی رفتار بھی بڑھی، ایسا لگ رہا تھا آج تو دل کبخت پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

تقی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا مالا سرخ رنگ کی پوٹلی صورت پلنگ پر بیٹھی تھی دوپٹہ کھینچ کر لمبا سا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ تقی نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی اور پھر سیدھا کتابوں والے میز کی طرف بڑھا۔

مالا کو گھونگھٹ کی اوٹ میں کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، تقی میز پر سے کچھ اٹھا رہا تھا اور پھر ہاتھ میں کچھ پکڑے جیسے ہی پلنگ کی طرف آیا مالا نگاہیں جھکائے سمٹ سی گئی وہ پلنگ پر بالکل سامنے بیٹھ چکا تھا۔

اف وہ گھڑی آن پہنچی تھی جس کو چار دن میں پتا نہیں کتنی بار سوچتی رہی تھی، تقی گھونگھٹ اٹھائے گا، پھر محبت سے اس کے چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کر سیدھا کرے گا۔۔۔ سفید مہندی لگے ہاتھوں میں پسینہ سا آنے لگا تھا۔

”مالا۔۔“

تقی نے ہاتھ میں پکڑی کاپی کو کھولتے ہوئے مگن سے لہجے میں پکارا، تقی کی زبان سے اپنا نام سن کر مالا کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے رہی تھی۔ وہ تو اب آنکھیں جھکائے اس کے گھونگھٹ اٹھانے کے منتظر تھی۔

گھونگھٹ کی اوٹ میں ہی پلکیں زور سے میچ کر وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے تقی اسے پٹ کے پیچھے سے بھی دیکھ رہا ہو۔

”مالا۔۔۔ اٹھاؤ یہ دوپٹہ یہ دیکھو ادھر“

اور اوراق پلٹنے کی آواز کے ساتھ تقی نے اب کی بار رعب دار لہجے میں کہا تو مالا جو شرمائے، لجا ئے بیٹھی تھی، اس کے رعب پر آہستگی سے ہاتھ سے دوپٹے کے کنارے تھامے گھونگھٹ کو اوپر اٹھایا، وہ اپنے پورے جلوے سمیت سامنے بیٹھا تھا، اگر چندن روپ وہ دھارے ہوئے تھی تو کم تو وہ بھی نہیں لگ رہا تھا، مالا نے محبت سے دیکھا پر یہ کیا وہ اس کی طرف تو نہیں بلکہ نیچے کھلی کاپی پر نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔

مالا نے اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہ نیچے کی تو دل دھک سے رہ گیا، اور آنکھیں پوری پھٹنے کی حد تک کھل گئیں یہ اس کی ریاضی کی کاپی تھی جس میں جگہ جگہ سرخ کاٹے کے نشانات لگے تھے۔

”یہ تمہاری کاپیاں ہیں اور ٹیسٹ ہیں؟“

تقی نے نگاہ اٹھائے سپاٹ لہجے میں لب بھینچے اس سے سوال کیا تو وہ جو نا سمجھی اور حیرت کے ملے جلے اثرات میں بیٹھی تھی، گڑبڑاگئی چوڑی دارنٹھ کے نیچے لب ادھ کھلے رہ گئے۔ پھر تقی کے یونہی سوالیہ انداز میں گھورنے پر بمشکل آواز نکلی۔

”ج۔۔۔۔۔جی۔۔۔۔۔“

بے ربط سی پھمکی آواز ابھری، تقی نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا جس پر اب ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ جس دن وہ حویلی پہنچا تو اس کے کمرے میں بلاوجہ کا دوسرے کمروں کا بھی بہت سا سامان پڑا تھا جن کو غصے سے اٹھا کر باہر نکالتے ہوئے اچانک مالا کے بسترے میں سے اس کی کاپیاں نکل کر نیچے تقی کے قدموں میں گر گئیں، اور پھر کاپیاں دیکھ کر تو اس کی آنکھیں کھل گئیں مالا اس کی سوچ سے بھی زیادہ نالائقی تھی۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کا اہم حصہ بننے والی لڑکی سولہ سال کی عمر میں بھی دسویں جماعت پاس ناکرتی، پتہ نہیں استانی جی اور سکول والے اسے کیا پڑھاتے تھے لیکن اب نکاح کے بندھن میں رہتے ہوئے تو وہ اسے پڑھا نہیں سکتا تھا کیونکہ گھر والے اس بات کو معیوب سمجھتے تھے، بس پھر کیا تھا صبح اٹھتے ہی تقی میاں نے رخصتی کا اعلان کر دیا۔

مالا دم سادھے، ورطہ حیرت میں تقی کی طرف دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں محبت کے کوئی آثار نہیں تھے وہ اتنی ہوش ربا لگ رہی تھی پر سامنے بیٹھے تقی نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے، اپنی شادی کی پہلی رات وہ اسے اس کے ٹیسٹ کی کاپیاں کیوں دکھا رہا تھا، ناپیار سے دیکھنا تعریف کی ناہاتھ پکڑا اور نا کوئی اور جسارت

”تمہیں واقعی میں کچھ بھی نہیں آتا۔۔۔ مطلب ناراضی، نایہ دیکھوا نگلش۔ ہر ٹیسٹ میں زیرو۔۔۔ ایک۔۔۔ دو سے زیادہ نمبر نہیں ملے ہوئے تمہیں“

تقی کی پیشانی پر اب بل پڑے تھے، وہ ساتھ ساتھ کاپی کے اوراق پلٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ غصے سے سامنے عروسی جوڑے میں بیٹھی اپنی دلہن کو جھاڑ رہا تھا۔

”ٹینس نہیں آتے، سپلنگز اتنے غلط ہیں اور پھر یہ سائی نس کی کاپی، املا کا حال دیکھو اپنا“

تقی نے انگلش کی کاپی غصے سے ایک طرف پٹخی اور ساتھ پڑی ایک اور کاپی اٹھائی اور اس کے اوراق تیزی سے پلٹتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پتا بھی ہی دسویں جماعت کے امتحان میں کتنے مہینے باقی ہیں؟“

تقی نے گھور کے سوال پوچھا، وہ تو ہونق بنی بیٹھی تھی، خوف زدہ چہرے کے ساتھ تقی کو دیکھا ”صرف تین۔۔۔ اور تمہاری تیاری یہ ہے تم تو فیل ہو جاؤ گی بورڈ کے امتحان میں، اور استانی جی۔۔۔۔۔ پتہ نہیں وہ کیا پڑھاتی رہی ہیں تمہیں“

تقی نے جھنجلا کر کاپی ایک طرف رکھی، مالا کا سانس خشک تھا اور آنکھیں ابھی بھی بے یقینی سے تقی کو دیکھ رہی تھیں۔ جواب ماتھے پر بل ڈالے اس پر پورا حق جتا رہا تھا۔

”یہ تمہارا بستہ میں نے اس رات دیکھا جب میں لاہور سے واپس آیا تھا، مجھے اتنی پریشانی ہوئی تم اتنی نالائقی ہو میں تو تمہیں پتا نہیں کتنا پڑھانے کا سوچے بیٹھا تھا اور تم ہو کو میٹرک فیل کا ٹھپا لگانے کے لیے تیار بیٹھی تھی“

تقی نے تاسف سے لب بھینچے ایک غصیلی نگاہ اس پر ڈالی وہ اب نادام اور ڈری سی بیٹھی تھی۔

”اب ویسے تو تمہیں پڑھا نہیں سکتا تھا اس لیے سوچا رخصتی کروالوں اور ان تین مہینوں میں، میں خود تمہیں پڑھاؤں گی تیاری کرواؤں گا ایک تو ویسے ہی میٹرک کی عمر سے زیادہ عمر ہے پھر اب کی بار بھی فیل ہو جاؤ گی تو آگے کیسے پڑھو گی“

تقی غصے میں بھرا بول رہا تھا اور وہ جس کے ارمانوں پر اس نہیں منوں مٹی پڑی تھی حواس باختہ تقی کو دیکھ رہی تھی۔ تقی نے پاس پڑے کچھ کاغذ اٹھائے جو وہ ایک خاکی رنگ کے لفافے میں سے نکال رہا تھا۔

”یہ پچھلے پانچ یا چھ سالوں کے امتحانی پرچے ہیں“

تقی نے پرچے ایک ایک کر کے الگ کرتے ہوئے اسے دکھائے۔ مختلف سالوں کے دسویں جماعت کے پرچے تھے

”ان تین مہینوں میں تمہیں ان سے تیاری کرواؤں گا، بس یہ پرچے تیار کر لو پاس ہو جاؤ گی ان شاء اللہ، روز رات کو جو کچھ میں دیا کروں گا سمجھایا کروں گا، وہ اگلی رات سنا بھی کروں گا اور لکھوا کر بھی دیکھوں گا“

تقی ہدایات جاری کر رہا تھا اور وہ ویسے ہی بیٹھی تھی، کر بھی کیا سکتی تھی جا بھی کہاں سکتی تھی، سب کچھ ایک چھنا کے سے ٹوٹ گیا تھا، تقی کہاں اس کے حسن میں گرفتار ہوا تھا وہ تو اس کی نالائقی میں گرفتار ہوا تھا اور نکاح کا حکم جاری کر دیا۔

شادی کی پہلی رات جہاں دوسری دلہنوں کو محبت بھرے جملے اور لمس ملتے ہیں وہاں اسے ڈانٹ مل رہی تھی پرچے مل رہے تھے۔ دل کر رہا تھا اپنے سامنے بیٹھے اپنے اس شوہر کو جھنجھوڑ کر رکھ دے کہ پورا گاؤں آج اس کے حسن کے قصیدے پڑھتے گیا ہے وہ خود آئی نے میں اپنا عکس دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی کہ اس پر کتنا روپ آیا ہے پر یہاں اس کھڑوس کو اس کے زیر و نمبر والے پرچے نظر آرہے تھے لیکن اس کا دو آتشہ حسن نظر ہی نہیں آرہا تھا۔

”آج رات تو بہت دیر ہو گئی ہے کل سے ٹھیک سات بجے تم کمرے میں ہو گئی، بہت کچھ سیکھانے والا ہے تمہیں“

تقی نے کاپیاں سمیٹتے ہوئے رعب سے حکم جاری کیا اور وہ تو سر بھی ناہلا سکی۔
”سکول بھی جاؤ گی تم کوئی چھٹی نہیں ہو گی اور رات کو جب میں واپس گھر آؤں تب تک سب کچھ یاد ہونا چاہیے سمجھی“

تقی اب انگلی کھڑے کیے اسے خبردار کر رہا تھا چوڑی لبوں سے ٹکرا رہی تھی، اور اس حسن کی دیوی کے اتنی سردی میں بھی ہاتھ پاؤں سامنے بیٹھے تقی کے رعب سے گرم ہو گئے تھے۔ اتنا رعب تو آج تک کسی نے نہیں چلایا تھا اس پر ایک وہی تو تھا اس کے دل کے تحت کا مالک جو یوں اسے چاروں شانے چت کیے ہوئے تھا۔
”سو جاؤ اب آرام کرو شاباش“

تقی نے اس کی کتابیں سمیٹیں مصروف انداز میں ایسے کہا جیسے وہ کوئی بچی ہو، کتابیں اٹھا کر میز پر اپنی کتابوں کے ساتھ رکھیں اور خود سامنے کرسی پر بیٹھ کر کچھ کاغذات دیکھنے لگا۔

مالانے ایک خفاسی نگاہ اس پر ڈالی، وہ تو پتہ نہیں کیا نقشے کھول کر بیٹھا تھا پتا نہیں ہسپتال کے تھے۔ زیور، ہار سنگھار سب گیا بھاڑ میں، مالانے دل مسوس کر سوچا۔ ایسے تو نہیں سو سکتی میں، زیور اتارنا پڑے گا یہ سوچ کر تھوڑا سا ہلی تھی کہ خاموش کمرے میں چھن، چھم، چھن کی کتنی آوازیں گونج اٹھی، تقی نے سر اوپر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں کیا ہوا؟ سو جاؤ اب۔۔۔“

بڑے ملائی م سے لہجے میں کہا اب کی بار، پر مالا کا دل کیا مسہری نوچ ڈالے اس کا سر پھوڑ ڈالے، سامنے کوئی لوں سے دھکتی انگلیٹھی اس پر الٹا دے پر وہ یہ سب صرف سوچ سکتی تھی جب وہ نگاہ اٹھاتا تھا اس کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔

”مجھے یہ اتارنا ہے سب۔۔“

مالا نے معصوم سی صورت بنائے تقی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی الجھن کا سبب بتایا۔

”ہاں اتار لو۔۔۔“

آرام سے جواب دیا اور پھر جناب کھڑوس اول نقشے پر سر جھکا چکے تھے۔ اور وہ اپنی قسمت کو کوستی ہوئی پلنگ پر سے اتری اور سامنے دیوار میں نسب شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

جیسے ہی نگاہ سامنے اپنے عکس پڑی دل خون کے آنسو رو یا کیا کوئی اتنا بھی سنگ دل ہو سکتا ہے کہ اس کے اس روپ کے آگے ناجھکا، لبوں کو رونے کے انداز میں باہر نکالے زور زور سے زیور اتار کر ایک طرف لگے چھوٹے سے میز پر پٹچا تھپ تھپ زمین پر پاؤں مارتی پلنگ تک آئی۔ اور لحاف سر تک تان کر لیٹ گئی۔

اس کے لیٹتے ہی تقی نے چور سی نگاہ اس طرف ڈالی وہ لحاف سر تک اوڑھ چکی تھی، وہ کہاں ابھی اس کو اس کم سنی میں ہی رخصت کر کے لانا چاہتا تھا اور ویسے بھی اس کو مالا کی عادات پسند نہیں تھیں وہ بالکل سنجیدہ مزاج، شائستہ اور سمجھدار نہیں تھی جبکہ تقی کو ذاتی طور پر ایسی لڑکیاں ہر گز پسند نہیں تھیں۔

تقی نے گہری سانس خارج کی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر پلنگ تک آیا، سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کو پاس کروانے اور پڑھانے کی ناٹھان لی ہوتی تو وہ کبھی بھی اسے ابھی اس کمسن سوچ کے ساتھ نابیاہ کر لاتا۔

لحاف کا ایک کونا اٹھایا اور ایک کونے میں سمٹ کر لیٹ گیا، جیسے ہی وہ لیٹا تو لحاف میں وہ سمٹ رہی تھی، شائ داب بھی جاگ رہی تھی، تقی نے آنکھوں پر بازو دھرا اور ذہن کو پرسکون کرتے ہوئے کب آنکھ لگی خبر ہی ناہوئی۔

فرہاد نے اپنے کمرے کے دروازے کو آہستگی سے کھول کر قدم اندر رکھا۔ کمرے میں منہا کے دانج کی ہر چیز نئی تھی پلنگ، سنگھار میز، لکڑی کا صوفہ، اس کے آگے پڑی لکڑی کی میز، مسہری کی لڑیاں لکڑی کے پلنگ کے ارد گرد پھیل کر اسے چاروں اطراف سے ڈھانپے ہوئے تھیں۔

اور ان کے بیچ منہا آتشی، سبز، اور ہلکے نیلے رنگ کے ملاپ والے جوڑے میں بیٹھی تھی۔

فرہاد مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور مسہری کی لڑیوں کو انگلیوں کی جنبش سے ہٹاتا ہوا پلنگ پر براجمان ہوا، منہا سے محبت کی تکمیل کی رات نے اسے کے انگ انگ کو خوشی سے سرشار کر رکھا تھا۔

اس کے بیٹھے ہی گھونگھٹ سے چہرہ چھپائے بیٹھی منہا نے پیروں کو اندر کی طرف اکٹھا کیا، مہندی لگے پاؤں اب دوپٹے کی اوٹ میں چھپ چکے تھے، اس کی اس حرکت پر فرہاد کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری تھی اس کا یہ لجا یا سا روپ فرہاد کے اندر سکون اتار گیا کیونکہ نسبت طے ہونے سے لے کر اب تک اس نے منہا سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

اسی دلکش مسکراہٹ کو لبوں پر مزین کیے اس نے آگے ہوتے ہوئے گھونگھٹ کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے الٹ دیا تھا۔ منہا سپاٹ چہرے کے ساتھ نگاہیں جھکائے بیٹھی فرہاد کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر گئی تھی۔ وہ سانولے رنگ و روپ کی پرکشش لڑکی تھی۔

فرہاد اب محبت پاش نگاہیں اسے دلہن کے روپ میں بدلے خوبصورت چہرے پر مرکوز کیے خاموش بیٹھا تھا، منہا نے الجھ کر پلکیں گالوں پر کپکپائی یں تھی وہ کچھ بول کیوں نہیں رہا تھا۔ چند لمحے یو نہی گزرنے کے بعد فرہاد کی آواز نے کمرے کی خاموشی کے سکوت کو توڑا۔

” آج بھی یوں ہی چہرہ غصے والا رکھو گی اب تو مسکرا دو“

فرہاد کی آواز میں دنیا بھر کی مٹھاس گھلی تھی، وہ جواب کی منتظر مخمور نگاہیں اب اس پر گاڑے بیٹھا تھا پر منہا نے ناتو کوئی جواب دیا تھا اور نا ہی چہرے کے تاثرات تبدیل ہوئے۔

فرہاد نے گرتے کی جیب سے مخمل کے کپڑے سے ڈھکی چھوٹی سی سرخ ڈبیانکالی اور پھر مسکراہٹ کو مزید گہرا کرتے ہوئے اسکا گھٹنے پر دھرا مہندی لگا ہاتھ تھا مادہ اس جسارت پر ہلکا سا کسمائی تھی۔ سونے کے نقش و نگار والے جال کی چھوٹی سے گول انگوٹھی تھی جس کے نقش و نگار کے بیچ میں چھوٹا سا سرخ نگینہ جڑا تھا۔

” یہ انگوٹھی ابا کے ساتھ خود جا کر بنوا کر لایا تھا“

فرہاد نے سونے کی انگوٹھی کو اس کی انگشت انگلی کے ساتھ والی انگلی میں پہناتے ہوئے محبت سے کہا اور پھر ہاتھ کو ہلکا سا ہلاتے ہوئے اس کی طرف بھنویں اچکا کر دیکھا

” بتاؤ تو تمہیں پسند آئی؟“

فرہاد نے تھوڑا سا جھکتے ہوئے محبت سے پوچھا، منہا نے ایک نظر انگوٹھی پر ڈالی اور لب بھینچے سر کو اثبات میں ہلانے ہر اکتفا کیا

” اتنی خاموش تم ہو تو نہیں جتنی آج بیٹھی ہوئی ہو کچھ تو بولو چلو لڑ ہی لو مجھ سے“

فرہاد نے اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا سائے کھلتے ہوئے کہا۔

”م۔۔ مجھے نیند آرہی ہے سونا ہے مجھے“

منہا نے سپاٹ لہجے میں کہا اور ہاتھ فرہاد کے ہاتھ سے کھینچ لیا تھا، وہ جو منہا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھا تھا اس کے ہاتھ یوں ہی ہوا میں ہی معلق رہ گئے، پھر گہری سانس لے کر پاس پڑے گاؤ تکیے پر بازو دھرا ”آج تو نہیں سونے دوں گا“

فرہاد نے شریر سے لہجے میں کہا، منہا اس کی اس معنی خیز جملے پر عجیب طرح سے جزبز ہوئی، پھر فرہاد کی خماری جھلکاتی نگاہوں سے بے نیازی برقی پلنگ سے اترنے کے لیے آگے ہوئی۔

”منہا۔۔ کیا ہوا؟“

فرہاد نے فوراً سیدھے ہوتے ہوئے پریشان سے لہجے میں پوچھا، منہا کا متواتر یہ روکھا پن اب عجیب طرح سے کھل گیا۔ جسے وہ جھجک سمجھ رہا تھا وہ تو اس کی خفگی نکلی

”کچھ نہیں سونا ہے مجھے بہت تھک گئی ہوں“

منہا کا لہجہ ہنوز روکھائی لیے ہوئے تھا، وہ فرہاد سے متواتر نگاہیں چرا رہی تھی، اک ان چاہ رشتہ اتنی جلدی وہ اور اسکا ذہن کیسے قبول کر لیتے۔

”منہا مانتا ہوں بچپن سے اب تک بہت تنگ کرتا آیا پر یہ بھی سچ ہے بہت محبت کرتا ہوں میں امی سے لڑ لڑ کر یہ رشتہ کروایا ہے میں نے“

فرہاد محبت بھرے لہجے میں اپنی سارے جذبے اس کے گوش گزار کر رہا تھا، جو وہ کبھی کر نہیں پایا تھا اور درحقیقت وہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا جب تک کہ وہ پورے حق سے اس کی ہو نہیں جاتی۔

”فرہاد میں بہت تھکی ہوئی ہوں“

منہا کی آواز کپکپا گئی تھی، اس کی یوں بھاری سی بے زار آواز فرہاد کو نادام سا کر گئی، ایسا لگے تابیاں اور پہلی رات کے ملن کی خوشی بس اسے ہی ہے۔

محبت سے اس کے قریب ہوتے ہوئے پیش کش کی، جس پر وہ اور بے زار ہوئی

منہا نے نظریں چراتے ہوئے روکھائی سے جواب دیا اور پھر فوراً پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چھن چھن کی آواز کے ساتھ سنگھار میز تک پہنچی اور پھر زیور اتار کر سنگھار میز کے دراز میں رکھنے لگی۔

فرہاد کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر خود کو جھٹلاتا ہوا پلنگ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا، فرہاد اس کے عقب میں آ کر کھڑا ہوا دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے تھام کر قریب ہوا، اس کے یوں قریب آنے پر منہا فوراً پلٹی۔

”سوئی میں اب۔۔۔۔۔“

پلکیں لرزاتے ہوئے پھیکسی سی آواز میں کہتی وہ اس کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھی اور پھر فرہاد کو وہیں چھوڑ کر، پلنگ کے لحاف کو کھینچتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی، فرہاد کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر دل میں سراٹھاتی الجھن کے سبب شکن پیشانی پر ابھارے پلنگ پر آیا۔ پلنگ پر بیٹھتے ہی کہنی کے بل منہا پر جھکا، اور لحاف اس کے چہرے پر سے ہٹایا

”منہا۔۔۔“

محبت بھری سرگوشی تھی جس کے جواب میں اس نے آنکھیں کھولنی بھی گوارا نہیں کی تھی۔ فرہاد اسی طرح کہنی پر سے وزن اٹھاتا سیدھا ہوا تھا اور پھر تکیے پر سر رکھے اوپر ساکن پٹکھے کو گھورتے ہوئے، پورے منظر کو پھر سے دہرا کر اپنی غلطی کو تلاش کرنے لگا، وہ اس رشتے سے ناخوش نہیں اس سے ناخوش لگتی تھی، کتنی ہی باتیں اور وسوسے دماغ میں گھومتے رہے اور کب نیند کے جھونکے نے اسے لیٹیٹ میں لیا خبر نہیں ہوئی۔

* * * * *

ارحمہ پلنگ پر بے سدھ سو رہی تھی، کچھ دور لیٹی رملہ ہلکی سی غنودگی میں تھی، پورے کمرے میں مالا کی سسکیوں کی آواز متواتر گونج رہی تھی، پلنگ پر ایک ٹانگ اوپر کیے اور ایک ٹانگ نیچے لٹکائے غزالہ اپنے سامنے بیٹھی مالا کو گھور رہی تھی۔

جو آلتی پالتی مارے پلنگ پر ارحمہ کے قریب بیٹھی تھی اور بچوں کی طرف سسکیوں صورت روئے جارہی تھی۔ گہرے فیروزی رنگ کے جوڑے میں سفید موتیوں کے بیچ لگے سونے اور نگینوں والا ہار گلے میں ڈالے اور چھوٹی، چھوٹی جھمکی والے جھمکے کانوں میں ڈالے وہ رو رو کر ناک سرخ کر چکی تھی، ولیمے کی تقریب کے بعد جیسے ہی مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے تھے وہ مغرب کی نماز پڑھتے ہی ماں کے کمرے میں آن دھمکی تھی اور کل رخصتی کے وقت ایک بھی آنسو نہ بہانے والی مالا اب چپ ہی نہیں کر رہی تھی۔

”مالا اب یہ ٹسوے بہانے بند کرے گی تو ہی کچھ بتا سکے گی نا مجھے کہ آخر کو ہوا کیا ہے؟“

غزالہ نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا تھا اور تشویش ظاہر کی جو روتے ہوئے رخ پھیر رہی تھی کبھی گھٹنوں میں منہ دے رہی تھی تو کبھی چہرہ اوپر اٹھا رہی تھی۔

”شادی کے بعد پڑھتا ہے کیا کوئی۔۔۔؟“

مالا نے ہچکیوں میں شکوے بھری نگاہ غزالہ پر ڈل کر خفگی سے سوال کیا لبوں کو دانتوں میں بے دردی سے کچل ڈالا آنسو کسی صورت نا تھم رہے تھے، غزالہ کے ماتھے پر نا سمجھی کے بل پڑے

”کیا۔۔ کیا مطلب تقی پڑھانا چاہتا ہے تمہیں؟“

غزالہ نے فوراً اس کی بات سمجھ کر اس سے سوال پوچھا جواب رونے کے ساتھ ساتھ پیشانی پر بل ڈالے غصے میں اضافہ کرتی جارہی تھی۔

”پڑھانا کیا۔۔ انہوں نے تو شادی ہے۔۔۔ مجھے میٹرک کی تیاری کروانے کو کی ہے“

مالا نے روتے ہوئے غصے سے ماتھے پر بل ڈال کر اپنا دکھ سنایا، انداز نہروٹھا تھا ایسے جیسے سب نے زبردستی اس کی شادی کر دی تھی۔

”تو۔۔۔ تم کیوں اتنا رو رہی ہو، کچھ اچھا ہی سوچنا تفتی نے لو بھلا سب کیا۔۔ کیا۔۔ بکو اس کر رہے تھے، پر وہ ہیرے جیسی سوچ کا ہی مالک نکلا“

غزالہ نے مسکراتے ہوئے فخر سے گردن اٹھائے تفتی کی شان میں قصیدے پڑھے جو مالا کو کسی صورت نہیں بھائے تھے۔

”اماں۔۔۔ بس کر دے۔۔ مجھے نہیں پتا کچھ بھی، اٹھو میرے ساتھ چلو، تفتی کو بولونا جا کر مجھے نہیں پڑھنا ہے آگے وہ یہ ضد چھوڑ دیں“

مالا نے بچوں کی طرح فرمائی لیش کی اور پاس ہو کر غزالہ کا گھٹنا تھام لیا چہرے پر التجار قم تھی، غزالہ نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا ایسے جیسے اسے بیوقوف سمجھ رہی ہوں

”مالا اگر تو بتا رہی ہے اس نے شادی ہی میٹرک کی تیاری کروانے کے لیے کی ہے، تو تھوڑی سی محنت کر لے اس کی خواہش پر، جہاں اتنی محبت ہو وہاں بیویوں کو شوہر کی خواہشات پر سر جھکانے پڑتے ہیں“

غزالہ نے اس کی فرمائی ش پر زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کا ساتھ دینے کے بجائے اسے الٹا سمجھایا تھا جس پر وہ غصے سے غزالہ کے گھٹنے چھوڑ کر پیچھے ہوئی

”اتنا۔۔ کتنا۔۔ اماں، ان کو اتنا، جتنا، کتنا بھی پیار نہیں ہے مجھ سے وہ تو آج بھی وہی تفتی ہیں جنہوں نے زبردستی دوسری جماعت میں داخل کروا دیا تھا مجھے اور اب مجھے سولہ سال کی ہونے پر طعنے دے رہے تھے رات، بھلا بتاؤ تو۔۔۔ جو خود چودہ سال میں کر لیا تھا میٹرک تو کیا اب سب اسی میں کریں یہ کہاں کا اصول ہوا“

خفگی بھرے لہجے میں مالارات کے سارے شکوے شکائی تیں ماں سے کر رہی تھی، غزالہ نے اس کی طرف ناگواری سے دیکھا

”مالا مجھے بہت برا لگ رہا ہے جو تو یوں پہلی رات کے بعد ہی آکر مجھ سے اپنے شوہر کے رویے کے رونے رو رہی ہے، اچھی بیٹیاں کبھی میکے میں آکر اپنے شوہر کی شکائی تیں نہیں کیا کرتی ہیں اور رہی بات تقی کو سمجھانے والی تو میں ہر گز ہرگز نہیں تمہارے اور اس کے معاملے میں بولوں گی مجھے اس پر یقین ہے اس نے کچھ بہتر ہی سوچا ہو گا“

غزالہ ماتھے پر بل ڈالے جھاڑنے کے انداز میں اسے سمجھا رہی تھیں، اور وہ ہونق بنی ماں کے اس رویے کو دیکھ رہی تھی جس نے ایک دن میں ہی اسے خود سے پرایا کر دیا تھا اور تقی کے حوالے کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے مجھے یہی امید تھی اماں۔۔۔ تو کبھی میرا ساتھ نہیں دے گی، میں خود داجی سے بات کروں گی“

مالا نے آنسو صاف کرتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں خفگی کا اظہار کیا۔

”بکو اس نا کر چپ۔۔۔ بلکل چپ۔۔۔ خبر دار اگر داجی کے سامنے کچھ بھی اول فول بکا ہو تو تقی کے بارے میں، وہ ر منا کو بھی پڑھایا کرتا تھا اسے میٹرک کروا رہا تھا اپنی فیس کے پیسوں سے اور اسی طرح اب تمہارے بارے میں فکر مند ہے“

اچانک مالا کو سمجھاتے سمجھاتے غزالہ کا لہجہ ر منا کو یاد کر کے بھیک گیا۔ مالا ویسے ہی شکوے بھری نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

”رات بہت ہو گئی ہے چل شاباش تقی کمرے میں انتظار کر رہا ہو گا، اور اس کا ہر حکم ماننا اچھی بیوی بن کر وہ پڑھائے گا تو، تو پڑھ جائے گی مجھے یقین ہے“

غزالہ نے اس کے روہانسی صورت کو ہاتھوں میں لے کر تسلی دی پروہاں تو کوئی اثر نہیں تھا

”میں نے آج وہاں نہیں سونا کل بھی ساری رات مجھے ان کے پلنگ پر نیند نہیں آئی میں یہاں ار حمہ کے ساتھ سو جاتی ہوں“

مالا نے بڑے مزے سے جانے سے انکار کرتے ہوئے پلنگ پر ٹانگیں سیدھی کی، غزالہ اس کے اس انداز پر گڑبڑا کر سیدھی ہوئی اس کا بازو تھاما

”ادھر آ۔۔ بند کریہ حرکتیں بچی نہیں رہی اب شادی ہوگئی ہے چل جا اپنے کمرے میں اٹھ یہاں سے تقی انتظار کر رہا ہوگا“

غزالہ نے غصے سے اس کا بازو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، مالا نے خفاسی نگاہ ڈالی اور پھر ایک جھٹکے سے اپنا بازو سہلاتے ہوئے پلنگ پر سے اٹھ کر کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

تقی کے کمرے کا دروازہ بند تھا سردی کے باعث حویلی کے تمام کمروں کے دروازے اس وقت بند ہی تھے وہ اب کمرے کے بند دروازے کے آگے کھڑی تھی۔ دل کل کے رویے سے ایسا نالاں تھا کہ یہاں سے بھاگ جانے کو دل چاہا

آہستگی سے کواڑ کو اندر کی طرف دھکیلتی ہوئی کمرے میں جیسے ہی داخل ہوئی تقی سامنے کرسی پر براجمان تھا۔ ہلکے سے نیلے رنگ کے قمیض کے اوپر سیاہ رنگ کی جرسی پہنے وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مگن تھا، جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی تقی نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک دم سے نگاہوں کا تصادم ہوا تقی کی آنکھیں ہی بتا گئیں کہ وہ اس کے یوں دیر سے کمرے میں آنے پر غصہ ہے، مالا نے غصہ محسوس ہونے کے باوجود ہمت مجتمع کیے قدم پلنگ کی طرف بڑھائے

”ادھر آؤ۔۔“

وہ پلنگ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی جب تقی کی پکار پر قدم یک لخت تھم گئے۔ پل بھر کو وہ تھمی پھر اس دشمن جاں کے حکم پر اس کے بالکل پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ میز کے سامنے والی کرسی پر وہ خود براجمان تھا، اور ایک کرسی کو میز کے اطراف میں دیوار کے ساتھ لگایا ہوا تھا۔

”یہاں بیٹھو۔۔۔“

تقی نے آنکھوں سے ہی دیوار کے ساتھ لگی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا، آج سارا دن وہ باہر برانڈوں میں ہی رہا تھا اس لیے اب جا کر وہ نظر آئی تھی۔ کھانے کے بعد وہ کمرے میں اسی غرض سے آیا تھا کہ وہ موجود ہوگی لیکن وہ کمرے میں نہیں تھی۔

”مالا ہمارے پاس دن بہت کم ہیں اور ہماری تیاری بہت زیادہ پڑی ہے اس لیے تم یہ سستی ختم کر کے سنجیدہ ہو جاؤ“

تقی نے ماتھے پر بھنویں ڈالے اسے غور سے دیکھتے ہوئے خبردار کیا تھا، فیروزی رنگ کے جوڑے میں ملبوس گلابی گالوں پر پلکیں جھکائے وہ بہت مؤدبانہ اس کے سامنے بیٹھی تھی وہ کل کی نسبت آج زیادہ کم عمر لگ رہی تھی کل شامی دہار سنگھار اسے اس کی عمر سے زیادہ بڑا دکھا رہے تھے۔

”آج پہلے تو ہم مضامین کو تقسیم کر لیں گے ویسے تو تقسیم مشکل اور آسان مضامین کو رکھ کر کیا جاتا ہے پر یہاں تمہارے لیے تو سبھی ہی مشکل ہیں“

تقی نے پنسل سے کاغذ کے بالکل وسط میں ایک لمبی لائی ن لگائی تھی، مالا نے اس کے طنز پر نگاہ اٹھائے اس کو دیکھا تھا۔ سر جھکائے بڑے انہماک سے وہ پنسل سے کاغذ پر لائی ن لگاتا مالا کو تپا گیا تھا کتنا جذبات سے عاری شخص تھا وہ۔

”انگریزی، سائی نس اور اردو یہ ایک دن اور۔۔۔۔۔“

تقی نے لائی ن کے ایک طرف یہ سارے مضامین لکھے، مالا اس کی پلکیں دیکھ رہی تھی اس کی پلکیں گھنی تھیں اور آنکھیں سیاہ تھیں۔

”ریاضی، مطالعہ اور اسلامیات یہ دوسرے دن مطلب ایک دن تین یہ کتابیں اور اگلے دن تین یہ کتابیں ان کو پڑھیں گے ہم“

تقی نے لائی ن کے ایک طرف نمبر دیتے ہوئے الگ الگ کتابوں کی تقسیم کو لکھا اور نگاہ مالا پر ڈالی وہ تو کاغذ کی طرف نہیں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”سمجھ میں آیا کچھ۔۔۔؟“

تقی نے تھوڑا سا چہرہ قریب کیے سوال کیا تو وہ جو بڑے انہماک سے اس کی پلکوں کا گھنا ہونا، اس کی آنکھوں کا سیاہ ہونا، بالوں کا ماتھے پر گرنا، ناک کا تیکھا ہونا اور ہلکی سی بڑھی شیوہ دیکھ رہی تھی ایک دم سے گڑبڑا گئی، اور سر زور سے اثبات میں ہلا دیا۔

”اچھی بات ہے، اب آج ہم ریاضی والے دن سے شروع کریں گے کتاب نکالو اور پرچہ بھی نکالو کوئی پرانا ریاضی کا“

تقی نے ریاضی کی کتاب کو میز پر اپنی طرف کھسکاتے ہوئے مگن سے لہجے میں حکم جاری کیا، مالانے بد مزہ سی صورت بنائے اس کو دیکھا جس کو اس کے دل کی حالت کی ذرا پرواہ نہیں تھی۔

تقی نے ریاضی کی کتاب کھولتے ہی الجبرا کے فارمولا پر ہاتھ رکھا اور مالا کی طرف دیکھا، مالانے جلدی سے اس کے یوں دیکھنے پر اپنی صورت پر سے بد مزگی کو ختم کیا

”فارمولہ سنو تو یہ آتا ہے کیا؟“

تقی فار مولا پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا، اور اسے اب فار مولا تو آتا نہیں تھا تقی کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی اس کے ہتھیلی چھوٹی اور انگلیاں زیادہ لمبی تھیں اور ہاتھ بہت مضبوط تھا جرسی کے نیچے سے بازو پر موجود بال بھی نظر آرہے تھے۔ تقی اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا اور وہ اس کے ہاتھ کو بغور دیکھ رہی تھی، تقی کو اتنے قریب سے اور اتنی تسلی سے آج سے پہلے کبھی اس نے دیکھا بھی نہیں تھا

”مطلب حد ہوتی ہے، اب پہلے آج تو یہ سارے فار مولے لکھ رہا ہوں یہاں کاغذ پر کل یہ انگلیوں پر یاد ہونے چاہیے سمجھی“

تقی نے اس کی خاموشی سے ہی اندازہ لگایا کہ اسے یہ فار مولا نہیں آتا ہے اور گھورتے ہوئے اب سفید رنگ کے کاغذ پر وہ بڑی مہارت سے فار مولے لکھ رہا تھا، وہ اتنی روانی سے سارے فار مولے لکھ رہا تھا کہ ساتھ بیٹھی مالا کو حیرت کا دھچکا لگا۔ کیا وہ اس سے بھی یہی توقع رکھے گا کہ وہ یوں فر فر فار مولے لکھے گی۔

مالا نے تھوک نگلا الجبر اکتا تھا اسے اور تقی نے اسی سے ہی شروعات کی تھی۔ اب پتا نہیں وہ اسے کون سے سوال کو سمجھا رہا تھا مالا کی تو آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اور پھر ایک دم سے مالا نے سر میز پر دھر دیا۔

”اب کیا ہوا۔۔۔؟“

ٹھپ کی آواز پر تقی اس کی طرف متوجہ ہوا اور سوالیہ نگاہیں اس پر جمائے پوچھا، جو ہاتھوں کو اوپر نیچے میز پر دھر کر اب سر اس پر ٹکائے ہوئی تھی، مالا نے دھیرے سے چہرہ اوپر اٹھایا معصوم سی صورت اور آنکھیں نیند سے کچھ یوں بوجھل تھیں کے پوری کھل بھی نہیں رہی تھیں۔

”نیند آرہی ہے۔۔۔“

بیچارگی سے جواب دیا، تقی نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ اس کی ادھ کھلی آنکھیں گواہ تھیں وہ بمشکل جاگ رہی ہے

معصومیت سے اپنی خوبی سے آگاہ کیا، جبکہ نیند نے دماغ کی سمجھ کے شٹر گرا دیے تھے۔ تقی نے لب بھینچے

”تو کل سے عادت بد لو نا، بلکہ کل سے کیوں آج سے ہی۔۔۔ چائے بنانی آتی ہے؟“

مالا نے ناک اور اوپری ہونٹ ایک ساتھ اوپر اٹھایا، وہ اب کیا کرنے والا تھا اس کے ساتھ، دل تو چاہ رہا تھا اٹھ کر زور سے چیخ کر کہے، نہیں آتی چائے بنانی مجھے سونا ہے تم نے کیا شادی کر کے مجھے کھ پتلی سمجھ لیا ہے ظالم، اکڑو، کھڑوس،۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب دل بس دماغ کو سن رہا تھا یہ وہ تقی کو کہہ نہیں سکتی تھی۔

آہستگی سے سر اثبات میں ہلایا عزت کا معاملہ تھا کیا سوچے گا تفتی پڑھائی میں بھی ننگی اور چائے بھی نہیں بنانی آتی۔

”اچھا۔۔۔ تو چلو اٹھو چائے کی ایک پیالی پیو آج زیادہ دیر جاگو گی تو کل دوپہر کو خود بخود دینید آئے گی“

تقی نے پنسل ایک طرف رکھے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا، مالانے رونے جیسے صورت بنائی وہ جتنا نرم دل اوپر سے دکھائی دیتا تھا ویسا بالکل نہیں تھا کتنا ظالم تھا وہ۔ مطلب کی اب وہ اس کی بچپن کی عادت ایک دن میں بدلے گا۔۔۔ کیا مصیبت تھی۔۔۔ مالادل میں خون کے آنسو رو دی

”میں تو رات کو دودھ پیتی ہوں چائے نہیں پیتی“

بیچارگی سے اپنی اگلی خوبی سے آگاہ کیا کہ شائی د جان خلاصی ہو جائے

”تم کیا کرتی تھی، کیا نہیں کرتی تھی، سب اوٹ پٹانگ حرکتیں بدلو آج سے، اٹھو جاؤ چائے بنا کر لاؤ ایک پیالی میرے لیے بھی“

تقی نے اب کی بار گھورتے ہوئے حکم صادر کیا، کیا چیز تھی وہ ساری عادات اس سے یکسر مختلف تھیں، اور ڈھیٹ ایسی کہ نئے پن سے بھی کچھ ہاتھ آگے

”میں تورات میں کبھی صحن میں نہیں گئی مجھے فوارے کے پاس سے ڈر لگتا ہے“

اگلی خوبی بڑی مصومیت سے بتائی جو تقی کے دل میں اس کی رہی سہی عزت پر بھی پانی پھیر گئی اسے ڈر پوک لوگ بالکل پسند نہیں تھے۔ گھور کر غصے سے اسے دیکھا، معصوم چہرہ بمشکل آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔

”چلو میں ساتھ چلتا ہوں اٹھو، تقی نے ایک دم سے کرسی پیچھے کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا، مالانے بے زار صورت

بنائی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی، مجال ہے یہ شخص ذرا سا بھی احساس کرے اسے ڈاکٹر نہیں ہونا چاہیے تھا اسے تو فوج میں ہونا چاہیے تھا مالانے گھور کر اس کی پشت کو دیکھا وہ اس کے آگے چل رہا تھا۔

تقی اسے اپنے ساتھ باورچی خانے تک لے آیا تھا اور مالانے شکر ادا کیا سردی کی وجہ سے مٹی کے بنے چولہے میں کوئی لے پہلے ہی دھک رہے تھے نہیں تو اسے آگ بھی جلانے کا حکم صادر ہونا تھا۔

سٹیل کی چھوٹی سے دیگی کو اٹھایا، اس میں پانی انڈیلا اور اسے چولہے پر رکھ کر کوئی لوں پر پھونکنے سے پھونک مار کر آگ کو سلگایا کوئی لے دھک کر اب آگ پکڑ رہے تھے تقی پاس ہی ہاتھ باندھے کھڑا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ کچن کا کام تو بڑی مہارت سے کر رہی تھی۔

”پتی زیادہ ڈالو اور قہوہ زیادہ پکاو“

وہ چھوٹے سے ڈبے میں سے چیچ کی مدد سے پتی پانی میں ڈال رہی تھی جب تقی نے سر پر کھڑے حکم دیا، مہندی لگے ہاتھ آج دوسرے دن ہی چولہے میں جوھنکے ہوئے تھے، وہ سر پر کھڑا تھا مالا کا دل کیا جلتا کوئی لہ اٹھا کر اس کے پاؤں پر دھر دے، چائے کو دو پیالیوں میں ڈال کر وہ کمرے میں آئے تھے۔

تقی نے اسے چائے پینے کا کہا اور خود چائے کی پیالی ایک طرف رکھے اسے پھر سے پڑھانے میں مگن ہو چکا تھا۔ کبھی چائے کی چسکی لیتا اور پھر پڑھانے لگتا اور مالا پڑھنے سے زیادہ اس کے ہلتے ہاتھ اور اس کے مسلسل بولتے لبوں کو دیکھ رہی تھی وہ ریاضی سمجھاتا کبھی ماتھے پر انگلی پھیر رہا تھا کبھی پر سوچ انداز میں لبوں کو منہ کے اندر لے جا کر سوچ رہا تھا، کبھی قلم کو انگلی میں جھلا رہا تھا۔ مالا تو یہ سب دیکھنے میں مصروف تھی اور اسے یہ سب دیکھنے میں ہی مزہ آرہا تھا۔

چائے کا اثر بھی مالا پر کوئی پندرہ منٹ ہی رہا تھا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ تقی نے اسے یوں بند آنکھوں کے ساتھ دیکھا تو اسے سر سے پکڑتے ہوئے چہرہ اوپر کیا۔

”مالا۔۔۔ آنکھیں کھولو“

ملائی م سے لہجے میں کہا، پروہاں اب کوئی پیش رفت نہیں تھی وہ گہری نیند میں تھی۔

”چلو سو جاؤ۔۔“

تقی نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا اور گہری سانس لیے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ وہ میز پر ہی سر رکھ چکی تھی۔ تقی جھنجلا کر اپنی جگہ سے اٹھا کیا عجیب تحفہ ہے یہ لڑکی منہ میں بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور پھر اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کیا۔

مالا یہاں نہیں پلنگ پر چلو شاباش

اسے بازو سے تھام کر وہ پلنگ تک لایا تھا اور پھر لیٹتے ہی مالا تو ایسے نیند میں گئی اسے خود کا ہوش ہی نہیں رہا۔

اس پر لحاف درست کرنے کے بعد وہ خود کروٹ لے چکا تھا۔

* * * * *

صحن میں جگہ جگہ بھنسیوں کے چارہ کھانے کے لیے کھریاں رکھی گئی تھیں جن کے ساتھ ان کو باندھنے کے کھونٹے تھے صحن کی دیواروں پر بھنسیوں کے گوبر کو پیڑوں کی شکل دے کر قطار در قطار چیکایا گیا تھا۔

سکینہ بھاگتی ہوئی اب مالا کے پاس آگئی تھی۔

”مالا۔۔۔ پاگل ہو کیا۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو؟“

سکینہ نے کندھے سے پکڑ کر زور سے اسے پیچھے کھینچا وہ ہلکا سا لڑکھڑائی

”دکھ نہیں رہا تمہیں اندھی ہو کیا، یہ جھوٹ کے پلندے جلا رہی ہوں، جھوٹ لکھا ہے ان میں سب کا سب، لڑکی

خوبصورت اور لڑکا اس کے حسن کا دیوانہ“

مالا نے نخوت سے ناک چڑھا کر کہا اور ہاتھ میں پکڑے رسالے کے دو ٹکڑے کر کے آگ میں پھینک دیے، سیاہ

رنگ کی شال کو کندھوں پر اوڑھے وہ سرخ ناک لیے غصے میں بھری کھڑی تھی۔

”پاگل کہیں کی چھوڑ، کیوں یہ قصے کہانیاں جلا رہی ہے جھوٹ کے پلندے ہوں یا جو بھی وقت تو گزرتا ہے مجھے

دے دے خود کو تو اب تقی مل گیا“

سکینہ نے اس کے ہاتھ سے رسالہ چھنتے ہوئے کہا

”تقی مجھے نہیں ملا میں انہیں مل گئی پتہ نہیں کس کس بات کے بدلے مجھ سے لے رہے ہیں وہ“

مالا نے غم و غصے کے ملے جلے لہجے میں کہا ویسے بھی سکینہ سے کب وہ کوئی بات چھپاتی تھی دو دن سے تقی اسے

فارمولے یاد کر رہا تھا اور آج رات آخری رات تھی اس نے خبردار کیا تھا کہ آج ہر حال میں فارمولے یاد ہونے

چاہیے نہیں تو اس سے برا کوئی نہیں ہو گا۔

جس پر وہ دل میں سوچ کر ہی رہ گئی اس سے برا بھی کوئی نہیں اس کے لیے اور اب وہ سکینہ کے سامنے

پھٹ پڑی تھی۔

”جو ملے بس اس کو پڑھانے بیٹھ جاتے ہیں، میں تو یہ سمجھی تھی وہ ڈاکٹر بننے تک ہی پڑھائی کے کیڑے ہیں پر نہیں بھئی ان کو تو پڑھائی کا ایسا خبط ہے جب کوئی مریض بھی ان کے پاس آئے گا کہیں گے پہلے الجبرا کے سارے فارمولے سناؤ، ٹینس بتاؤ پھر چیک اپ کروں گا“

مالا دانت پیستے ہوئے جلے دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھی۔ سکینہ نے بمشکل اپنی ہسنی دبائی

”مالا ایسے کو سننے سے اچھا ہے تو بات کر تقی بھائی سے کہ تجھے بالکل نہیں پڑھنا“

سکینہ نے مسکراہٹ چھپا کر شائستگی سے سمجھایا

”کیا کہتی اس سے پہلے ہی رات کہہ دیا، خبردار۔۔۔ اگر یہ سوچا بھی تو“

مالا نے بھاری سی آواز میں تقی کی نقل اتاری اور گردن کو تقی کی ہی طرح اکڑایا وہ ابھی دنیا پور جاتا تھا اور پھر واپس آکر ہسپتال کی تعمیر میں لگ جاتا تھا۔ شادی کو آج چوتھا دن تھا اور فارمولے سنانے کا آخری دن

”تو پھر تو میں یہی کہوں گی دل لگا کے پڑھ لے“

سکینہ نے لب بھینچے اس کا مسیٰ لہ حل کیا، جو ناک پھلائے کھڑی تھی، تقی پر تو بس چلتا نہیں تھا سو سارا سالوں پر چلا لیا تھا

”دل ایک ہی جگہ لگایا جاسکتا ہے ایک وقت میں اور میرا ان کے ساتھ لگ چکا ہے اب پڑھائی میں خاک لگے گا“

مالا نے نخوت سے ناک چڑھائی، وہ کرتی بھی کیا تقی اسے پڑھانے بیٹھتا تھا اور وہ بس اسے دیکھے جاتی تھی نتیجہ یہ کہ آج چوتھا دن تھا تقی کی نرمی کا ناجائزہ فائی دہ اٹھاتے ہوئے۔ وہ جلتے کاغذوں پر نگاہیں جمائے کھڑی ان کے ساتھ خود بھی سلگ رہی تھی۔

سائی یکل کچی مٹی سے بھری سڑک پر چل رہا تھا، سائی یکل کے پیسے کے ساتھ مٹی گھوم کر دھول اڑا رہی تھی، اور سائی یکل سڑک کے دائیں بائیں کچے پکے مکانوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، کچھ خواتین سروں پر کچی مٹی کے گھڑے رکھے باتیں کرتے ہوئے جا رہی تھیں، عصر کے بعد کا وقت تھا اور چکی کی مدھری کوک پورے گاؤں میں گونج رہی تھی۔

لڈن ہلکے بھورے رنگ کے قمیض کے اوپر سرخ سویٹر پہنے اور کانوں اور منہ کو اچھی طرح گرم مفلر سے لپیٹ، نیچے تہبند باندھے سائی یکل کے پیڈل پر زور سے پاؤں مار کر چلا رہا تھا۔

اس نے حویلی کے بیرونی گیٹ کے آگے سائی یکل روکا اور پھر سائی یکل کا ہینڈل تھامے باغوں کے درمیان راہداری پر چلتا ہوا آگے بڑھا۔ دور سے ہی بیرونی برآمدے میں گاما جسٹر نما کھاتوں پر جھکا کچھ لکھنے میں مصروف نظر آ رہا تھا، اور کچھ دور چارپائیوں پر عمر رسیدہ دو آدمی حقوں کے کش لگاتے باتوں میں مصروف تھے۔

لڈن نے سائی یکل برآمدے کے بالکل سامنے پیپل کے درخت کے ساتھ کھڑا کیا اور پھر سست روی سے چلتا ہوا برآمدے میں آکر گامے کی کرسی میز کے ساتھ رکھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”تھک گیا میں تو اب اوپر سے تقی میاں کی ڈانٹ الگ سننے کو ملے گی“

لڈن نے اپنے کندھے پر ڈالامنڈ اس اپنا چہرے پر پھیرتے ہوئے افسردگی ظاہر کی، گامے کے کانوں میں اس کی آواز پڑی جواب بھی سر جھکائے کچھ لکھنے میں مگن تھا اس کا تاسف بھرالہجہ گامے کو اس کی طرف متوجہ کر گیا۔

”تقی میاں سے کس بات کی ڈانٹ بھئی، لڈن خیر تو ہے ان کا کوئی کام تو خراب نہیں کر بیٹھے کہیں“

گامے نے سر اوپر اٹھائے عینک کوناک پر انگلی سے تھوڑا نیچے کئی غور سے لڈن کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا، جو پریشان صورت لیے بیٹھا تھا۔

”کام خراب تو نہیں کیا چاچا گامے پر کام کر بھی نہیں سکا اللہ قسم دوپہر کا نکلا سارے گاؤں کی دوکانیں دیکھ لیں اور پھر وہ سڑک پار جو دو دوکانیں ہیں ان کو بھی دیکھ کر آ رہا ہوں پر نہیں ملا قلم تقی میاں کا، اب ڈانٹ پڑے گی ان سے“

لڈن نے اپنی ساری آج کی آپ بیتی گوش گزار کی اور مایوسی سے کندھے گرائے، گامے نے نا سمجھی کے شکن ماتھے پر سجائے

”ہیں ایسا کونسا قلم منگوا لیا تقی میاں نے جو پکی سڑک والی دوکانوں سے بھی نہیں ملا“

گامے نے تشویش ظاہر کی

”مجھے اسی بات کا پہلے ہی ڈر تھا اسی لیے میں ان کا پرانا قلم دیکھ کر بھی گیا انہوں نے کہا تھا ایسا لے کر آنا پر ملا نہیں ویسا“

لڈن نے گردن نیچے جھکائے مایوسی سے بتایا، تقی نے لڈن کو قلم لانے کے پیسے دیے تھے، لڈن کیونکہ اکثر کچھ کا کچھ اٹھاتا تھا اس لیے لڈن نے تقی سے کہا کہ جیسا قلم چاہیے تقی میاں وہ ایک دفعہ مجھے دکھادیں تقی نے جیب سے پرانا قلم نکال کر لڈن کو دکھایا کہ یہ دیکھو بالکل ایسا قلم لانا ہے، پر لڈن کو کہیں سے ویسا قلم نہیں ملا تھا۔

”ایسا کونسا قلم ہے تقی میاں کے پاس، دیکھو ایسا تو نہیں تھا کہیں“

گامے نے حیرت ظاہر کی، اور اپنے ہاتھ میں پکڑا قلم سامنے کیا یہ ڈالر کا سیاہی والا قلم تھا، لڈن سر ہلاتا ہوا آگے ہوا

”نہیں ایسا نہیں تھا جو تقی بھائی نے دکھایا تھا مجھے، اسکا جو ڈھکن ہے نا اس کے اوپر سوراخ تھا اب یہ کسی قلم میں نہیں ملا مجھے“

لڈن نے گامے کے ہاتھ سے قلم پکڑا اور اس کے اوپری ڈھکن پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے، گامے کو پوری بات سمجھائی

گامے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر آگے ہوتے ہوئے افسوس سے اس کے ہاتھ سے قلم پکڑی، ”لڈن جب اللہ عقل بانٹ رہا تھا تو سچ بتا تو کیا کر رہا تھا اس وقت، یہ قلم کے اوپر ڈھکن ایسا ہی ہوتا ہے تقی میاں نے جو قلم تجھے دکھایا ہو گا اس کے اوپری ڈھکن پر سے یہ قلم کا ہینڈل ٹوٹ گیا ہو گا جس کی وجہ سے سوراخ ہو گیا جیسے دیکھ یہ میرے پرانے قلم کے اوپر بھی سوراخ ہے“

گامے نے نگاہیں جھکائے پاس پڑی ٹوکری میں سے ایک قلم نکال کر لڈن کے سامنے کیا تو لڈن میاں پہلے تو کچھ دیر دونوں قلم دیکھتا رہا پھر بتیسی نکالی اور ٹوپی اتار کر اپنی گنج پر خارش کرنے لگا۔

”وہ بس چاچے گامے میں اوپر سوراخ کو ہی ذہن میں نشانی بنا کر لے گیا تھا اس لیے ایسا ہوا میرے ساتھ سوراخ والا کوئی تھا ہی نہیں“

لڈن نے ہنستے ہوئے اپنی بات مکمل کی، جبکہ گاما اب متواتر ہنستے جا رہا تھا۔

حاکم قصاب مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا تھا، مغرب کے بعد ہی رات کے کھانے کا دسترخوان بچھ جاتا تھا اور اب کھانے کے بعد چوہدری حاکم دسترخوان پر ہی بیٹھے منیر میاں سے بیوپار کے بارے میں محو گفتگو تھے۔ پاس ہی نقیب اور نوازش بھی بیٹھے ان کی گفتگو میں کہیں کہیں حصہ لے رہے تھے۔

تاری بو اب برتن دسترخوان پر سے اکٹھے کر رہی تھیں اور سکینہ بھاگ بھاگ کر برتنوں کو باورچی خانے تک لے جا رہی تھی۔ بلقیس اور غزالہ باورچی خانے میں گھسی چائے بنا رہی تھیں، سردیوں میں کچھ لوگ رات کے کھانے کے بعد لازمی چائے لیتے تھے، ویسے تو سونے سے پہلے گرم دودھ کا بڑا گلاس چھوٹے بڑے سب مکین کو پیش کیا جاتا تھا۔

تقی کھانے کے کچھ دیر بعد ہی، دسترخوان سے اٹھ آیا تھا اسے ہسپتال کی مرمت کا سارا حساب کتاب اس وقت کرنا ہوتا تھا اور ساتھ ساتھ وہ مالا کو بھی پڑھاتا تھا۔

آج اسے کمرے میں آئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا لیکن مالا آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی، اچانک تقی کو یاد آیا کہ تین دن سے وہ اسے الجبرا کے کلیے یاد کروانے میں لگا تھا اور کل رات اس نے سختی سے اسے کہا تھا کہ یہ کلیے اگر کل اسے یاد نہ ہوئے تو اس کو سزا ملے گی۔ وہ ان تینوں دنوں میں اس بات کا باخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ مالا ذہنی طور پر بالکل کمزور نہیں ہے وہ فقط حد سے زیادہ لا پرواہ ہے اور اس کا دماغ صرف اس کے دل کی سنتا ہے اور اس کا پڑھائی کے علاوہ ہر اوٹ پٹانگ کام میں لگ جاتا ہے۔

آدھے گھنٹے سے بھی اوپر وقت جانے لگا تھا تقی ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر نکلا، باہر نکلتے ہی قدم تھم گئے آج تو حویلی کے تمام مکیں اٹاری کے دسترخوان پر محفل جمائے بیٹھے تھے شائ داس کی وجہ منیر میاں کی چار دن کے بعد شہر سے واپسی تھی، تقی نے نگاہیں گھمائی تو اس کی زوجہ محترمہ بھی منہا کے ساتھ گاؤ تکیے پر مہرانی کی طرح کہنی ٹکائے بیٹھی تھی اور اب تقی کو دیکھ کر بھی ان دیکھا کر رہی تھی۔ گہرے سبز رنگ کے ویلیوٹ کے جوڑے پر ٹشو کا سنہری کناری والا دوپٹہ اوڑھے وہ بڑے انہماک سے سب کی باتوں کو سن رہی تھی۔

فارمولے تو سرے سے یاد ہی نہیں کیے تھے، جب کتاب لے کر بیٹھتی کبھی کچھ ذہن میں آنے لگتا تو کبھی کچھ اور ایسے کرتے ہی صبح سے شام ہو گئی تھی اور اب قید و مشقت کا وقت شروع ہو گیا تھا جس میں جانے کو اس کا بالکل دل نہیں تھا وہ تو اچھا ہوا سب بڑے باتوں میں لگ گئے اور وہ بھی ان کے ساتھ جم کر بیٹھ گئی، پر اب چانک تقی کمرے سے باہر آ کر اسے گھور رہا تھا، کچھ دیر تو وہ ان دیکھا کرتی رہی پھر اچانک نظر اٹھی تو تقی اس کو ہی گھور رہا تھا جیسے ہی نظر ملی تقی نے آنکھوں کو گھماتے ہوئے مالا کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا پر وہ تو ایسے لا پرواہی ظاہر کر

گئی جیسے دیکھا ہی ناہو، جلدی سے رخ موڑے باتوں میں مگن ہو گئی اچھا ہے جتنا وقت ایسے گزر سکتا ہے گزر جائے اس جن نماشوہر سے سے بچی رہوں میں۔

”مالا۔۔۔۔“

تقی نے اچانک پکارا تو مالا نے چونک کر سر اوپر اٹھائے اس کی طرف دیکھا، سب کے بیچ بیوی کو بلا کر کمرے میں لے جانا بہت معیوب حرکت تھی اسی بات کا فائی دہ تو وہ اٹھا رہی تھی۔

”جی۔۔“

بڑے پریم سے جی کہا اور تقی کی طرف دیکھا جو آج بھی پتلون اور شرٹ میں ہی ملبوس تھا وہ اکثر شہر سے واپس آ کر فوراً کپڑے تبدیل نہیں کرتا تھا اور آج بھی نہیں کیے تھے۔

”میری ایک کتاب نہیں مل رہی ہے میز پر ہی رکھی تھی آ کر دیکھ کر دو ذرا“

تقی نے رعب سے سب کے بیچ حکم صادر کیا جسے وہ کسی صورت ٹال نہیں سکتی تھی کیونکہ خدیجہ بیگم سمیت اب سب بڑے اسے گھور رہے تھے، وہ منہ بسورتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی اور تقی کے پیچھے چل دی جو اسے حکم صادر کرتے ہی کمرے کی طرف پلٹ گیا تھا، کمرے میں داخل ہوتے ہی تقی اس کی طرف مڑا، وہ اتنی لمبی ہونے کے باوجود تقی کے بس کندھے تک آتی تھی تقی یوں پلٹنے پر وہ ایک دم رک کی اور نگاہیں اس کے سینے پر جمادیں

”جب میں سب کے بیچ آنکھوں سے اشارہ کیا کروں تو فوراً اٹھ کر کمرے میں آ جایا کرو وقت مت ضائع کیا کرو“

تقی نے گھور کر تنبیہ کی، آنکھوں سے اشارے بڑی محبت بھرے کرتے ہیں نا جو میں فوراً حکم کی تعمیل کیا کروں

۔۔۔۔۔ مالانے جل کر سوچا اور تقی کے پلٹتے ہی اسے گھور کر دیکھا جو اب میز کے پاس جا کر کرسی پیچھے دھکیل رہا تھا

”چلو نکالو اب کاپی اور سنو اور پتا ہے نا آج اگر فارمولے نایا دہوئے تو سزا ملے گی“

”چلو بتاؤ، اے پلس بی پلس سی کا مربع کس کے برابر ہوتا ہے“

[illegible]

”کوئی اور پوچھ لیں یہ تھوڑا مشکل ہے“

”ملا میں تنگ آگیا ہوں تمہیں کیوں نہیں یاد ہوتے یہ، آج تین دن ہو گئے ہیں ہم انہی فارمولوں پر بھٹک رہے ہیں، آگے نہیں بڑھ رہے ہیں“

تقی نے اونچی آواز میں جھاڑا تھا اور تاسف سے اس کی طرف دیکھا، جو اس کے اچانک یوں غصے میں آجانے پر بدک کر سپیدھی ہوئی۔

تقی نے غصے سے اس کے سامنے کتاب میز پر مارتے ہوئے سزا سنائی تو وہ ایک لمحے کے لیے ساکن ہو گئی لیکن اگلے ہی لمحے لکھنے کے خیال سے ہی سکینہ کا چہرہ ذہن میں لہرا گیا، لکھنے کی سزا تو بری نہیں تھی۔

مالا نے اس کے غصے سے ڈرتے ہوئے منمننا کر اس کی سزا قبول کی اس وقت تو اس کا ذہن ریاضی کے ان فارمولوں سے ہٹانا تھا کیونکہ باقی مضامین کا سبق وہ یاد کر چکی تھی۔

تقی اسے جواب دینے کے بجائے اس کے بستے سے کچھ نکالنے میں مصروف تھا اور پھر خاکی کاغذ میں لپیٹی ہوئی کاپی نکال کر اس کے صفحے پلٹے۔

”اچھا۔۔۔۔۔ کل پھر تم اس سے لکھو الو گی ساری سزا ہیں ناں؟؟؟“

تقی نے کاپی کھول کر اس کے بالکل سامنے پٹنی اور سکینہ کی لکھائی پر انگلی دھر کر اسے خونخوار نگاہوں سے گھوراما۔
نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ آنکھوں کو مکمل طور پر سکوڑے ہوئے تھا۔

ہیں۔۔۔۔۔۔ کیا چیز تھا اس کے سامنے بیٹھایہ شخص وہ مجرم بنی کٹہرے میں کھڑی تھی اور اس کے ڈاکٹر صاحب اب کالا کوٹ پہنے اس سے سوال پوچھ رہے تھے۔

”کس کی لکھائی ہے یہ؟“

پھر سے غصے سے سوال کیا، تقی گھور رہا تھا اور انگلی لکھائی پر دھری ہوئی تھی، مالانے تھوک نگلا، آج تو وہ کچھ زیادہ ہی غضبناک ہو رہا تھا روزیوں تو نہیں پڑھاتا تھا۔

”مہ۔۔۔ میری ہے۔۔۔ اور کس کی ہوگی“

گڑبڑا کر بے ربط جملوں سے جھوٹ بولا اور نظریں اس کی گھورتی نظروں سے ناملانے کی بھرپور کوشش کی ” جھوٹ مت بولو مجھ سے، تمھاری لکھائی یہ والی ہے یہ کس کی ہے سچ بتاؤ جس سے ہوم ورک کرواتی تھی، جماعت کے کام میں تو تمھاری لکھائی اور ہے“

تقی نے بھنویں سکڑ کر سوال کیا اور پاس پڑی دوسری کاپی کو اس کے سامنے رکھا، وہ اس کے سکول کی کوئی استانی نہیں تھا جو جھانسنے میں آجاتا۔

”سک۔۔ سکینہ کی“

مالا نے سر نیچے جھکایا اور جواب دیا، تقی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا، پھر غصے سے آگے ہوا

”لکھو ابھی سارے فارمولے، چاہے ساری رات لگ جائے ایک فارمولا سودفعہ جلدی کرو“

تقی نے لب بھینچے اور پھر اونچی آواز میں حکم صادر کیا، مالا نے زور سے آنکھیں بند کی۔ اور پنسل تیزی سے کاغذ پر چلنے لگی تھی۔

دل میں تقی کے لیے آج سے پہلے اس نے اتنی نفرت کبھی محسوس نہیں کی تھی جتنی آج کر رہی تھی وہ خود اب یوں ہی ماتھے پر بل ڈالے کچھ لکھنے میں مگن تھا۔

مالا کا دل کیا پنسل کو اچھی طرح تراش کرے اور تقی کے ہاتھ میں زور سے مار دے اسے بچپن سے ہی لکھنے سے بے انتہا الجھن تھی اور آج جو کام دیا تھا وہ تو اس کے لیے سوہان روح تھا۔

اس کے ہاتھ درد کرنے لگے تھے پر تقی نے جان نہیں چھوڑی، رات کے پتا نہیں کس پہر اس کو مالا کے اونگھنے پر ترس آیا تھا اور پھر رعب سے سونے کا حکم جاری کیا۔

”چلو سو جاؤ اور ابھی سکول سے چھٹیاں ہیں میں جانتا ہوں سارا دن گھر میں فارغ ہی ہوتی ہو یہ سزا پوری کرو گی“

تقی نے انگلی ہوا میں اس کے سامنے معلق کیے اسے خبردار کیا اور پھر اشارہ پلنگ کی طرف کر دیا اور وہ غصے سے تقی کو گھورتے ہوئے پلنگ کی طرف چل دی اس کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہونے کو تھا۔ پلنگ پر لیٹتے ہی غصے سے جلتی آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک ماچس کی تیلی کا شعلہ نمودار ہوا اور پھر فرہاد نے ہاتھ میں پکڑی تیلی سے سنگھار میز پر دھری موم بتی کو شعلہ دیا، موم بتی جلتے ہی ہلکی سی پیلی روشنی کمرے میں پھیلی گئی تھی۔ وہ سرشار سا مسکراتا ہوا پلنگ کی طرف واپس پلٹا، جہاں منہا لیٹی تھی، فرہاد جیسے ہی پلنگ کے پاس پہنچا چہرے پر رقم کچھ دیر پہلے والی خوشی آہستگی سے غائب ہوئی منہا اب آنکھوں پر بازو دھرے لا پرواہی سے لیٹی تھی، وہ جواب اس تکمیل کے بعد بہت ساری باتیں کرنے کی غرض سے پلٹا تھا اس کا یہ انداز دیکھ کر بجھ سا گیا۔ پلنگ پر لیٹتے ہی کروٹ اس کی طرف لی تھی۔ اور پھر محبت سے اس کی آنکھوں پر سے بازو کو ہٹایا۔

”منہا۔۔۔ تم خوش نہیں ہو کیا؟“

فرہاد نے آہستگی سے پوچھا، منہا نے اپنے اوپر جھکے اس کے چہرے کو بغور دیکھا، آنکھوں کے بجھے دیوں میں کچھ پل پہلے کی کوئی خوشی رقم نہیں تھی۔

”میرا خیال ہے آج تو یہ پوچھنا نہیں چاہیے تمہیں“

منہا نے روکھائی سے جواب دیا اور پھر دھیرے سے بازو اس کی گرفت سے آزاد کیا، فرہاد نے بھنویں نا سمجھی سے سکیڑیں

”تم ہو کر بھی نہیں تھی“

فرہاد نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی تھی جس پر وہ ایک لمحے لیے جزبز ہوئی اور پھر غصے سے پیشانی پر بل ڈالے

”میں تمہارے ذہن کا کچھ نہیں کر سکتی کل تک تمہیں کسی اور بات پر اعتراض تھا، میں نے آج وہ دوری بھی ختم کر دی اور آج تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں ہو کر بھی نہیں تھی“

منہا نے جھنجلا کر جواب دیا نگاہیں وہ اب بھی فرہاد سے نہیں ملارہی تھی، جس کی وجہ سے فرہاد عجیب کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ پر منہا کا یوں خفگی بھر انداز دیکھ کر جلدی سے بات کو بدلہ شائے وہ ہی غلط سوچ رہا ہے۔

”اچھا ناراض تو نہیں ہو میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا، میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں کبھی یوں زبردستی تو حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا تمہیں“

فرہاد نے گڑبڑا کر اپنی بات کا بہتر بدلہ تھا، منہا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا

”میں زبردستی نہیں تھی اپنی رضا سے تھی اور اب مجھے سونا ہے، خدا را۔۔۔ سونے دو“

منہا نے نخوت سے جواب دیا اور ہاتھ ہوا میں معافی کی صورت جوڑے فرہاد کے چہرے پر یک لخت ندامت لہرا گئی

”ہمم۔۔۔ سو جاؤ۔۔۔“

آہستگی سے اجازت دی، منہا فوراً بازو پھر سے آنکھوں پر دھر چکی تھی، اور وہ پریشان سا خلا میں گھور رہا تھا۔

موم بتی کا شعلہ دھیرے دھیرے ہل رہا تھا اور دیوار پر کمرے کی کتنی ہی چیزوں کے ہیولے بن رہے تھے۔

پر فرہاد کا دل آج سب پالینے کے بعد بھی بچھ سارہا تھا۔

تقی جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہوا سامنے پلنگ کے منظر نے اس کا دماغ گھما دیا، مالا آج پھر لحاف میں گھسی سوری تھی، کمرے کے اندر بلب روشن تھا وہ چہرہ تک لحاف میں چھپائے ہوئے تھی۔ یہ دوسرا دن تھا وہ رات کا کھانا نہیں کھا رہی تھی اور چھ بجے ہی سو جاتی تھی۔

پہلے دن تو تقی نے اسے نہیں جگایا تھا کہ شامی دتھکی ہوئی ہے کوئی بات نہیں اگر ایک دن کی چھٹی ہو بھی جاتی ہے تو پر یہ کیا وہ تو روز کا معمول بنا رہی تھی اس حرکت کو، وہ ایک ہفتے سے اس پر سر کھپا رہا تھا لیکن سب بے سود تھا وہ جتنی اس پر محنت کرتا وہ اتنا ڈھیٹ ہو جاتی تھی۔ اور اب تو وہ روزیہ سونے والا کام کر کے اسے مزید تنگ کر رہی تھی۔

سکول سے سر دیوں کی دس چھٹیاں تھیں تقی چاہتا تھا وہ ان چھٹیوں کا فائدہ اٹھا کر اسے زیادہ زیادہ پڑھالے گھر پر ایک ہفتے بے کار گزارا تھا۔ تقی لب بھیجے پلنگ کے پاس گیا اور لحاف کو اس پر سے اٹھایا۔ وہ لحاف اٹھانے پر بھی نہیں اٹھی تھی ایک طرف کروٹ لیے بے خبر سوری تھی۔

”مالا۔۔۔ مالا اٹھو۔۔۔“

تقی نے جھک کر اسکے کندھے کو دھیرے سے ہلاتے ہوئے پکارا، مالا نے آنکھیں اور زور سے بند کر لیں اس وقت اٹھ جانا اپنی جان کو عذاب میں ڈالنے کے مترادف تھا وہ اس قید اور مشقت سے بری طرح تنگ آچکی تھی اور کل یہ سونے کا نائک کار آمد ثابت ہوا تھا اس لیے آج پھر یہی دہرایا۔ تقی دن بدن اس پر پڑھائی کی سختی زیادہ کر رہا تھا جو اس کی برداشت ختم کر رہی تھی۔

”مالا دیکھو دو دن ہو گئے ہیں تم یوں جلدی سو جاتی ہو، اٹھو آج پڑھنا ہے لازمی“

تقی نے غصے سے اس کے کندھے کو پھر سے ہلاتے ہوئے کہا، لیکن وہاں تو کوئی اثر نہیں تھا، پیچھے ہوا کمر پر ہاتھ دھرے اسے بغور دیکھا اور پھر ایک دم سے میز پر سے پانی کا پورا بھرا ہوا جگ اٹھا کر اس پر الٹ دیا پانی چھپاک کی آواز سے گرا اور اسے سارا بھگو گیا۔

”آہ۔۔۔۔۔“

وہ بوکھلا کر اٹھی، اتنی سردی اور ٹھنڈا پانی وہ کمر تک بھیگ گئی تھی اور بال اور منہ سے پانی نچڑھاتا حیرت اور غصے سے تقی کی طرف دیکھا، وہ سخت تھے پر ایسا تشدد مالا کی نسیں ابھرنے لگیں۔

”اٹھو اب، شرافت سے میز پر آؤ پڑھنا ہے“

تقی نے حکم صادر کیا اور قدم میز کی طرف بڑھا دیے، مالا کا ضبط جو کے آخری حدود تک تو تین دن سے پہنچا ہوا تھا آج سرے سے ختم ہوا

”نہیں پڑھنا ہے مجھے۔۔۔۔۔“

مالا کی سپاٹ آواز ابھری تقی جو میز پر کتابیں نکال رہا تھا پلٹ کر اس کی طرف دیکھا، وہ ماتھے پر بل ڈالے رعب سے بیٹھی تھی انداز ایسا تھا جیسے اس کے اندر کوئی بدروح گھس گئی ہو

”پڑھنا ہے اٹھو پہلے کپڑے تبدیل کرو، آؤ سناؤ جو پرسوں پڑھایا تھا“

تقی نے اس کے غصے اور اس کے لہجے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے متوازن لہجے میں اگلا حکم صادر کر دیا اور پھر سے میز کے اوپر اپنے کاغذ کھول کر رکھنے لگا

”میں نے کہا نا مجھے نہیں پڑھنا اور اب کپڑے بھی تبدیل نہیں کرنے یونہی گیلے کپڑوں میں سونا ہے مجھے“

مالا نے بچوں کی طرح ضد باندھی اور لحاف اٹھائے اپنے اوپر اوڑھ لیا، تقی نے مڑ کر دیکھا تو وہ پھر سے لحاف اپنے اوپر اوڑھ چکی تھی۔ تقی تپاک سے آگے بڑھا اور ایک جھٹکے سے پورے کا پورا لحاف اس کے اوپر سے کھینچ لیا۔

تقی اب غصے سے گھور رہا تھا، اور وہ جو پہلے ہی سرخ چہرہ لیے لیٹی تھی ایک جھٹکے سے اٹھی، سیاہ رنگ کے جوڑا تھا گلے میں گلائی صورت سرخ دھاگے سے شیشے جڑے تھے جو اب گیلے ہو کر دن سے چپک رہے تھے۔

”ڈھیٹ میں نہیں آپ ہیں، آپ ظالم ہیں، میں جب پڑھنا نہیں چاہتی تو کیوں زبردستی مجھے پڑھانے پر تلے ہیں“

مالا اونچی آواز میں چیخی تو تلقی تمللا کر آگے بڑھا آج سے پہلے مالا کیا کسی نے اس سے اس قدر بد تمیزی اور اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی وہ شائستہ مزاج تھا اور اسی طرح کے لوگ اسے پسند تھے۔

”آواز نیچی رکھو جاہل کہیں کی باہر جا رہی ہے کمرے سے“

لبوں پر انگلی دھرے اسے آہستہ بولنے کے لیے کہتا وہ بالکل پاس آگیا تھا، غصہ اسے کم آتا تھا پر آج مالا کی یہ بد تمیزی اسے بری طرح کھل گئی تھی۔

”اور ہاں زبردستی پڑھانا ہے مجھے تمہیں، اٹھو اب“

تقی نے غصے سے لال چہرہ لیے اس بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے نیچے اتار تھا۔ وہ چھوٹی سی گڑیا کی طرح اس کے بازو سے جھولتی ہوئی بیڈ سے نیچے آگئی تھی

”نہیں پڑھنا مجھے۔۔۔۔۔ سنا تھا ڈاکٹر بے حس ہوتے ہیں آج دیکھ بھی لیا، مجھے نہیں پڑھنا اور نا امتحان دینے
ہیں“

مالا نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑوایا تھا اور سختی سے تقی کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں، وہ چھٹانک بھر کی لڑکی جسے وہ معصوم سی بچی سمجھ سمجھ کر پڑھا رہا تھا آج اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑے وثوق سے کھڑی تھی۔ تقی کو عجیب سا احساس ہوا شادی کے ایک ہفتے بعد وہ یوں اس کو نیکی اور خود سے بے حد چھوٹی نہیں لگی تھی۔ مالانا ک اور

منہ پھلا کر پھر سے پلٹی تھی۔ تقی نے اس کے پلٹنے سے پہلے ہی بازو کو جھٹکا دیا تھا وہ لڑکھڑاگئی تھی۔ تقی نے جھٹکا دے کر اپنے قریب اور سامنے کیا تھا

”بات سنو میری غور سے مجھے یہ بد تمیزی، بچوں کی طرح ضد یہ سب پسند نہیں سمجھی اور تم یہ سب کر کے مجھے غصہ دلارہی ہو“

تقی نے دانت پیستے ہوئے اس کے باغی سے چہرے پر نگاہیں گھمائی، مالا کی آنکھیں بازو پر موجود ہاتھ کی گرفت کی وجہ سے پانی سے بھرنے لگا تھا

”آپ کو اگر اتنا کچھ ناپسند ہو سکتا ہے تو کیا میں انسان نہیں مجھے بھی کچھ ناپسند ہو سکتا ہے میرا خیال نہیں آپ کو“ مالا کی آواز اچانک آنسوؤں سے بھاری ہوگئی تھی، چمکتی گہری نیلی آنکھیں ایک پل میں آنسو چھلا کاگئی اور جیسے ہی اس کے گال پر آنسو گرا تقی کی گرفت فوراً اس کے بازو پر ڈھیلی ہوئی

”مجھے نہیں پڑھنا ہے میرا دل نہیں لگتا ہے پڑھائی میں اور نا مجھ سے پڑھا جاتا ہے، ہاں آپ پڑھ گئے ہیں تو کیا اب زبردستی سب کو پڑھائی میں گے اس کی مرضی کے بنا“

مالا اب ہچکیوں میں رونے لگی تھی تقی اس کے یوں رونے پر ایک دم سے پریشان ہو کر پلکیں جھپکانے لگا، وہ روتے ہوئے عجیب سا احساس دلاگئی تھی۔

وہ نا صرف رورہی تھی بلکہ بھگینے کی وجہ سے کپکپا بھی رہی تھی، اور وہ جو اس کے یوں رو دینے اور حق سے لڑنے پر عجیب طرح کے احساس سے دوچار ہوا تھا گنگ کھڑا تھا۔

پتہ نہیں کیوں پر ایک لمحے کو دل چاہا اسے کھینچ کر اپنی باہوں میں بھرے اور اس کے آنسو صاف کر دے یہ خیال آتے ہی تقی نے عجیب طرح سے دماغ کو جھٹکا تھا سامنے کھڑی یہ لڑکی جو اس کے نکاح میں تھی اس کی بیوی تھی اب وہ ننھی سی مالا تو نہیں تھی جس کے رونے پر وہ اسے گود میں اٹھالیتا تھا اپنے ساتھ لگالیتا تھا۔ کچھ تھا پر عجیب تھا۔

”ٹھیک ہے مت پڑھو جاؤ سو جاؤ“

تقی اچانک سپاٹ چہرے کے ساتھ پلٹا تھا اور پھر میز پر جا کر بیٹھ گیا اور وہ ششدر وہاں کھڑی تھی ننگے پاؤں، گیلے کپڑوں کے ساتھ کانپتی ہوئی۔

کچھ دیر یونہی کھڑی تقی کی پشت کو گھورتی رہی اور پھر آہستگی سے الماری کی طرف بڑھی اور کپڑے نکالے یقین نہیں آ رہا تھا اس نے کہہ دیا تھا مت پڑھو بار بار وہ پیچھے مڑ کر تقی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر کپڑے اٹھائے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے باہر نکلتے ہی تقی نے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا، کیا ہوا تھا یہ سب اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ ذہن کو جھٹکا اور پھر سے حساب کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کی

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب وہ واپس کمرے میں آئی تقی اسی طرح میز پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا، مالا اس کے پاس سے گزرتی پلنگ تک آئی، کیا تھا عجیب پر اب خوشی کیوں نہیں ہو رہی تھی وہ مان تو گیا تھا کہ مت پڑھو پھر اب کس بات کی بے چینی تھی دل کو۔

کیا تقی مجھ سے ناراض ہو گئے، چورسی نگاہ تقی پر ڈالی وہ مگن تھا گھنی پلکیں اٹھی ہوئی تھیں اور چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔ اسی طرح خود سے الجھتے تقی سے کی گئی بد تمیزی پر نادام ہوتے کب اسے نیند آئی خبر نہیں ہوئی۔

تقی نے ساری رات کرسی پر گزار دی تھی، وہ جیسے ہی ذہن کی مصروفیت کم کرتا تھا ایک دم سے کوئی احساس گھیرنے لگتا تھا اور مالا کا روتا چہرہ سامنے آ جاتا تھا۔ صبح جب ہاتھ اور پاؤں کی اکڑنے کے احساس سے آنکھ کھلی تو دیکھا وہ میز پر ہی سر رکھے سو رہا تھا۔

عصر کی اذان کے بعد اب سرمئی شام اپنے ڈیرے ڈال رہی تھی، حاکم قصر کی دیواریں اوپری حصے پر دھوپ کو رکھے الودع کہہ رہی تھیں۔

صبح میں رات کے کھانے کے لیے ہلچل سی شروع ہو گئی تھی۔ اٹاری کے زینے چڑھتے ہی یہ دائیں طرف کا تیسرا کمرہ تھا جو منہا اور فرہاد کا کمرہ تھا، شادی کو ابھی دو ہفتے ہی گزرے تھے، مسہری کو پلنگ کے کونوں پر اکٹھا کر دیا گیا تھا لیکن اتارا نہیں تھا، چمچا تا فرنیچر جو کے جدید طرز پر تیار کروایا گیا تھا کمرے کی شان میں اضافہ کر رہا تھا۔ پلنگ پر منہا اور فرزانہ سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں، پلنگ کے وسط میں فرزانہ کا تیسرا نمبر والا بیٹا علی حسن لیٹا تھا جس کی عمر چھ ماہ تھی، اس سے بڑے فرزانہ کے دو بچے تھے ایک بیٹا اور ایک بیٹی جو باہر رحمہ کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔

مالا پلنگ پر لیٹے علی حسن پر جھکی ہوئی تھی، رحمہ کے بعد اب جا کر اسے کوئی کھیلانے کو مل جاتا تو وہ اس بچے کے بوسے لے لے کر اسے تنگ کر دیتی تھی اور اب یہی حال وہ علی حسن کا کر رہی تھی۔

مالا بار بار علی حسن کے ننھے سے پیٹ پر سے قمیض اٹھائے وہاں ہونٹ رکھ کر پھونک مار رہی تھی، جس کے باعث وہ ننھی ننھی ٹانگیں مارتے ہوئے، سنسنے لگتا، کمرے میں علی حسن کی قلقاریاں گونج رہی تھیں۔ وہ صحت مند بھرے بھرے جسم کا بچہ تھا جس کو دیکھتے ہی پیار آ جائے

فرزانہ، منہا کے ساتھ آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہی تھی، جن سے مالا یکسر بے نیازی برتے ہوئے تھی، کچھ دیر وہ شادی شدہ سمجھدار بن کر ان کے بیچ بیٹھی پر پھر ان کی باتیں کچھ خاص سمجھنا آنے پر وہ ذہن پر زور دینے کے بجائے علی حسن کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

مالا اب علی حسن کے گال کو لگاتا رہا بوسے دے رہی تھی اس کا نرم گداز سا گال بوسے دینے پر ایک فرحت بخش احساس دلارہا تھا اسی لیے وہ علی حسن کے تنگ آجانے کو بھی محسوس نہ کر سکی پتہ تب چلا جب فرزانہ آپا نے اسے ایک چپت لگائی۔

”مالا توبہ ہے کتنا چومتی ہے بچے کو بس کر اب“

فرزانہ آپا نے ہنستے ہوئے اسے کندھے سے پیچھے کیا، مالا نے سیدھے ہو کر گہرا سانس لیا اور پیار سے علی کی طرف دیکھا

”آپا یہ ہے ہی اتنا پیارا ماشاء اللہ، دیکھو تو ذرا، دل کرتا ہے کھا جاؤں اس کے گال“

مالا نے دانتوں کو زور سے ایک دوسرے میں پیوست کیے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور پھر ننھے علی پر جھک کر اس کے گداز گالوں پر پھر سے مسٹھی دینے لگی۔

”میری تو دعا ہے اللہ تم دونوں کو بھی جلدی سے دے ایسے کھلونے“

فرزانہ آپا نے شرارت سے پہلے منہا اور پھر مالا کی طرف دیکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا، مالا اس بات پر گلال ہوتی ہو سیدھی ہوئی۔ فرزانہ آپا اس کے اس طرح شرمانے پر محفوظ ہوئی یں اور تنگ کرنے کے سلسلے کو بڑھایا

”مالا تجھے بیٹا چاہیے یا بیٹی“

فرزانہ آپا کے چھیڑنے پر وہ بے حال سی ہوئی اور پھر جلدی سے علی حسن کو اٹھایا

”آپا مجھے علی حسن دے دو بس“

مالا نے مسکراہٹ دبائے بات کو گول کیا اور پھر سے دانت زور سے بند کیے اسے پیار کرنے لگی اس کی ننھی ہتھیلوں کو کھول کھول کر وہ ان پر بوسے دے رہی تھی۔

”اچھا۔۔۔ مالا ایک کام کر تو علی کو لے کر اپنے کمرے میں چل میں بھی آتی ہوں کچھ دیر میں، تقی سے بھی ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں“

فرزانہ نے اسے علی کو اپنے کمرے میں لے جانے کا کہا تو وہ دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی اور پھر علی حسن کو گود میں لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی فرزانہ غور سے منہا کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے اور قریب ہوئی۔

”منہا۔۔۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے مجھے“

فرزانہ نے پریشان لہجے میں بات شروع کی تھی منہا نے چہرہ کچھ یوں اوپر اٹھایا جیسے سمجھ گئی ہو کیا بات کرنی ہے۔ نگاہیں چرائیں جبکہ چہرہ بے تاثر تھا

”منہا ویسے تو یہ تم دونوں کا آپسی معاملہ ہے مجھے اس میں بات نہیں کرنی چاہیے، لیکن میں کیا کروں فرہاد میرا بھائی بھی ہے اور میری بہن کی طرح ہمراز بھی“

فرزانہ نے مسکراتے ہوئے کہا منہا نے سر آہستگی سے ہلا کر جھکا دیا، فرزانہ آپا کی سب چھوٹے بہت عزت کرتے تھے، پر اب جو بات وہ کر رہی تھیں منہا کو بہت ناگوار گزر رہی تھی

”تمہیں کیا فرہاد اچھا نہیں لگتا شادی کے بعد بھی؟“

فرزانہ نے شائستگی سے سوال کیا تھا جس پر منہا کے چہرے پر ایک رنگ سا لہر اگیا۔

”ن۔۔۔ نہیں آپا ایسی بات نہیں ہے فرہاد بہت اچھے ہیں پر آپ جانتی ہیں میں۔۔۔“

منہا نے بات ابھی مکمل نہیں کی تھی کہ فرزانہ نے اس کی بات کو اچک لیا

”ہاں جانتی ہوں تم بہت کم گو ہو گئی ہو کچھ سالوں سے اور فرہاد بہت شوخ سا ہے لیکن اچھی بیوی وہی ہوتی ہے

جو شوہر کے رنگ میں خود کو ڈھال لے“

فرزانہ نے محبت سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا، منہا نے چہرہ فرزانہ کی طرف موڑا
 ”کیوں آپا بیوی ہی کیوں شوہر بھی تو ڈھل سکتا ہے نا اس کے رنگ میں“

منہا نے درشتی سے جواب دیا تھا جس پر فرزانہ ایک دم سے چپ ہوئی، اس کا لب و لہجہ فرزانہ کو اچھے سے باور کروا
 گیا تھا کہ وہ فرزانہ کی ان کے تعلق میں مداخلت کو پسند نہیں کر رہی ہے۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں اسے سمجھاؤں گی، اچھا اب دکھاؤ تو جو وہ کل جوڑا لے کر آیا تمہارے لیے شہر سے
 کہہ رہا تھا آپ کو پسند آیا تو ایک آپ کے لیے بھی لاؤں گا“
 فرزانہ نے جلدی سے بات کا رخ بدلہ تھا منہا نے مسکرا کر دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گئی
 اور فرزانہ خود کو ہی کو سنے لگی اسے فرہاد کی باتوں میں آکر منہا کو نہیں سمجھانا چاہیے تھا۔

علی حسن کو گود میں اٹھائے اور ایک ہاتھ سے دروازے کے کواڑ کو اندر کی طرف دھکیلتی وہ کمرے میں داخل ہوئی
 اور اندازے کے عین مطابق تقی کرسی پر براجمان تھا، اور اس کے دروازہ کھولنے پر لمحہ بھر کو اس کا کاغذ پر چلتا ہاتھ
 تھا اور پھر سے لکھنے میں مصروف ہو گیا اس نے مالا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

آج تین دن ہو گئے تھے اس بے رخی کو اپنائے ہوئے، وہ مالا کو بلانا تو دور کی بات اس کی طرف دیکھتا تک نہیں تھا
 پہلے چاہے وہ اسے ڈانٹتا تھا، سختی سے پڑھاتا تھا پر وہ اس سے بات کرتا تھا اسے دیکھتا تھا یوں خفا نہیں تھا، مالا کی
 پڑھائی سے توجان چھوٹ گئی تھی۔ لیکن وہ حیران تھی اسے اب ساری رات نیند کیوں نہیں آتی تھی، لحاف کی
 اوٹ سے بس تقی کو دیکھتی رہتی تھی دل عجیب طرح سے بجھا بجھا رہنے لگا تھا۔ ناکھانا اچھا لگتا تھا پینا بس تقی کی بے
 اعتنائی بری طرح پریشان کر رہی تھی۔ بارہا دل کو سمجھایا کہ پڑھائی سے جان چھوٹی اور کیا چاہیے تھا اسے پر بے کلی
 تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

مالا علی حسن کو اٹھائے پلنگ پر آگئی تھی اگرچہ تقی علی حسن کو بہت پیار کرتا تھا لیکن اس وقت پتا نہیں کیوں وہ علی حسن سے بھی مکمل بے رخی برت رہا تھا۔

اس دن مالا کے یوں رو دینے پر بچپن سے لے کر اب تک کے سارے مناظر اس کے ذہن میں گھوم گئے تھے، ہاں ر مناسے جب اس کی نسبت طے تھی تب وہ لڑکپن سے جوانی میں آیا تھا اور ایک عقیدت جیسے جذبات اس کے ر مناسے جڑ گئے تھے، لیکن پھر اس کے یوں اچانک چلے جانے کے بعد وہ خود کو ان جذبات سے بہت دور رکھنے لگا تھا کیونکہ یہ جذبات انسان کو کمزور بنا دیتے ہیں اور اس کے مقصد سے دور کر دیتے ہیں ایسا وہ ر مناسے کے انتقال کے بعد اپنے ایک سال ضائع کر دینے کی وجہ سے سوچتا تھا اور پھر اس کے بعد اس نے کبھی کسی بھی لڑکی کے لیے اپنے دل میں ایسے جذبات پنپنے نہیں دیے تھے۔

شیریں کی طرح کالج اور ملازمت کے دوران بہت سی لڑکیوں نے پیش رفت کی تھی کیونکہ وہ ایک خوب رو نو جوان تھا لیکن وہ ان سب جذبات میں بہہ کر اپنے آپ کو کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اور مالا سے شادی سے پہلے بھی اس کے ذہن میں اسے پڑھانے اور میٹرک کروانے کے علاوہ اور کوئی سوچ نہیں تھی، اس کا ماننا یہ تھا کہ اللہ نے ہر انسان کو دماغ ایک جیسا ہی دیا ہے بس کوئی اسے کم استعمال کرتا ہے اور کوئی زیادہ۔

ہر کسی کے اندر کوئی خوبی ہوتی ہے لیکن بہت سے لوگ اس خوبی کے ساتھ محنت کو جوڑ کر اسے برؤے کار لانے کی کوشش نہیں کرتے یہی وجہ تھی اس نے مالا کو پڑھانے کی ٹھانی تھی پر مالا نے بری طرح اس کی ہر کوشش کو ناکام کر دیا تھا بلکہ اس رات اس کے دل پر دستک دے کر اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسی پریشانی کے تحت وہ فوراً اس پر سے ہاتھ کھینچ کر پیچھے ہوا تھا اب ایک جنگ تھی جو تین دن سے دماغ میں چل رہی تھی۔

دل مالا کے ساتھ جڑے رشتے کی خوبصورتی کی وجہ سے جھکنے لگا تھا جبکہ دماغ اسے اب بھی یہ احساس دلانے پر تلا ہوا تھا کہ وہ چھوٹی ہے، ان سب باتوں اور اس طرح کے رشتے کے لیے وہ اس سے کمسن ہے، بس یہی کشمکش میں وہ مالا کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

اور وہ اتنا مضبوط تھا کہ اپنے دل کو اپنے دماغ کے ذریعے قابو میں لا کر زیر کر دینے کی طاقت رکھتا تھا اور اب بھی تین دن سے وہ یہی کر رہا تھا۔

مالا علی حسن کو پلنگ پر لٹائے اس پر جھک کر اسے پیار کر رہی تھی، تقی نے ناچاہتے ہوئے بھی نگاہ اٹھائے ادھر دیکھا تھا کیونکہ علی حسن کی قلقاریاں اتنی خوبصورت تھیں کی تقی کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔

وہ کاسنی رنگ کے جوڑے میں آج بالوں کو بس اوپر ایک کلپ سے باندھے باقی کے بال کھلے چھوڑے ہوئے تھی جبکہ اکثر ان بالوں کی چٹیا ہی گوندھ کر رکھتی تھی۔ علی حسن پر جھکے ہونے کے باعث اس کے بال آگے کی طرف اس کی کمر پر آبخار کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔

وہ بھری جسامت اور گداز گالوں والی دوشیزہ تھی یہی وجہ تھی وہ اپنی عمر سے بڑی لگنے لگی تھی، تقی ناچاہتے ہوئے بھی آج اس کے سر آپے کو دیکھ رہا تھا آج سے پہلے اس نے کبھی کسی لڑکی کو یوں اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا اور آج بھی یہ سب لاشعوری طور پر ہو رہا تھا۔

”اہم۔۔۔اہم۔۔۔“

فرزانہ کی کھنکار پر تقی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا فرزانہ پتا نہیں کس لمحے کمرے میں آئی تھی اور پھر تقی کو یوں مالا کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر معنی خیز گلا کھنکارا تھا۔ تقی نے فوراً چہرے کے تاثرات بدلے۔ فرزانہ اب اندر داخل ہو رہی تھی اور معنی خیز نگاہوں سے مالا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو اس کے بیٹے پر جھکی اسے مسلسل بوسے دے رہی تھی۔

”ارے بھئی اتنی مٹھی کر رہی ہو میرے بیٹے کو، کس کو دکھا رہا ہو؟“

فرزانہ مالا کو چھیڑتے ہوئے آگے بڑھی تو، مالا تو اس بات پر ایسی گلال ہوئی کہ فوراً مسکراتے ہوئے علی حسن کو اٹھا کر اپنے چہرے کے آگے کر لیا جبکہ تقی نے چہرے پر سنجیدگی طاری کی

”آئیے فرزانہ آپا۔۔۔“

تقی نے ہمیشہ کی طرح کھڑے ہو کر فرزانہ کو سامنے کر سی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا

”نہیں جی ہم تو اپنی چھوٹی سے بھابھی کے ساتھ پلنگ پر ہی بیٹھیں گی“

فرزانہ نے شرارت سے گردن کو گھماتے ہوئے کہا اور ہنستے ہوئے آکر مالا کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گئی اور تقی فرزانہ کے بیٹھتے ہی کر سی کا رخ پلنگ کی طرف موڑے سیدھا ہوا

”ہاں ویرجی کہاں تک پہنچا ہسپتال؟“

فرزانہ نے مسکراتے ہوئے اس سے اس کے ہسپتال کی تعمیر کے بارے میں سوال کیا

”آپا ہسپتال کی تعمیر تو بہت پڑی ہے ابھی تو شروعات ہے پر سوچا یہی ہے کہ پہلے کلینک بنالوں گا اور زیر تعمیر ہسپتال کے کلینک میں بیٹھنا شروع کر دوں گا ان شاء اللہ“

تقی نے مبہم سی مسکراہٹ سجائے اپنے ارادے سے آگاہ کیا، فرزانہ بھی مسکرا دی اور پھر علی حسن کی چہک پر گردن موڑے مالا اور علی کی طرف متوجہ ہوئی

”تقی تمھاری بیوی کو بچے بہت پسند ہیں“

فرزانہ نے شریر سے لہجے میں کہا اور پھر تقی کی طرف دیکھا جو بے ساختہ مالا اور علی کی طرف متوجہ ہوا تھا

”بچوں کو بچے پسند ہوتے ہیں“

تقی نے سپاٹ سے لہجے میں فوراً کہا تو مالا نے چونک کر تقی کو دیکھا، کتنی چڑھتی اسے تقی کے اس خیال سے

”ارے واہ۔۔۔ اب بھی اتنی لاڈلی رکھی ہوئی کہ بچی ہی لگتی، اوہاں یاد آیا مالا کیسی جارہی ہے تیاری کچھ ماہ ہی رہتے ہیں دسویں جماعت کے پرچوں میں منہا بتا رہی تھی تم نے پڑھنا ہے آگے“

فرزانہ نے بات کو ادھورا اچھوڑے جیسے ہی مالا سے سوال کیا مالا گڑبڑا کر سیدھی ہوئی چورسی نگاہوں سے تقی کی طرف دیکھا جو بے حد سنجیدہ بیٹھا تھا۔ جواب مالا کی جگہ تقی کی طرف سے آیا تھا

”نہیں۔۔۔ نہیں دے رہی امتحان“

تقی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو فرزانہ نے حیرت سے ایک نظر مالا کی طرف دیکھا اور پھر تقی کی طرف ”کیوں۔۔۔ تقی تم کیسے مان گئے؟“

لہجے میں حد درجہ حیرت تھی کیونکہ وہ جانتی تھی تقی جس نے اپنی بہن اور اپنے کزن حتیٰ کے اس کو بھی پڑھانے پر اتنی محنت کی تھی وہ اپنی بیوی کو کیسے آٹھویں جماعت تک رکھ سکتا ہے

”پسند نہیں ہے اسے ہر کسی کی اپنی مرضی ہوتی ہے، میں کیا لگتا ہوں اس کا جو اس پر اپنی مرضی چلاتا پھروں“

تقی نے لب بھینچے کہا اور پھر ایک دم سے اٹھا، چہرے پر غصے کے آثار تھے

”آپا علی حسن پکڑائے گا مجھے“

فرزانہ کو کہا اور بازو آگے کیے حالانکہ علی مالا کی گود میں تھا، مالا کو بری طرح اس کی خفگی محسوس ہوئی، فرزانہ نے مسکراتے ہوئے علی حسن پلنگ سے اٹھا کر تقی کی طرف بڑھا دیا تقی علی حسن کو لے کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے اور فرزانہ نے غور سے مالا کے جھکے سر اور روہانسی صورت کی طرف دیکھا

”ناراض ہو گیا ہے تم سے“

فرزانہ نے آہستگی سے باہر جاتے تقی کی پشت کو دیکھتے ہوئے پوچھا، فرزانہ کا ایسے کہنا ہی تھا کہ مالا اچھل کر فرزانہ کے گلے لگی اور ہچکیوں صورت رونے لگی

”ارے بگی۔۔۔۔۔ روکیوں رہی ہے شوہر ناراض ہو جایا کرتے ہیں پھر مان بھی جاتے ہیں“
 فرزانہ نے اسے خود سے الگ کیا اور محبت سے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لیا، مالانے آہستگی سے سر اثبات میں ہلا
 دیا اب وہ فرزانہ کو کیا بتاتی کہ تقی اس سے کتنا زیادہ خفا ہے تین دن بعد آج شدت سے اس کی ناراضگی کا احساس ہوا
 پھر رات بھر بھی وہ چھپ کر بار بار تقی کی طرف دیکھ رہی تھی جو بے تاثر چہرہ لیے ہوئے تھا۔

دوپہر کا وقت تھا اور حویلی کے زیادہ مکین صحن میں چارپائی ڈال کر بیٹھے تھے، خدیجہ بیگم لحاف اوڑھے تخت پر بیٹھی
 تھیں جہاں تار ی بواپتہ نہیں ان کو کیا گاؤں کا قصہ سنار ہی تھی۔
 اور تخت سے تھوڑا دور ہی موجود کمرے میں مالا پلنگ پر چت لیٹی تھی، سر تکیے پر رکھا تھا آنکھیں موندی ہوئی تھیں
 ، ایک بازو اوپر کیے سر کے گرد گھمایا ہوا تھا دونوں سفید کلائی یوں میں سرخ کانچ کی چوڑیاں بچ رہی تھیں اور تقی کی
 میز پر رکھے ریڈیو سے گیت کی آواز نکل کر پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔

آج تم غیر سہی۔۔۔۔۔

پیار سے بیر سہی۔۔۔۔۔

آج تم غیر سہی۔۔۔۔۔

پیار سے بیر سہی۔۔۔۔۔

تیری آنکھوں میں پیار کا کوئی پیغام نہیں۔۔۔۔۔

تجھ کو اپنا بنا بنا یا تو میرا نام نہیں۔۔۔۔۔

پلنگ پر ایک ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ سفید پاؤں کو گیت کے بولوں کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ جھلار ہی تھی، ذہن
 میں تقی کی صورت اس کا غصہ اور کل فرزانہ آپا کے سامنے کہے گئے الفاظ گونج رہے تھے۔

اچانک باہر سے شور کی آواز پر وہ پیشانی پر بل ڈالے اٹھ کر بیٹھی، شور میں تقی کی آواز پہچانتے ہی وہ ننگے پاؤں ریڈیو کی آواز بند کرتے ہوئے جیسے ہی برآمدے میں آئے تو پردہ ہاتھ میں رہ گیا، صحن میں تقی، تقی کو بری طرح پیٹ رہا تھا اور وہ اونچی آواز میں رورہا تھا۔

”ارے سٹیا گیا ہے تقی چھوڑ دیو اس کی جان کو، کاہے کو مارے چلے جا رہا ہے اسے“

خدیجہ بیگم تخت پر بیٹھے ہی بازو لمبا کیے چیخ رہی تھیں جبکہ بلقیس مسکین سی صورت لیے تقی کے پاس کھڑی تھی جو غصے میں پیشانی پر بل ڈالے تقی کی گردن کو دبوچے ہوا تھا۔ اور بار بار اسے جھکا کر اس کی پیٹھ پر تھپڑ مار رہا تھا۔ بلقیس تھوڑا سا آگے ہوئی تو تقی نے فوراً خبردار کرنے کو انگلی ہوا میں ان کے سامنے کھڑی کی، سرمی رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس اس کا چہرہ غصے سے لال بھوکا ہو رہا تھا کرتے کی آستین اپنے مخصوص انداز میں آگے سے موڑ رکھی تھی۔

”اماں پیچھے رہیں آپ ایک تو بگاڑ کر رکھ دیا ہے سب گھر والوں نے اسے، پڑھتا یہ نہیں اور اب سگریٹ اتنی سی عمر میں“

تقی نے غصے سے کہا اور پھر تیرہ سالہ تقی کو مارنے لگا، وہ اتفاق سے تقی کو دوستوں کے ساتھ اس طرح کی حرکت کرتے ہوئے نظر آ گیا تھا، پھر کیا تھا، کھیل کے میدان سے وہ اسے یونہی مارتا ہوا گھر لے کر آیا تھا۔

”بھائی معاف کر دو اب سے نہیں کروں گا“

تقی ہاتھ جوڑے معافی مانگ رہا تھا، پر تقی کو تو پتا نہیں کس کس بات کا غصہ تھا جو وہ تقی پر اتارے چلے جا رہا تھا۔

”پڑھتا تو نہیں ہے تجھے صابر کے پاس پڑھنے کے لیے ڈالا تھا میں نے شام کو جاتا کیوں نہیں اس کے پاس اگر فیل ہونا اس سال دیکھنا کیا حال کرتا تیرا“

تقی نے پھر سے اس کا گریبان پکڑ کر غصے سے جھنجوڑ ڈالا، اس نے آج تک سگریٹ نہیں پی تھی اور اپنے سے اتنے چھوٹے نقی کو سگریٹ پیتا دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔

”آئے۔۔۔ ہائے۔۔۔ چھوڑ دے اس کی جان کیا آج ہی بی اے پاس کروادے گا، کاہے کو آج سانڈ کی طرح اس پر غصہ اتارے جا رہا ہے“

خدیجہ بیگم نے غصے سے ہانک لگائی، وہ مکمل طور پر ایک لڑکا پرست خاتون تھیں اور نقی تو ویسے بھی ان کا لاڈلا تھا۔

”بی جان آپ تو چپ کریں، بھائی ہے میرا چھوٹا، کیا اس کو بھی کچھ ناکہوں، فرض ہے میرا اس کو سمجھانا اچھے برے کی تمیز سیکھانا“

تقی نے غصے سے کہا اور نگاہ اچانک تخت کے بالکل پیچھے کھڑی مالا پر پڑی اور پھر ایسی ناگوار نگاہ اس نے مالا پر ڈالی کہ وہ نادام سی ہو کر نظریں جھکا گئی۔

مطلب وہ اسے جتا گیا تھا وہ جن کو اپنا سمجھتا ہے انہی پر حق جتا تا ہے اور مالا کے ساتھ پڑھائی کے معاملے میں زبردستی کا مطلب یہی تھا وہ اسے اپنا سمجھتا تھا۔

صحن میں نقی کی سگریٹ پینے کو لے کر شور و غل برپا تھا اور وہ بجھی سی صورت لیے کمرے میں آگئی۔ اور پھر نگاہ میز پر پڑی کتابوں پر ٹک گئی۔

رات کا سناٹا حویلی کو جیسے ہی لپیٹ میں لے گیا تھا، سب مکین کمروں میں گھس گئے تھے اور وہ ارحمہ کو سلا کر اپنے کمرے کی طرف آرہی تھی۔

ارحمہ بعض اوقات اس کے ساتھ سونے کی ایسی ضد ڈال لیتی تھی کہ پھر غزالہ کی بھی نہیں سنتی تھی اس لیے مالا اس کے ساتھ لیٹ کر اسے اپنے ساتھ لگا کر سلاتی تھی۔

کمرے کا دروازہ معمول کے مطابق بند تھا اور کمرے کی بتی جل رہی تھی جو دروازے کی ہلکی سی اوٹ سے چھن کر باہر آرہی تھی، مطلب تفتی کمرے میں موجود تھا، مالانے ہمت باندھی اور دروازہ کھولا کیونکہ آج وہ جو کرنے والی تھی اس کے لیے ہمت ہی چاہیے تھی، دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو معمول کے مطابق تفتی نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

وہ آج بھی کل والا سرمئی گرتا ہی زیب تن کیے ہوئے تھا جو شام کو آکر تبدیل کیا تھا، مالانے پلنگ کے بجائے قدم میز کی طرف بڑھا دیے اور پھر آکر کرسی کو سیدھا کرنے لگی۔ کلائی یوں میں پہنی چوڑیاں شور کرتی کمرے کی خاموشی کو توڑ گئی تھیں جو پانچ دن سے اس کمرے میں موجود نفوس میں قائم تھی۔

تفتی نے پلکیں پھڑپھڑائییں پر اس کی طرف دیکھا نہیں اتنے دن سے یہی تو غصہ تھا۔ مالانے بیٹھ کر پاس پڑی اپنی کاپی اٹھائی اور پنسل کو تراش کرنے لگی، تفتی مکمل طور پر اس سے بے اعتنائی برتے ہوئے تھا۔

مالانے پنسل تراش کرنے کے بعد کاپی کو میز پر رکھا اور پھر الجبرا کے کلیے لکھنے شروع کیے وہ ایک کے بعد دوسرا کلیہ فر فر لکھ رہی تھی، آج صبح سے شام تک اس نے ہر کلیہ پچاس پچاس دفعہ لکھ کر یاد کیا تھا۔ اور جب آپ کی لگن سچی ہو تو مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔

تفتی نے ایک چورسی نگاہ اس کی کاپی پر ڈالی وہ سر جھکائے انہماک سے لکھنے میں مصروف تھی اور اتنی روانی سے لکھ رہی تھی کہ ایک بھی کلیہ غلط نہیں تھا تفتی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا وہ یونہی اس کو دیکھ رہا تھا جب اچانک مالانے مکمل لکھنے کے بعد چہرہ اوپر اٹھایا۔

تفتی نے فوراً نگاہوں کا زاویہ بدل کر چہرہ سپاٹ کیا، جبکہ دل کو عجیب خوشگوار حیرت نے آن گھیرا تھا، مالانے کاپی تفتی کے بلکل آگے رکھ دی، تفتی نے ہاتھ سے کاپی کو پیچھے کسکھا دیا اور پھر سے اپنے سامنے کھلی کتاب پر نگاہیں جما

دیں، تھوڑی خفگی ظاہر کرنا بنتا تھا کیونکہ اگر وہ غلط نہیں سوچ رہا تھا تو یہ سب اس کی اتنے دن کی بے اعتنائی کا نتیجہ تھا۔

مالانے کاپی اٹھا کر اس کی کتاب کے اوپر رکھ دی، تقی نے نگاہیں اٹھائیں اور اس کی طرف دیکھا، دل موہ لینے والی صورت لیے وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی چہرہ اداس تھا، درمیان میں مانگ نکالنے کی وجہ سے چہرہ زیادہ ہی گول اور معصوم لگ رہا تھا۔

”فارمولے یاد ہو گئے ہیں آگے پڑھیں اب“
مدھر سی آواز ابھری تھی، وہ جھجکتے ہوئے آہستہ آواز میں کہہ رہی تھی۔
”تمہیں تو پڑھنا نہیں تھا رو کر اس دن یہی کہا تھا تم نے مجھے“

تقی نے ہنوز سپاٹ چہرے کے ساتھ اب لہجہ بھی سپاٹ رکھا ہوا تھا، کیونکہ اب بھی اسے تھوڑا رعب دکھانا لازمی تھا کیونکہ اس کی تھوڑی سی بھی ڈھیل پر اور خوشی ظاہر کرنے پر وہ پینتر ابدل سکتی تھی۔
”ہاں کہا تھا پر اب مجھے پڑھنا ہے“

مالانے ملائی م سے لہجہ میں التجا کی اور دھیرے سے نچلے لب کو اس کی خفگی کے پیش نظر دانت میں دبا کر چھوڑا، وہ اتنا خفا تھا کہ اب اس کے پڑھنے پر آمادہ ہونے کے بعد بھی اسے پڑھنا نہیں چاہتا تھا
”کیوں اب کیا ایسا ہوا ہے جو پڑھنا ہے تمہیں“

تقی نے بھنویں اچکائے سوال کیا، نرم سے نگاہیں اس کے ہر نقش کو بغور دیکھ رہی تھیں، وہ بہت حسین تھی آج سے پہلے کبھی توجہ ہی نہیں گئی تھی اس طرف
”کیونکہ۔۔۔۔۔“

مالا نے سر نیچے جھکا لیا تھا، تقی نے مسکراہٹ دبائی اسے وہ یوں نادم سی اچھی لگ رہی تھی لیکن اپنی سختی اسے برقرار رکھنی تھی۔

”کیونکہ میں آپ کو ناراض نہیں کر سکتی“

مالا کی آواز بہت آہستہ تھی اور پلکیں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی یہ بات تقی کو اندر تک سرشار کر گئی اور اسے اپنے اندر ہونے والے اس انوکھے سے احساس نے حیران کر دیا۔

”نہیں صرف میری ناراضگی کو لے کر تم اتنی بڑی قربانی مت دو“

تقی نے اپنے سامنے کھلی اس کی کاپی کو بند کرتے ہوئے سنجیدہ سے لہجے میں کہا اور کتاب کی طرف متوجہ ہوا، مالا نے بیچارگی سے دیکھا اس کی ناراضگی سوہان روح تھی۔

”کیوں نا کروں ناراضگی کی پرواہ کروں گی میں“

مالا نے ایک دم سے چہرہ اوپر اٹھائے و ثوق سے کہا نگاہیں سیدھا تقی کی نگاہوں سے ملیں تھیں۔

”پر میں اب تمہیں پڑھانا نہیں چاہتا“

تقی نے لب بھینچے مصنوعی روکھے سے لہجے میں جواب دیا تو مالا کی منہ کھل گیا پھر آنکھیں سکوڑ کر تقی کی طرف دیکھا۔

”آپ نا پڑھائی یں یہیں پاس بیٹھ کر پڑھتی رہوں گی“

مالا نے ناک پھلاتے ہوئے کہا اور پھر جلدی سے انگلی کی کتاب کھول کر اپنے سامنے رکھی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ تقی نے بے اعتنائی برتتے ہوئے اپنی کتاب پر نگاہ جمائی، پروہ اتنے غلط تلفظ ادا کرتے ہوئے پڑھ رہی تھی کہ تقی

کی برداشت جواب دے رہی تھی۔ تقی نے کھینچ کر کتاب اپنے پاس کی

”سارا غلط پڑھ رہی ہو کر سی پاس کرو“

تقی نے رعب سے کہا تو مالا بے ساختہ مسکرا دی اور پھر کرسی قریب کرتے ہوئے نظریں کتاب پر جمادیں اب تقی اسے پڑھا رہا تھا اور آج پہلے دن وہ تقی کے بجائے کتاب پر مکمل توجہ دیے ہوئے تھی۔

یہ تنگ سے بازار تھا جس میں چھوٹی چھوٹی اندر کوزینے اترتی دوکانیں تھیں اور یہاں ایک ہی قطار میں بہت سے پنساری بیٹھے تھے۔ گلی اتنی تنگ تھی کہ دن چڑھے بھی اندھیرا سا محسوس ہو رہا تھا۔ لوگوں کے بولنے کی آوازیں ارد گرد سے کانوں میں گھس رہی تھیں اور جڑ بوٹیوں کی تیز خوشبو ناک کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔

دو قدم تیزی سے اس سرخ اینٹوں کی روش والے تنگ بازار میں آگے بڑھ رہے تھے، کلائی میں چاندی رنگ کی گھڑی باندھ رکھی تھی اور تیز تیز قدم اٹھانے کے باعث ہاتھ ہل رہا تھا اور پھر وہ ایک دوکان کے سامنے رک گیا۔ ناظم پنسار اور دواخانہ۔۔۔ گدلہ سا بورڈ تھا جو شائ دپہلے سفید رنگ کا ہو کبھی لیکن اب تو میل کچیل اور مٹی سے اٹنے کی وجہ سے پیلے سے رنگ کا دکھائی دیتا تھا، اس پر سرخ رنگ سے یہ نام پینٹ ہوا تھا۔ وہ دو قدم بھی اب ناظم پنسار اور دواخانہ کے بورڈ لگی اس چھوٹی سی دوکان میں داخل ہوئے تھے۔

چھوٹے بڑے ڈبے دیوار میں بنی الماری کے خانوں میں ترتیب سے رکھے ہوئے تھے، ہر ڈبے کے اوپر چھوٹی سی کاغذ کی چٹ لگی تھی جس پر مختلف نام لکھے تھے، دوکان کا دروازہ پورا لکڑی کا تھا لیکن اس کے اوپری حصے میں چوڑائی کی صورت شیشہ نصب تھا۔ اور آگے شٹر تھا جو اس وقت اوپر اٹھا ہوا تھا۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے تھیلے بھی پڑے تھے جن میں شائ مختلف جڑی بوٹیاں تھیں۔ اوپر چھت پر پنکھا لگا تھا جس پر ایک دبیز تہہ مٹی کی جمی تھی۔ دوکاندار اس نفس کے دوکان میں داخل ہوتے ہوئے سیدھا ہوا اور پہچان کر مسکرا دیا۔

”اسلام علیکم یہ لیجئے جتنے پیسے آپ نے کہے تھے میں لے آیا ہوں، زہر تیار ہے؟“

دو قدم اب بلکل دوکاندار کے سامنے تھے اور پھر سفید رنگ کے کپڑے کو دوکاندار کی طرف بڑھایا، دوکاندار نے بتیسی نکالی سر اثبات میں ہلایا پیسے جو کپڑے میں لپٹے تھے پکڑے اور مڑ کر لکڑی کی الماری کی طرف بڑھا واپس پلٹا تو ہاتھ میں ایک خاکی کاغذ تھا۔ جسے اس نے سامنے کھڑے شخص کی طرف بڑھا دیا، جسے پکڑتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں لمحہ بھر کو ہلکی سی لغزش آئی۔

”کام کرے گا یہ؟“

بے یقینی سے سوال پوچھا، دوکاندار نے دانت نکالے ”کیسی باتیں کرتے ہو باؤ اتنی مہنگی جڑی بوٹی سے بنا ہے کام کیوں نہیں کرے گا بس دیکھو بہت کم مقدار دینی ہے، اگر ذرا سی بھی زیادہ مقدار دی تو طبیعت بہت بگڑ جائے گی، میں نے ہر ایک دن کے لیے ایک چھوٹی سی پڑی بنائی ہے اور وہی دینی ہے روز“

دوکاندار نے چشمہ نیچے کرتے ہوئے اس کی اوٹ سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اب سامنے بیٹھے شخص کے ہاتھ تیزی سے کاغذ کو لپیٹ رہے تھے۔

”اچھا بہت شکریہ“

کاغذ کو چھپا کر تھیلے میں رکھتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا، دوکاندار اب تیزی سے پیسے گن رہا تھا۔

”پورے ہیں؟“

سامنے کھڑے شخص نے پوچھا

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ بلکل پورے ہیں“

پنساری نے پیسے گنتے ہوئے اوپر دیکھا اور دانت نکالے دو قدم تیزی سے دوکان سے باہر نکل گئے تھے۔ اور دوکاندار کے ہاتھ ابھی بھی پیسے گن رہے تھے۔

مالا صحن سے برانڈے کے زینے چڑھتی ہوئی اوپر آئی تھی، برانڈے میں سناٹا تھا، وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی جو غزالہ اور نوازش کے کمرے کے ساتھ ملحقہ تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا، سامنے پلنگ پر غزالہ اور نوازش سو رہے تھے وہ ان کے پاس سے گزرتی ہوئی ان کے کمرے کے ساتھ ملحقہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی بتی جلانے کو ہاتھ بڑھایا کمرے میں اندھیرا تھا۔ بتی کے بٹن دبانے پر بھی بتی نہیں جلی تھی، اندازے کے مطابق کھڑکی تک آئی جہاں

موم بتی جلا کر جیسے ہی سر اوپر اٹھایا تو وہ کمرہ اس کا کمرہ تو نہیں تھا یہ تو تفتی کا کمرہ تھا۔

اتنی رات کو میں تفتی کے کمرے میں کیا کر رہی ہوں الجھ کر سوچا شادی سے پہلے یوں تفتی کے کمرے میں بی جی نے دیکھ لیا تو۔۔۔ ذہن میں اس خیال کے اڈتے ہی واپس پلٹنے کو قدم ابھی بڑھائے ہی تھے، اچانک نگاہ سامنے اٹھی تو الماری کے پاس کوئی کھڑا نظر آیا، وہ الماری کے پٹ کھولے کھڑی تھی بال پشت پر بکھر کر ساری کمر کو ڈھکے ہوئے تھے۔ مالا آنکھوں کو سکیڑے آگے بڑھی کون تھی رملہ تھی کیا؟ وہ کیا نکال رہی ہے الماری میں سے۔ پشت سے وہ رملہ لگ رہی تھی۔

”رملہ۔۔ کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا چاہیے تمہیں؟ تفتی کے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟“

مالا بہت سے سوال ایک ساتھ کرتی ہوئی آگے بڑھی جیسے ہی اس کے قریب پہنچی تو اچانک رملہ نے رُخ موڑا، وہ رملہ نہیں تھی وہ رملہ تھی۔

”آپا۔۔ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں“

مالا نے فوراً پہچان کر بھنویں سکیڑ کے پوچھا۔ رملہ بے تاثر سفید چہرہ لیے کھڑی تھی۔ اچانک ذہن میں آیا کہ رملہ آپا تو مرچکی ہیں۔

”مالا اُسے بچالو۔۔۔“

رمنانے آہستگی سے کہا اور پھر مالا کے اور قریب آئی تھی

”آپا۔۔۔ کسے۔۔۔؟“

مالا نے حیرت سے رمنان کی طرف دیکھا، رمنان نے غصے سے گھورتے ہوئے منہ پورا اکھولا اور پھر اسے ایک زور کا دھکا دیا۔ وہ اڑتی ہوئی سیدھی دیوار کے ساتھ جا لگی

ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تھی، وہ پلنگ پر لیٹی تھی، خواب عجیب وحشت ناک تھا، سب سے پہلی نگاہ مالا کی الماری کی طرف گئی تھی۔

دل خوف کی وجہ سے تیز دھڑک رہا تھا، ذہن نے فوراً سے سب سلجھایا اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس وقت وہ تقی کے ہی کمرے میں اس کے ساتھ پلنگ پر لیٹی ہے۔

کمرے میں بہت اندھیرا تھا بس ہلکی سی صحن میں جلتی قندیل کی روشنی کے باعث کمرے میں نظر آ رہا تھا، تقی کو بالکل اندھیرے میں نیند آتی تھی، اس لیے وہ چھوٹا بلبل نہیں جلاتا تھا۔ وہ تقی سے پہلے آکر بستر میں لیٹ جاتی تھی جس وقت بتی جل رہی ہوتی تھی اس لیے آج پہلے دن وہ کمرے میں اس اندھیرے کو دیکھ رہی تھی۔

رمنان کی آواز اور ہولناک دھکا دل لرزا گیا تھا، خوف سے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ آج سے پہلے کسی خواب میں وہ یوں مالا پر غصہ نہیں ہوئی تھی، بے اختیار وہ کھسک کر تقی کے قریب ہوئی ان دونوں کے درمیان کافی فاصلہ ہوتا تھا کیونکہ تقی پلنگ کے ایک کنارے سے لگ کر اس سے دوری بنا کر سوتا تھا۔

مالا نے پاس ہو کر اس کی کمر کے گرد بازو حائل کر لیا وہ اسی کی طرف کروٹ لیے بے خبر سو رہا تھا۔ بازو حائل کرتے ہی وہ اور قریب ہوئی اور تقی کے سینے میں چہرہ چھپایا لرزتے دل اور خوف کے احساس کو کچھ سکون سا ملا۔

گہری نیند میں تقی کو کسی کے ساتھ لگنے کا احساس ہوا تو آنکھ کھلی، ذہن کو ایک دو سکینڈ سمجھنے میں لگے اور پھر ایک جھٹکے سے اس نے آنکھیں کھولیں یہ مالا تھی جو اس کے ساتھ لگی تھی اور کانپ رہی تھی۔

”مالا۔۔۔“

تقی نے چہرہ نیچے کیے نیند سے بو جھل ہوتی آواز میں پکارا وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے ہوئے تھی اور کمر کے گرد بازو اوپری رُخ گھمائے ہوئے تھا۔ تقی کی آواز پر مالا نے فوراً چہرہ اوپر اٹھایا۔

”مالا کیا ہوا۔۔ کانپ کیوں رہی ہو؟“

تقی نے آہستگی سے اپنے گرد اس کے حائل بازو کو اٹھائے اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب کرتے ہوئے پوچھا، مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بہت کم واضح تھا لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا وہ ڈری ہوئی ہے۔

”ڈر لگ رہا ہے مجھے، خواب دیکھا ہے ایک“

مالا نے گھٹی سی آواز میں وضاحت دی، آواز میں خوف کی جھلک ابھی بھی نمایاں تھی۔ اس کی حالت گواہ تھی وہ واقعات بہت بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔

”مالا ڈر مت خواب تھا بس، ادھر اوپر دیکھو“

تقی نے آہستگی سے ایک ہاتھ میں اس کے ہاتھ کو لیا اور دوسرے ہاتھ کی مدد سے اس کے چہرے کو اوپر کرنے کی کوشش کی تھی جو وہ اس کے سینے میں پھر سے چھپا رہی تھی۔

”مالا۔۔ خواب تھا صرف اتنا کیوں گھبرا گئی ہو“

تقی نے ملائی م سے لہجے میں سمجھایا تھا، پر اس کے ہاتھ جواب تقی کے ہاتھ میں تھا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

”بتی جلا دوں کیا؟ زیادہ ڈر لگ رہا ہے تو“

تقی نے پھر سے آہستگی سے چہرہ نیچے کیے پوچھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ لگے اس کے وجود کی لغزش وہ باخوبی محسوس کر سکتا تھا۔

”آپ کو نیند نہیں آئے گی ایسے“

مالا نے نادم سے لہجے اور گھٹی سی آواز میں جواب دیا، وہ چہرہ اس کے سینے میں چھپائے بول رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں تم جب سو جاؤ گی میں اس کے بعد سوؤں گا بتی جلا دیتا ہوں“

تقی نے آہستگی سے اپنا آپ اس سے الگ کیا تھا اور پھر پلنگ پر سے اٹھ کر چیل پاؤں میں پہنٹا دیوار پر لگے بورڈ تک پہنچا اور بٹن دبایا خاموش کمرے میں بٹن نیچے کرنے کی آواز کے ساتھ ہی کمرہ ایک دم سے پیلی روشنی میں نہا گیا، مالا نے آنکھیں چندھیا جانے کے باعث زور سے بند کی تھیں۔

”اب تو نہیں لگے گا ڈر“

تقی نے پلنگ کے قریب آتے ہوئے پوچھا اور پھر میز کے پاس آکر اس پر پڑے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلا

”لو اٹھو پانی پی لو“

تقی نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا جواب پلنگ پر لیٹی پوری آنکھیں کھولے الماری کی طرف دیکھ رہی تھی۔

مالا ہاتھوں پر دباؤ دیتے ہوئے اوپر ہوئی اور پھر تقی کے ہاتھ سے گلاس تھام کر پانی کے بس تین چار گھونٹ کے ساتھ گلے کو تر کیا اور گلاس واپس تقی کی طرف بڑھا دیا۔ تقی بغور اس کے گھبرائے سے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”چلو اب ذہن سے جھٹک دو جو کچھ دیکھا ہے، میں جاگ رہا ہوں تم سو جاؤ آرام سے“

اپنائی ت بھرے لہجے میں کہا اور خود میز کی طرف بڑھ گیا پھر کرسی کو ایک ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے کرسی پر براجمان ہوا اور سامنے پڑی کتاب کھول لی مالا اس کی طرف دیکھتے ہوئے لیٹ گئی۔

کچھ پل بعد ڈر کا احساس مند مل ہوا تو ایک انوکھا سا احساس میٹھی سی چھن بن کر پورے وجود میں سرائی بیت کرنے لگا۔ کچھ دیر پہلے ڈر کے باعث جو جسارت سرزد ہوئی تھی اس کے انوکھے سے احساس کی محسوسات اب کچھ اور ہی رنگ لے رہی تھیں۔ شادی سے لے کر اب تک کہاں اس کے اور تقی کی بیچ اس طرح کی قربت ہوئی تھی وہ لحاف میں سمٹ گئی اور آنکھیں سرشاری سے موند لیں کچھ دیر پہلے کی قربت کی شرم اس کو اب آرہی تھی۔

سو یا تو وہ کچھ دیر پہلے ہی تھا، بارہ بجے تک وہ مالا کو پڑھاتا تھا پھر جب وہ بستر پر جا کر لیٹ جاتی تھی اس کے بعد وہ اپنے حساب کتاب میں لگ جاتا تھا، شادی کو ایک ماہ تین دن ہو چکے تھے، مالا اب پوری توجہ سے پڑھتی تھی اور تقی کا اندازہ بالکل درست تھا وہ فقط لاپرواہ تھی، اب جب توجہ سے پڑھنے لگی تھی تو ہر چیز بہت جلدی ناصر فیکھ رہی تھی بلکہ خود بھی محنت کر رہی تھی۔

آج بھی ایک بجے کے قریب جب وہ پلنگ پر آیا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں لحاف اوڑھے سو رہی تھی۔ وہ بھی اپنی جگہ پر لیٹ کر سو گیا تھا لیکن اسے ابھی سوئے ہوئے گھنٹہ بھر ہی ہوا تھا جب مالانے یوں ساتھ لگ کر پھر سے اٹھادیا۔

تقی نے کھلی کتاب پر سے نظر اٹھائی اور رخ موڑے اس کی طرف دیکھا وہ آنکھیں موندے لیٹی تھی چہرہ اب لحاف سے باہر تھا۔

بالوں کی بہت سی لیٹیں بے ترتیب سی ہو کر چہرے کی اطراف کو ڈھک رہی تھیں، لمبائی رخ بھنویں اور ان کے نیچے اوپری رخ ہلکی سی خم لیے ہوئے پلکیں، چھوٹی سی ناک جو اس کے گلائی صورت چہرے کی مصومیت میں اضافے کا باعث بنتی تھی۔

مالا کو یوں دیکھنا دل کو ر جھانے لگا تھا اور آج کی قربت نے ایک انوکھے سے احساس کو جنم دے دیا تھا۔ اس کی قربت کو یاد کر کے دل کی دھڑکنیں رفتار کیوں بڑھا رہی تھیں۔ تقی نے تین انگلیاں ماتھے پر رکھیں اور آہستگی سے پیشانی سہلائی۔

سر کو بار بار جھٹکنا بھی آج کار آمد نہیں تھا، آہستگی سے کرسی پر سے اٹھا اور پلنگ پر آکر ساتھ لیٹ گیا کروٹ مالا کی طرف لے کر بازو کو فولڈ کرتے ہوئے اس پر سر ٹکایا دیا اور نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں اس کو دیکھنا فرحت بخش احساس دے رہا تھا۔ وہ لاکھ مضبوط سہی پر یہ میٹھا سا احساس جواب مالا کے لیے اس کے دل میں جاگ رہا تھا اس کو اچھا لگنے لگا تھا اور پھر یونہی اسے دیکھتے دیکھتے آنکھ پھر سے لگ گئی۔

آنکھ کھلی تو وہ پلنگ پر اکیلا لیٹا تھا، دن چڑھ گیا تھا، کمرہ کھڑکیوں کے پردوں سے اور روشن دان سے آتی روشنی کے باعث روشن تھا۔

حاکم قصر کے مکینوں کی آوازیں پوری حویلی میں گونج رہی تھیں۔ مطلب اس کے سوا ہر کوئی جاگ چکا تھا، تقی نے گردن گھما کر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا صبح کے دس بج رہے تھے۔

کل ساری رات مالا کی وجہ سے نیند نہیں پوری ہوئی تھی اور پھر صبح جب آنکھ کھلی تو سر بو جھل تھا اور دل عجیب طرح سے بے ایمان ہسپتال جانے کا ارادہ ترک کرتا وہ پھر سے سو گیا تھا۔ اور اب دن چڑھے جا کر آنکھ کھلی۔ اٹھ کر پلنگ پر بیٹھنے کے بعد گردن کو دائیں بائیں جھٹکے دیتا اور بالوں میں ہاتھ پھیرتا اٹھا، چپل پہن کر باہر آیا تو صحن میں رونق لگی ہوئی تھی وہ شامی داس وقت گھر نہیں ہوتا تھا اس لیے یہ سماں دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔

خدیجہ بیگم باہر چارپائی دھوپ میں ڈالے تارے بو اسے سر کی مالش کروا رہی تھیں، اریب پاس ہی ریڈیو کان سے لگائے بیٹھی تھی۔

بلقیس اور غزالہ ایک طرف بیٹھی دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی تیار کر رہی تھیں، منہا ایک کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی اور اس کی نیند حرام کر دینے والی اور چین چرائینے والی محترمہ درخت کے ساتھ بندھے جھولے پر بیٹھی گود میں رکھی کتاب پر سر جھکائے ہوئے تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کے جوڑے میں وہ سبز درخت کے نیچے بیٹھی قدرت کا حسین منظر لگ رہی تھی یا پھر اس کا ذہن اور دل رات متفق ہو کر اسے پوری دنیا کی حسین ترین دوشیزہ مان چکے تھے وہ تقی کو سکول ناجانے پر راضی کر چکی تھی وہ سکول نہیں جانا چاہتی تھی، بس گھر رہ کر تیاری کرنا چاہتی تھی۔

مرد حضرات گھر سے جا چکے تھے اور چھوٹے بچے سارے سکول گئے تھے شامی داس لیے ان میں سے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تقی منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے برانڈے کے زینے اترتا ہوا غسل خانوں کی طرف بڑھا۔

”تقی۔۔۔ ادھر آئی یو“

خدیجہ بیگم کی نظر جیسے ہی تقی پر پڑی تو آواز لگا دی، مالانے چونک کر سر اوپر اٹھایا

”اسلام علیکم۔۔۔ جی بی جی“

تقی نے خدیجہ بیگم کے بلانے پر فوراً قدم واپس پلٹے تھے اور پھر ان کی چارپائی کے پاس آ کر رکا

”و علیکم سلام جیتے رہو لال، آج خیریت ہی ہووے نا بیٹا طبیعت ٹھیک ہے؟“

خدیجہ بیگم نے اس کے یوں گھر ہونے پر تشویش ظاہر کی اب مالا سمیت باقی سب بھی تقی کی طرف جواب طلب نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔

”جی بی جی بالکل خیریت ہے بس رات زیادہ دیر تک کام کرتا رہا اس لیے آنکھ نہیں کھلی“

تقی نے سنجیدگی سے جواب دیا، جس پر خدیجہ بیگم کی تیوری چڑھی اور ناگوراری سے ناک اوپر اٹھائی

”یہ رات اللہ نے سونے کے لیے بنائی ہے میاں، رات بھر الو کی طرح مت جاگا کر سو جایا کرو وقت پر“

خدیجہ بیگم کی پریشانی پل بھر کو ہوا ہوئی تھی، تقی مسکرا کر گردن کو ہاتھ سے دباتا غسل خانے کی طرف بڑھ گیا کچھ دیر بعد گیلے چہرے اور بالوں کے ساتھ وہ واپس سیدھا مالا کی طرف آیا تھا۔

”کیا پڑھ رہی ہو۔۔۔؟“

پاس آ کر، آبرؤ چڑھائے پوچھا، مالانے سر مزید نیچے جھکا لیا، اس کا اپنی طرف آتا دیکھ کر ہی دل زور سے دھڑکنے لگا تھا، رات والی حرکت کے بعد اب اسے یوں دیکھنا، ہمت نہیں بندھ رہی تھی، صبح جب اسے سوئے دیکھا تب سے لے کر اب تک بس ذہن میں یہی بات تنگ کر رہی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہو گارات کی حرکت پر۔

”سائی نس کے دو پیپر تیار کر رہی ہوں آج رات کو ٹیسٹ دوں گی“

مالانے سر جھکائے ہی جواب دیا وہ جھولا تھا مے کھڑا تھا اور نگاہیں اس کی مانگ پر جمی تھیں۔

”ہمممم۔۔۔ ٹھیک ہے ویسے آج میں گھر ہوں تو ہم ریاضی کے کچھ سوال کر لیں گے میں ناشتہ کر لوں پھر کمرے میں آ جانا“

تقی نے آہستگی سے کہا وہ سر ہلا کر رہ گئی، مگر چہرہ اوپر نہیں اٹھایا

”تقی آ جانا ناشتہ کر لے“

بلقیس نے صحن میں ایک چھوٹے لکڑی کے میز پر ناشتہ سجانے کے بعد آواز لگائی تھی، تقی واپس پلٹا تو مالانے سینے پر ہاتھ رکھے سانس خارج کیا، شکر ہے تقی نارمل ہے نہ امت تھوڑی کم ہوئی

پھر وہ ناشتہ کرتے ہوئے بھی بار بار چور نگاہوں سے مالا کو دیکھ رہا تھا جواب اس کی نگاہوں سے بے نیاز تھی اور صحن میں چکر لگاتے ہوئے پڑھ رہی تھی۔

یہ سبز گنبد والی پکی اینٹوں سے تعمیر کی ہوئی خوبصورت مسجد گاؤں کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ جس کے لکڑی کے بنے بڑے سے گیٹ کو بھی سبز رنگ کیا ہوا تھا۔

غزالہ نے مالا کا ہاتھ تھام رکھا تھا وہ سیاہ برقعہ زیب تن کیے ہوئے تھی اور مالانے بڑی سی سیاہ شال اپنے ارد گرد لپیٹ رکھی تھی۔ دونوں اب مسجد کے گیٹ کے پاس پہنچی تھیں۔ مسجد حویلی سے زیادہ دور نہیں تھی اس لیے وہ دونوں پیدل ہی آئی تھیں۔

یہاں مسجد میں دینی تعلیم کے ساتھ پانچویں جماعت تک طلبہ بھی بٹھائے جاتے تھے جن کو درسی تعلیم بھی دی جاتی تھی اس لیے یہ مسجد مکتب تھا، ابھی بھی دوپہر کا وقت تھا اور بچے چھٹی کے بعد مکتب سے نکل رہے تھے گھروں کے ہی کپڑوں میں ملبوس، کپڑے کے بنے بستے پشت پر ڈالے، کتابیں اور تختی ہاتھ میں تھامے کتنے ہی بچے مکتب سے بھاگتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔

مسجد کے اندر داخل ہوتے ہی راہداری سے ایک چھوٹا سا گیٹ اندر کی طرف جاتا ہے جہاں مولوی روح اللہ کی رہائی لیش گاہ تھی وہ مسجد کے امام تھے۔ مالانے رات آنے والے خواب کا ذکر پھر سے غزالہ سے کیا تو اب کی بار غزالہ بھی پریشان ہو گئی تھی کیونکہ مالا بہت ڈری ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ اب مالا کو لے کر گاؤں کے مولوی کے پاس آئی تھی جو دم درود کرتے تھے اور دینی مسائیل میں رہنمائی بھی کرتے تھے۔

راہداری سے آگے آتے ہی غزالہ مالا کا ہاتھ تھامے اس چھوٹے سے لکڑی کے دروازے میں سے گزرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی کچے صحن کے درمیان میں گھنے نیم کے درخت کے نیچے چند بچے قرآن پاک پڑھنے میں مصروف تھے۔ صحن کو گیلی مٹی اور توڑی کے ملاپ سے اچھی طرح لپ کیا گیا تھا۔ درخت کے نیچے بیٹھے بچے ایک قطار میں کچھور کے خشک پتوں سے بنی چٹائی پر بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے اور ان کے پیچھے

درخت کے نیچے چارپائی یاں لگی تھیں۔ کچھ دوری میں دو تین زینے چڑھ کر چبوتر ابنا گیا تھا جہاں دو کمرے تھے، غزالہ اب مالا کا ہاتھ تھامے صحن عبور کرتی ان بچوں کے پاس آچکی تھی۔

”بچو قاری صاحب کہاں ہیں؟“

تھوڑا سا جھکتے ہوئے مولوی صاحب کے بارے میں دریافت کیا، ایک بچے نے قرآن کو بند کیے ان کی طرف نگاہ اٹھائی

”ہجرے میں گئے ہیں خالہ آپ بیٹھو میں ابھی بلا کر لاتا ہوں“

بچہ فوراً اٹھا اور مولوی کو اطلاع دینے کی غرض سے کچھ دور بنے کمروں کی طرف بھاگ گیا، اور غزالہ مالا کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی، کچھ دیر بعد ہی مولوی صاحب کمرے سے باہر نکلے، سفید داڑھی اور سر پر سیلے سے ٹوپی سجائے وہ بہت نفیس شخصیت کے حامل انسان تھے سفید رنگ کے ڈھیلے سے کرتا شلوار میں ملبوس وہ اپنے کندھے پر ہلکے سرخ رنگ کا چیک والا منڈا سار کھے ہوئے تھے اور شلوار ٹخنوں سے اوپر تھی۔ جیسے ہی وہ درخت کے پاس لگی چارپائی یوں کے پاس آئے غزالہ عقیدت سے کھڑی ہوئی

”اسلام علیکم مولوی صاحب“

احترام سے سلامتی بھیجی، مولوی صاحب نگاہیں جھکائے ہوئے تھے، وہ اسی طرح خواتین کے ساتھ نگاہیں ملائے بنا نگاہیں جھکا کر ہی بات کرتے تھے۔

”وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ بیٹھو بیٹا“

انہوں نے بڑے شائستہ لہجے میں سلام کا جواب دیا اور ہاتھ کو اٹھائے دو آمنے سامنے رکھی گئی چارپائی یوں میں سے ایک چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

غزالہ مالا کا ہاتھ تھامے چارپائی پر بیٹھی تو مولوی صاحب بھی بالکل سامنے براجمان ہوئے۔ بیٹھتے ہی غزالہ نے ایک پل کی توقف کے بعد اپنی مدعا پیش کی

”قاری صاحب ایک پریشانی درپیش ہے، یہ میری دوسرے نمبر والی بیٹی ہے مالا، اس سے بڑی بیٹی کا گیارہ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا، آپ نے ہی جنازہ پڑھایا تھا شائے دیاد ہو آپ کو“

غزالہ نے اپنی بات کی تہمید باندھی، مولوی صاحب بڑے تحمل سے بات سن رہے تھے۔

”جی۔۔۔ بچے بالکل یاد ہے اللہ بیٹی کے درجات بلند کرے، چوہدری حاکم صاحب کی بڑی پوتی تھی“

قاری صاحب نے نگاہیں جھکائیں ہی غزالہ کی بات کی تائید کی، غزالہ نے دکھ سے سر ہلایا اور پھر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

”قاری صاحب اس کو اس کی بہن خواب میں دکھائی دیتی ہے بار بار اور یہ بہت زیادہ ڈرنے لگی ہے بچپن سے ہی رات کو صحن میں نہیں جاتی تھی جہاں فوارے کے پاس وہ گری تھی اور اب تورات کو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے بہت خوف ناک سے خواب آتے ہیں اور متواتر ایک ہی قسم کے خواب“

غزالہ نے پریشانی پر شکن ڈالے پریشان سے لہجے میں مولوی صاحب کو ساری بات بتائی، مولوی صاحب آہستگی سے جھکے سر کو اثبات میں جنبش دے رہے تھے۔

”بیٹا جی بہن کس حالت میں دکھائی دیتی ہے جب خواب میں آتی ہے؟“

مولوی صاحب نے براہ راست مالا کو مخاطب کیا، مالا نے ایک نظر غزالہ کی طرف دیکھا اور پھر اس کے آنکھوں کے اشارے کو سمجھتے ہوئے سر پر دوپٹہ درست کرتی گویا ہوئی

”قاری صاحب وہ ہمیشہ روتے ہوئے نظر آتی ہے اور ایک بٹن ہے جو ہمیشہ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، وہ بٹن میں نے اٹھایا تھا اس کے ہاتھ سے جب وہ چھت سے گری تھی“

مالا نے خوفزدہ سے لہجے میں ساری بات قاری صاحب کے گوش گزار کی، اور پھر ساتھ ہی اپنے تمام خواب بھی سنائے۔ قاری صاحب خواب سننے کے بعد کچھ پل پر سوچ انداز میں خاموش رہے پھر گہری سانس خارج کی۔ ”ہمممم۔۔۔ بیٹا بات یہ ہے کہ خواب کی تین اقسام ہوتی ہیں، ایک خواب آپ کے روزمرہ کے امور پر منحصر ہوتا ہے جن کاموں میں آپ مشغول رہتے ہو جو باتیں ذہن پر سوار رکھتے ہو، وہی رات کو خواب میں آتی ہیں“ وہ بوڑھے سے جھری دار ہاتھوں کو آپس میں ملائے بہت شائستگی سے بات کر رہے تھے، مالا ہم تن گوش ان کی بات کو غور سے سن رہی تھی۔

”دوسری قسم شیطانیت کے غلبے کی ہوتی ہے جب آپ نماز اور قرآن سے دوری اختیار کرتے ہیں تو آپ کو ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں، عجیب و غریب جانور جیسے کے سانپ، بچھو“ انہوں نے آہستگی سے ہاتھ اٹھا کر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا تھا اور پھر بات جاری رکھی

”اور خواب کی تیسری قسم وہ ہے جسے منجانب اللہ بشارت کہا گیا ہے، یہ خواب ایسے ہوتے ہیں جس میں اللہ جسے چاہتا ہے آنے والے واقعات کے بارے بشارت، آگاہی، اشارات دیتا ہے، یہ اشارے ان باتوں کے بارے میں ہوتے ہیں جو آگے وقوع پزیر ہونے ہوتے ہیں، اس کی زندگی میں یا پھر اس کے کسی پیارے کی زندگی میں، اس کے لیے اللہ تعالیٰ مختلف طرح کے اشارے دیتا ہے، یہ کسی خوشی کے بارے میں بھی ہو سکتے ہیں کسی غم کے بارے میں بھی یا پھر کسی مصیبت کے بارے میں جو درپیش آنے والی ہو“

انہوں نے جڑے ہوئے ہاتھوں کو الگ کیا اور ہاتھوں کو دائیں بائیں کرتے ہوئے اقسام بتائی۔

”اب جیسے تم نے اپنے خواب بیان کیے اس میں ایک بات تو یہ ہو سکتی ہے کہ تم اپنی بہن کی بخشش کی دعا نہیں کرتی ہو اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے اللہ تمہیں آنے والے وقت سے آگاہی دے رہا ہے“

قاری صاحب نے بات مکمل کی اور خاموشی اختیار کی، مالا نے آہستگی سے سر نفی میں ہلایا

”قاری صاحب میں تو نماز قرآن پابندی سے پڑھتی ہوں اور اس کی بخشش کی دعا بھی کرتی ہوں لیکن سمجھ نہیں آتا کہ ایسے خواب کیوں آتے ہیں اس کے متعلق“

مالانے پریشان سے لہجے میں کہا، قاری صاحب نے اثبات میں سر ہلایا جیسے اس کی بات سمجھ گئے ہوں ”ہمم۔۔۔ بیٹا فی الوقت تو کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ خواب بہت عجیب ہیں کوئی سرا نہیں ان کا، آپ صدقہ دو اپنا بھی اپنے شوہر کا، روز سورۃ بقرہ کی آخری تین آیات کی تلاوت با آواز بلند کرو، با وضو رہو“

قاری صاحب بہت شائستگی سے اسے سب سمجھ رہے تھے، اور پھر آنکھیں بند کیے کچھ پڑھنے لگے ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا جسے وہ بار بار صاف کر رہے تھے، پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

”بچی بہت بری بد نظری کا بھی شکار ہے، اس کا فوراً صدقہ دو اور چاروں قل کا پانی پر دم کر کے دوہر فجر کی نماز کے بعد اللہ پاک بہتری لائے گا“

قاری صاحب نے اپنے کندھے پر رکھے پٹکے سے اپنی آنکھیں صاف کیں، جو دم کرتے ہوئے نم ہو گئی تھیں۔

”بہت شکریہ قاری صاحب“

غزالہ نے مشکور لہجے میں کہا اور پھر مالا کو اٹھنے کا اشارہ کیا

”اللہ حافظ“

غزالہ نے حدیہ ایک طرف رکھتے ہوئے خدا حافظ کہا اور مالا کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دوپہر کا وقت تھا اور جاڑے کا موسم اب اپنا زور کم کر چکا تھا، نیم کے دونوں درخت ہلکی ہلکی ہوا کے زور پر رقص کرتے ہوئے جھول جھول کر ایک دوسرے کو بو سے دے رہے تھے۔

اب دھوپ میں بیٹھنا محال ہو جاتا تھا لیکن چھت کے پنکھے ابھی چلنا شروع نہیں ہوئے تھے، دوپہر کے کھانے کے بعد جہاں دسترخوان سمٹ رہا تھا وہاں چوہدری حاکم اب اٹھ کر بیٹھک میں سستانے کے لیے جانے والے تھے۔ خدیجہ بیگم کا کھانا اب الگ سے تخت پر ہی لگتا تھا کیونکہ ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم خم نہیں تھا کہ زمین پر بیٹھ کر با آسانی اٹھ سکتیں۔ تقی بڑے مگن سے انداز میں نوازش اور نقیب کے ساتھ اپنے ہسپتال کے معاملات کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔

شادی کو ڈھائی ماہ ہو چکے تھے اور ان ڈھائی ماہ میں جہاں تقی اور مالا میں تھوڑی سی بے تکلفی ہونے لگی تھی وہاں دوسرے جوڑے کے ہاں تو خوشخبری کی نوید بھی سنا دی گئی تھی۔ منہا غسل خانوں کے پاس دل متلانے کی وجہ سے بے حال بیٹھی تھی تو فرہاد اس کے پاس کھڑا اس سے بھی زیادہ بے حال لگ رہا تھا۔ یہ منظر برآمدے میں بیٹھی خدیجہ بیگم کو ایک آنکھ نہیں بھار رہا تھا۔

”ارے دیکھو۔۔۔ ناشرم نالحاظ۔۔۔“ گوڑا مارا کیسے اس کے چالاڈ کرنے میں لگا ہے ایک ہمارا زمانہ تھا بچہ ہو بھی جاتا تھا تو پانچ، چھ مہینے تو بچے کے باوا بزرگوں سے شرم کے مارے بچے کو اٹھاتے تک نہ تھے، اور یہاں دیکھو“

خدیجہ بیگم نے ناگواری سے ناک چڑھائی، غزالہ اور بلقیس نے بمشکل اپنی ہنسی چھپائی۔

”یہاں نا دید نالحاظ، وہ کھڑا ہے اپنی زوجہ کے پاس“

خدیجہ بیگم نے ہاتھ جھلاتے ہوئے کہا، ساتھ بیٹھی اریب نے تو اور جل کر پہلو بدل لہ

”اماں اس کا بس چلے تو اس کے ہر قدم کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ دے اور ایک وہ ہے ہر دم بس سڑی صورت بنائے گھومتی ہے“

اریب نے ناگواری سے ماں کا ساتھ دیا اور فرہاد کی بیوی سے محبت کو جتایا، مالا جو کچھ دور ہی موڑھے پر بیٹھی تھی، حسرت سے سامنے دیکھا تھا جہاں فرہاد منہا پر صدقے واری جا رہا تھا

یہاں دو مہینوں میں تقی ہنسنے بھی لگا تھا باتیں کرنے لگا تھا لیکن منہا اور فرہاد کو دیکھ کر اکثر اس کے دل میں بھی ایسی خواہشات سراٹھانے لگتی تھیں۔

اکثر محسوس ہوتا تھا کہ تقی اسے محبت سے دیکھ رہا ہے لیکن جیسے ہی وہ نگاہ اٹھاتی وہ نظروں کا زاویہ بدل لیتا تھا۔ اب بھی وہ سامنے بیٹھے تقی کو بار بار دیکھ رہی تھی جو پتہ نہیں کونسی اہم گفتگو میں مصروف تھا۔ آج جمعہ کا دن تھا اور وہ سفید کرتے میں ملبوس تھا اور باتوں میں اس درجہ مگن کہ اس کے یوں دیکھنے پر بھی متوجہ نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک تقی نے اس کی طرف دیکھا تو مالانے گڑبڑا کر نظروں کا زاویہ بدلہ

”مالا۔۔۔ وہ میرے میز پر سے خاکی رنگ کا لفافہ اٹھا کر لانا“

تقی کے اچانک حکم پر وہ جو کھوئی سی بیٹھی تھی، گہری سانس لے کر اٹھی، اتنا ہی بہت تھا کہ وہ اب اس کی بچوں جیسی حرکتوں پر غصہ نہیں کرتا تھا ہنس دیتا تھا اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا احترام کرتا تھا۔ اور وہ بھی اس کی خواہش کا احترام کرتی تھی وہ اس کو پڑھا لکھا دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے بہت محنت کرنے لگی تھی۔

آپ کے اندر موجود خوبی، مہارت اس وقت تک بے کار ہے جب تک آپ ان دونوں چیزوں کے ساتھ محنت کو نہیں جوڑ لیتے، کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے خوبی اور مہارت دونوں کے ساتھ محنت کو ضرب دینا پڑتا ہے تب جا کر کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے اور مالا اب محنت کرنے لگی تھی۔

مالانے کمرے میں جا کر میز پر سے کاغذ اٹھائے وہ باہر آئی اور لا کر تقی کو تھما دیے وہ کاغذ کھول کر اب نوازش اور نقیب سے باتیں کر رہا تھا، اور مالا سر جھٹک کر کتابیں اٹھاتی کمرے میں چل دی۔

چاند کی آخری تار یخوں کی سیاہ رات میں ڈوبے حاکم قصر کے صحن میں فوارے کے اوپر لٹکی قندیل جل رہی تھی اور مسوائے ایک کمرے کے باقی تمام کمروں کی بتی گل تھی، اس کمرے میں بلب کی پیلی روشنی کمرے کے ہر کونے کو روشن کیے ہوئے تھی

کمرے میں موجود لکڑی کی میز پر سرخ رنگ کا گتے کا چکور ڈبہ تھا اور اس میں گہرے بھورے رنگ کے رس دار گلاب جامن تھے جن پر شیرہ چمک رہا تھا اور کہیں پستہ لگا تھا کہیں بادام۔ تقی سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا اور مالا اطراف کی کرسی پر برابر اجمان منہ میں گلاب جامن ڈالے بیٹھی تھی، شہد رنگ جوڑے میں چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھیں گلاب جامن کی لذت کو محسوس کرتے ہوئے پوری کھلیں تھیں۔

مالا نے اب تیسری گلاب جامن اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، جب ہاتھ ڈبے کے بجائے سیدھا لکڑی کے میز پر جا لگا۔ مالا نے چونک کر اوپر نگاہ اٹھائی تو تقی ڈبے کو میز سے اٹھائے اوپر کر چکا تھا۔

”بس کرو مالا۔۔۔۔۔ ہر چیز کی مناسب مقدار صحت کے لیے اچھی ہوتی ہے تم دو گلاب جامن کھا چکی ہو“ تقی نے ماتھے پر شکن ڈالے اسے کھانے سے منع کیا، جو اس بات پر روہانسی ہو گئی اور بد مزہ سی صورت بنائے تقی کو دیکھا

”تو صرف دو ہی تو کھائی یں ہیں، آپ نے خود کہا تھا یہ پورا ڈبہ تمہارا ہے“

مالا نے بیچارگی سے کہا اور پھر نچلے لب کو دانتوں میں دبائے پر جوش انداز میں گلاب جامن اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا جسے تقی نے ڈبہ اور اوپر کرتے ہوئے ناکام بنا دیا۔

تقی نے نئی گاڑی خریدی تھی، گھر میں موجود دو گاڑیاں بہت مصروف رہنے لگی تھیں ایک گاڑی پر بہادر کبھی کسی کو تو کبھی کسی کو گھمائے پھرتا تھا اور دوسری نقیب کے پاس ہوتی تھی، تقی کو شہر جانے میں مسیٰ لہ ہوتا تھا کیونکہ اس کی واپسی شام کو ہوتی تھی اسی وجہ سے وہ اپنی ذاتی گاڑی خرید چکا تھا، جس کی خوشی میں وہ آج مٹھائی لے

کر آیا تھا جہاں حاکم قصر کے باقی سب مکینوں کے لیے ایک مٹھائی کا ڈبہ تھا وہاں وہ مالا کے میٹھے سے محبت کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس کے لیے الگ سے ایک ڈبہ لے کر آیا تھا اور مالا تو اسے یوں کھا رہی تھی جیسے آج ہی ختم کرنا فرض ہو اس پر۔

”تقی ایک اور دے دیں بس پھر نہیں مانگوں گی“

وہ اب آگے ہو رہی تھی اور چہرے پر التجا سچی تھی تقی نے زور سے نفی میں سر ہلایا اور ڈبے کو اس سے بچاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”دیکھو مالا تمہارا ہی ہے، الماری میں رکھ لو لیکن ذرا تحمل سے کھاؤ روز کی بس دو گلاب جامن“

تقی نے اسے تنبیہ کیا جو دیوانی ہو رہی تھی اور اب اس کے سامنے کھڑی اچک کر اس کے ہاتھ سے ڈبہ لینے کی کوشش کر رہی تھی وہ جس طرف کو اوپر ہوتی تقی اسی طرف سے ڈبے کو دوسری طرف کر دیتا۔ تقی اس سے لمبا تھا اس لیے وہ ایڑیوں کے بل اچک اچک کر مٹھائی کھانے کی کوشش میں تھی۔

وہ بے اختیار ڈبہ لینے کے لالچ میں تقی کا ایک بازو قابو کیے اتنا قریب تھی کہ اسے خبر تک نہیں تھی وہ اوپر ڈبے پر نگاہ رکھے ہوئے تھی جبکہ تقی اب اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔

شادی کو تین ماہ ہو چکے تھے، دسویں جماعت کے امتحانات قریب تھے جہاں مالا دن رات پڑھائی میں جتی رہتی تھی وہاں وہ مالا کے لیے اپنے دل میں انگنت جذبات پنپ چکا تھا، وہ چھوٹی سی لڑکی جہاں اپنی تمام عادات اس سے مختلف رکھتی تھی وہاں ایک بہت پیارا سادل بھی رکھتی تھی جس میں اس کی محبت کے ساتھ فکر، عزت اور احترام بھی تھا۔

وہ حیران ہوا تھا کہ جس نے ساری عمر پڑھائی نا کرنے کی تگ و دو کی تھی اس کے لیے خود کو کتنا بدل لیا تھا۔

تقی کے دل کے قفل کھولنے میں جہاں اس کے دو آتشہ حسن کا کمال تھا وہاں اس کے محبت کرنے والے دل نے بھی بہت کمال دکھایا تھا، لیکن تقی نے ابھی اپنے جذبات اس پر آشکار نہیں کیے تھے وہ جانتا تھا وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے اور جس دن اس نے بھی اپنے جذبات ظاہر کر دیے اس کی توجہ پڑھائی پر سے کم ہو سکتی ہے جو کہ وہ ہر گز نہیں چاہتا تھا۔

”آں۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔بس کریں نابس ایک دے دیں اس کے بعد نہیں لوں گی، وعدہ ہے پکے والا“

مالا اب بچوں کی طرح ضد پر اتر آئی تھی، اور بے اختیار تقی کے اتنا قریب آگئی تھی کہ خبر ناہوئی احساس تو تب ہو جب اس کی نگاہوں کی تپش کو اپنے چہرے کے ہر خدو خال کو چھوتے ہوئے محسوس کیا پھر مالا کی نگاہ بھی ڈبے پر سے ہٹتی اس کی نگاہوں تک آن پہنچی تھی جہاں اس کے خواب حقیقت کا لبادہ اوڑھے کھڑے تھے، تقی کی گہری سیاہ آنکھوں میں بے پناہ محبت جھلک رہی تھی ایسی محبت جو اس نے کبھی قصے کہانیوں میں پڑھی تھی وہ اس کے چہرے کو آج جس نظر سے دیکھ رہا تھا آج سے پہلے یوں نگاہوں کے تصادم کی سنگت میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ تو ہر بار مالا کے دیکھنے پر نگاہ چراتا تھا۔ تقی کو اچانک احساس ہوا وہ اس پر اپنی بے تابی ظاہر کر رہا ہے تو فوراً گڑبڑا کر پیچھے ہوا۔ وہ یوں پیچھے ہوا تو مالا بھی اس بے باکی پر نادام سی ہوتی نگاہیں جھکا گئی، وہ جو ہر روپ میں اسے بھاتا تھا اس لمحے اس سیاہ گرتے میں اس کے دل کی دنیا اٹھل پھٹھل کیے ہوئے تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے لے لو لیکن بس ایک“

تقی نے مسکراتے ہوئے ڈبہ اس کے سامنے کیا، اس نے ہاتھ بڑھایا اور ایک کے بجائے دو گلاب جامن اٹھالیے اور بے ساختہ کھکھلا دی۔ اس کی ہنسی کی کھنک پورے کمرے میں جلتی رنگ بجاگئی تھی۔ اور شہد رنگ جوڑے میں چہرک گلابی ہو گیا تھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔دھوکا۔۔۔۔۔سہی ہے وہ جو کہا تھا کہ گاڑی پر بیٹھ کر سیر پر لے جاؤں گا وہ اب بالکل نہیں“

تقی نے خفگی سے ڈبہ بند کرتے ہوئے مصنوعی ناراضگی دکھائی تو مالا جو پوری گلاب جامن کو منہ میں ڈال چکی تھی ہاتھ ہی ہلاتی رہ گئی کیونکہ بول تو پا نہیں رہی تھی تقی اب الماری کی طرف بڑھ رہا تھا اور مالا اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ بمشکل گلاب جامن نگلی۔

”یہ بات غلط ہے وہ وعدہ آپ پہلے لے چکے ہیں“

مالا نے خفگی سے کہا تقی اب الماری کھولے ڈبے کو وہاں ایک طرف رکھ رہا تھا۔ مالا کی نظر الماری پر پڑی تو تیوری چڑھ گئی لکڑی کی ایک طرف بنی یہ چھوٹی الماری تقی کی کتابوں اور کاغذات سے بھری ہوئی تھی اور ساتھ موجود لمبے والے پٹ میں کپڑے تھے جہاں زیادہ تقی کے کپڑے تھے اس کے تو اکا دو کا جوڑے یہاں ہوتے تھے اور باقی سب سٹور میں موجود ڈرنک میں ہوتے تھے اور اب تقی کی الماری کی اتنی ابتر حالت دیکھ کر مالا کو شدید افسوس ہوا تھا۔

”اللہ۔۔۔۔۔ تقی الماری کتنی گندی ہو رہی ہے آپ کی صفائی کروں گی امتحانات کے بعد“

مالا نے ہنوز ناگواری سے بے ترتیب الماری کو دیکھتے ہوئے کہا

”نہیں بالکل نہیں، بہت اہم کتابیں پڑی ہیں اور کچھ کاغذات بھی آج تک نہیں ہاتھ لگانے دیا کسی کو میں نے“

تقی نے الماری کو بند کیا اور پھر کمر الماری کے ساتھ ٹکادی۔

”میں تو ساری صفائی کروں گی اب یہ کمرہ صرف آپ کا تھوڑی ہے میرا بھی تو ہے اپنی مرضی سے ہر چیز سیٹ

کروں گی“

مالا نے بچوں کی طرح چہکتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا جس نے اس کی بے رنگ

زندگی میں کتنے ہی رنگ بھر دیے تھے۔

کچھ مہینے پہلے وہ اسے اپنے گلے میں زبردستی پہنائی ہوئی مالا لگ رہی تھی جسے وہ بس گلے میں لٹکائے پھرتا تھا پر آج اس مالا کو اور اس کے اندر پروئے ہوئے ہر پھول ہر کلی کو اپنے اندر سمونا چاہتا تھا وہ اسے بہت عزیز ہو گئی تھی مگر پیش رفت میں عجیب سی جھجک اڑے آ جاتی تھی۔

مالا اب پھر سے میز پر بیٹھ کر اپنی کتاب کھول چکی تھی، تقی نے بھی گہری سانس لیتے ہوئے قدم میز کی طرف بڑھا دیے۔

سفید رنگ کے کاغذ پر نیلی سیاہی کے قلم سے لکھے گئے الفاظ ایک قیامت برپا کر گئے تھے۔ لفظ لفظ ہر پڑھنے والے کے لیے حیران کر دینے والا تھا۔

آداب

ایک بہت ہی اہم خبر آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں، بہت شرمندہ ہوں یہ خبر پہنچانے میں بہت تاخیر کر دی پر اب سمجھتا ہوں نابتا کر نا انصافی کروں گا، میاں منیر اختر آپ سب کو دس سال سے دھوکے میں رکھے ہوئے ہیں، انہوں نے لاہور شہر میں پانچ سال پہلے ایک طوائف سے نکاح کیا تھا اور اب اس میں سے دو بچے بھی ہیں، وہ بیوپار کے سلسلے میں جو ہفتہ ہفتہ بھر شہر گزارتے ہیں دراصل آپ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں، پہلے پانچ سال تک وہ حاکم قصر کے بیوپار سے کمانے والا پیسہ رانی نامی طوائف پر خرچ کرتے رہے اور پھر پانچ سال پہلے اسے اپنے نکاح میں لے آئے اور دنیا پور لے آئے اب وہیں اس کے ساتھ اور اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ جانتا ہوں میرا یقین کوئی نہیں کرے گا اس لیے ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھیج رہا ہوں۔

حاکم قصر کا خیر خواہ

خط پر لکھے الفاظ پیٹھ پر مارے جانے والے خنجر کے مترادف تھے، خطاب فرہاد، اریب، نوازش اور نقیب کے ہاتھ سے گزرتا ہوا چوہدری حاکم کے ہاتھ میں آیا تھا۔

حاکم قصر کے اٹاری میں تو جیسے ایک قیامت سا سماں بندھ گیا تھا، اریب بے حال تخت پر بیٹھی بین کر رہی تھی، بال بکھر کر چٹیا سے نکلے ہوئے تھے رورو کر آنکھیں لال ہو رہی تھیں، پاؤں میں جو تا تک نا تھا وہ ننگے پاؤں لٹکائے تخت پر خدیجہ بیگم کے پاس بیٹھی تھی۔

نقیب، نوازش، منہا، فرہاد، غزالہ، بلقیس، نقی، رملہ، ارحمہ، سکینہ اور تاری بوا سب موجود تھے کوئی ستون کو تھامے کھڑا تھا تو کوئی تخت کے گرد کھڑا تھا سب حیران و پریشان تھے۔ نقی ہسپتال میں تھا اور مالا پیپر دینے گئی تھی، اریب بیگم کی سسکیاں بار بار گونج رہی تھیں جو ماحول کو اور سوگوار بنا رہی تھیں۔

اب چوہدری حاکم سفید رنگ کا کاغذ ہاتھ میں تھامے کھڑے تھے اور جھری دار پوٹوں کے نیچے شیر جیسارعب رکھنے والی آنکھیں کاغذ پر لکھی سطروں کا عکس آنکھوں کی پتلیوں میں بنا رہی تھیں۔

چوہدری حاکم نے تحریر ختم کی تو نوازش نے ان کی طرف تصویر بڑھائی، تصویر آج سے پانچ سال پہلے کی تھی، تصویر میں سرخ غرارے میں ملبوس انیس بیس سالہ جوان دوشیزہ منیر میاں کے پہلو میں کھڑی تھی اور منیر میاں سو روپے کی نوٹوں کو تھون رخ جوڑ کر بنائی جانے والی مالا گلے میں پہنے پوری بتیسی کا نمائش کرتا ہوا چوہدری حاکم کی رگوں میں بہتے خون کو نا صرف گرم کر گیا تھا بلکہ خون کی رفتار بھی بڑھا گیا تھا۔

”اماں میں نا کہتی تھی اتنے دن لگا آتے ہیں شہر کچھ تو چکر ہے، دل کو تو بہت عرصے سے کھٹکا تھا بس چپ رہی آپ لوگوں کی عزت کی خاطر“

آنسوؤں سے بھیگی آواز میں اریب بلبل اٹھی، بار بار دوپٹے کے پلو کو اٹھا کر آنسو پونچھ رہی تھی اور خدیجہ بیگم بیٹی کے اس حال پر بے حال بیٹھی تھیں، جھری زدہ چہرہ بیٹی کے غم سے دل پر گزرنے والی قیامت کی عکاسی باخوبی کر رہا تھا۔

”یہ خط بھیجنے والا کون ہے کچھ پتا چلا“

نقیب، نوازش کی طرف دیکھتے ہوئے آگے ہوا اور چوہدری حاکم کے ہاتھ سے خط تھام لیا، نوازش نے آہستگی سے سر جھکا کر نفی میں گردن ہلا دی۔

”یہ کون ہے اس کا پتا کرنے کے بجائے اس خبیث کی منڈی دبوچنی ہے، میری پیٹھ پر ہی خنجر گھونپنے کھڑا ہا اتنے سال سے ناہنجار، نقیب بہادر کو کہو گاڑی نکالے ابھی اور اسی وقت جانا ہے شہر“

چوہدری حاکم نے غم اور غصے کے ملے جلے لہجے میں لب بھینچے پاس کھڑے نقیب کو حکم صادر کیا

”اباجی بہادر کو کہنا مناسب نہیں ہے، اسے کیوں گھر کے مسئی لوں میں الجھائی یں، میں گاڑی چلا لوں گا آپ ساتھ چلیں“

نقیب نے گردن نفی میں ہلاتے ہوئے چوہدری حاکم سے کہا

”اونیں۔۔۔۔۔ بہادر کو اس کے دوستوں کی رہائی لیش گاہ کا پتہ ہے، تو مجھے بہادر کے ساتھ ہی جانے دے“

چوہدری حاکم نے نقیب کی بات کی نفی کی اور دور درخت کے پاس کھڑے لڈن کو اشارے سے اپنی طرف بلایا جو اشارہ ملتے ہی مڈب انداز میں بھاگتا ہوا اٹاری کے زینے کے قریب آیا۔

”لڈن میاں کہو بہادر کو گاڑی تیار کرے“

چوہدری حاکم نے پاس کھڑے لڈن کو اشارہ کیا تھا، لڈن جلدی سے سر ہلاتا ہوا گیٹ کی طرف چل دیا، اب سب کی نگاہیں چوہدری حاکم پر جمی تھیں

”کاہے کو جارہے ہیں اس سانپ کے پاس آپ؟ اب کیا فائی دہ دکھ جو دینا تھا دے دیا، میں تو کہیے دیتی ہوں حویلی کی دہلیز میں قدم نارکھے وہ لپا۔۔۔ لٹیرا“

خدیجہ نے دلگیر لہجے میں غصہ نکالا اور پھر سے دوپٹے میں منہ چھپائے روتی اریب کو دکھ بھری نگاہوں سے دیکھا ”کیوں ناجاؤں۔۔۔ وہ وہیں طلاق دے گا اس عورت کو یہ کیا کوئی چھوٹی موٹی بات ہے، چوہدری حاکم کی بیٹی کے سر وہ سوکن لا کر بیٹھا دے گا وہ بھی طوائف اور میں چپ سادھ لوں گا ہو ہی نہیں سکتا“

چوہدری حاکم نے غصے میں دانت پیستے ہوئے ایسے کہا کہ ان کا پورا وجود غصے سے کانپ اٹھا اور سفید رنگت پل بھر میں ہی سرخ ہونے لگی۔

”ابا جی بال بچے ہیں اس میں سے بھی ایسے کیسے طلاق دے گا اب“

نوازش نے پریشان سے لہجے میں کہتے ہوئے گفتگو میں حصہ ڈالا، چوہدری حاکم نے ایسی خونخوار نگاہ نوازش پر ڈالی کہ وہ فوراً نگاہیں جھکا گیا۔

”تو یہاں کیا۔۔۔ یہ دونوں اس کے بچے نہیں ہیں، اس کی اچھی خبر لوں گا میں یہ صلہ دیا ہماری بے لوث محبت کا اس نے، اپنے کاروبار کو میں نے اسے ایسے سوئپ دیا تھا جیسے وہ میرا تیسرا بیٹا ہو، اور اس نے میری ہی بیٹی کو دکھ دے دیا“

چوہدری حاکم کا چہرہ سرخ تھا اور جھری دار کنپٹی کی نسلیں بھی غصے کے سبب باہر کو ابھر رہی تھیں۔ اور پھر وہ وہاں رُکے نہیں تھے تیز تیز قدم اٹاری کے زینے اترنے لگے پیچھے نقیب اور نوازش بھی اسی رفتار سے قدم بڑھا چکے تھے اور اٹاری میں سب نفوس دم سادھے کھڑے تھے بس اریب کا بین گونج رہا تھا۔

”کبھی خوشی نا دی۔۔۔ اس شخص نے مجھے۔۔۔ ہائے۔۔۔ ساری عمر کاٹ دی اپنے میکے میں۔۔۔۔۔ سفید ہوتے ہوئے بالوں میں یہ کھے ڈال گیا۔۔۔۔۔“

چھت پر لگا پنکھا درمیانی رفتار میں چل رہا تھا اور پنکھے کے گھومتے پر گیس۔۔۔ گیس۔۔۔ کی آواز کے ساتھ پورے کمرے میں ہوا بکھیر رہے تھے، ہوائیچے میز پر رکھی کتاب کے اوراق کو اڑا رہی تھی اور کتاب کے ساتھ میز پر کہنی کے بل ہاتھ پر چہرہ ٹکائے مالا کتاب سے بے نیاز اس چہرہ لیے خلا میں گھور رہی تھی۔

تقی سامنے کرسی پر بیٹھا کسی کتاب کو پڑھنے میں محو تھا۔ مالا جب پیپر دے کر واپس آئی تو پورا حاکم قمر ایسے دل دہلا دینے والے سنائے میں ڈوبا تھا کہ وہ پریشان ہو گئی بعد ازاں غزالہ سے اسے سارے ماجرے کی خبر ہوئی۔ چوہدری حاکم منیر کو زبردستی اس کے شہر والے گھر سے اٹھلائے تھے اور اب منیر میاں کو کہاں رکھا گیا تھا حویلی کے مکین ابھی اس بات سے بے خبر تھے۔

کتاب کے اوراق پھڑپھڑانے کی آواز مسلسل تقی کے کانوں میں پڑی تو اس نے سر اوپر اٹھایا، مالا اس صورت اور پرسوج نگاہیں لیے خلا میں گھور رہی تھی۔ کرمزی رنگ کے جوڑے میں وہ اس جوڑے پر بنے چھوٹے چھوٹے سرخ پھولوں کی ہی مانند لگ رہی تھی۔ بالوں کا وہی مخصوص انداز درمیان میں مانگ اور چوٹی کندھے سے آگے کی طرف گرائے، لمبی گھنی پلکیں جھپکے بنا وہ سامنے غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی۔

”مالا۔۔ کیا ہوا؟“

تقی نے آہستگی سے پکارا تو وہ پلکیں جھپکا کر ہوش میں آئی۔ ہتھیلی پر سے ٹھوڑی اٹھائے اور جلدی سے ایک نظر کتاب کی طرف اور پھر تقی کی طرف دیکھا۔

”کہ۔۔۔ کچھ نہیں“

بے دلی سے جواب دیا اور نگاہیں کتاب پر جمادیں، تقی نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا جو الجھن کا شکار تھا۔

”کچھ تو ہے بتاؤ تو کیا آج والا پرچہ اچھا نہیں ہوا؟“

تقی نے آبرؤ چڑھائے تشویش سے سوال کیا جس پر وہ فوراً نفی میں سر ہلا گئی۔

”پہر بہت اچھا ہوا ہے پر میں یہ سوچ رہی ہوں منیر پھپھانے دوسری شادی کیوں کی آخر؟ اریب پھپھو اتنی پیاری تو ہیں“

مالانے دکھ بھرے لہجے میں اپنی اداسی کا سبب بتایا تو تقی نے مسکراتے ہوئے کتاب بند کی اور بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا معصوم صورت اور پیشانی پر الجھی سی لکیریں موجود تھیں۔

”اس کا تعلق خوبصورتی سے تو نہیں ہوتا، اس کا تعلق تو محبت سے ہوتا ہے، جس مرد کو اپنی بیوی سے محبت نہیں ہوتی وہی اپنی بیوی کو ایسا دکھ دیتا ہے کیونکہ اس کے احساسات اس کے لیے ختم ہو جاتے ہیں“

تقی نے شائستگی سے جواب دیا، مالانے روہانسی صورت بنالی لیکن تقی اُسکی حالت سے بے نیاز بس بولے جارہا تھا۔

”دیکھو دوسری شادی ویسے تو مرد کر سکتا ہے اسے اجازت ہے، پر اس کی بہت سی شرائط ہوتی ہیں جو آجکل کے بہت سے مرد کبھی پوری نہیں کر سکتے اور جس طرح منیر پھپھانے دوسری شادی کی یہ غلط ہے اس میں انہوں نے اپنی بیوی کو دھوکا دیا چھپ کر شادی کی اور یہ ثابت کر دیا انہیں اریب پھپھو سے محبت نہیں تھی“

تقی نے ایک لمحے کا توقف کیا، وہ دم سادھے تقی کو سن رہی تھی اور دل میں عجیب سے دوسو سے اور خوف سر اٹھانے لگا تھا۔

”کیونکہ ہم بیوی کو دکھ دینے کا صرف اس وقت سوچ سکتے ہیں جب ہمارے دل میں اس کی محبت ختم ہو جائے مطلب ہم اس کے احساسات کی پرواہ نہ کریں، اور دوسری عورت سے شادی کر لیں۔“

تقی نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں خوف کے سایے لہرا رہے تھے۔ مالانے بھنویں سکڑیں اور ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا ئے میز پر رکھا، لبوں کو آپس میں ملا کر ہمت جتائی۔

”تو کیا آپ بھی دوسری شادی کر لیں گے؟“

سہمے سے لہجے میں سوال کیا، جبکہ نگاہیں نیچے جھکار کھی تھیں، تقی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جو رونے جیسی صورت بنائے بیٹھی اس سے سوال کر رہی تھی۔

”کیا۔۔۔؟“

تقی بے ساختہ اس کی بات پر ہنس دیا اور سر ہوا میں تاسف سے مارا، بمشکل اپنی ہنسی کو روکا، اچھا تو یہ تب سے یہ سوچے جارہی ہے۔

”ہاں آپ بھی تو مجھ سے محبت نہیں کرتے تو کیا دوسری شادی کر لیں گے“
خفا سا لہجہ تھا اور خالص تائیدیوں جیسا شکوہ، تقی نے محبت سے اس کی طرف دیکھا جس کو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔
”تمہیں کب میں نے کہا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا؟“

مسکراہٹ کو لبوں میں بمشکل دبائے مالا سے سوال کیا، نگاہوں سے اس کے چہرے کے ہر ہر نقوش کو چھو لیا، وہ یوں اس کی محبت کو کھودینے کا خوف لیے بیٹھی اس کے دل میں اپنی جڑیں اور پھیلا رہی تھی۔
مالا نے پلکیں گالوں پر لرزائی یں وہ چہرے پر ایسے نگاہیں گاڑے بیٹھا تھا کہ سامنے دیکھنا محال تھا، لجائی سی آواز میں اگلا شکوہ کیا

”تو آپ نے یہ کب کہا کہ آپ محبت کرتے ہیں“
لہجہ ہنوز خفگی بھرا تھا اور چہرے پر انگنت رنگ رقص کناں تھے۔

”تو محبت کیا بتانے سے ہی ظاہر ہوتی ہے اعمال سے نہیں ہو سکتی کیا؟“

تقی نے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مخمور لہجے میں کہا تو مالا نے الجھ کر نگاہ اٹھائی کون سے اعمال آج تک میرا ہاتھ تک تو پکڑا نہیں۔۔۔ دل نے دماغ سے ہی شکوہ کر ڈالا

”میں تمہارا اتنا خیال کرتا ہوں، تمہاری ہر خواہش کا خیال کرتا ہوں کیا یہ محبت نہیں“

تقی نے بھنویں اچکائے سوالیہ نگاہوں کو اس کے چہرے پر جمائے پوچھا جواب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
”تو آپ پھر دوسری شادی نہیں کریں گے نا“

بے یقینی سے پوچھا، نگاہیں ہنوز تقی کی گہری سیاہ آنکھوں میں جھانک رہی تھیں اور دل ہولے ہولے میٹھا سا رتھ
رگ و پے میں دروڑانے کا سبب بن رہا تھا اور ایسا ہی کچھ حال سامنے بیٹھے تقی کا تھا، اس کی ہر ادا پر دل ہار رہا تھا وہ پر
دل اسے تنگ کرنے پر اکسانے لگا

”جس دن تم نے کہا تھا مجھے نہیں پڑھنا اس دن میں نے سوچا تھا ویسے کہ دوسری شادی کر لوں گا کسی پڑھی لکھی،
کسی ڈاکٹر سے“

تقی نے مسکراہٹ دبائے اسے چھیڑا تھا، حالانکہ جس دن اس نے پڑھنے سے انکار کیا تھا اسی دن تو اس سے محبت
کے انوکھے جذبے سے وہ آگاہ ہوا تھا، تقی کی اس بات پر اس کا پورا منہ کھل گیا، دل ڈوب گیا اور آنکھیں ادا اس ہو
گئیں

”اگر میں نا پڑھتی تو آپ شادی کر لیتے“
دلگیر لہجے میں معصوم رونی صورت بنائے سوال کیا
”ہاں سوچا تو تھا ایسا“

تقی نے کندھے اچکائے اور مسکراہٹ کو اٹھانے سے زبردستی روک کر سنجیدگی اختیار کی اور یہ کرنا اس کے لیے
مشکل تو نہیں تھا۔

”آپ نے تو ابھی کہا تھا کہ مرد دوسری شادی اس وقت کرتا ہے جب اسے پہلی بیوی کے دکھ کا احساس نہیں ہوتا،
تو آپ صرف اس وجہ سے کر لیتے کہ میں پڑھ لکھ نہیں رہی تھی“

”ادھر دیکھو میری طرف، تمہیں پتا ہے میں کیوں چاہتا ہوں تم پڑھ لکھ جاؤ“

مالا چونک کر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تقی کے منہ پر ہاتھ رکھ چکی تھی، تقی نے محبت سے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا

ملا حیرت سے اس کے آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، جو بڑے آرام سے اس طرح کی باتیں کرتا ہوا اس کے دل کو دبوچ رہا تھا شدت سے احساس ہوا کہ وہ اسکا کیا ہے اس کی ایسی بات پر ہی سانس رکنے لگی تھی۔

”ایسے باتیں کیوں کر رہے ہیں، اللہ نا کرے آپ کو کچھ ہو کبھی، میری عمر بھی آپ کو لگ جائے“

مالا نے بھیگی سی آواز میں اپنی عمر سے بڑی بات کر دی تھی اور یہ سب بے ساختہ اس کے دل سے نکلا تھا وہ تقی سے بے پناہ محبت کرنے لگی تھی۔ اور یہ محبت شادی سے پہلے والی محبت سے بہت مختلف تھی اسے اب شادی کے بعد تقی اپنے ہی جسم کا کوئی حصہ لگتا تھا جس کے بنا جینا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”غلط بات، ایسے نہیں کہتے، جانا سب نے ہے ایک دن، میں تو ایک حقیقت بتا رہا ہوں تمہیں کیونکہ تم بہت چھوٹی ہو مجھ سے“

تقی نے محبت سے کہتے ہوئے اس کے ملائی م سے ہاتھ پر گرفت مضبوط کی، مالانے غصے سے ہاتھ پیچھے کھینچے

”چھوٹی ہوں۔۔۔ چھوٹی ہوں۔۔۔ میں نہیں ہوں چھوٹی آپ کی بیوی ہوں بس، چھوٹی بڑی کا نہیں پتا مجھے“

مالا کے لہجے میں خفگی تھی وہ رو دی تھی، تقی بے ساختہ اس کی اس بات پر قہقہہ لگا گیا

”ٹھیک ہے مان لیا تو بیوی جی، آنسو پونچھ ڈالو، میں دوسری شادی کبھی نہیں کروں گا، اب کچھ پڑھ لیں صبح پرچہ بھی ہے تمہارا“

تقی نے اس کی چھوٹی سی ناک کو پکڑ کر محبت سے دائی بائیں ہلایا تو وہ اس کے محبت بھرے لمس پر جھینپ گئی پھر گلابی گالوں پر بکھرتے رنگ لیے نگاہیں کتاب پر جھکا دیں۔

تقی نے مسکراتے ہوئے اپنے سامنے پڑی کتاب پھر سے کھول لی۔ جس طرح کا اظہار مالا چاہتی تھی شامی داسے ویسا اظہار کرنا نہیں آتا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں لڑکیوں کی خواہشیں لفظوں کی محتاج ہوتی ہیں جبکہ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں وہ سمجھتا تھا لفظوں سے زیادہ اعمال سے محبت جتنی چاہیے۔

قدیل فوارے سے لٹکے جل رہی تھی، شیشے کے بنے گول سے شمع دان میں شمع آہستہ آہستہ جلتے ہوئے ہل رہی تھی، صحن ملگجی سی روشنی میں نہایا ہوا تھا جبکہ اٹاری میں سواٹ کے بڑے بلب کی پیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی، رات کے اس پہر پہلی دفعہ حویلی کی اٹاری میں سب نفوس جاگ رہے تھے، رات کے سات بجتے ہی جو بے سدھ سو رہے ہوتے تھے آج رات دس بجے بھی جاگ رہے تھے۔ صرف بچے تھے جو کمروں میں سو رہے تھے اور منیر میاں کو جان بوجھ کر بچوں کے سو جانے کے بعد حویلی میں لایا گیا تھا۔

اٹاری کی رنگ برنگی ابھرے ابھرے نقش و نگار والی چھت سے لٹکتے تینوں بچکے چل رہے تھے، تخت پر خدیجہ بیگم اریب کے کندھے تھام کر بیٹھی تھیں، چوہدری حاکم کرسی پر بیٹھے تھے اور سامنے موڑھے پر منیر اختر مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا اس کے منہ پر جگہ جگہ نیل کے نشان تھے آج تیسرے دن اسے حویلی میں لایا گیا تھا۔ منیر میاں کو اس کے شہر والے گھر سے اٹھا کر سیدھا ڈیرے لے جایا گیا تھا جہاں اس کی اچھی خاصی خدمت کے بعد اس کے گھر والوں کو بھی بلایا گیا، منیر میاں نے کہا وہ حویلی جا کر اپنا فیصلہ سنائے گا۔ اور اب تمام نفوس اس کی بات پر پوری آنکھیں کھولے کھڑے تھے۔

بات ہی کچھ ایسی تھی سب کا یوں ششدر ہو جانا بنتا تھا، منیر میاں سر جھکائے جو کہہ رہا تھا وہ کہاں قابل قبول تھا۔ ”ہاں میری شرط یہی ہے میں رانی کو طلاق دینے کے لیے تیار ہوں، پر وہ دونوں بچے ان کو میں اپنے ساتھ رکھوں گا“

منیر نے سر نیچے کیے اپنا فیصلہ سنایا، اریب نے نگاہیں اٹھائی یں اور چیخ پڑی، وہ خدیجہ بیگم کے پاس بے حال بیٹھی تھی تیز تیز سانس لیتی بال بکھرائے بیٹھی اریب کا بس نہیں چل رہا تھا وہ منیر پر جھپٹ پڑے اور اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ دے۔

”تو اب عمر کے اس حصے میں۔۔۔ میں اپنی سوکن کے بچے پالوں گی یہ صلہ دیا تو نے میری وفا کا، میری محبت کا“ اریب نے دکھ سے چیختے ہوئے شکوہ کیا اور پھر دوپٹہ منہ میں لے کر اونچا اونچا رو دی۔

”چپ کرو اریب، آواز نا نکلے تمہاری“

چوہدری حاکم نے گھورتے ہوئے اریب سے کہا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے منیر کی طرف متوجہ ہوئے، اس وقت اپنی بیٹی کا گھر بچانا ان کے لیے سب سے اہم تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہمیں شرط منظور ہے تم اس عورت کو طلاق دو، لیکن اریب اور تم ادھر ہی رہو گے حویلی میں تو اس لیے تمہارے وہ بچے بھی ادھر ہی آئی یں گے“

چوہدری حاکم نے ناک پھلائے فیصلہ سنایا، تو خدیجہ بیگم غصیلی نگاہوں سے منیر کو گھورتے ہوئے گویا ہوئی یں۔
”تجھے تو یہ دیدنا آوئے آستین کے سانپ، اتنے اتنے سے تو تیرے نو اسی نو اسے ہیں، کچھ تو حیا کرتا یہ خاک ڈالنے سے پہلے“

خدیجہ بیگم کی تیکھی سی آواز ابھری تو، منیر نے لب بھینچے سر جھکا لیا وہ نادم تو تھا لیکن وہ اتنی مار کھانے کے بعد بھی اپنے بچے چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا تھا۔ تقی جو تب سے ستون کے پاس چپ کھڑا تھا اب برداشت ختم ہونے پر آگے ہوا۔

”داجی یہ ظلم ہے سراسر ظلم، ایک ظلم تو منیر پھپھا اپنی بے حسی کی وجہ سے دوسری شادی کر کے ڈھا ہی چکے ہیں اور اب آپ لوگ ماں سے اس کے بچے الگ کریں گے ایک تو ابھی بہت چھوٹا ہے، میں تو یہ کہتا ہوں پھپھا کی دوسری شادی کو قبول کر لیں“

تقی نے سنجیدگی سے اپنا مفید مشورہ دیا جس پر منیر نے تو چونک کر تقی کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا، جبکہ چوہدری حاکم نے غصے سے تقی کو گھورا انہیں تقی کی یہی باغی عادت بری لگتی تھی۔ اریب تخت کو دونوں ہاتھوں سے تھامے چیخ پڑی

”نہیں یہ طلاق دیں اس عورت کو ہر حال میں دیں۔۔۔، میں ان کی جان نہیں بخشوں گی اور وہ بچے بھی حویلی میں نہیں آئی یں گے۔۔۔۔“

اریب گلا پھاڑے تیز تیز سانس لیتے ہوئے اپنا فیصلہ سنار ہی تھی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور اب خونخوار نگاہوں سے منیر کو گھور رہی تھی۔

”نہیں میں بچے نہیں چھوڑ سکتا، جہاں میں رہوں گا وہاں میرے وہ بیٹا اور بیٹی رہیں گے“
منیر نے سر جھکا کر دائیں بائیں نفی میں ہلاتے ہوئے اپنے اٹل فیصلے سے آگاہ کیا، تقی کے ساتھ نے اس کی ہمت بڑھادی تھی

”پھر مجھے چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ چھوڑ دیں مجھے یہ مجھ سے جو دو بچے ہیں آپ کے ان سے تعلق ختم کر دیں، یہ جواب آپ کے بڑھاپے کا سہارا بننے والا ہے اس سے کہہ دیں کہ یہ بیٹا نہیں ہے آپ کا“
اریب ننگے پاؤں پھر کر تخت سے اٹھتی آگے بڑھی، نقیب نے بمشکل اس کو قابو کیا، وہ منیر پر چیخ رہی تھی اور جھپٹنا چاہ رہی تھی۔

”چپ کرو تم سب، وہ ایک طوائف تھی لیکن بچے منیر کا خون ہیں منیر اس عورت کو طلاق دے اور بچے ابھی سے الگ کر دے حویلی میں لے آئے یہاں پلیں گے وہ“
چوہدری حاکم نے ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے دو ٹوک لہجہ اپنایا، مسوائے تقی کے سب خاموش ہوئے جبکہ تقی کچھ بولنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا جسے نوازش نے ہاتھ پکڑ کر اشارے سے زبردستی چپ رہنے کا کہا
”میں نہیں پالوں گی اس گندی عورت کے بچوں کو، میں گلے دبا دوں گی ان کے“
اریب نے چیخ کر غم و غصہ ظاہر کیا

”چپ کر کیا جاہلوں کی طرح بولے چلے جا رہی ہے۔۔۔ شوہر بھٹک جایا کرتے ہیں اور اچھی بیویوں کا شیوہ ہے ان کو معاف کریں منیر میاں اس عورت کو چھوڑ رہے ہیں یہ کافی ہے تمہارے لیے“
چوہدری حاکم نے اونچی آواز میں دھاڑتے ہوئے کہا اور غصے سے اریب کی طرف دیکھا، جواب بمشکل خود پر قابو پائے کھڑی تھی۔

”بلقیس، غزالہ۔۔۔ جب وہ بچے حویلی میں آئیں گے تم دونوں دیکھ بھال کرو گی ان بچوں کی“

چوہدری حاکم نے پیشانی پر انگنت شکن نمودار کیے حکم صادر کیا تو بلیقیں اور غزالہ فوراً سر جھکا کر اثبات میں ہلانے لگیں۔

”بس اب اس کے بعد کوئی بات نہیں ہوگی اس پر، منیر میاں صبح میرے ساتھ وکیل کے پاس چلو گے تم طلاق کے کاغذات تیار کرنے ہیں، فارغ کرو اس عورت کو“

چوہدری حاکم نے تلخ لہجے میں منیر کو گھورتے ہوئے حکم دیا، اور پھر نگاہیں گھما کر سب کی طرف دیکھا

”چلو اب جاؤ سب اپنے اپنے کمروں میں یہاں کوئی نظر نا آئے مجھے“

چوہدری حاکم نے غصے سے کہا اور قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھا دیے۔ اب سب آہستہ آہستہ اپنے کمروں کی طرف قدم بڑھا چکے تھے۔

مالا نے کمرے کا دروازہ آہستگی سے بند کیا، اور غصے میں ماتھے پر بل ڈالے بیٹھے تنہی کی طرف دیکھا جو باہر واحد ایسا تھا جو سب سے الگ بات کر رہا تھا کہ اس عورت کو اس کے بچوں سے الگ نا کیا جائے پر آج بھی بڑوں میں سے کسی نے تنہی کی ایک نہیں سنی تھی۔

تنہی پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے لب بھینچے ایسا بیٹھا تھا جیسے غصہ ضبط کر رہا ہو، سرخ چہرہ تھا جہاں جبرے سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ کے نیچے سیاہ پینٹ پہنے ہوئے تھا شرٹ کے آستین مخصوص انداز میں اوپر چڑھا رکھی تھیں اور دونوں ہاتھوں کے پنجوں کو آپس میں ملائے ہوئے غصے میں بھرا بیٹھا تھا

-

مالا کا آج آخری پرچہ تھا پر اس کی سوچ کے بلکل برعکس وہ اتنی خوش نہیں تھی جتنا اس نے سوچا تھا کہ وہ پرچے ختم ہونے پر خوش ہوگی، گھر کا ماحول ہی اس قدر تناؤ کا شکار تھا کہ کوئی ایک نفس بھی خوش نہیں تھا۔ اور اب تقی کی یہ حالت مالا کو برداشت نہیں تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پاس آکر تقی کے برابر میں پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ چکی تھی، کچھ سکینڈیو نہیں خاموش رہنے کے بعد مالا نے لب کھولے تو کمرے میں پنکھے کی آواز کے بعد کسی کی آواز سنائی دی۔

”تقی آپ پریشان ناہوں، داجی بڑے ہیں بے شک ان کا فیصلہ درست ہی ہوگا“

مالا نے ملائی م سے لہجے میں تقی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ لب بھیچنے سامنے دروازے کو غصے سے گھور رہا تھا۔ مالا کی بات پر وہ فوراً بول پڑا

”ہر بات غلط ہے بلکل غلط ہے، دوسری عورت کو طلاق دلوانا، اس کے بچوں سے اسے الگ کرنا“

تقی نے غصے سے جھنجھلاتے ہوئے وہ سب کہا جو اسے باہر کہنے نہیں دیا جا رہا تھا۔ مالا نے بھنویں پریشانی سے سکیڑیں اور محبت سے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائی ہیں۔

”میں آپ کی بات کو سمجھتی ہوں پر یہاں سب فیصلے داجی کے ہوتے ہیں آپ کی بات کوئی نہیں سنے گا“

مالا نے آہستگی سے اسے دیکھتے ہوئے سچ بات بولی اور پھر سر جھکا لیا، تقی ہنوز خاموش بیٹھا تھا، کمرے میں پھر کچھ لمحے کے لیے خاموشی ہوگئی تھی اور اب کی بار بھی مالا نے ہی توڑی تھی۔

”میرا آج آخری پرچہ تھا آپ نے تو اس کا بھی نہیں پوچھا مجھ سے، اتنے غصے میں مجھے ہی بھول بیٹھے؟“

مالا نے ٹانگیں آہستہ آہستہ جھلاتے ہوئے شکوہ کیا وہ تقی کا ذہن اس بات سے ہٹانا چاہتی تھی اسے تقی یوں غصے میں بیٹھا پریشان کر رہا تھا۔

مالا کی بات پر تقی نے گہری سانس لی اور پھر سر جھٹک کر مبہم سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس کی طرف دیکھا جو واحد اس کی زندگی میں اسے داجی کا درست فیصلہ لگنے لگی تھی۔

”کیسا ہوا پرچہ؟“

غصے کو ختم کرتے ہوئے ماتھے کے شکن کو ختم کیا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا وہ آج بڑے دنوں کے بعد نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔

امتحانات میں تو دن رات وہ پڑھائی میں مگن اپنا آپ سنوارنا بھی بھولے ہوئے تھی پر آج وہ شام کو تقی کے آنے سے پہلے ہی بڑے نک سک سے تیار ہوئی تھی، سرخ رنگ کے جوڑے میں دمکتا چندن روپ اور کانوں میں چھوٹی سی جھمکی والے بوندے اسے دلکش بنا رہے تھے جن پر تقی کی توجہ اب گئی تھی اور اس کا یہ روپ واقعی تنے ہوئے اعصاب پر ٹھنڈی پھوار کا کام کر گیا تھا۔

وہ شام کو ہسپتال سے واپس آ کر باہر برانڈوں میں ہی مردوں کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔ وہ آجکل نقیب کے کہنے پر سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگا تھا اور اب رات نوبے گھر میں آیا تھا سب مردوں کے ساتھ۔

مالا نے مسکرا کر تقی کی نگاہوں میں دیکھا جواب پیار سے اسے پرچے کا پوچھ رہا تھا۔

”جی بہت۔۔۔ بہت۔۔۔ اچھا ہوا پرچہ“

مالا نے چہکتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا، کلائی یوں میں پہنیں سرخ کانچ کی چوڑیاں ایک ساتھ بجا اٹھیں، تقی اس کی خوشی پر بے ساختہ ہنس دیا جبکہ وہ بچوں کی طرح بولے جارہی تھی۔

”اب تو میں جلدی سو سکتی ہوں ناب تو نہیں جگایا کریں گے نا اور اب چائے بھی نہیں پینی مجھے رات کو میں پہلے کی طرح دودھ پی کر سویا کروں گی“

وہ اسے اپنی آزادی سے آگاہ کر رہی تھی جبکہ وہ اس کے چہرے اس کی ہاتھوں کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

ایک نرم سا احساس تھا جو گھیرا ڈال رہا تھا۔ وہ یوں پاس بیٹھی آج اسے سارے خول توڑنے پر مجبور کیے ہوئے تھی۔
پر دماغ تھا کہ دل کو جکڑ کر قابو کرنے کی بے انتہا کوشش میں لگا تھا جو بے تاب ہوئے جارہا تھا۔
”شکر شکر شکر، امتحان ختم ہوئے۔۔۔“

وہ اب چہکتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔ وہ یوں چہکتی کھکھلاتی تھی کہ دل پر زور کی ضرب لگا چکی تھی اور وہ بے اختیار بول پڑا
”ابھی ایک امتحان تو باقی ہے“
تقی کی مخمور سی آواز پر مالا کے اوپر کواٹھے ہاتھ ایک دم نیچے آئے اور پھر سوالیہ نظروں سے تقی کی طرف دیکھا، جو محبت سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
”کیسا امتحان۔۔۔؟“

مالا نے آبرو چڑھائے معصومیت سے سوال کیا، دل تو دھک سے رہ گیا اب کون سا امتحان باقی تھا۔ تقی نے گہری نگاہوں کو اس کے چہرے پر گھمایا
”ہے ایک امتحان جو میں لوں گا تمہارا، پر ابھی نہیں“
تقی نے مخمور سے لہجے میں ذومعنی جملہ کہا اور دلکش مسکراہٹ لبوں پر سجائی، مالا نے اس کی آنکھوں میں موجود شرارت کو اور اس کی بات کو سمجھتے ہی جھینپ کر پلکیں گرائیں، دل پوری رفتار سے دھڑکا تھا اور پورے وجود میں کرنٹ دوڑ گیا۔

تقی اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا جب اچانک اس نے بول کر اس کے چہکے چھڑا دیے۔

مالا کی مدھم سی سرگوشی نما آواز ابھری، جو بمشکل اس کے حلق سے براآمد ہوئی تھی وہ اب گلال ہوئے بیٹھی تھی جتنی تیزی سے دل دھڑک رہا تھا اتنی تیزی سے گداز گالوں پر پلکیں لرز رہی تھیں۔ مالا کا یہ انداز رہے سہے ضبط کو ختم کرنے پر تلا تھا، تنہی گڑبڑا کر فوراً پلنگ پر سے اٹھا۔

تیزی سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا تھا جب مالا کے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا، وہ منجمد ہو گیا، مالا ہاتھ کو تھامے ہی آہستگی سے کھڑی ہوئی

”امتحان تو مجھے دینا ہے نا تو میں تیار ہوں“

* * * * *

بھاری سے پلکیں اور دن چڑھے تک سونے کی وجہ سے آنکھیں بوجھل تھیں، اسے کسی نے اٹھایا بھی نہیں، سب کو یہ احساس تھا کہ کل اُس کے امتحانات ختم ہوئی ہیں تو اس لیے آرام کر رہی ہے۔

تقی اٹھ کر جا چکا تھا جس کے جانے کی اسے خبر تک ناہوئی، نا اس کے جانے کی، نامالا کو بیٹھ کر کتنے ہی لمحے تکتے کی، اور ناد لکش مسکراہٹ کے سنگ پرچے پر اس کے لیے نمبر لکھنے کی۔ مالا کو تو ان سارے لمحوں کی خبر ہی ناہوئی وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اور وہ محبت سے اسے دیکھتا ہوا چلا گیا تھا۔

اب تقریباً صبح دس بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تھی اور وہ آنکھیں کھول کر کتنے ہی پل یو نہی پلنگ پر چت لیٹی مسکاتی رہی پھر میز پر کتاب کے کے کونے کے نیچے پڑے کاغذ کے بار بار ہوا کے زور سے پھڑ پھڑانے کی آواز پر گردن کو تکیے سے تھوڑا اوپر اٹھائے میز کی طرف دیکھا۔

چادر کو خود سے اتارتی، آنکھیں سکیڑ کر کاغذ کی طرف دیکھتی وہ ننگے پاؤں ہی پلنگ سے اتری تھی، میز کے قریب جا کر کاغذ کو کتاب کے کونے کے نیچے سے نکال کر آنکھوں کے سامنے کیا۔

تقی کی لکھائی وہ باخوبی پہچانتی تھی اور اس پر دیے گئے نمبر دل دھڑکا گئے تھے، کاغذ میں ہی گلال ہوتا چہرہ چھپائے کتنے لمحے وہ میز کے قریب کھڑی من ہی من لمحے دہرا کر شرماتی رہی، امتحان میں پاس نہیں پورے نمبر دے کر جانا والا اس کے دل کی سلطنت کے تحت برابر اجماع تھا۔

کاغذ کو چہرے پر سے ہٹایا اور ارد گرد نگاہ دوڑائی تو کمرے کی ہر چیز اس کے سنگ خوشی میں رقص کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وصل کی سرشاری چہرے کی چمک میں اضافہ کیے ہوئے تھی، تقی سے جو کچھ ہچکچاہٹ باقی تھی اب ختم ہو چکی تھی یوں لگا اس پر اور اس کی ہر چیز پر اب اس کا حق ہے۔

گھوم کر کمرے کو دیکھا آج بس تقی کے آنے سے پہلے ہی پورا کمرہ، یہ میز، کتابیں، الماری ہر چیز صاف کرنی ہے، سکینہ کو بلاتی ہوں اور اسے اپنے ساتھ کام پر لگاتی ہوں۔

اچانک ذہن میں اڈتے خیال کے باعث، دلکش سے مسکراہٹ نے چہرے پر رنگ بکھیر دیے تھے وہ کاغذ کو پیار سے پاس پڑی کتاب کے اندر رکھتے ہوئے کمرے کے بیرونی دروازے کی قدم بڑھا چکی تھی۔

پلنگ پر کتابوں کا ڈھیر لگا تھا، ادب، فکشن، سائی نس اور نصاب کی مختلف چھوٹی بڑی کتابیں تھیں جن کو اتنے سالوں تک تلقی کے علاوہ کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت تک نہ تھی، مٹی کی تہہ سے اٹی ہوئی کتابیں اب اوپر نیچے پلنگ پر ڈھیر ہو رہی تھیں۔

ملا سٹول پر کھڑی الماری کے اوپری خانے میں سے کتابوں کو اٹھا کر سٹول کے پاس کھڑی سکینہ کو پکڑا رہی تھی اور سکینہ اس کے ہاتھ سے کتابیں لے کر پلنگ پر کتابوں کو اوپر نیچے رکھتے ہوئے ڈھیر لگا رہی تھی، گہرے نیلے رنگ کا جوڑا جو جگہ جگہ سے دھول، مٹی سے اٹا ہوا تھازیب تن کیے، دوپٹے کو دایں کندھے پر ڈال کر بائیں طرف سے کمر پر باندھے، قمیض کے آستین کہنیوں تک موڑ کر اوپر چڑھائے، بالوں کی چٹیا کو گھما کر جوڑے کی شکل دیے وہ الماری سے کتابیں نکالنے میں مگن تھی، وہ ایک دفعہ میں پانچ سے چھ کتابیں دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سٹول کے پاس کھڑی سکینہ کو پکڑا رہی تھی۔ مالانے ناگواری سے ناک چڑھائی۔

[illegible]

وہ ہاتھ کو چہرے کے آگے جھلاتے ہوئے کھانسنے لگی، کتابوں کے اٹھانے کے سبب ہوا میں اُڑتی دھول ناک کے نتھنوں سے سفر کرتی گلے میں خراش پیدا کر رہی تھی۔

وہ اب سٹول سے نیچے اتر کر دوسرے نمبر والے خانے پر متوجہ ہوئی، کتابیں اٹھا کر ایک طرف کی تو ایک کونے میں پڑی قمیض پر نظر پڑی جو کتابوں کے موجود خلا میں گھسا کر رکھی ہوئی تھی۔

مالا نے مگن سے انداز میں کتابیں ایک طرف کرتے ہوئے قمیض کو نکال کر پلنگ پر پھینک دیا، پہلے خانے کی طرح دوسرے خانے میں موجود ساری کتابیں بھی پلنگ پر ڈھیر کرنے کے بعد وہ پیچھے ہوئے اور سکینہ کو ہاتھ سے آگے

آنے کا اشارہ کیا سکینہ نے الماری کو اچھی طرح کپڑے سے صاف کیا جبکہ وہ اس دوران پلنگ پر پڑی کتابوں کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے احتیاط سے واپس پلنگ کی ایک طرف خالی جگہ پر رکھ رہی تھی۔

سکینہ نے الماری کے خانوں سے دھول اچھی طرح جھاڑنے کے بعد مالا کے ہدایت پر پرانے اخبار ترتیب سے تمام خانوں میں بچھائے اور پھر الماری کے کواڑ کو گیلے کپڑے سے صاف کیا تو وہ چمچم کرنے لگی۔

”اتر و سکینہ اب تم مجھے کتابیں پکڑاؤ اور میں واپس رکھتی جاتی ہوں“

مالا نے الماری کے قریب آکر سکینہ کو حکم صادر کیا سکینہ سر ہلاتی سٹول سے نیچے اتری اور پلنگ کی طرف بڑھ گئی جبکہ وہ اب سٹول پر کھڑی ہو رہی تھی۔

ترتیب سے کتابیں الماری کے خانوں میں سیٹ کرنے کے بعد وہ اب ستائی شی نگاہوں سے صاف ستھری گرد سے پاک الماری کو دیکھ کر مسکرا دی۔

”سکینہ اب تم ایسا کرو جھاڑو پوچا کر لو کمرے کا کل کپڑوں کی الماری صاف کرنی ہے بالکل ایسے ہی“

مالا نے خوشی اور جوش میں سکینہ کی طرف دیکھ کر کہا، جو چہرے پر تھکان کے آثار لیے کھڑی تھی اس کی اسی تھکان کے پیش نظر مالا نے آج پورے کمرے کی صفائی کا ارادہ ترک کر دیا تھا کیونکہ اس ایک الماری کی صفائی پر ان دونوں کے تین گھنٹے لگ چکے تھے

مالا کی اس بات پر سکینہ بھی مسکراتی ہوئی سے جھاڑولانے کی غرض سے کمرے کی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مالا نے کمرے کے گرد دوپٹے کی گانٹھ کو کھولتے ہوئے سامنے پلنگ کی طرف دیکھا تو آنکھیں سکر گئیں، کتابوں کی الماری سے نکلی قمیض اس نے اس وقت بنا دیکھے ہی پلنگ پر پھینک دی تھی۔ وہ بھنویں سیڑے پلنگ کی طرف بڑھی۔

ہلکے شربتی رنگ کی مردانہ کاٹن کپڑے کی قمیض تھی جس پر مٹی کی تہہ جی تھی مالانے آگے بڑھ کر قمیض اٹھائی اور اسے کھولا قمیض سے اڑنے والی دھول کے ذرات سے اس کے کپڑے اور بازو بھر گئے تھے۔

قمیض کھولتے ہی قمیض کی پھٹی جیب نیچے کو لڑھک گئی ایک طرف مٹی کا دھبہ تھا اور قمیض کے بٹن۔۔۔۔۔

قمیض کو جھاڑنے کی غرض سے اوپر کیے اس کے ہاتھ یو نہی ہو امیں آوینختہ رہ گئے اور نگاہیں بٹن پر ساکن ہوئیں، اب بٹن کا عکس اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں ابھرا ہوا تھا اور ماتھے کے شکن پہچان ہو جانے کے زیر اثر آہستگی سے کم ہو رہے تھے۔

وہ بے اختیار قمیض کے گریبان پٹی پر لگے بٹن کو پکڑ کر بغور دیکھ رہی تھی۔ ایک پل میں ہی وہ شناخت کر چکی تھی یہ بٹن خواب میں اتنی دفعہ وہ دیکھ چکی تھی کہ اب کیسے بھول سکتی تھی۔

وہی بٹن، وہی حجم، وہی شکل اور یہ بات بہت عجیب تھی اس نے یہ بٹن اور اس رنگ کے بٹن آج تک کبھی گھر میں کسی اور مردانہ قمیض کو لگے نہیں دیکھے تھے۔

وہ بٹن کی پہچان کے بعد یو نہی خوابوں کو دہرا رہی تھی جب اٹاری سے اٹھتے واویلے کی آواز کانوں میں پڑی، وہ تیزی سے کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھی ہاتھ اس دوران عجلت میں قمیض کی تہہ لگا رہے تھے، قمیض کو احتیاط سے الماری کے نچلے خانے میں رکھتی، بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

کواڑوں کے درمیان لٹکتے سفید ململ کے پردے کو دائیں ہاتھ سے پیچھے سرکاتے وہ اٹاری میں آئی تو سامنے کے منظر پر آنکھیں پوری کھل گئیں، منہا کے بلکنے کی آواز اٹاری میں گونج رہی تھی وہ اپنے پیٹ کو تھامے چیختے ہوئے رو رہی تھی ایک طرف سے بلقیس نے تھام رکھا تھا تو ایک طرف سے غزالہ نے، منہا کے چہرے پر رقم تکلیف کے آثار بتا رہے تھے درد اس کی برداشت کے درجوں سے تجاوز کر چکا ہے۔

صحن میں افراتفری سی مچ گئی، سکینہ، تاری بوا، اریب، خدیجہ بیگم، غزالہ اور بلقیس سب منہا کے ارد گرد جمع تھے۔

منہا کو امید سے ہوئے ابھی مہینہ ہی گزرا تھا اور آج صبح سے وہ ناتواں سی طبیعت لیے پھر رہی تھی پر اب پیٹ میں تکلیف اتنی بڑھ چکی تھی کہ ضبط کھوئے وہ اونچا اونچا چلا رہی تھی۔

بلقیس نے برقعہ پہن رکھا تھا شائے وہ منہا کے ساتھ جا رہی تھیں، صحن میں پریشان حال ساقیب حاکم اب گیٹ سے اندر داخل ہو کر اب تقریباً بھاگتا ہوا منہا اور بلقیس کے قریب آ رہا تھا۔ اس کے قریب آتے ہی غزالہ نے منہا کا ہاتھ مارا اور کندھا چھوڑ دیا۔ اور اب منہا کو ساقیب حاکم ایک طرف سے تھام چکا تھا وہ یونہی بے حال روتی ہوئی منہا کو لے کر حویلی کا گیٹ عبور کر چکے تھے، کھلے گیٹ کے سامنے بہادر کار کاروازہ کھولے کھڑا نظر آ رہا تھا۔

غزالہ، تاری بوا، اریب اور خدیجہ بیگم اب پریشان صورت لیے واپس اٹاری کی طرف آ رہی تھیں، مالا تیزی سے زینے کے قریب آئی جہاں سے غزالہ اب اوپر آ رہی تھی۔

”اماں کیا ہوا منہا آپا کو؟“

مالا نے پیشانی پر بل ڈالے تشویش ظاہر کی، غزالہ زینے چڑھ کر اس کے قریب آئی، تاری بوا اب خدیجہ بیگم کا ہاتھ تھامے انہیں بھی زینے چڑھنے میں مدد دے رہی تھی۔

”دعا کرو مالا، بچے کو کچھ ناہو“

غزالہ نے پریشان سے لہجے میں کہتے ہوئے مالا کے کندھے پر ہاتھ رکھا، مالا کا منہ حیرت اور تاسف سے وا ہوا۔

غزالہ اسے یونہی پریشان سا کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تھی اور وہ جو منہا کی امید کی خبر پر سب سے زیادہ خوش تھی۔ اب اس خبر پر دل ایک دم سے ڈوبنے لگا۔ ستون سے ٹیک لگائے وہ اداس صورت لیے کتنی ہی دیر حویلی کے

گیٹ کو ہی تکتی رہی، سکینہ اب اس کے کمرے میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ اور منہا کی پریشانی میں وہ الماری میں رکھے قمیض کو فراموش کر گئی۔

پانی سے بھرے گلاس کو دھیرے سے میز پر رکھتے ہوئے مالا میز کے پاس پڑی کرسی پر براجمان ہوئی، سامنے والی کرسی پر تقی سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا، میز پر چپا تیا میں گول روٹی اور سٹیل کی پیالی میں سالن پڑا تھا، سر جھکائے کھانے کے باعث اس کے بکھرے سے کچھ بال ماتھے پر گرے تھے۔

منہا کو تقی کے کہنے پر فوراً شہر کے ہسپتال میں لے گئے تھے جہاں اسے داخل کر لیا گیا تھا، بلقیس، نقیب اور بہادر ادھر شہر میں منہا کے پاس تھے جبکہ تقی اب رات کے آٹھ بجے شہر سے واپس لوٹا تھا۔ باقی سب لوگ تورات کا کھانا کھا کر اپنے کمروں میں لیٹ چکے تھے اس لیے تقی کو اس نے اب کمرے میں ہی کھانا دیا تھا۔

”کیسی ہے منہا آپ؟“

مالا نے پریشان سے لہجے میں، تقی کی طرف دیکھتے ہوئے، منہا کی خیریت دریافت کی، تقی نے میز پر پڑا پانی کا گلاس اٹھا کر منہ کو لگایا، پانی پینے کے بعد گلاس میز پر رکھتے ہوئے مالا کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے پر ابھی ایک دو دن ہسپتال میں رہے گی“

سنجیدگی سے جواب دیا اور پاس پڑے رومال سے ہاتھ پونچھے۔ مالا کے چہرے پر اب بھی افسردگی تھی۔

”اور۔۔۔۔۔ بچہ۔۔۔۔۔؟“

بھنویں اوپر چڑھائے آہستگی سے پوچھا، تقی نے لب بھینچے سر کو تھوڑا سا جھکایا اور تاسف سے گردن کو نفی میں جنبش دی، مالا کا دل ڈوب گیا وہی ہوا جس کا ڈر تھا، منہا کا بچہ اب نہیں رہا تھا۔

تقی نے اس کے چہرے کو پریشانی سے زرد ہوتے دیکھا تو جلدی سے بات کو رخ بدلہ، بے شک وہ خود بھی پریشان تھا اور جو بات ڈاکٹر تسنیم نے اسے بتائی تھی وہ اسے اور تشویش میں مبتلا کر چکی تھی لیکن اس وقت اپنے سامنے بیٹھی مالا اس کو پریشان ہوتی برداشت نہیں تھی۔

”پریشان نا ہو اللہ بہتر کرے گا، برتن اٹھاؤ“

تقی نے مسکرا کر اس کی پریشانی کو کم کیا جواب آنکھوں میں اداسی لیے بیٹھی تھی۔ وہ تقی کے مسکرانے پر گہری سانس خارج کرتی برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔

برتن رکھنے کے بعد جب واپس آئی تو تقی کپڑے بدل چکا تھا اور اب سر جھکائے قمیض کے بٹن بند کر رہا تھا۔
”تقی آپ کو کچھ دکھانا ہے“

اچانک الماری کا یاد آ جانے پر مالا چمکتے ہوئے آگے بڑھی، تقی اب اس کی طرف متوجہ تھا جو کتابوں کی الماری کو کھول رہی تھی۔

الماری کے دونوں کواڑ کھول کر وہ اب مسکراتی ہوئی مڑی اور داد طلب نگاہوں سے تقی کی طرف دیکھا۔ تقی نے آبرو اچکائے الماری کی طرف دیکھا جس کی مالانے دنیا ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ صاف ستھری الماری اور سلیقے سے رکھی کتابیں وہ مسکرا دیا

”واہ۔۔۔۔۔واہ۔۔۔۔۔“

لبوں کو ستائی شی انداز میں باہر نکالے، مالا کی طرف بڑھا جس کی خوشی اب دیدنی تھی اور نچلے لب کو خوشی سے دانتوں میں دبائے کھڑی تھی۔

”میں نے صاف کی ہے آج“

مالانے گردن اکڑا کر مسکراتے ہوئے بتایا، تقی اس کے اس بچکانہ انداز پر قہقہہ لگانے پر مجبور ہوا

”اچھا سنیں اب میں نے یہ سوچا ہے کہ یہ پلنگ ادھر سامنے دیوار کے ساتھ یوں، اور میز کو اس کونے میں لگائیں گے“

مالا نے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے پھر سے نگاہ اٹھائی اور شیریں سے لہجے میں کہا تو تقی نے مصنوعی گھور کر اس کی طرف قدم بڑھا دیے۔

تقی نے اس کے بلکل سامنے آکر کہا اور جھک کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔

”کمرے کی صفائی پر نہیں آپ کی اس کتابوں کے خزانے کی الماری کو صاف کرنے کا انعام، کل آتے ہوئے گلاب حامن لے کر آئے گا“

مالا نے چہکتے ہوئے جتانے کے ساتھ انعام بھی بتایا تو تقی بے ساختہ ہنس دیا،

”گلاب جامن کے کی بچی۔۔۔۔۔ انعام میں دوں گا تو ہو گا بھی میری مرضی کا، ناکہ تمھاری مرضی کا“

تقی نے اس کے ناک کو مخصوص انداز میں پکڑ کر دبایا تھا جس کے باعث مالا نے تھوڑا سا منہ کھول کر تکلیف کو برداشت کیا اور پھر مصنوعی خفگی سے تقی کو گھورتے ہوئے اپنی ناک کو سہلایا

”آپ کیا انعام دیں گے؟“

مالا نے خفا سے لہجے میں پوچھا، وہ بھرپور انداز میں مسکرا دیا اور پھر آنکھوں میں شرارت چمکی

”میں۔۔۔۔۔“

تقی نے مسکراہٹ دبائے اس کے کندھوں پر اپنے دونوں بازو دھر دیے، مالا نے آبرؤ اوپر نیچے نچاتے ہوئے اشارے سے پوچھا، کیا۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔

”میں تو کل والا انعام دینا چاہتا ہوں آج بھی“

تقی نے شریر سے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی پیشانی سے اپنی پیشانی ٹکائی، مالا جھینپ گئی اور مسکراہٹ پل بھر میں ہی ہوا ہوئی

”وہ انعام ہے کوئی۔۔۔۔۔“

پلکیں گرائے، آہستگی سے کہا، تقی ہنوز سر جوڑے مسکرا رہا تھا۔

”ہاں تو کیا نہیں ہے“

تقی نے مخمور سے لہجے میں مسکراتے ہوئے اس کے سر کو ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ کل وہ امتحان تھا اور آج رات انعام بن گیا“

مالا نے مسکراہٹ دبائے شریر سے لہجے میں چھیڑا، جبکہ نگاہیں ابھی بھی اٹھانے کی ہمت نہیں تھی، تقی بے ساختہ کھکھلا دیا پھر ہنسی پر قابو پاتے ہوئے آہستگی سے اسے قریب کیا۔

”ہاں ہر دفعہ اسے اپنے مطلب میں ڈھال لوں گا“

ہاتھ بڑھا کر مالا کے بالوں کی لٹ کو اس کے کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے سرگوشی کی تو وہ مسکراہٹ کو دباتے تسبیح گلال کی طرح مہک اٹھی۔

سرمئی شام حاکم قصر کے پورے صحن کو چھاؤں کی لیپٹ میں لے چکی تھی، اب چھت پر لگے پنکھے پوری رفتار سے چلنے لگے تھے اور تندور کے پاس بنے کچی مٹی کے بڑے سے چولہے کے اوپر پڑے بڑے سے پتیلے کو اتار لیا گیا تھا جس میں نہانے کے لیے پانی گرم کیا جاتا تھا، دن لمبے ہوگئے تھے شام سے ہی صحن اور اٹاری میں ہلچل سی شروع ہو جاتی تھی۔

آج بھی روز کی طرح عصر کی نماز کے بعد سے ہی رات کی کھانے کا اہتمام شروع ہو چکا تھا، باورچی خانہ کے بلکل پاس مٹی کے بنے چولہے پر جہاں ایک طرف گوشت کا سالن چڑھا ہوا تھا تو دوسری طرف ایک مٹی کی ہانڈی میں یخنی ابل رہی تھی جس کے بلکل قریب بیٹھی بلقیس تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس میں چچ ہلا رہی تھی۔ اور دوسرے چولہے کے پاس غزالہ سالن کے نیچے چولہے میں لکڑیاں اب کم کر رہی تھی۔ سالن کی اشتہا انگیز خوشبو بتا رہی تھی کہ بکرے کا گوشت آج بھی بہت لذیذ بنا ہے

تاری بو اتندور کو تپا رہی تھیں تو ایک طرف چھوٹی چوکی پر بیٹھی سکینہ مٹی کی پر ات میں آٹا گوندھ رہی تھی، بلقیس نے پیالے میں یخنی کو انڈیلا اور بھاپ اڑاتا پیالہ سٹیل کی ٹرے میں سجایا ٹرے کو اٹھایا اور پھر اٹاری کی طرف چل دی۔

منہا آج دوپہر کو ہی تہی بطن حویلی لوٹ آئی تھی اس کی حالت ابھی بھی ناتواں تھی، بلقیس نے اٹاری کے زینے چڑھ کر اس کے اور فرہاد کے کمرے کا رخ کیا، اس کے کمرے کے کواڑ کے آگے لگے ململ کے سفید پردے کو سرکایا اور آگے بڑھ گئی وہ بے سدھ زرد چہرہ لیے پلنگ پر چت لیٹی تھی۔ لکڑی کے چمکتے فرنیچر پر دودن سے جھاڑ پونجھ ناہونے کی وجہ سے گرد کی ہلکی سی تہہ جی اپنے مکان کی لاپرواہی کا رونا رو رہی تھی، منہا اپنے کمرے کی جھاڑ پونجھ سکینہ کو نہیں کرنے دیتی تھی۔ ایک طرف درمیانی سائی زکی ٹوکری پڑی تھی جس میں سیب، انار، کیلے جیسے مختلف پھل سجے تھے۔

”منہا اٹھو۔۔۔“

بلقیس نے یخنی سے بھری پیالی پلنگ کے اطراف میں لگے چھوٹے سے میز پر دھرتے ہوئے منہا کو پکارا، منہا نے آہستگی سے بوجھل آنکھیں کھول کر بلقیس کی طرف دیکھا جواب اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ رہی تھی۔

”اماں کیوں لے آئی کہا تو تھا ابھی سونا ہے مجھے ابھی کچھ کھانے کو دل نہیں میرا“

منہا نے بیزاریت سے ناک سکوڑی، بلقیس نے ان سنی کرتے ہوئے اس کے قریب ہو کر اس کی کمر کے گرد اپنا بازو حائل کیا

”روٹی نہیں ڈالی یخنی کے اندر، بس صرف یخنی ہے اٹھ جا پی لے بہت کمزوری ہے پھر دو الینی ہے“

بلقیس اب زبردستی اسے اٹھاتے ہوئے اس کی پشت کے پیچھے تکیے لگا رہی تھی، منہا ناگوار سی صورت بنائے تکیوں سے پشت ٹکائے اوپر کو سرکتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ بلقیس نے ٹرے اس کے سامنے رکھی، اور پھر بغور اس کا چہرہ دیکھا جواب بد مزہ سی صورت بنائے یخنی کو تاک رہی تھی۔

”منہا۔۔۔ جو ڈاکٹر تجھ سے کہہ رہی تھی وہاں ہسپتال میں، اس نے تقی کو بھی بتایا ہے“

بلقیس نے آہستگی سے کہا، منہا نے چونک کر اوپر دیکھا، چچ بمشکل منہ کے اندر گیا تھا لب بھیج کر یخنی کو حلق میں اتارا

”اماں مجھے ڈاکٹر کی بات میں کوئی سچائی نہیں لگی مجھے کسی نے کچھ نہیں کھلایا اور میں خود کھاتی پیتی ہوں سب ایسے ہی وہم مت پال“

منہا نے تسلی سے جواب دیا، اور نگاہیں جھکا کر پھر سے پیالے پر جمائی یں چچ سے یخنی کو دھیرے سے ہلایا

”ڈاکٹر تجھ سے زیادہ جانتی ہے، مجھے تو بہت فکر ہے دل ہولائے جا رہا ہے تب سے جب سے ڈاکٹر کی یہ بات سنی ہے ایک تو تیری پھپھو بھی تیرے ساتھ کھی کھی کھی۔۔۔“

بلقیس بات کو ادھورا چھوڑ کر اب کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی، جب سے ڈاکٹر نے منہا کے تہی بطن ہونے کا جواز کسی دوا کو بتایا تھا تب سے بلقیس کا سوچ سوچ کر برا حال تھا، دل میں اریب کو لے کر عجیب و سو سے پیدا ہو گئے تھے وہ تو اریب کی نفرت کو عام ساس کی نفرت کی طرح گردانتی تھی لیکن یہاں تو معاملہ بہت سنگین نکلا تھا۔ جس دن منہا کی طبیعت خراب ہوئی تھی فرہاد کا روبرو کے سلسلے میں شہر سے دور تھا اسی لیے بلقیس کا شک صرف اور صرف اریب پر جاتا تھا۔

”اماں کچھ نہیں کیا پھپھو نے، آپ چھوڑ دیں اس بات کو، بلا وجہ کا شک کریں گے ہم وہ تو پہلے ہی پریشان ہیں پھپھا کی حرکتوں پر“

منہا نے تیوری چڑھائے اپنی ماں کو سمجھایا جو پریشان صورت لیے بیٹھی تھیں۔ بس فکر اس بات کی تھی کہ وہ تو اس بات کو چھوڑ ہی دے گی لیکن تقی جو ڈاکٹر کے ساتھ مل کر اس بات کی تہہ میں پہنچنا چاہ رہا تھا وہ کیا کرے گا۔

بلقیس کھوئی سی بیٹھی تھی جب منہا کی پریشان سی آواز پر چونکی۔

”اماں مجھے بہت ڈر لگنے لگا ہے، کہیں فرہاد بھی منیر پھپھا جیسا نکلا تو؟“

منہانے بھنویں اچکائے بلقیس سے سوال کیا، بلقیس نے خفگی سے دیکھا، شادی کو تین ماہ سے اوپر ہو گئے تھے لیکن آج بھی وہ منہا کے دل میں فرہاد کے لیے وہ محبت نہیں دیکھ پارہی تھی جب کے اس کے برعکس وہ مالا کو تقی کے نام پر ہی گلال ہو تا دیکھ کر اس کے بارے میں ضرور سوچتی تھیں حالانکہ فرہاد، تقی سے زیادہ محبت کرنے والا اور آگے پیچھے پھرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔

اور اب منہا کی بات ان کو حد درجہ ناگوار گزری تھی۔

”چپ۔۔۔ کیسی باتیں کر رہی ہے اللہ نا کرے فرہاد ایسا ہو، وہ تو اتنی محبت کرتا ہے تم سے“

بلقیس نے غصے سے گھور کر جواب دیا، پر اس کے چہرے پر فقط بے یقینی تھی اور وہ اپنے اندر اٹھتے وہم کو بلقیس سے بیان کیے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

”اماں محبت تو منیر پھپھا بھی پھپھو سے بہت کرتے تھے میں نے تو سنا ہے خون کا بہت اثر ہوتا ہے ایسا نا ہو فرہاد کے خون میں بھی بے وفائی کے جراثیم ہوں“

منہانے کھوئے سے لہجے میں کہا، بلقیس نے گڑبڑا کر دروازے کی طرف دیکھا

”مجھے نہیں سمجھ آتی یہ تیری اتنی مشکل باتیں میں نے اسی لیے تقی سے کہا تھا کہ تمہیں بارہ جماعتیں نا پڑھائے

دماغ اونچا ہو گیا ہے تیرا اور کچھ نہیں، فرہاد کیسے آگے پیچھے پھرتا ہے اور اب بھی تم سے زیادہ دکھ اس کے چہرے پر ہے اولاد کو کھودینے کا“

بلقیس نے غصے میں نا صرف اس کی بات کو رد کیا تھا بلکہ اسے جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

”اماں اس کو اس بچے کی اتنی فکر ہے جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں تھا لیکن دیکھا نہیں اس بات میں تقی کا کوئی ساتھ نہیں دے رہا منیر پھپھا سے کہیں مت کرے اس عورت پر اتنا ظلم بس اسے الگ گھر میں رکھے اور بچے اس کے ساتھ رہنے دے“

منہانے نے غصے سے پھولی سانس کے ساتھ پوری بات کہی، منیر نے جیسے ہی رانی کو طلاق دی تھی وہ پتا نہیں اپنے کہاں سے اثر رسوخ سامنے لے آئی تھی اور بھند تھی کہ بیٹی وہ اپنے ساتھ لے کر جائے گی جو منیر ہر گز نہیں چاہتا تھا، حاکم چوہدری جس معاملے کو اتنا آسان سمجھے تھے وہ اتنا آسان ہر گز نہیں تھا، عدالتوں کی چکر لگ رہے تھے اور اب منہا بھی اس معاملے میں تقی کے ساتھ تھی کہ اس عورت کو طلاق نادی جائے بلکہ بچے اور اس کو الگ رکھا جائے۔

”تو چپ کر جا یہ بڑوں کے فیصلے ہیں، پہلے تقی کی وجہ سے باتیں سننے کو ملتی ہیں تیرے ابا سے مجھے اور اب تو شروع ہو جا“

بلقیس نے ڈپٹ کر اسے پھر سے چپ کروا دیا جواب چہرے پر ناگواری رقم کیے بلقیس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بڑوں کے فیصلے بڑوں کے فیصلے۔۔۔ اماں کب یہ بدلے گا یہ سب“

منہانے حد درجہ روکھے پن سے کہا اور آدھی بھری پیالی کو ٹرے سمیت پلنگ کے ساتھ پڑے میز پر رکھ دیا۔

”تیرے پاس ان باتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہو تا بس، فرہادیہ فروٹ کاٹو کر ابھر کر تیرے لیے ہی رکھ گیا ہے، ٹھونس لے کچھ۔۔۔ تو جان بنے“

بلقیس نے ناگواری سے اس کی بات کا جواب دیا اور ٹرے اٹھا کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی جب کے منہا تکلیف سے ناک اور لب چڑھاتی اب لیٹنے کی کوشش میں تھی۔

سجاد رفیق ہسپتال سفید رنگ کا بڑا سا بورڈ دیوار پر اور لوہے کے بنے گیٹ کے اوپری طرف آویزاں تھا۔

گیٹ کو اور پوری عمارت کو سفید رنگ کا روغن تھا اور گیٹ سے آگے لمبی راہداری کے ارد گرد بڑے بڑے سبز گھاس کے میدان تھے، جس کے اطراف میں لمبے لمبے سفید سیمل کے درخت گیٹ سے لے کر راہداری کے آخر

تک جاتے تھے، جہاں بہت سے لوگ بیٹھے اور نیم دراز تھے، راہداری سے گزرتے ہی سامنے وسیع و عریض عمارت دنیا پور کے سب سے بڑے ہسپتال کی عمارت تھی، یہاں ارد گرد کے گاؤں اور قصبوں سے لوگ علاج کے لیے آتے تھے۔

تقی کی تقرری یہیں پر ہوئی تھی وہ یہاں دن کی شفٹ میں ڈاکٹری کے فرائض سرانجام دیتا تھا اور پھر شام کو گاؤں کے کلینک میں بھی بیٹھتا تھا جو ابھی زیر تعمیر ہسپتال تھا جہاں وہ مفت گاؤں کے لوگوں کا علاج کر رہا تھا۔ اس ہسپتال کی لیبارٹری اتنی جدید نہیں تھی جہاں اس وقت تقی سفید کوٹ زیب تن کیے پیشانی پر شکن سجائے کھڑا تھا، ایک طرف چالیس سال کے لگ بھگ خاتون بھی اسی طرز کا سفید کوٹ پہنے کھڑی تھیں یہ تنگ سی لیبارٹری میں ایک کرسی میز لگائے لڑکا بیٹھا تھا جس کے آگے مختلف بند چھوٹی بڑی شیشاں اور ٹیوبز ترتیب سے پڑی تھیں اس کے بالکل پیچھے ایک لکڑی کی بڑی سی الماری تھی جس میں مختلف قسم کے آلات ٹیسٹوں کے لیے رکھے گئے تھے۔ لڑکے نے سفید کاغذ پر تیار کردہ رپورٹ اور خون کے نمونے جو ایک بند شیشے کی چھوٹی سی بند ٹیوب نما بوتل میں موجود تھے تقی کی طرف بڑھائے، تقی نے فائل کو پکڑ کر بغل میں لیا اور شیشے کی بنی ٹیوب کو آنکھوں کے آگے کیا، جس کے تہائی حصے میں خون تھا۔

”مجھے دکھائی یں ذرا“

ڈاکٹر تسنیم نے چشمہ درست کرتے ہوئے تقی کی طرف دیکھا، تقی نے فوراً فائل کو ہاتھ میں منتقل کیا، ڈاکٹر تسنیم نے تقی کے ہاتھ سے رپورٹ کو پکڑا چشمہ نیچے گرائے بغور رپورٹ پر نگاہ دوڑائی اور پھر رپورٹ بند کرتے ہوئے تقی کی طرف دیکھا۔

”ڈاکٹر تقی آپ اس خون کے نمونے کو اچھی لیبارٹری سے بھی ٹیسٹ کروائیے، میں یہاں کے نتائج سے مطمئن یں نہیں ہوں“

ڈاکٹر تسنیم نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے رپورٹ تقی کو واپس پکڑائی اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چہرہ اوپر کیا، تقی ہنوز پریشان حال کھڑا تھا، کیونکہ ڈاکٹر تسنیم کی بات عجیب و غریب تھی ان کے مطابق منہا کا حمل زائل ہونے کے وجہ کوئی ایسی دوا تھی جو اسے کھلائی گئی تھی اور اسی بات کے پیش نظر منہا کے خون کے نمونے لیے گئے تھے جن کے نتائج بتائیں گی کہ منہا کی لیب بارٹری سے درست نہیں نکلے تھے۔ اور اب ڈاکٹر تسنیم ان نمونوں کو لاہور یا کراچی بھیجنے کا مشورہ دے رہی تھیں۔

”ہمم چلیں میں دیکھتا ہوں اپنے دوست کو بھجواتا ہوں یہ سہیل بہت مشکور ہوں آپ کا جو آپ نے میری بہن کا معافی نہ اتنی گہرائی سے کیا“

تقی نے مسکرا کر تشکر آمیز نگاہوں سے ڈاکٹر تسنیم کو دیکھا جن کا تجربہ ہی اتنا زیادہ تھا کہ انہوں نے ناصر ف منہا کا علاج کیا تھا بلکہ یہ تشویش بھی ظاہر کر دی تھی کہ منہا کی یہ حالت غیر معمولی ہے اور یہ بات تقی کے لیے ایک عجیب پریشانی کا سبب بن گئی تھی۔

مطلب منہا کے بچے کو قتل کیا گیا تھا یہ عجیب غریب قسم کی بات تھی وہ کبھی گھر کے معاملوں میں دلچسپی نہیں لیتا تھا مگر یہ بات تشویش ناک تھی اور اس بات کا ذکر وہ لازمی فرہاد سے کرنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر تسنیم تو مسکرا کر واپس ڈیوٹی پر جا چکی تھیں مگر وہ اب بھی پریشانی پر انگلیاں پھیرتا ہوا وہیں کھڑا تھا۔ آج صبح ہی منہا کو ہسپتال سے چھٹی ملی تھی اور وہ گھر گئی تھی، اور آج ہی اس کے خون کے نمونے کے نتائج سامنے آئے تھے جس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تھا لیب بارٹری کے نتیجے کے مطابق اس کے خون میں کسی قسم کے دوا کے آثار موجود نہیں تھے۔

لیکن ڈاکٹر تسنیم ابھی بھی اسی بات پر ڈٹی ہوئی تھیں کہ بچہ بالکل ٹھیک تھا اس کے یوں بطن میں جان دینے کا سبب کوئی دوا تھی جس کا اثر انہیں صاف نظر آیا تھا۔

خون کے نمونے کو دوبارہ محفوظ کرنے کے بعد وہ بھی لیبارٹری کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

سکول کی گھنٹی بجتے ہی سب اپنے بستے بند کر رہے تھے، مالانے بھی جلدی سے بستہ بند کیا، کلاس کی لڑکیاں تیزی سے جماعت کے بیرونی دروازے سے باہر نکل رہی تھیں، یہ پانچویں جماعت کا کمرہ تھا اور کمرے میں اب اندھیرا پھیل رہا تھا۔ مالانے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا کیارات ہو رہی ہے وہ اتنی دیر سے سکول میں کیوں ہے۔

عجب سے خوف کے احساس کے زیر اثر وہ بھاگ کر کمرہ جماعت سے باہر آئی تھی، پر باہر آتے ہی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں یہ ایک صحرا تھا، جہاں دور دور تک چھوٹے بڑے کتنے ہی ٹیلے تھے، تپتی ریت تھی اور وہ ننگے پاؤں یہاں اکیلی تھی، پاؤں کے تلوؤں سے زیادہ اس کا جسم جل رہا تھا گرمی کا احساس گھٹن پیدا کر رہا تھا، مالانے قدم آگے بڑھائے۔

چلنا دشوار ہو گیا تھا پاؤں ریت میں دھنس رہے تھے، اوپر سے پیاس کا احساس تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، وہ بار بار خشک ہوتے لبوں کو زبان سے تر کر رہی تھی، ناسکول تھا اور نا ہی سکول کا گیٹ، اچانک ہوا کے جھکڑ چلنے لگے،

شائیں۔۔۔۔۔ شائیں۔۔۔۔۔ کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑ دینے کے مترادف تھیں۔

وہ اب قدم آگے بلکل نہیں بڑھا پا رہی تھی جتنی قوت وہ قدم آگے بڑھانے کے لیے لگاتی اتنی ہی زور سے ہوا اسے پیچھے دھکیل رہی تھی اور پھر وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھنے پر مجبور ہو گئی، ہوا سے بچنے کی خاطر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے کے آگے کر رکھا تھا۔

ایک دم سے ہوا تھم گئی، مالانے آہستگی سے ہاتھوں کو چہرے کے آگے سے ہٹایا۔

جہاں وہ دوزانو بیٹھی تھی اس کے بلکل سامنے ریت اکٹھی ہو کر ایک قبر بن گئی تھی۔ مالا کو خوف کا احساس ہوا ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ابھری، لاشعور نے کہا یہ خواب ہے۔۔۔۔۔ ہاں یہ خواب ہے اور اب رونا آنا آجائے گی کہیں سے۔

وہ بار بار سر کو جھٹکے دے کر خواب سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی لیکن یہ خواب تو نہیں تھا۔ مالانے فوراً پیچھے ہو کر اٹھنے کی کوشش کی پر اس کی ٹانگ کسی کے ہاتھ میں تھی، مالانے چیخنے کے لیے منہ کھولا، جس سے گھٹی سی چیخ برآمد ہو رہی تھی جس کسی نے بھی ٹانگ پکڑی تھی اب اسی ریت کی قبر میں سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح وہ رونا ہی تھی۔ مالانے جلدی سے قل پڑھنے شروع کر دیے، مولوی کی باتیں ذہن میں گونجنے لگی تھیں اسے خواب میں احساس ہو چکا تھا یہ خواب ہے۔

”مالا اس کو کہو اب بس کرے ظلم۔۔۔“

رمنانے آہستگی سے مالا کی طرف رخ موڑے کہا مالانے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، مالانے زور سے اپنے پاؤں کو اس کی گرفت سے آزاد کروایا۔ ایک دم سے ریت پر جگہ جگہ بٹن نظر آنے لگے۔ مالا جلدی سے اٹھی تھی اور پھر رمنانے سے ڈر کر بھاگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی وہ پہلی دفعہ خواب میں رمنانے سے ڈر کر بھاگ رہی تھی، بٹنوں کو پاؤں کے نیچے روندتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ اور اونچی آواز میں قل پڑھ رہی تھی، گلے میں پیاس کے باعث کانٹے چبھ رہے تھے۔

”مالا۔۔۔۔۔مالا۔۔۔۔۔“

کوئی بہت پیار سے آواز دے رہا تھا، تلی کی آواز تھی مالانے ارد گرد نگاہ دوڑائی تلی کہیں نہیں تھا۔ اچانک کسی کے ہاتھ کا احساس کندھے پر ہوا۔

”مالا اٹھو کیا ہوا ہے“

تقی نے زور سے کندھا جھنجھوڑا تھا، رات کو بجلی اچانک چلی گئی تھی اور پنکھا بند ہوتے ہی عجیب گھٹن اور تلخی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ ابھی نیم غنودگی میں ہی تھا جب مالا کے آہستہ آہستہ سسکنے اور ڈرنے کے جیسی آوازیں نمودار ہونے لگیں۔

تقی کے کندھا ہلاتے ہی ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تھی کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، پنکھا بند تھا اور تقی کہنی کے بل سر ٹکائے اس کی طرف کروٹ لیے لیٹا پریشانی سے اسے پکار رہا تھا۔

”مالا کیا ہوا اس طرح کی آوازیں کیوں نکال رہی ہو؟“

تقی نے اس کے چہرے پر آہستگی سے ہاتھ پھیرا، اس کی پیشانی پسینے کے ننھے قطروں کو سجائے ہوئے تھی جو تقی کو اس اندھیرے میں نظر تو نہیں آئے، لیکن ہتھیلی نے باخوبی پیشانی کے گیلے پن کو محسوس کیا تھا۔

”پانی۔۔۔“

مالا نے گھٹی سی آواز میں کہا وہ اب شامی داٹھ کر بیٹھ رہی تھی، تقی بھی فوراً اس کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھا۔

”رکو دروازہ کھولتا ہوں کمرے کا تھوڑی روشنی ہوگی تو کچھ نظر آئے گا“

تقی نے آہستگی سے کہا اور پھر پلنگ سے اٹھ کر ننگے پاؤں ہی کمرے کے دروازے تک پہنچا، چٹخنی کے نیچے گرنے کی آواز کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور صحن میں فوارے پر جلتی بجھتی قندیل کی روشنی دروازے سے اندر داخل ہو کر کمرے کو ملگجی سی روشنی بخش گئی۔ مالا نے جلدی سے پلنگ پر نیچے ٹانگیں لٹکائے میز پر پڑے جگ کو اپنی طرف کھسکایا، جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا تو پانی گرنے کی آواز نے خاموش کمرے میں شور ڈال دیا، تقی اب پردہ پیچھے کیے کمر پر دونوں ہاتھ رکھے صحن کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ مالا کی شرٹ گلے سے پسینے سے بھیگ چکی تھی اور پانی پیتے ہی خشک گلے کو سکون ملا۔

سامنے صحن میں چارپائی یاں ڈالی ہوئی تھیں اور ان پر لیٹے نفوس سفید رنگ کے کھیس اوڑھے ہوئے تھے، حویلی کے چند مکین جن کو زیادہ گرمی لگتی تھی وہ جلدی صحن کا رخ کر لیتے تھے اب بھی نوازش حاکم، فرہاد اور ایک چارپائی پر خدیجہ بیگم سو رہی تھیں، صحن میں اچھی خاصی ہوا چل رہی تھی، نیم کے درخت کے اڑتے پتے اس کا واضح ثبوت تھے، تقی ایک دم سے مڑا

”مالا۔۔۔ چلو چھت پر چلتے ہیں“

بجلی کافی گھنٹوں سے نہیں تھی اس کا مطلب تھا کہ اب آج رات تو اس کے آنے کا ہر گز امکان نہیں تھا کمرے میں پنکھے کے بنا لیٹنا محال ہو رہا تھا، مالا جو پہلے ہی خواب کو سوچ کر گھبرائی ہوئی تھی چھت کا نام سن کر زور سے نفی میں سر ہلایا، تقی نے کرتے کے آستین چڑھاتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھائے

”کیوں۔۔۔۔۔ بھئی ہوا چل رہی ہے اٹھو سکون کی نیند آئے گی کمرہ تو گرم ہو رہا ہے“

تقی نے اس کے انکار پر آبرؤ چڑھائے پوچھا، پاس آکر، اس کے بالکل برابر میں پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھ گیا۔ مالا نے آہستگی سے رخ تقی کی طرف پھیرا جو اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

خوف اب دل بھرنے اور دل آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بنا اور وہ ایک جھٹکے سے تقی کے گلے لگ کر بے بسی سے رودی، عجیب سے خوابوں کا سلسلہ اب تیز ہوتا جا رہا تھا اور وہ تنگ آرہی تھی، بچوں کی طرح سسکا اٹھی، تقی اس طرح رونے پر پریشان ہو گیا۔

”مہ۔۔۔۔۔ مالا۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔“

اس کے گرد اپنے بازو کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی، وہ کیوں اس طرح رو رہی تھی

”یار بتاؤ تو ہوا کیا ہے خواب دیکھا کوئی“

تقی نے تھوڑا سا پیچھے ہوتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا، مالا نے آہستگی سے سر اثبات میں ہلایا۔

”اوہ تو۔۔۔ اس میں یوں رونے والی کیا بات ہے خواب ہی تھانا“

تقی نے اسے ایک طرف سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بازو سہلایا مالا پھر سے اس کی قمیض کی جیب میں انگلیاں پھنسائے اس کے گریبان میں چہرہ چھپا رہی تھی رونا تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا وہ سب کچھ تقی کو بتانا چاہتی تھی پر عجیب سی جھجک تھی وہ اتنا پڑھا لکھا تھا کیا پتا اس کی ان باتوں پر کیا کہے گا اسے ڈانٹ دے گا۔ اور پھر رونا آپا کا ذکر وہ تقی سے ہر گز نہیں کرنا چاہتی تھی دل میں عجیب سا احساس تھا اگر رونا آپا آج زندہ ہوتی تو تقی کبھی اس کا نہیں ہوتا۔

”چلو آؤ اوپر چھت پر چلتے ہیں، خواب تھانا خواب ختم ڈر ختم“

تقی نے اسے اپنے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا اور تکیہ اس کی طرف بڑھا کر خود چادر کو اٹھایا، وہ اتنی محبت سے کہہ رہا تھا کہ مالا اب کی بار انکار نا کر سکی ویسے تو صحن بہت بڑا تھا پر چھت پر بھی برساتی کے نیچے چارپائی یاں پڑی تھیں جن کو بہت گرمی کے دنوں میں چھت پر ڈال کر حویلی کے کئی مکین سوتے تھے۔

وہ تقی کے ساتھ چھت پر جانے کے لیے زینے چڑھ رہی تھی لیکن نگاہ بار بار فوارے کے پاس اسی کونے میں اٹھ رہی تھی اور جان بوجھ کر وہاں رونا کا عکس بنا رہی تھی، سر کو بار بار جھٹکنے پر بھی رونا ذہن سے نہیں نکل رہی تھی۔ جیسے ہی وہ چھت پر آئے فرحت بخش ٹھنڈک اور ٹھنڈی سی ہوا نے اندر تک سکون اتار دیا چھت پر آتے ہی تقی

برساتی سے چارپائی نکال کر چھت کے وسط میں لا رہا تھا اور وہ تکیہ اور چادر ہاتھ میں تھامے اوپر آسمان پر موجود ستاروں کو دیکھ رہی تھی ستاروں سے بھرا آسمان، کھلی چھت اور تقی کا محبت بھرا ساتھ سب کچھ تسکین بخش تھا مالا نے کھلی فضا میں گہرے سانس لیے تقی چارپائی بچھا چکا تھا۔

”آؤ۔۔۔ بھی اب“

تقی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تو مالا مسکراتی ہوئی آگے بڑھی، تھوڑی دیر پہلے والے خوف کے احساس کو وہ ختم کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی، تقی نے اس سے چادر پکڑ کر پاؤں کی طرف چارپائی پر رکھی جبکہ وہ تکیہ سرہانے کی طرف رکھ رہی تھی۔ تقی نے چارپائی پر لیٹ کر اپنے برابر میں ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا۔

”آجاؤ یہاں اور اب مجھے بتاؤ کیوں ڈر گئی تھی“

تقی نے نرمی سے کہا مالا نے مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور پھر چارپائی پر بیٹھ کر پہلے تقی کا بازو کھینچ کر سیدھا کیا جس پر وہ بے اختیار مسکرا دیا وہ اسی طرح تو کرتی تھی جب بھی لیٹتی تھی اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹتی تھی اور جب وہ سو جاتی تو تقی دھیرے سے اپنا بازو اس کے سر کے نیچے سے نکال لیتا۔

مالا نے سر تقی کے بازو پر رکھا اور چت لیٹ کر آسمان کی طرف دیکھا جس کا منظر بری طرح آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا وہ رات کے وقت یوں پہلی بار چھت پر تھی۔

نیچے تو درخت آدھا آسمان کھا جاتے تھے اس لیے اتنے ستاروں بھرے آسمان کا نظارہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا جبکہ تقی تو اکثر چھت پر آکر سوتا تھا۔

”کتنا پیارا لگ رہا آسمان صحن سے دیکھو تو اتنا پیارا نہیں لگتا“

مالا نے مبہوت آسمان کو تکتے ہوئے کہا، تقی نے بھی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سانس لی

”اور تمہیں پتا ہے میں نے یہ نظارہ ہزاروں بار دیکھا ہے مگر جو مزہ آج ہے وہ پہلے کبھی نہیں تھا“

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد محبت سے مالا کی طرف دیکھا، مالا کو اچانک دو چاند والا مشہور جملہ یاد آ گیا جو اکثر ہیر و اپنی بات مکمل کرنے کے لیے ناولوں میں بولتے تھے۔

”کیوں آج ایسا کیا ہے؟“

مالا نے شریر سے لہجے میں تقی کی طرف کروٹ لیتے ہوئے پوچھا پیار سے اپنا پاؤں اس کے پاؤں پر دھر دیا

”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔۔۔“

تقی نے اس کی طرف کروٹ لی تو چہرہ اتنا قریب تھا کہ مالا کے ناک سے ناک ٹکرا گیا، وہ دلکش مسکراہٹ سجائے بڑی بڑی آنکھیں کھولے اب چاند کی روشنی میں تقی کو محبت سے دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں اس کے لیے بے پناہ پیار تھا۔

”ہاں اب پوچھ لیا ہے تو بتادیں نا کیا خاص بات ہے آج کی رات میں“

مالا نے آہستگی سے سر کو بازو پر کھسکا کر چہرہ اور قریب کیا، لب مسکرا رہے تھے اور آنکھیں چمک رہی تھیں، تقی نے گال پر ہاتھ رکھا تو اس نے آہستگی سے آنکھیں بند کیں اور پھر کھول کر مسکرا دی۔

”اس لیے کہ تم میرے ساتھ ہو“

تقی نے مخمور سے لہجے میں جواب دیا، تو وہ سمٹ کر مسکرائی پر مصنوعی خفگی سے ماتھے پر بل ڈالے اسگ دیکھا جو سفید کرتے میں چاند کی روشنی کے نیچے دل میں گدگدی جیسا احساس پیدا کر رہا تھا۔

”بس اتنا ہی“

پیار سے شکوہ کیا، تقی اس کے چہرے پر نگاہیں گھما رہا تھا۔

”اور کتنا۔۔۔“

تقی نے ناک کو پکڑ کر محبت سے کھینچا

”آپ کو میں دوسرا چاند نہیں لگ رہی کیا؟“

مالا نے خفا سے لہجے میں شکوہ کیا، جس پر تقی کا خفیف سا قہقہہ گونجا

”نہیں تو چاند کیوں لگو گی تم“

تقی نے ہنستے ہوئے پوچھا، وہ خفا سی اور بھی حسین لگ رہی تھی۔

”مطلب میں چاند جیسی پیاری نہیں لگتی آپ کو“

مالا نے خفگی سے آنکھیں سکوڑی تھیں

”مجھے تو چاند پیارا نہیں لگتا، چاند ہے وہ جس کا کام رات کو روشن کرنا ہے وہ ایک کرہ ہے تم انسان ہو تم کیوں لگو گی چاند“

تقی نے پیشانی پر بل ڈالے اس کی خفگی پر حیران ہوتے ہوئے جواب دیا، اور وہ اس شخص کو حیرت دیکھ رہی تھی جس کو چاند پیارا نہیں لگتا تھا اور نا وہ چاند جیسی لگتی تھی۔

”آپ کو ان سب چیزوں کو دیکھ کر محبت کا احساس نہیں ہوا کبھی؟“

مالا نے حیرت سے پوچھا، جبکہ وہ اب گہری سانس لیے ایک نگاہ آسمان کی طرف دیکھ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا ”دیکھو میں کوئی شاعر تو نہیں ہوں اس لیے مجھے ہر چیز کے پیچھے اس کا اصل مقصد نظر آتا ہے، میں نے نا ان سب کو محبت کے نظریے سے دیکھا تھا کبھی اور نا انہوں نے مجھے احساس دلایا، مجھے تو زندگی میں پہلی دفعہ اگر کسی نے محبت کا احساس دلایا ہے تو وہ تم ہو اور تم صرف تم ہونا تو چاند ہو اور نا ہی ستارہ“

تقی نے اس کی کمر کے گرد بازو حائل کرتے ہوئے محبت سے کہا تو اس کے جواب پر مبہوت ہوئی وہ اتنا بے زار ہو کر بھی ہر دفعہ اپنی بات سے اس کا دل جیت لیتا تھا۔ اور وہ بالکل سہی کہہ رہا تھا جہاں وہ تھا وہاں یہ چاند تارے یہ آسمان سب کچھ بے معنی تھا وہ تو صرف اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ایک ہاتھ میں شرٹ کے بٹن کو تھامے اور دوسرے ہاتھ میں دھاگے میں بندھے بٹن کو تھامے وہ پلنگ پر بے حال بیٹھی سارے خواب دہرا رہی تھی، رات کے خواب نے اس قدر پریشان کیا تھا کہ وہ اب اٹھتے ہی شرٹ الماری

سے نکال کر بیٹھ گئی تھی۔ باہر کی گہما گہمی بات رہی تھی اس کی صبح ہوئی ہے لیکن باہر تو سب کی دوپہر شروع ہے۔

آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھلا اور فرزانہ علی حسن کو گود میں اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ وہ کل شام کو ہی منہا کی خیریت لینے آئی تھی۔

”مالا علی حسن کو پکڑو گی ذرا کی ذرا میں بچوں کو نہلا دوں“

فرزانہ اس سے بات کرتے ہوئے اب پلنگ تک آگئی تھی اور پھر حیرت سے آنکھیں سکڑ کر مالا کے ہاتھ میں پکڑی شرٹ کو دیکھنے لگی۔

”اللہ توبہ تقی نے اپنی قمیض کا حال کیا کر دیا ہے اتنے پیار سے کڑھائی کر کے دی تھی میں نے اسے“
مالا نے سر اٹھا کر فرزانہ کی طرف دیکھا تھا، جواب آنکھیں سکیڑے تقی کی قمیض کی طرف دیکھ رہی تھی، صبح فجر کی نماز کے بعد وہ پھر سے کمرے میں آ کر سو گئی تھی، اب کچھ دیر پہلے اٹھی اور ناشتے کے دوران ہی اسے رات کے خواب نے الجھا دیا اور پھر عجلت میں ناشتہ ختم کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے سے گڑیا کے گلے میں پہنا ہار اور الماری میں رکھی قمیض نکال کر بیٹھ گئی تھی۔

ذہن الجھا ہوا تھا اور پہیلی تھی کہ سلجھ نہیں رہی تھی، جو چند کڑیاں وہ ملاپائی بس اس سے تو یہی کہانی بن پائی کہ کیا ----۔۔۔!!؟ر منا آپا کی روح یہ نہیں چاہتی تھی کہ میری تقی سے شادی ہو، کیا روحیں سچ میں اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی پیار کرتی ہیں کسی سے اور پھر کسی اور کو اس کا ہوتے دیکھ نہیں سکتی ہیں۔

وہ تب سے کمرے میں بیٹھی فرزانہ آپا کی آمد سے پہلے بس یہی نتیجہ اخذ کر پائی تھی کیونکہ یہ تقی کی قمیض ہے اتنا تو وہ بھی اندازہ لگا چکی تھی تقی کے الماری سے نکلا یہ قمیض اسی کا ہی ہو سکتا تھا۔ الجھن تو فقط یہ تھی کہ بٹن اور ر منا

اسے کیوں متواتر خواب میں نظر آتے تھے اور اب کچھ کڑی مل چکی تھی کہ اس سب کا تعلق تقی سے تھا اور تقی کا گہرا تعلق اس سے تھا اسی لیے رمناس کے خواب میں آتی تھی۔

فرزانہ نے علی حسن کو آہستگی سے پلنگ پر بیٹھایا اور پھر خود بھی پلنگ پر مالا کے سامنے ٹانگیں لٹکائے بیٹھ گئی، نگاہیں مالا کے ہاتھ میں پکڑے ہلکے شربتی رنگ کے قمیض پر ٹکی تھیں جس کے گریبان پٹی کے گرد کی گئی نفیس ریشم کے دھاگے کے ساتھ کڑھائی اسے آج بھی یاد تھی چھوٹے چھوٹے پھول ایک بیل کے ساتھ اوپر کو کاڑھے گئے تھے جن کے دونوں اطراف سے باریک پتے بھی بنائے گئے تھے دھاگہ اور گریبان پٹی پر لگے بٹن قمیض سے ہم رنگ تھے۔ اب فرزانہ کی بات پر مالا گہری سانس لیتیے، الجھی سوچوں کو تھپکتے ہوئے سیدھی ہوئی۔

”جی آپاں کی پرانی قمیض ہے کوئی، الماری میں رکھی تھی صفائی کرتے ہوئے نکالی ہے“

مالا نے فرزانہ کی طرف تائی دیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کی بات کی تصدیق کر دی، فرزانہ اب قمیض کو ہاتھ میں تھامے بیٹھی تھی لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں پرانی بیتی یاد کی چمک تھی۔ علی حسن کو پلنگ پر جیسے ہی اس نے چھوڑا وہ ننھے ننھے ہاتھ پلنگ کی چادر پر مار تا ہوا گھٹنوں کے بل آگے بڑھنے لگا۔

”اپنی شادی کی خریداری کے لیے گئی تھی میں اماں کے ساتھ، پہلے یہ بٹن خریدے تھے میں نے، مجھے اتنے پسند آئے کہ بس پوچھو ہی مت اور پھر بٹنوں کے ساتھ ملا کر اس گدھے کے لیے سوٹ خریدا کہ اپنی شادی پر کاڑھ کر کے اسے تحفہ دوں گی اور دیکھو تو قمیض کا کیا حشر کیا ہے بے قدرے نے“

فرزانہ اب قمیض کے گریبان پر لگے بٹن کو دیکھ کر کھوئے لہجے میں افسوس کر رہی تھی، سارے پرانے لمحے ذہن کے پردوں سے سرک رہے تھے، شادی سے کچھ دن پہلے وہ اس سوٹ کو تقی کے لیے لے کر آئی تھی اور ساتھ ہی اس سے فرمائی لیش بھی کر دی کہ میری شادی پر پہننا تمہاری رنگت صاف ہے بچ جائے گا، فرزانہ نے بیت پل کو ذہن میں دہرایا اور پھر ایک دم سے مالا کی طرف دیکھا، جواب بھی الجھی لکیریں پیشانی پر سجائے بیٹھی تھی۔

فرزانہ نے آخری جملے پر تاسف سے سانس بھری اور پھر بازو کو اٹھائے تیزی سے تیوری چڑھائی۔ احمد حسن اس کا بڑا بیٹا تھا، تلقی کا یہ دس سال پرانا قمیض اس وقت کے اس کے دبلے جسم کی یاد دلا گیا

”آیا یہ رہا آستین کا بیٹن۔۔۔۔۔“

مالا نے مدھم سے لہجے میں کہتے ہوئے ہتھیلی فرزانہ کے آگے کھول دی۔
”اور پتا ہے یہ کس کے پاس تھا“

مالا کی بات پر فرزانہ نے تعجب سے آنکھیں اوپر اٹھائیے مالا کی طرف دیکھا۔ مالا اب بٹن کو ہتھیلی پر رکھے اور نگاہوں کو بٹن پر جمائے بول رہی تھی۔

”یہ رونا آپ کے ہاتھ سے اٹھایا تھا میں نے، جب وہ چھت سے گری تھی، شائے دلتی کی آستین کا بٹن ٹوٹ گیا ہو گا اس کو ٹانگنے کو بھاگی دوڑی پھر رہی ہو گی آیا“

مالانے اپنے دماغ میں الجھن بڑھاتی سب باتوں کو جھٹک کر، غزالہ کی کہی ہوئی بات دہرا دی تھی اور فرزانہ اب دھاگہ دیکھ رہی تھی جو مالانے بچپن میں بٹن میں پرو کر اسے گڑیا کا ہار بنار کھا تھا۔ فرزانہ ر مناکے ذکر پر بالکل مالا کی طرح ہی اداس ہوئی تھی، مالانے فرزانہ کو دھاگا پکڑے یوں حیران دیکھا تو خفیف سامسکائی

”میں نے باندھا تھا یہ دھاگا آیا، میری گڑیا کا ہار تھا“

مالا کی بات پر فرزانہ بھی اداس آنکھوں سمیت مسکرا دی، علی حسن اب پلنگ کے سرہانے کو پکڑ کر چل رہا تھا، اور فرزانہ کے پاس آکر اس کا کندھا تھا مے پلنگ سے نیچے اترنے کو اچکنے لگا۔ فرزانہ کی توجہ علی حسن پر مبذول ہوئی تو بٹن مالا کی طرف بڑھاتے ہوئے گویا ہوئی۔

”اچھا مالا علی حسن کو پکڑ لے میں بچوں کو نہلا دوں، حسن پہنچنے والے ہوں گے شام سے پہلے نکلنا ہے ہمیں اور اس شرٹ کے بٹن اتار کر مجھے دے دینا علی کے کرتے پر لگاؤں گی“

فرزانہ نے عجلت میں مالا سے کہا جواب قمیض کو سمیٹ رہی تھی، فرزانہ کی بات پر جلدی سے اٹھی اور قمیض کو تھا مے الماری کی طرف بڑھ گئی، اور پھر قمیض رکھنے کے بعد آکر علی کو گود میں اٹھالیا۔
ننھے علی کو ہوا میں اوپر اچھال کر وہ نیچے آنے سے پہلے ہوا میں ہی تھام رہی تھی اور وہ منہ کھولے ننھے سے موتیوں جیسے دانتوں کی نمائی ش کر رہا تھا۔

بظاہر تو وہ دل کو تسلی دے چکی تھی پر ایک پھانس تھی دل میں، آخر کو آپا کی روح تقی کے ساتھ مجھے دیکھ کر خوش کیوں نہیں ہے، رات کو استخارہ کروں گی شئی کوئی اشارہ ملے یا پھر مولوی جی کے پاس جاؤں۔۔۔
نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ یہ روح والی بات سن کر ناراض ہو جائی یں گے مالا کو اچانک ان کی پچھلی دفعہ کی گفتگو یاد آئی جس میں انہوں نے اس کے خوابوں کے سلسلے کو اللہ کی طرف سے کسی انہونی کا اشارہ قرار دیا تھا۔۔۔
وہ علی حسن کو گلے لگائے باہر آگئی۔

اٹاری میں وحشت ناک سی خاموشی تھی، اریب پھپھو کا دکھ، منہا کا دکھ ایک ساتھ ہی آکر حویلی کے مکینوں کے چہرے پر اداسی چھوڑ گیا تھا۔

چھت پر چلتے پنکھے کے عین نیچے تخت پر خدیجہ بیگم سر کو باندھے لیٹی ہوئی تھیں تار ی بوا ان کی ٹانگیں دبار ہی تھی۔ اور ایک طرف چارپائی ڈالے اریب بھی پڑمر دہ حالت میں لیٹی ہوئی تھی، وہ اب بالکل خاموش ہو گئی تھی

اس کی تیکھی سی آواز جو ہر چند منٹ کے توقف سے ار حمہ، رملایا تھی کو ڈانٹنے کے لیے ابھرتی تھی اب ایک ہفتے سے معدوم ہو گئی تھی۔

مالایوں زندہ لاشوں کو دیکھ کر اور اداس ہوئی اور کمرے کا رخ کیا، جب دل میں ہی اداسی بھری ہو پھر ارد گرد کا سارا ماحول ہی سو گوار لگتا ہے اس کا حال بھی کچھ یوں ہی تھا، دل میں رمنائے کے متعلق عجیب سے خیال نے اداسی بھر دی تھی اور اب کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کمرے کا پنکھا رنگے برنگے پھولوں کے نقش و نگار والی چھت پر اپنے تین پر گھما رہا تھا، اور نیچے کمرے میں اس کی ہوا اس کے بالکل نیچے کھڑے تھی کے بال اڑا رہی تھی۔ وہ خاکستری رنگ کا قمیض شلوار پہنے اُلجھے سے ایک طرف کی مانگ نکالے بال ماتھے پر بکھیرے مضطرب سا کمرے کے وسط میں کھڑا تھا اور بالکل سامنے بلقیس کھڑی تھیں جن کی صورت کے تاثرات بھی اس سے کم مضطرب نہیں تھے۔

یہ بلقیس اور نقیب حاکم کا کمرہ تھا، اس کا شمار حویلی کے چھوٹے کمروں میں ہوتا تھا جہاں ایک طرف بس دو چھوٹے پلنگ جوڑ کر رکھے گئے تھے اور دوسری طرف دیوار کے ساتھ تین لکڑی کی کرسیوں کے آگے ایک لکڑی کا میز رکھا ہوا تھا، جس پر سلیقے سے سفید کڑھائی والا میز پوش بچھا تھا اور میز کے وسط میں ایک مصنوعی سرخ کاغذ کے پھولوں والا گلدان پڑا تھا، پلنگ پر مبین نامی آٹھ سال کا لڑکا بے سدھ سو رہا تھا یہ منیر میاں کا بیٹا تھا جسے وہ رانی سے الگ کر کے حویلی لے آیا تھا، سمیرا نامی چار سالہ بیٹی کو غزالہ کے حوالے کیا گیا تھا اور بیٹی کی دیکھ بھال بلقیس کے ذمہ داری تھی۔ مبین بخار میں تپ رہا تھا۔ ماں سے جدائی ننھی جانوں پر ظلم تھا مگر یہاں چوہدری حاکم کے آگے کون زبان کھولے۔ وہ اپنے طاقت کے بل بوتے پر رانی سے کیس جیت چکے تھے رانی منیر میاں سے علیحدگی کے بعد پھر سے لاہور چلی گئی تھی۔

اور اس وقت بلقیس سرخ چہرہ لیے اپنے سامنے تن کر کھڑے تھی کو گھور رہی تھی۔ ان کا گھورنا بجا تھا کیونکہ تھی کے بات ہی غیر مناسب تھی وہ منہا کے بارے میں فرہاد سے باز پرس کرنا چاہتا تھا اور بلقیس بیگم اس بات کی اسے اجازت نہیں دے رہی تھیں۔

”اماں آپ کی بات میرے سر کے اوپر سے ہی گزر گئی ہے“

تھی نے اپنے مخصوص انداز میں کمر پر سے ہاتھ اٹھا کر ہوا میں معلق کرتے ہوئے بلقیس کے نفی کر دینے پر برہم ہوا ، کہنیوں سے نیچے ہلکے سے بالوں والے بازو پر قمیض کی آستین موڑ رکھی تھی، بین والے گریبان کا صرف ایک بٹن کھلا تھا، اور وہ گھنی سی بھنویں سکیڑے جواب طلب نگاہیں بلقیس کے چہرے پر جمائے کھڑا تھا۔

”کیا مشکل بات کر دی میں نے، بس میری بات کان کھول کر سن لے بہن کے سسرال کا معاملہ ہے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کرے گا تو، فرہاد کیا سوچے گا یہ میری ماں پر شک کر رہے ہیں، مجھے اور منہا کو تو وہ ڈاکٹرنی کی باتوں پر ذرا بھر بھی بھروسہ نہیں“

بلقیس نے غصے میں ماتھے پر شکن ڈالے تھی کی طرف دیکھا جو اس وقت لب بھینچے بلقیس کی بات کو برداشت کر رہا تھا جبکہ بلقیس بیگم جانتی تھیں اریب اور اس کے بچے پہلے ہی ایک کرب سے گزر رہے ہیں اور تھی اب ان پر ایک نئی پریشانی تھو پنا چاہتا تھا۔

منیر میاں کی اس حرکت کا سب سے زیادہ اثر فرہاد پر ہوا تھا، پرانا شوخ و چنچل فرہاد کہیں کھو گیا تھا، وہ نادام سا نگاہیں جھکائے باپ کی حرکت پر چپ چپ رہنے لگا تھا۔

”آپ کو ان لوگوں کے ناراض ہونے کی پڑی ہے اور مجھے منہا کی پڑی ہے ایک ہی بہن ہے میری میں اس کے معاملے میں ایسے کیسے چپ سادھ لوں جو اس کے ساتھ ہو چکا ہے اس کے نتائیج پتا نہیں کتنے سنگین ہو سکتے تھے“

تقی کے چہرے پر پریشانی واضح تھی وہ بظاہر لا پرواہ سہی لیکن اپنے رشتوں کی قدر و قیمت باخوبی سمجھتا تھا، اکثر لا پرواہ نظر آنے والے لوگ دل میں اپنوں کے لیے زیادہ احساس رکھتے ہیں اور تقی ان میں سے ہی ایک تھا، منہا اس کی اکلوتی، چھوٹی اور لاڈلی بہن تھی وہ بچپن سے ہی اس کے ہر معاملے میں یونہی فکر مند رہا تھا، اس کی پڑھائی کے معاملے میں اس کے مستقبل کو لے کر وہ اپنے ماں باپ تک کے خلاف چلا گیا تھا جو منہا کو دس سے آگے پڑھانے پر قطع آمادہ نہیں تھے۔ اور اب وہ یوں اس کی زندگی سے کھیل جانے پر کیسے چپ بیٹھ سکتا تھا۔

”یہ سب بھی میں تیری بہن کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہوں، یہ بات تیرے ابا تک بھی نہیں پہنچنی چاہیے، گھر میں ویسے بھی اتنی پریشانی کا عالم ہے تم اس بات کو کھول کر اور تماشہ مت کھڑا کر دینا“

بلقیس اب انگلی تانے اسے تنہیہ کر رہی تھیں جو اکڑ کر گردن تانے کھڑا تھا۔

”میں وہ خون کے نمونے لاہور لیبارٹری میں بھجوا چکا ہوں اور اگر ڈاکٹر تسنیم کا شک درست ثابت ہوا تو میں فرہاد سمیت اریب پھپھو کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا، جو میری معصوم بہن کی زندگی سے کھیل گئے“

تقی نے دو ٹوک لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا اور پھر وہاں رکا نہیں تھا، بلقیس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ کمرے سے نکل چکا تھا اب تو کمرے کے کواڑ کے آگے بس سفید پردہ ہی ہل رہا تھا جس کو دیکھ کر بلقیس ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

”مالا جلدی کرو شام ہو رہی ہے“

سکینہ نے درخت کے نیچے سے آواز لگائی، وہ درخت کی ٹہنی پر بیٹھی تھی، سکینہ کی آواز پر جلدی سے دیکھ کر سب سے اچھے والا امرود توڑ کر مالانے نیچے چھلانگ لگائی، دھپ سے کچی مٹی کی پگڈنڈی پر اس کا پاؤں بمشکل پھسلے

ہوئے سنبھلا، اس نے ہاتھ میں پکڑے امرود کو کھانے کی غرض سے اوپر کیا تو وہاں ہاتھ میں کچا آم تھا۔ ہیں امرود جیسا لگ رہا تھا اوپر۔۔۔۔

مالا نے ابھی سی نگاہیں سکینہ کی تلاش میں دوڑائی ہیں، وہ یہیں تو تھی، ایک دم سے کسی کے پکارنے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔۔۔۔

مالا۔۔۔۔۔مالا۔۔۔۔۔

کوئی اسے پکار رہا تھا، آواز کی بازگشت پر مالا نے کھیت میں قدم آگے بڑھا دیے، یہ سکینہ بلا رہی ہوگی اسے، وہ کھیت میں بنی پگڈنڈی پر تیز تیز چلنے لگی، لڈن میاں حویلی کے لیے بیل گاڑی جوت چکے ہوں گے اسی سوچ کے ذہن میں آتے ہی وہ کچی سڑک کی طرف تیز تیز قدم بڑھائے ہوئی تھی۔ نیندا اتنی آرہی تھی کہ دل میں خیال ابھرا چارے کی گٹھری پر ہی سر رکھ کر بیل گاڑی پر ہی سو جائے گی۔

اچانک نگاہ اٹھائی تو کچی سڑک پر تو وہ آگئی تھی لیکن یہاں نا تو بیل گاڑی تھی اور نا ہی سکینہ۔۔۔ کیا وہ لوگ مجھے کھیت میں بھول کر ہی چلے گئے آج کیا سکینہ کو نہیں پتا تھا میں بھی ساتھ ہوں۔ مالا نے غصے سے ارد گرد دیکھا مالا۔۔۔۔۔مالا۔۔۔۔۔

آوازوں کی بازگشت پھر سے سنائی دی، مالا نے ان کے تعاقب میں قدم بڑھائے گاؤں کا کنواں کھیت میں آگیا تھا، وہ پریشان سی کنویں کی طرف بڑھی کھیتوں میں تو کوئی کنواں نہیں تھا ہاں البتہ گاؤں میں دو کنویں تھے جس سے لوگ میٹھے پانی کے گھڑے اور مشکیزے بھر کے گھروں کو لے جاتے تھے۔

وہ کنویں کے پاس پہنچ گئی تھی، یہ گہرا کنواں تھا، گاؤں کے کنویں سے کہیں گہرا تھا اس کو پکارنے کی آوازیں کنویں میں سے آرہی تھیں۔۔۔۔ ہائے اور با کیا سکینہ کنویں میں گر گئی مالا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اب کنویں پر جھک کر اندر جھانک رہی تھی لیکن ہلتے سیاہ پانی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

اچانک پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی مالانے جیسے ہی رخ موڑا ایک ہاتھ آگے بڑھا اور اسے جیسے ہی دھکا ملا مالانے اچک کر اپنے بچاؤ کے لیے سامنے کھڑے آدمی کے قمیض کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالا اور ایک ہاتھ سے اس کی کلائی تھامی پر توازن ایسا بگڑا کہ وہ سامنے کھڑے شخص کی جیب کو پھاڑتی اس کی کلائی سے بٹن کو توڑتی نیچے گری، اس شخص کو اندھیرے کے باعث دیکھ بھی ناپائی، پورے جسم میں خوف کے باعث بجلی کو ندگی ذہن نے خود کو پانی میں گرنے کے لیے تیار کیا۔

پر یہ کیا وہ ایک جھٹکا کھا کر بنا کسی تکلیف کے گری تھی پر یہ پانی نہیں حاکم قصر کا صحن تھا مالانے آنکھ اوپر اٹھائی اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی وہ فوارے کے پاس صحن میں گری تھی نگاہ اوپر اٹھائی تو کوئی وجود اس پر گر رہا تھا مالا کا جسم ہل نہیں پارہا تھا مالانے زور سے خوف کے باعث آنکھیں میچ لیں، کوئی دھڑم سے ساتھ گرا تھا گرنے کی آواز بہت مانوس تھی مالانے آنکھیں کھول کر گردن گھمائی اور اس کے برابر میں آکر گرنے والا وجود ر منا کا تھا اس کا چہرہ اس کی طرف مڑا ہوا تھا اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

مالا ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور جلدی سے ر منا کی ہتھیلی کی طرف دیکھا وہاں بٹن موجود نہیں تھا، بٹن مالا کے ہاتھ میں تھا۔ ر منا اب اٹھ کر بیٹھ رہی تھی۔ مالا کا جسم خوف کے باعث کانپنے لگا ذہن نے فوراً بتا دیا یہ خواب ہے۔۔۔۔۔ یہ خواب ہے۔۔۔۔۔

مالانے پوری قوت سے جھٹکا لگا کر آنکھیں کھولیں، وہ بستر پر تھی پنکھا چلنے کا شور تھا، کمرے میں چھوٹے بلب کی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی، جو کچھ دن پہلے آنے والے خواب کے پیش نظر تقی نے کمرے میں لگا دیا تھا اس کو لگتا تھا مالا اندھیرے سے ڈر جاتی ہے، تقی اسے اپنی باہوں میں بھر کر سو رہا تھا اس کا مضبوط بازو مالا کی گردن کے گرد کچھ اس طرح سے لپٹا ہوا تھا کہ مالا کو اپنا سانس رکتا سا محسوس ہوا۔ سبز رنگ کی روشنی میں تقی کے تن پر موجود سفید گرتا

وہ بہت دن کے ارادے پر آج عمل پیرا ہوئی تھی، استخارہ کرنے کے بعد روتے ہوئے دعا مانگ کر سوئی اور اب ذہن استخارہ کے جواب کے طور پر خواب کو دہرا رہا تھا۔ رونا کو چھت سے دھکا ملا تھا جیسے اسے دھکا ملا اور دھکا دینے والی کی جیب ر منانے تھامی ہوگی جیسے اس نے تھامی تھی پھر جیب پھٹی اور کف سے بٹن ٹوٹ کر ہاتھ میں رہ گیا اور وہ بٹن تقی کی قمیض کا تھا اور تقی۔۔۔۔۔

مالا نے ایک جھٹکے سے تقی کے بازو کو اپنے کندھے پر سے ہٹایا اور آنکھیں خوف کے مارے زور سے بند کیں پلکیں
کپکپا رہی تھیں۔ تقی نے رونا آپا کو دھکا دیا۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ کیسا اشارہ تھا اللہ میاں۔۔۔۔
اس کے لب اپنی ہی سوچ کے انکار پر کانپ گئے، تقی نے قمیض کو کتابوں میں چھپا کر رکھا تھا۔۔۔ افس
میرے خدا تو آیا مجھے بچپن سے یہ بتانے کی کوشش میں تھی اور میں۔۔۔۔۔

مالانے کرب سے آنکھیں کھولیں، تقی اس کے چہرے پر جھکا اسے ہی دیکھ رہا تھا مالا کی فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی۔۔۔ وہ جو کہنی کے بل اٹھ کر اس کو دیکھ رہا تھا دبک گیا مالا کے بازو جھٹکنے پر اس کی آنکھ کھلی تھی اور پھر وہ عجیب طرح سے چہرے کے زاویے بگاڑ رہی تھی، تقی اس کے چہرے کو تعجب سے دیکھتا ہوا اس پر جھکا تھا جب اچانک اس نے آنکھ کھول کر چیخ ماری جیسے وہ تقی نہیں کوئی اور ہو۔

”مالا۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟“

تقی نے اسے دونوں کندھوں سے تھام رکھا تھا، اور اس کے یوں کاپنپنے اور چیخنے کا سبب دریافت کر رہا تھا۔ مالا بے یقینی سے تقی کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جسم میں خوف کی سنسناہٹ تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

ر منا آپا کو چھت سے دھکا تقی نے دیا پر کیوں۔۔۔ ذہن الجھ رہا تھا پر زبان گنگ تھی اور تقی اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ جسے وہ کوئی جواب دینے کی حالت میں نہیں تھی۔ سبز روشنی کے باعث سب کچھ سبز لگ رہا تھا اس وقت تقی کا چہرہ سبز تھا اس کے ہونٹ بھی سبز تھے۔

”مالا مجھے بتاؤ کیا مسئی لہ ہے تمہارے ساتھ؟ کیسے خواب ہیں جو آئے دن تمہیں تنگ کر رہے ہیں؟؟“

تقی پیشانی پر پریشانی اور حیرت کے شکن نمودار کیے اس سے وہ سوال کر رہا تھا جس کا جواب آج اس کا دل دہلا گیا تھا۔ ر منا آپا اس کو تقی سے بچانا چاہتی تھیں کیا۔

مالا اسے بچالو۔۔۔۔۔ مالا اس کو کہو ظلم بس کر دے۔۔۔۔۔ وہ سارے خواب ایک ہی دفعہ میں دہرا رہی تھی اور آخری خواب کا اختتام سب سمجھا گیا۔

”مالا کچھ بولو بھی اب کیسے خواب آتے ہیں کیا خوفناک کہانیاں پڑھتی ہو تم؟“

تقی اس پر جھکا سوال پر سوال کر رہا تھا اور وہ شاکی نگاہوں سے تقی کو گھور رہی تھی۔ تقی نے ر منا آپا کو دھکا کیوں دیا ہو گا یہ تو اتنے اچھے ہیں۔۔۔ مالا اب بے یقینی سے آنکھیں سکیڑے تقی کو دیکھ رہی تھی۔ تقی اس سے جواب کے انتظار میں تھا اور وہ تھی کہ گھورنا ہی بند نہیں کر رہی تھی۔ اسے غصہ آ گیا اس کی چپ پر

”مالا۔۔۔۔۔ عجیب پاگل لڑکی ہو میں کب سے پوچھ رہا ہوں کچھ؟ کیا ہو جاتا ہے تمہیں؟ کیوں ڈرتی ہو اتنا؟“

تقی اب غصے میں جھنجلا کر اس سے سوال کر رہا تھا۔ مالا اس کے یوں غصہ ہونے پر سٹپٹا گئی۔ اور فوراً جھوٹ بول کر جان چھڑائی

”کہ۔۔۔۔۔ کچھ۔۔۔۔۔ نہیں بس وہ۔۔۔۔۔ جن۔۔۔۔۔ چو۔۔۔۔۔ چڑیل۔۔۔۔۔“

مالا نے پھکی سی آواز میں بے ربط جملے ادا کیے تو تقی نے بے ساختہ اپنے ماتھے کو ہاتھ سے جکڑ لیا اور پھر ایک دم سے مسکراتے ہوئے اسے باہوں کے حصار میں لیا۔

”تم یہ بچوں جیسے کام کرنا کب چھوڑو گی مت پڑھا کرو یہ جن چڑیل کے قصے“

تقی اس ساتھ لگائے کان میں سرگوشی کر رہا تھا اور آج پہلی دفعہ وہ تقی کے حصار میں گھٹن محسوس کر رہی تھی،

”نماز پڑھ کر سوتی ہو، قل تم پڑھ کر خود پر پھونکتی ہو پھر یہ سب ذہن سے جھٹک کر سویا کرو جن چڑیلوں سے زیادہ خطرناک تو انسان ہوتے ہیں“

تقی اسے ساتھ لگائے شائستگی سے سمجھا رہا تھا اور اس کی آخری بات پر مالا کا دل لرز گیا وہ کسمسا کر خود کو تقی سے الگ کرنے لگی۔

”ہمم کیا ہے اب“

تقی نے سر نیچے جھکائے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائی یں، جو ہونق چہرہ لیے بے چین لیٹی تھی۔

”پہ۔۔ پانی پینا ہے“

مالا نے آہستگی سے جواب دیا اور پھر تقی کی باہوں میں سے نکلتے ہوئے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، وہ اس سے پہلے ہی تیزی سے کہنی کے بل اوپر ہوا۔

”رکو میں دیتا ہوں پانی“

تقی پلنگ پر میز کی طرف سوتا تھا، اب وہ تقریباً میز کی طرف آدھا جسم گھمائے اس کے لیے پانی جگ سے گلاس میں انڈیل رہا تھا۔ مالا نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر تقی کی جیب میں ہاتھ ڈالا ریڑھی کی ہڈی میں کپکپی سی ہوئی۔ تقی پانی سے بھر گلاس تھامے اس کی طرف مڑا تو مالا نے جلدی سے جیب میں سے ہاتھ نکال دیا۔

”لو پانی پیو“

ملائی م سے لہجے میں مالا کی طرف پانی بڑھایا، مالانے اسی طرح ہونق حالت میں گلاس تھاما اور تین گھونٹ میں تیزی سے پانی پی کر تقی کی طرف بڑھا دیا۔

تقی نے مسکراتے ہوئے گلاس کو تھاما تھوڑا سا رخ موڑے گلاس کو میز پر رکھا اور پھر اس کی طرف رخ کیا مالا پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا۔۔۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو، میں تقی ہوں جن نہیں“

تقی نے ہنستے ہوئے چھیڑا جس پر وہ اس کا ساتھ بھی نادے سکی
”ویسے تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا، میں بھی تو اتنا تنگ کرتا ہوں“

تقی محبت سے کہتے ہوئے اس پر جھکا تھا، مالانے آہستگی سے اس کے بازو کو حصار میں لینے سے پہلے ہی روک دیا، وہ متحوش بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا طبیعت ٹھیک ہے“

تقی نے آبرو چڑھائے تشویش ظاہر کی کیونکہ مالا کا اس کے ساتھ یہ رد عمل پہلی دفعہ تھا۔ وہ تو اس کی تھوڑی سی جسارت پر ہی سرشار ہو جاتی تھی پر آج عجیب احساس تھا۔

”نیند آرہی ہے“

پھیکی سے آواز بمشکل پنکھے کی آواز میں تقی کے کانوں کو سنائی دی، تقی نے لب بھینچے سر کو اثبات میں ہلایا، وہ شائے زیادہ گھبراگئی تھی آج۔

”لیٹو سو جاؤ اور کل سے کوئی کہانی نہیں پڑھو گی ایسی جو ذہن پر سوار ہو جائے“

تقی نے لیٹ کر اپنا بازو اس کے سر رکھنے کے لیے تکیے کے اوپر سیدھا کیا اور وہ ہنوز اسی طرح مضطرب بے کل آہستگی سے نیچے ہو کر اس کے بازو پر سر رکھے لیٹ گئی ذہن میں بار بار خواب کا وہ منظر گھوم رہا تھا اس کا جیب میں ہاتھ

پندرہ منٹ۔۔۔۔۔ آدھا گھنٹہ۔۔۔۔۔ دو گھنٹے۔۔۔۔۔ ذہن شل تھا، سوچ کربار بار نفی کر کے، متواتر خواب دہرا کے۔

تقی تو پھر سے سوچکا تھا اور وہ تھی کہ تانے بانے بنتے نیند سے کوسوں دور رہی۔ جلتی آنکھیں فجر کی آذان تک جاگ رہی تھیں۔

* * * * *

کمرے کا دروازہ آہستہ سے اندر کو کھولتے ہوئے غزالہ جیسے ہی آگے بڑھی مالانے آنکھیں چندھیا جانے کے باعث آنکھوں کے اوپر بازو کو کہنی کے بل موڑ کر رکھا۔ وہ پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی، چوٹی سے نکلتے بال، شکن آلودہ لباس، اندھیرا کمرہ

”مالا کیا ہو گیا ہے؟، آج دوپہر ہونے کو ہے اُٹھ کیوں نہیں رہی ہے“

غزالہ پریشان حال سی آگے بڑھی، پلنگ پر بیٹھی اور اس کے یوں آج کمرے میں ہی بند ہو جانے پر تشویش ظاہر کی وہ ساری رات کی جلتی آنکھوں پر بازو دھرے ساکن بیٹھی تھی۔

غزالہ نے پلنگ کے پاس آکر اس کی آنکھوں پر سے بازو ہٹایا تو منہ حیرت سے وا ہوا، مالا کی آنکھیں رونے کے باعث سو ج چکی تھیں اور متر و مآثر آنکھوں کی سفید پتلیاں ہلکی سی لالی لیے اس کی اذیت اور رنج کی گواہی دے رہی تھیں۔ غزالہ کا دل ہولا کے رہ گیا

”مالا۔۔۔ تو رو کیوں رہی ہے؟“

غزالہ نے پریشان سے لہجے میں سوال کیا، پر وہ جو بے تاثر آنکھیں لیے بیٹھی تھی ماں کو دیکھ کر پھر سے رودی۔
 غزالہ پلنگ پر سے تیزی سے اٹھی، ایک ہاتھ سے دیوار پر نصب سوئی چ کو دبا کر بتی جلاتی، بیرونی دروازے کی
 طرف بڑھی کواڑ کو تیزی سے ایک دوسرے میں مار کر بند کیا اور مضطرب سی پلٹی۔ پلنگ پر پھر سے اس کے پاؤں
 کی طرف تھوڑا سا ٹک کر اس کی طرف دیکھا جواب بے آواز آنسو بہائے جا رہی تھی۔
 ”مالا بے شک میں ماں ہوں لیکن جب تک تو نہیں بتائے گی اپنے رونے کی وجہ میں کیسے جان سکوں گی کہ مسئی لہ
 کیا ہے؟۔۔۔ کیا تقی نے کچھ کہہ دیا؟“

غزالہ نے محبت سے اس کا گھٹنا تھام لیا، مالا نے نگاہیں جھکائے ہی نفی میں سر ہلادیا، ہاتھوں کی انگلیاں وہ کچھ اس
 طرح سے ایک دوسرے میں پھنسائے بیٹھی تھی جیسے خود سے ہی جنگ کر رہی ہو۔
 اور کچھ ایسا ہی تھا، بعض اوقات انسان خود سے ہی تنگ آجاتا ہے مالا کی زندگی بظاہر مکمل اور پرسکون تھی پر
 خوابوں کا یہ عجیب سلسلہ اس کی پرسکون زندگی میں بری طرح خلل پیدا کر گیا تھا وہ ہر دفعہ کی طرح اس دفعہ اپنے
 خواب کو جھٹک نہیں رہی تھی شائ داس کی وجہ رات کو سونے سے پہلے خدا سے مانگی گئی مدد تھی وہ دعا تھی جو
 اس نے اللہ سے کی تھی کہ اللہ مجھے ان خوابوں سے چھٹکارا دے یا پھر کوئی اشارہ دے کہ مجھے تو یہ خواب کیوں
 دکھاتا ہے۔ انہی سوچوں کے بھنور میں پھنسی وہ بے سروپا، بے حال بیٹھی تھی جب غزالہ اسے آج باہر نادیکھ کر
 اندر آگئی تھی۔

”تو پھر ایسے کیوں بیٹھی ہے میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے بتا دے کیا کوئی نقصان کر دیا تقی کا؟“
 غزالہ کی پیشانی نا سمجھی کی الجھی لکیریں سجائے ہوئی تھی، مالا نے ہتھیلی کی پشت سے اپنی نم ہوتی گالوں کو باری باری
 رگڑا اور بھیگی پلکوں کی جھالراٹھائے سامنے بیٹھی اپنی ماں کو دیکھا۔ جس کی پیشانی پر موجود شکن پریشانی کا واضح
 ثبوت تھے۔

آنسوؤں میں روندھائی آواز تھی، بے حال پریشان چہرہ اس کے اندرونی کرب کی چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا۔
غزالہ نے جلدی سے اس کے چہرے کو ٹھوڑی سے تھام کر اوپر کیا۔

مالا نے بھیگے سے لہجے میں سپاٹ چہرہ اوپر اٹھائے اپنے رونے کا سبب بتایا تو غزالہ نے نا سمجھی سے اس کے چہرے کو دیکھا، ایک پل کے توقف کے بعد اس نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑ کر غزالہ کے سر پر حیرت کا پہاڑ توڑ دیا

”اور اماں وہ دھکا کسی اور نے نہیں تقی نے دیا تھا انہیں“

مالا اب بات مکمل کیے پھر سے رونے لگی تھی جبکہ غزالہ ایک پل کے لیے ساکن ہوئی ماتھے پر پڑے افقی بل ذہن میں بات کو سمجھ کر مزید بڑھ گئے اور دانت پیسے وہ ایک ہی جست میں مالا کے دونوں بازو دبوچ چکی تھی۔

”مالا بچپن سے ہی مجھے تو پاگل لگتی تھی لیکن اب یقین ہو چلا ہے جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے، جو دل میں آتا ہے کر دیتی ہے، تجھے اب گیارہ سال بعد ر منا کیوں نظر آنے لگی ہے ہر جگہ، کبھی وہ مواٹن اٹھائے پھرتی ہے، کبھی راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور اب یہ پتا چل گیا کہ ر منا کو تنقی نے چھت سے دھکا دیا تھا، عقل کی ماری چھت پر کوئی نہیں تھا تب یہ خواب تجھے یا گل کر دیں گے، یہ کیوں بھول رہی ہے تنقی تیرا شوہر ہے“

غزالہ نے تیز تیز بولتے ہوئے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا جانتی تھیں وہ ہر خواب کے بعد اس طرح کی کیفیت کا شکار ہو جاتی ہے اور اب اس دفعہ تو وہ اپنے خواب کا جو نتیجہ نکال کر بیٹھ گئی تھی اسے غزالہ نے ڈرا کر رکھ دیا۔

”اماں مجھے خواب بلا وجہ نہیں آتے کوئی تو وجہ ہے اور چھت پر۔۔۔۔۔۔ اس دن ضرور تقی تھے، مجھے استخارہ سے سب اشارہ ہو گیا کہ رونا آپا کیا بتا رہی ہے مجھے خواب میں آکر“

مالا نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور غزالہ کی بات کی تردید کر دی، غزالہ اس کے خوابوں سے پہلے ہی تنگ آچکی تھی اور اب یہ سلسلہ بجائے تھمنے کے عجیب صورتِ حال اختیار کر گیا تھا۔

”میں تیرا گلابادوں گی اس کو اس پر، پتا نہیں کیا گند بلا قصے کہانیاں پڑھ کر تیرے دماغ میں خناس بھر گیا ہے“

غزالہ نے دانت پیستے ہوئے غصے میں اسے جھاڑ کر رکھ دیا جبکہ ہاتھ واقعی میں اس کے گلابانے کے انداز میں آگے بڑھائے

”کوئی خناس نہیں بھرا یہ دیکھ بٹن اماں اور یہ قمیض تقی نے الماری میں چھپا کر رکھی تھی، یہ بٹن اسی قمیض کا ہے جب تقی نے دھکا دیا آپا کو تو اس کے بازو کا بٹن ٹوٹ کر آپا کی مٹھی میں قید ہوا“

مالا نے گھٹنا اٹھایا، کانپتے ہاتھوں سے اپنے گھٹنے کے نیچے دی ہوئی قمیض اور بٹن غزالہ کی طرف بڑھایا اور ساتھ ہی اپنارات کا سارا خواب غزالہ کے گوش گزار کیا۔

”دیکھ مالا۔۔۔ تو پتا نہیں کیا کیا سوچتی ہے دن بھر اور پھر وہی سب تیرے خواب بن جاتے ہیں، رونا کی موت کو کیوں نہیں بھول پارہی ہے، یہ میں نہیں جانتی پر اتنا ضرور جانتی ہوں تقی ایسا کبھی نہیں کر سکتا، وہ تو رونا کو سب سے چھپ کر پڑھاتا تھا اس کا خیال کرتا تھا، اباجی سے اپنی فیس کے پیسے زیادہ لے کر وہ رونا کی فیس ادا کرتا تھا“

غزالہ اب کھوئے سے لہجے میں تقی کی صفات بتاتے ہوئے اس کی ہر بات کی نفی کر گئی تھی۔ مالا بھی اب بھنویں سکڑے ماں کی بات پر ایمان لانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی پر ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا رات سے لے کر اب

تک وہ اس خواب کو ہزاروں دفعہ اپنے ذہن میں دہرا چکی تھی کہ وہ خواب اب خواب کم حقیقت زیادہ لگنے لگا تھا۔
غزالہ متواتر بولے جارہی تھی اور وہ اداس آنکھیں لیے تاک رہی تھی۔

”اور رمنہ۔۔۔۔۔، وہ تو تنقی کی ایسی دیوانی تھی کہ ناچاہتے ہوئے بھی صرف اس کی خاطر پڑھتی تھی اس کا ہر حکم مانتی تھی“

غزالہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور مالا ہنوز خاموش بیٹھی تھی، غزالہ نے دوپٹے کا پلو اٹھایا اور آنکھیں رگڑ ڈالیں مالا ایک ٹک سامنے خلا میں نگاہیں جمائے گویا ہوئی

”اماں پر۔۔۔۔۔ میرے خواب میں، میں نے صاف دیکھا کہ چھت سے دھکا کھا کر آپا نیچے آئی یں اور وہ خواب کم حقیقت زیادہ لگ رہا تھا“

دور کسی کنویں سے آتی آواز تھی، مالا کی سوئی اب بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ غزالہ نے تاسف سے پیشانی پر ہاتھ مارا ”مالا تو سہی کہہ رہی ہے تو خود بھی پاگل ہو رہی ہے اور مجھے بھی کر دے گی، خبردار یہ بات آج کے بعد میں نے تیرے منہ سے سنی تو۔۔۔۔۔ یہ یہاں ہم دونوں کے بیچ ہی ختم، گھر والے تجھے بد دماغ تو پہلے ہی سمجھتے ہیں اب باولی کہنے لگیں گے، پانی پڑھ کر لاتی ہوں وہ پی لے“

غزالہ نے تیوری چڑھا کر ہاتھ ہوا میں معلق کیے مالا نے منہ کھولا اور اس پہلے کہ وہ کچھ اور بولتی غزالہ جھٹکے سے اٹھ کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے دونوں پٹ ٹھک ٹھک کی آواز پر ارد گرد دیواروں سے ٹکرائے اور پردہ ہل کر رہ گیا۔

کیا اماں ٹھیک کہہ رہی ہے میرا یقین کوئی نہیں کرے گا کیا؟، آپا چاہتی کیا ہیں؟؟؟ کیا میں تنقی سے سوال کروں اس سے پوچھوں کہ آپا کو کیوں دھکا۔۔۔۔۔

وہ مضطرب دانتوں میں لب دبائے کچل رہی تھی، بے دلی سی اٹھی اور قمیض اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔

سورج ڈوب رہا تھا، اور شام اپنے ساتھ لائی ٹھنڈک اب حاکم قصر کے صحن کو بخش کر تپش کم کر رہی تھی جو اس کو دوپہر نے بخشی تھی۔

چکی کی گونگے کے ساتھ صحن میں لگے درختوں پر چڑیوں کے مسلسل چہچہانے کی آوازیں ایسی تھیں جیسے دن کو الودع کہنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی بڑائی اور ثنا بھی کر رہی ہوں جو صبح سے شام ہونے پر قادر ہے۔

تقی ہاتھ میں ڈاکٹری بیگ اٹھائے فرہاد کے پیچھے چلتا ہوا حاکم قصر کے گیٹ سے اندر داخل ہوا دونوں تیز تیز چلتے ہوئے اٹاری کی طرف بڑھ رہے تھے ہر نفس سے بے نیاز جو صحن اور اٹاری میں روزمرہ کے کاموں میں مشغول تھے۔

یہ فرہاد اور منہا کا کمرہ تھا جس کا پردہ سرکاتے وہ آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے اور داخل ہوتے ہی تقی کی سیدھی نگاہ سامنے پلنگ پر پڑی، جہاں زرد چہرہ لیے پڑمردہ لیٹی منہا کی آنکھیں مکمل طور پر بند تھیں۔

وہ دو ہفتوں میں ہی کمزور اور ناتواں دکھنے لگی تھی، حمل زائل ہونے کے بعد سے اس کا بخار ختم نہیں ہو رہا تھا ہر دوسرے دن وہ تپ میں تپ رہی ہوتی تھی۔ اور آج تو حالت اتنی ابتر تھی کہ فرہاد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے وہ شام کو گھر واپس پہنچا تو منہا کو بستر میں پتے پایا اور پھر فوراً تقی کے کلینک سے جا کر تقی کو گھر لے آیا۔ تقی شہر سے واپسی پر ابھی کلینک پہنچا ہی تھا جب فرہاد بولا یا سا کلینک پہنچا اور منہا کی طبیعت کے بارے میں آگاہ کیا۔

تقی اب آہستگی سے چلتا ہوا پلنگ کے پاس آیا جہاں منہا آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ جھک کر اس کی کلائی تھامی اور ایک ہاتھ اس کی جلتی پیشانی پر دھردیا۔ منہا نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور تقی کو خود پر جھکا دیکھا۔

”بھائی۔۔۔۔“

نخیف سی آواز اتنی مدھم تھی کہ بمشکل تقی کو سنائی دی، تقی اب اس کی نبض تھامے کھڑا تھا۔ اور وہ لبوں پر زبان پھیر کر فرہاد کی طرف دیکھ رہی تھی جو تقی کے بالکل برابر میں پریشان حال کھڑا تھا۔ تقی نے جھک کر منہا کی آنکھوں کے پوٹے اوپر کو اٹھاتے ہوئے آنکھوں کا معائیٰ نہ کیا پھر سیدھا ہوا اور فرہاد کی طرف رخ کیا۔

”فرہاد صبح تم اور منہا میرے ساتھ چلو شہر، مجھے منہا کے ٹیسٹ کروانے ہیں اور ایک دفعہ ڈاکٹر تسنیم سے بھی رابطہ کر لیتے ہیں“

تقی نے سنجیدگی سے فرہاد کو ہدایت دیں، یہ اچھا موقع تھا فرہاد سے وہ ساری باتیں کرنا کا بھی جو اس دن ڈاکٹر تسنیم نے کہی تھیں، وہ بلقیس کے سمجھانے پر چپ سادھ گیا تھا پر آج منہا کی یہ حالت اسے پھر سے تشویش میں مبتلا کر چکی تھی، فرہاد نے تقی کی بات پر اثبات میں سر کو جنبش دی

”بھائی کچھ نہیں ہوا مجھے، ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہلکا پھلکا بخار ہو گا تمہیں“

منہا نے آہستگی سے تقی کی طرف دیکھ کر کہا

”یہ ہلکا سا بخار نہیں ہے منہا بہت تیز بخار ہے“

تقی نے پلٹ کر خفگی سے گھورتے ہوئے اسے جواب دیا

”ہاں تقی ٹھیک کہہ رہا ہے اور تقی مجھے اس کی شکایت بھی کرنی ہے تم سے، یہ ڈاکٹر نی کی دی ہوئی دوا بھی ٹھیک سے نہیں لے رہی ہے“

فرہاد نے خفگی سے ایک نگاہ منہا پر ڈالی اور پھر تقی کی طرف دیکھ کر شکوہ کیا

”منہا کیوں تنگ کر رہی ہو اتنا“

تقی نے لب بھینچے منہا کو گھور کر دیکھا جواب غصے سے فرہاد کو دیکھ رہی تھی۔

”بھائی ان کو کیا پتا، آپ دیکھ لیں یہ پڑی ہے سنگھار میز پر دوا ہر روز کھاتی ہوں“

منہانے روہانے لہجے میں فرہاد کی بات کی تردید کی، تقی نے پریشان سی نگاہیں اس پر گاڑیں۔
”اچھا چلو اٹھو اب یہ بخار کی میڈیسن کھاؤ پہلے“

تقی ایک طرف رکھے بیگ کی طرف بڑھا بیگ کو کھولا اس میں سے گولیاں نکال کر منہا کے پاس آیا فرہاد جگ سے پانی گلاس میں انڈیل رہا تھا۔ اور پھر پانی کا گلاس منہا کی طرف بڑھایا۔
تقی نے گلاس خود تھام لیا اور ہتھیلی منہا کے آگے کی جس میں چھوٹی سی گولائی میں سفید رنگ کی گولیاں پڑی تھیں۔
منہانے بیزار سی شکل بنائی اور پھر تقی کے غصے کو بھانپتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ تقی کے ہاتھ سے ایک ساتھ دونوں گولیاں اٹھا کر منہ میں رکھیں اور پانی کا گلاس پکڑ کر منہ کو لگایا۔
”فرہاد صبح میرے ساتھ ہی نکلو گے تم دونوں؟“

تقی نے پیشانی پر انگلیاں رکھے دھیرے سے پیشانی مسلتے ہوئے پاس کھڑے فرہاد سے سوال کیا، فرہاد نے جواب کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ منہا کے بولنے پر چپ ہو گیا
”بھائی ابھی نہیں جانا مجھے، اگر کل تک بخار نہیں اترتا تو چلے جائیں گے، مجھے ہسپتال سے کوفت ہوتی ہے گھٹن سی“

منہا کے لہجہ بیزاریت اور نقاہت لیے ہوئے تھا
”تقی تم چلے جانا میں اسے لے آؤں گا صبح تمہیں وقت پر نکلنا ہے میں بہادر کے ساتھ گھرا کی گاڑی پر لے آؤں گا اسے“

فرہاد نے تقی کے کاندھے پر تسلی سے ہاتھ رکھے منہا کی بات کی لا پرواہی سے نفی کی جواب شکوہ آمیز نگاہیں فرہاد پر گاڑے بیٹھی تھی۔ تقی نے گہری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور بیگ اٹھا کر کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”فرہاد آپ بھی حد کرتے ہیں اتنے سے بخار کو ہوا ہی بنا لیا، بھائی کو پریشان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی آخر؟“
منہا نے جھنجلا کر شکوہ کیا، فرہاد جو تقی کو باہر نکلتا دیکھ رہا تھا بھنویں اچکا کر منہا کی طرف متوجہ ہوا جو ماتھے پر بل ڈالے اسے غصے سے گھور رہی تھی۔

”پیارے۔۔ بیگم تمہارے لیے یہ معمولی بخار ہو گا لیکن تم کیا جانو تمہیں اس حالت میں دیکھ کر اس دیوانے کے دل پر کیا گزرتی ہے“

فرہاد محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا پلنگ کی طرف آیا جہاں وہ اب منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

”فرہاد آپ کا کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔“

منہا نے آہستگی سے تاسف میں سر ہلایا جب کہ وہ اب محبت سے مسکراتا ہوا اسے لیٹنے میں مدد دے رہا تھا۔

فرہاد اور منہا کے کمرے سے نکل کر تقی سیدھا، تخت کی طرف آیا تھا جہاں خدیجہ بیگم گاؤ تکیے سے پشت ٹکائے تسبیح کر رہی تھیں، ایک طرف اریب سپاری کاٹ کر پان کا مصالہ تیار کر رہی تھی اور تخت سے کچھ دوری پر سکینہ اور تارے بوا د ستر خوان بچھا رہی تھیں۔

”اسلام علیکم بی بی۔۔۔“

تقی نے خدیجہ بیگم کے پاس بیٹھتے ہی سر نیچے جھکایا جس پر خدیجہ بیگم نے ہاتھ رکھتے ساتھ ہی اس کے چہرے پر اپنا چہرہ گول گھماتے ہوئے پھونک ماری۔ تقی نے چہرہ موڑا، آنکھیں سکڑ کر سامنے صحن میں تقی کو دیکھا جو دیوار پر گیند مارتا اور اچھلتی گیند کو ہاتھ میں تھام رہا تھا اور پاس کھڑا مبین اس کی اس سرگرمی کو بغور دیکھ رہا تھا، دونوں بچے اب کچھ کچھ بہتر ہو گئے تھے، باورچی خانے کے قریب غزالہ اور بلقیس ہانڈی کو چولہے سے اتار رہی تھیں۔

”جیتارہ۔۔۔ لال۔۔۔ کیا ہوا منہا کو“

خدیجہ بیگم نے گاؤ تکیے کا سہارا چھوڑ کر اوپر ہوتے ہوئے پوچھا۔ تقی نے شرٹ کے کف بٹن کھولتے ہوئے آبرؤ چڑھائے

”بی جی بخار ہے دوا دے کر آیا ہوں، فرہاد سے کہا ہے صبح شہر لے آئے اسے“
تقی نے مگن سے انداز میں، سنجیدگی سے جواب دیا، پاس بیٹھی اریب کی تیوری ایک سو اسی کی رفتار سے چڑھی۔
”تاپ تو چڑھے گا ہی بات تو کسی کی مانتی نہیں ہے میں نے کہا تھا کاڑھاپی روز، پر مجال ہے اس لڑکی کے کان پر جوں تک رینگے ہو“

اریب نے نخوت سے شکوہ کیا، منیر میاں کے معافی مانگنے کے بعد سے اریب اب کافی سنبھل گئی تھی، تقی نے پیشانی پر ہلکے شکن ڈالے اریب کی طرف دیکھا جن کے الفاظ سے اس کے اعصاب ایک دم سے تن گئے۔
”پھپھو یہ کاڑھے، کوڑھوں سے کچھ نہیں ہو گا، میں اس کے ٹیسٹ کرواؤں گا سارے“
تقی نے لب بھینچے تیکھے لہجے میں جواب دیا، بلقیس کے دسترخوان پر ٹرے رکھتے ہاتھ لمحہ بھر کو تھمے اور گھور کر تقی کی طرف دیکھا۔

”بیٹا۔۔۔۔۔ بے شک تو بہت بڑا ڈاکٹر بن گیا پر ہم نے بھی بال دھوپ میں سفید نہیں کیے، کیوں اماں؟؟ تو بتا،
کاڑھا کیسا مفید ہے اس حالت میں اور اجوائی ان کا پانی“
اریب نے ناک سکیڑے غصے سے ایک نظر تقی کو دیکھا اور پھر خدیجہ بیگم کی طرف دیکھا جو اس کی بات کی تائید پر سر ہلا رہی تھیں۔

تقی نے ضبط سے لب بھینچ کر پلکیں جھکائی اور ایک دم سے تخت سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ایک ہاتھ میں بیگ تھامے کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے سامنے پلنگ پر لیٹی مالا پر نگاہ پڑی، وہ گہری

نیند سورہی تھی۔ کروٹ لیے دونوں ہتھیلوں کے اوپر گال دھرے سوتی ہوئی وہ اسے ٹھنڈک جیسا احساس دے گئی، پنکھے کی تیز ہوا سے بالوں کی لٹیں بار بار اس کے گداز گالوں کو چھو رہی تھیں۔

مالا کے دلفربندہ چہرے کو دیکھتے ہی اس کے تنے ہوئے اعصاب پر سکون ہو گئے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا پلنگ تک آیا اور اس کے پاس بیٹھ کر نرم سی نگاہ اس کے چہرے پر جمادی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور باہر برانڈے سے کھانا لگ گیا کہ صدائیں ابھرنے لگیں۔

”مالا۔۔۔ اٹھو آج یہ کس وقت سورہی ہو؟“

تقی نے آہستگی سے اس کی گال پر ہاتھ رکھ کر اس کو تھپ تھپایا، اُس نے کسلمندی سے سوزش زدہ پوٹے اٹھائے، جیسی ہی نیلی پتلیوں والی آنکھیں وا ہوئی یں، سامنے کے منظر پر ٹھٹھک کر منجمد ہوئی یں، تقی دلفرب مسکراہٹ سجائے اس کے اوپر جھکا اسے اٹھنے کا کہہ رہا تھا۔

تقی کا چہرہ کتنا خوبو تھا، سیاہ روشن آنکھیں، گھنی بھنویں جن کی بناوٹ اس کی آنکھوں کی لمبائی میں اضافہ کرتی تھی، کشادہ پیشانی پر ہر وقت گرے سیدھے سیاہ بالوں کی چند لٹیں، کھڑی سی رعب دار ناک کوئی شک نہیں تھا اس بات پر کہ وہ خوبصورت مردوں میں شمار ہوتا تھا پر بعض اوقات خوبصورت چہروں کے پیچھے کیسے بھیانک روپ چھپے ہوتے ہیں، مالا کا دماغ اس کے چہرے کے پیچھے چھپے بھیانک چہرے کو سوچ رہا تھا۔ اور وہ محبت سے اسے دیکھ کر سارے دن کی تھکن کو اتار رہا تھا جس نے اس کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دیے تھے۔

خبر ہی نا ہوئی کب وہ اس چھوٹی سی لڑکی کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرنے لگا، دن بھر کی مصروفیت میں بھی جب کبھی وہ یاد آتی لبوں پر میٹھی سی مسکان اور دل میں گد گدی جیسی لہر دوڑ جاتی۔ سچ تو یہ تھا اس کے دل میں یہ شدید محبت پیدا کرنے میں زیادہ ہاتھ مالا کا ہی تھا وہ جس طرح اس کی فکر میں رہتی تھی اور محبت کرتی تھی تقی کا دل زیادہ عرصہ اس سے لا پرواہی نابت سکا۔

”کیا ہوا۔۔؟ کل رات سے دیکھ رہا ہوں مجھے بس دیکھے ہی جا رہی ہو، کچھ کہنا ہے کیا؟“

تقی نے اچانک اس کے دیکھنے کے انداز کو بھانپ کر سوال کر دیا، وہ جو کل رات سے ہی الجھی ہوئی تھی، اس کے یوں بھانپ لینے اور ذہانت پر گڑ بڑا گئی۔

”کچھ نہیں۔۔۔“

آہستگی سے جواب دیتے ہوئے اس کی سوالیہ نظروں سے نظریں چرائی یں اور پھر ہاتھوں کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی، کیا بتاتی وہ کل رات سے اسے اپنے من کا میت نہیں اپنی بڑی بہن کا قتل سمجھ کر سوچ رہی ہے۔

”آج میرے آنے سے پہلے تیار بھی نہیں ہوئی طبیعت ٹھیک ہے نا“

تقی نے اس کے بے سرو پا حلیے کو جانچتے ہوئے سوال کیا اور پھر اس کے ماتھے پر ہاتھ دھر دیا۔ مالا کسمساگئی، اسی لمحے پردہ سر کا اور ارحمہ جھٹ سے کمرے میں ننگے پاؤں تھپ تھپ مارتی داخل ہوئی، تقی فوراً سے ہاتھ ہٹا کر پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا

”تقی، بھائی، آپا۔۔۔ آجاؤ کھانا لگ گیا ہے، داجی بلارہے ہیں سب کو“

ارحمہ نے تیزی سے کہا اور پھر اسی رفتار سے باہر بھی نکل گئی جس رفتار سے اندر داخل ہوئی تھی۔

”چلو میرے کپڑے نکال دو، تم چلو میں بس کپڑے بدل کر آیا“

تقی نے میز کے پاس رکھی کرسی کو کھسکا کر بیٹھتے ہوئے حکم صادر کیا اور جوتے اتارنے کی غرض سے جھک گیا اور وہ اسی طرح بے تاثر چہرہ لیے اٹھ کر کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گئی۔

حاکم قصر میں رات کے گھپ اندھیرے کو بس صحن میں جلتے بلب کی روشنی چیر رہی تھی، قندیل بچاری یو نہی مٹی اور تیل سی اٹی اب فوارے پر لٹکتی رہتی تھی جس کو بس بتی جانے کے بعد ہی روشن کیا جاتا تھا، رات کی اس خاموشی

کانپتے ہاتھوں نے اب چاندی چٹچ کو اٹھایا اور چاندی رنگ چٹچ تانبے کے بڑے گلاس میں موجود سفید دودھ کے اندر آہستہ آہستہ گھومنے لگا، چٹچ گلاس کی دیواروں سے ٹکرا کر ٹن ٹن کی آواز پیدا کر رہا تھا جو باورچی خانے کی خاموشی میں جھینگوں کی جھیں جھیں کے ساتھ مل کر ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

گلاس میں چٹچ چلانے والے ہاتھ دودھ میں ڈالے گئے سفوف کو کچھ اس طرح سے گھول رہے تھے کہ سفوف کے ذرات دکھنا بند ہو جائیے۔

ٹُن۔۔۔نُن۔۔۔ن۔ن۔ن۔ٹُن۔ن۔ن۔۔۔۔۔

* * * * *

مالا نے صحن میں اُٹھتے شور پر قدم باہر نکالے تو صحن پہلے ہی تمام مکینوں سے بھرا پڑا تھا اور صحن کے وسط میں دنگل ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ سہم کر کھڑے تھے، کچھ چیخ چیخ کر نامارنے کا صدا ئیں بلند کر رہے تھے۔

پورے صحن میں نفی کے بلکنے کی آوازیں تھیں اور نفی کے جھانپڑ کی جو وہ اس کی پشت پر رسید کر رہا تھا وہ آٹھویں جماعت میں دوسری دفعہ فیل ہوا تھا۔ اور نفی تو جیسے اس پر برس پڑا۔

”بھائی۔۔۔۔۔ بھائی۔۔۔۔۔ معاف کر دو“

نقی اپنا بازو اٹھائے اس کی مار سے بچنے کی کوشش میں بے حال تھا پر نقی تو جیسے ہوش و حواس کھوئے ہوا تھا۔ ناکسی کی سن رہا تھا نقی کو چھوڑ رہا تھا، ستون کے پاس کھڑی مالا کا چہرہ ایک دم سے ذہن میں ابھرتے خیال کے باعث لٹھے کی طرح سفید پڑا وہ گہرے سانس اندر باہر اندھیلیتی کمرے میں آئی۔

ذہن سو کی رفتار پر سوچ کی پھر کی گھمانے لگا، نقی نے کہیں رونا آپا کو بھی پڑھنے سے انکار پر چھت سے دھکا تو نہیں دے دیا تھا، نقی پڑھائی کے لیے جنونی ہے دل تیزی سے خوف میں دھڑکنے لگا سارے منظر آنکھ کے پردے پر --- گھومنے لگے

کیوں؟ --- کیوں؟ --- کیوں؟ کا سوال جو تین دن سے دماغ کی نسیں دکھانے لگا تھا اس کو ایک جواب اب کچھ بہتر لگنے لگا، نقی کہیں رونا آپا پر غصہ ہو رہا ہو گا اور دھکا۔۔۔
ماتھے پر پسینہ آنے لگا، کانپتے ہاتھوں سے پسینہ صاف کیا اور پلنگ پر بیٹھ کر تکیے کو گود میں رکھ لیا۔

تیز دھوپ، جمعہ کی نماز کے بعد حاکم قصر کے تمام مکین اپنے اپنے کمروں میں سستانے کو لیٹ چکے تھے، بس تخت سے پاس ایک کمرے میں سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔
سفید ململ کے پردے کے بالکل پیچھے، کمرے میں فرش پر نیا چمچا تا پلنگ، اور ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا جدید طرز کا ابھرے سے پھول اور نقش و نگار والا گہرے بھورے رنگ کا سنگھار میز کمرے کو خوبصورتی بخش رہا تھا، نقی کہنیوں تک قمیض کی آستین چڑھائے پلنگ کو دیوار کے ساتھ لگا رہا تھا۔

سفید رنگ کی قمیض پر جگہ جگہ مٹی کے نشان تھے، لڈن اور بہادر کمرے تک تو فرنیچر چھوڑ گئے تھے مگر باقی ساری ترتیب اس نے اکیلے ہی دی تھی اسی لیے پیشانی پر پسینے کے ننھے قطرے پٹکھے کی ہوا میں بھی نمودار تھے

غزالہ کے بھائی یوں نے مالا کے لیے داج کا کچھ سامان بھیجا تھا جو اب چار ماہ بعد کمرے کی زینت بن رہا تھا اور مالا جس نے پتا نہیں اس لمحے کا دن گن گن کر انتظار کیا تھا اب اس خوشی کی متلاشی تھی جو اس لمحے اسے خود سے زبردستی کرنے پر بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تقی ہاتھ جھاڑ کر مسکراتا ہوا مالا کے پاس آیا۔

تقی نے ہنستے ہوئے ایک نگاہ پلنگ کی طرف اور پھر اس کی طرف دیکھا جو مضطرب سی کھڑی تھی اور اب تقی کی بات پر چونکی۔

مختصر جواب، مدہم سی حلق سے آواز برآمد ہوئی، تقی نے پیشانی پر بل ڈالے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔

اس کو کیا ہو گیا تھا ایک ہفتے سے وہ تھک چکا تھا اس سے پوچھ پوچھ کر پر وہ ڈھیٹ تھی کوئی جواب نہیں دے رہی تھی بس ٹال مٹو، مالا کے اس رویے کو وہ جانچ رہا تھا، گم صم، پریشان، اس سے دوری بناتی مالا ایک ہفتے پہلے والی مالا سے یکسر مختلف تھی۔

کنپٹی کی رگیں ابھریں اور پھر تقی نے ایک دم سے اس کا بازو کھینچ کر اسے پلنگ پر بیٹھایا۔
 ”بتاؤ مجھے مسئی لہ کیا ہے ایک ہفتے سے تمہیں“
 تقی نے غصے سے اونچی رعب دار آواز میں پوچھا

مالا تقی کے یوں چیخنے پر گھبرا گئی، ایک ہفتے میں ایک ہی خواب کو سوچ سوچ کر ذہنی بیمار کی سی کیفیت میں مبتلا ہو چکی تھی، غزالہ سے دل کا بوجھ ہلکا کرنے جاتی تو وہ اس سب کو اس کے دماغ کا خلل اور خود سے گھڑی کہانی کہہ کر چپ رہنے کا حکم صادر کر دیتی۔

تقی تیوری چڑھائے کچھ یوں کھڑا تھا کہ کپٹی کی رگیں تن کر باہر کو ابھر رہی تھیں تو لبوں کے نیچے دانت غصے سے پیوست تھے۔ مالا سر جھکائے کانپ اٹھی اس کو ضبط کی آخری سیڑھی پر لا کھڑا کرنے والی وہ خود ہی تو تھی، تقی تو ایک ہفتہ سے بڑی محبت و اپنائیت کے ساتھ اس سے گم صم رہنے کا سبب دریافت کر رہا تھا جس کا جواب وہ چاہ کر بھی نہیں دے پار ہی تھی اور اس کا نتیجہ کچھ یوں نکلا کہ وہ تقی کے خلاف اپنے ذہن میں کتنے ہی خیال اور دل میں کتنے ہی وسوسے پال چکی تھی۔

”مالا۔۔۔۔۔ تم مجھے غصہ دلارہی ہو“

مالا کی ہنوز خاموشی کے باعث وہ جھنجھلا کر گویا ہوا، دو قدم کا فاصلہ عبور کیا اور پلنگ پر اس کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھ گیا جو سر جھکائے اپنی ہتھیلیوں پر نگاہیں ٹکائے ہوئی تھی۔

”تم کس بات کو لے کر پریشان رہنے لگی ہو؟ کیا مجھ سے کوئی شکایت ہے تمہیں؟؟؟“

اگلا سوال کیے وہ پھر سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں تاہنوز اضطرابی کیفیت رقم تھی۔

”بولو بھی اب مالا، کیا ہوا ہے تمہیں؟“

تقی نے اس کے گھٹنے پر دھرے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا تھا، دوسرے ہاتھ سے اسکی ٹھوڑی کو تھام کر چہرہ اپنی طرف گھمایا، وہ پلکیں گرائے ہوئی تھی پر چہرہ کرب کی عکاسی کر رہا تھا۔ حلقے واضح تھے، زرد رنگت، گلاب کی طرح کھلا چہرہ آج مرجھایا ہوا تھا اور پھر مالا کی پلکیں کپکپائی یں اور لب واہوئے

”کچھ۔۔۔ نہیں ہوا بس طبیعت ٹھیک۔۔۔“

مالا نے وہی جواب دہرایا جسے وہ اتنے دن سے سن سن کر اکتا چکا تھا اور اب پھر سے اس کے بے تاثر لہجے سے کہے گئے اس جملے نے تقی کے اعصاب شل کر دیے۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا چہرہ چھوڑنے کدھوں سے تھام کر اسے اپنی طرف گھمایا۔

”ہوا ہے کچھ۔۔۔۔۔ پاگل سمجھ رکھا ہے اس دن سے پوچھ رہا ہوں ہر بات کرتی ہو مجھ سے اب کیا ایسا ہے جو مجھے بتا تک نہیں رہی تم“

تقی نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، وہ خوف سے آنکھیں کھولے اب تقی کی طرف دیکھ رہی تھی، تقی کا غصہ جہاں خوف کو بڑھا رہا گیا تھا، وہاں ذہن میں ایک اُبال سا چڑھنے لگا۔ ایک عجیب سی ہمت جسے وہ سمیٹ کر یکتا کر رہی تھی۔ اور پھر وہ پھٹ پڑی کہ تقی بھوچک گیا

”ر منا آپا کو کیوں دھکا دیا تھا چھت سے۔۔۔۔۔؟“

وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھایاں بھینچے پلنگ سے اٹھ کر چیخ اٹھی، اور وہ ہونق بنا اس کی بات سے زیادہ اس کے انداز پر شذر تھا۔

”آپ نے میری ر منا آپا کو چھت سے دھکا دیا تھا وہ گری نہیں تھی“

مالا نے چیخ کر انگلی کا اشارہ تقی کی طرف کیا جواب اس کے انداز سے اس کے کہے گئے جملے پر الجھ گیا تھا۔

”کیا؟۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ کو اس کر رہی ہو؟ دماغ ٹھیک ہے“

تقی نے حیرت میں غرق لہجے میں پوچھا، آواز متوش ہونے کی وجہ سے بہت پھسکی تھی، آڑی تر چھی ہوتی بھنوں کے نیچے سیاہ آنکھیں پوری کھلی تھیں، ابھی تک اس کے انداز کی حیرت ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس کے جملے پر وہ الجھسا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بکواس نہیں کر رہی ہوں سب جان گئی ہوں میں، اللہ تعالیٰ نے سب بتا دیا مجھے کہ مجھے وہ خواب کیوں آتے تھے“

مالا آنسو سے رندھائی بھاری آواز میں ہاتھ کھڑا کیے کہتی ہوئی پلٹی اور پھر تیز تیز چار قدم اٹھاتی لکڑی کی دیوار میں نصب الماری تک پہنچی، جھٹکے سے الماری کا پٹ کھولا اور قمیض کو مٹھی میں دبوچ کر پلٹی، تقی کے سامنے جا کر ایک جھٹکے سے قمیض کو کھولا

”یہ آپکی کی قمیض ہے؟“

تن کر سوال کیا، اب سب بول ہی دیا تھا تو ہمت بھی تو دکھانی تھی، آخر کو تقی ہے بتا سکتا تھا کہ رونا آپا کی روح کو سکون کیوں نہیں اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی، وہ کیوں مالا ہی کو تقی کی سچائی سے آگاہ کر رہی ہے، تقی نے قمیض پر نگاہ جمائی اور آنکھیں سیڑ کر تیوری چڑھائی

”پہچانیں یہ وہ قمیض ہے جو فرزانہ آپا نے آپ کو ان کی شادی سے پہلے کاڑھ کر تحفہ میں دی تھی“

مالا نے قمیض کو ہاتھ میں پکڑے ہوا میں جھلایا تقی نے اسی طرح متحیر انداز میں ہاتھ بڑھا کر قمیض کو تھاما بغور قمیض کو دیکھتے ہوئے اس کی پھٹی جیب کو اٹھا کر سیدھا کیا۔

فرزانہ کا نام لینے پر اسے قمیض تو یاد آگئی تھی ساتھ ہی گزرالمحہ بھی آنکھوں کے پردوں پر ایک فلم کی صورت چلنے لگا۔ فرزانہ اسی کمرے اس کے سامنے کرسی پر براجمان تھی اور وہ قمیض کو ہاتھ میں تھامے میز سے کہنی ٹکائے دوسری کرسی پر ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

”تقی۔۔ یہ قمیض میری شادی پر پہننا اچھا، میرے ویرکارنگ گورا ہے بچ جائے گی“

فرزانہ نے اس کے ہاتھ میں پکڑی قمیض پر نگاہ جمائے، چمکتے ہوئے فرمائی ش کی تھی، تقی نے قمیض کو ایک نظر دیکھا سر اٹھایا

”آپا اس کارنگ تو دیکھو، پتا تو ہے میں کہاں ایسے لڑکیوں کے جیسے رنگ پہنتا ہوں“
تقی نے خفیف سے ہنسی کے ساتھ قمیض کو دیکھتے ہوئے جواب دیا، فرزانہ نے خفگی سے پیشانی پر شکن ڈالے اسے
گھورا تھا جس نے اس کا دل ہی توڑ دیا تھا۔

”کیا برائی ہے اس رنگ میں، ہلکا سا تو ہے اور تجھ پر تو ہر رنگ کھل جاتا ہے جھلے“
فرزانہ اپنے مخصوص انداز میں اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی۔ جبکہ تقی اب بھی قمیض کے رنگ کو لے
کر گردن کھجڑا ہوا تھا۔

”چل میں جاتی ہوں۔۔۔ پہن لیجیو میرا ویر۔۔۔“

فرزانہ جھٹ سے کچھ یاد آ جانے پر اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور پھر باہر نکل گئی تھی، کمرے کے کواڑ کے آگے
لٹکتا پردہ تقی کے کی یاد کو معدوم کر گیا اور حال میں آتے ہی اس نے مالا کی طرف دیکھتے ہوئے مضطرب سے لہجے
میں جواب دیا۔

”ہاں یہ میری قمیض ہے پر۔۔۔؟“

تقی نے بھنویں سکڑے پریشان سے لہجے میں بات شروع کی کہ وہ تپاک سے دو قدم آگے بڑھ کر اس کی بات کو
کاٹ گئی

”ہاں یہ جانتی ہوں میں بھی آپ کی قمیض ہے، آپ نے اس دن ویسے کے روزیہ پہنی تھی، آپ نے کیوں دیا تھا
اس دن میری آپا کو دھکا، ان کی روح کو اک پل سکون نہیں ہے“

مالا چیخ کر پوچھ رہی تھی یوں جیسے ایک ہفتے سے ذہن میں ابلتا لاوا اب پھٹ کر بہہ رہا ہو، تقی نے سرا سیمگی کی حالت
میں مالا کی طرف دیکھا، رمنا کو دھکا یہ سب کیا کہہ رہی تھی وہ حیرت تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی

دماغ ابھی تک کسی بات کو سہی سے ناتو سمجھ پارہا تھا اور نا ہی قبول کر رہا تھا اس وقت تو اسے اپنے سامنے کھڑی مالا پاگل لگ رہی تھی۔

”مالا کیا بولے جارہی ہو؟ کیا ر منا آ پا کو دھکا یہ قمیض میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تمہیں ہو کیا گیا ہے؟“
تقی نے قمیض کو ہاتھ میں پکڑے حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثر سے اس کی طرف دیکھا جو کسی خونخوار چڑیل کی طرح تیز تیز سانس اندر باہر اندھیلیتی اس پر پھٹ پڑی تھی۔

”اگر یہ قمیض آپ کی ہے آپ کو یہ یاد آچکا ہے تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ر منا آ پا کو چھت سے دھکا آپ نے دیا تھا اور اس قمیض کی یہ جیب اور یہ بٹن“

مالا نے ہتھیلی کو کھول کر تقی کے سامنے بٹن کیا وہ اسی طرح ہکا بکا سے دیکھے جارہا تھا جو پتا نہیں کیا کہ جارہی تھی۔
”یہ بٹن میں نے۔۔۔ میں نے خود اٹھایا تھا آپ کی ہتھیلی سے جب وہ چھت سے نیچے گری تھیں۔۔۔ یہ بٹن اسی قمیض کے کف سے ٹوٹ کر ان کے ہاتھ میں رہ گیا تھا“

وہ بول رہی تھی اور تقی متحوش کھڑا اسے سن رہا تھا وہ مسلسل اسے شروع سے آخر تک کی داستاں سنارہی تھی انداز ایسا تھا جیسے صدیوں سے کسی قیدی کو رہائی ملی ہو۔ وہ آخری رات کا خواب سنائے اب پھٹی آنکھوں سے تقی کو تاک رہی تھی جو حیرت کا مرقع بنا مجسم کھڑا تھا۔ ماضی کے لمحے پھر سے ذہن کی گہرائیوں سے اوپر کو ابھر رہے تھے۔
ر منا گہرائی سی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”تقی۔۔۔ سنو۔۔۔“

”ہاں کیا ہوا ایسے کیوں گہرائی ہوئی ہو بولو“

تقی نے بالوں میں کنگھی چلاتے ہوئے مصروف لہجے میں پوچھا، وہ کمرے میں لگے آئی نے کے سامنے کھڑا تھا۔
”تقی تم سے بات کرنی ہے بہت ضروری ہے“

ر منا اضطراب کی کیفیت میں دونوں ہتھیلیوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے کھڑی تھی۔
”ہاں تو کرو“

تقی نے کھڑی کو پاؤں میں پہنتے ہوئے پوچھا

”نہیں وہ بات یوں یہاں کرنے والی نہیں ہے، آس پاس اتنے مہمان ہیں، میں چھت پر جا رہی ہوں تم اوپر آ جانا
کچھ دیر میں۔۔۔ میں انتظار کر رہی ہوں تمہارا“

ر منانے الجھے سے لہجے میں اسے اوپر آنے کا کہا، تقی نے اس ساری بات چیت کی دوران پہلی دفعہ سراٹھا کر اس کی
طرف دیکھا وہ واقعی پریشان لگ رہی تھی۔ ہلکے سے گلابی جوڑے میں اسکی دودھیار نگت زرد سی لگ رہی تھی۔
”تقی۔۔۔۔۔ بات سننا ذرا کی ذرا“

باہر سے زیب کی آواز ابھری جو شائ دپھر سے کسی کام کے لیے تقی کو پکار رہی تھی۔
”ایک تو یہ زیب پھپھو۔۔۔“

تقی نے جھنجلا کر کہا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے جواب کے انتظار میں کھڑی ر منا کی طرف دیکھا
”تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔۔ اور جہاں تک مجھے شک ہے تو میں جانتا ہوں تم کیا کہنے والی ہو“

تقی نے آبرو چڑھائے افسردہ سی مسکراہٹ سجائی
”نہیں تقی۔۔ تمہیں نہیں معلوم مجھے کیا بات کرنی ہے، میں پریشان ہوں“
ر منانے زرد چہرے کا ساتھ التجا کی،

کوڑ دھاڑ سا بجا اور زیب پھپھو غصے سے منہ پھلائے کمرے میں داخل ہوئی یں
”تقی سن لے آکربات کتنی منتیں کروائے گا، تیرے اسلم پھپھا بلار ہے ہیں“

ر منانگا ہیں جھکائے کمرے سے باہر نکل گئی تھی، تقی نے زیب پھپھو کی طرف دیکھا جو ماتھے پر بل ڈالے اب غصیلی سے نگاہ سے ہلتا پردہ دیکھ رہی تھیں۔

”جی پھپھو چلیں میں تیار ہوں بلکل“

تقی نے زیب کو کہا جواب اس کی طرف گردن موڑ چکی تھیں۔

”ہاں جاؤ وہ فرہاد کے کمرے میں تیار ہو رہے ہیں کوئی کام ہے شئی د“

زید نے ہاتھ کے اشارے سے اسے فرہاد کے کمرے کی طرف جانے کا کہا، تقی سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا باہر کی گہما گہمی سے نکلتا وہ فرہاد کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ سامنے ہی اسلم سفید کاٹن کے کلف لگے قمیض شلوار میں اکڑا کھڑا گیلے بالوں میں کنگھی پھیر رہا تھا۔

”جی پھپھا آپ نے بلایا تھا“

تقی نے سوالیہ نگاہیں سامنے کھڑے اسلم پر ڈال کر پوچھا، اسلم کی حشیت حویلی میں کچھ ایسی ہی تھی اسے ایک الگ ہی اہمیت دی جاتی تھی۔

”ہاں تقی۔۔۔ ادھر آؤ یا یہ چابی لے اور بھاگ کر جیپ کی ڈگی سے میری کھیڑی نکال لا، سب نے وہ پہنی ہے میں بھی کھسے کے بجائے وہی پہنتا ہوں“

اسلم نے عجلت میں کہتے ہوئے جیپ کی چابی تقی کی طرف بڑھائی، زیب پھپھو کی طرح اسلم میاں کو بھی عادت تھی اپنے چھوٹے چھوٹے کام بھی دوسروں سے کروانے کے تقی نے چابی تھامی اور قدم حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھا دیے کیونکہ جیپ باہر سڑک پر بسوں کے پاس کھڑی تھی اور جب تک وہ جیپ کے پاس جا کر وہاں سے کھیڑی لے کر واپس لوٹا تھا۔

بھاگ آرہے تھے۔ تقی بھی پریشان سانا سمجھی میں ساتھ بھاگ پڑا تھا۔

سے حال میں واپس آیا اور اب بے یقینی سے مالا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”مالا۔۔۔ میں نے رمناکو کوئی دھکا نہیں دیا تھا، تم ایک خواب کی مینا پر کیا سے کیا سوچے بیٹھی ہو، مجھے حیرت ہو

رہی ہے یہ وہ بات ہے جو ایک ہفتے سے تمھاری اس حالت کا جواز بنی ہوئی تھی۔“

تقی نے متحیر لہجے میں کہا وہ ابھی بھی اچنبھے کی کیفیت میں اسے شاکی نگاہوں سے گھور رہا تھا یوں جیسے اس کی دماغی

حالت پر شبہ گزرے، مالانے چہرے پر سے ہاتھ نہیں ہٹائے تھے۔

”اور یہ قمیض جس کی تم بات کر رہی ہو یہ تو کبھی میں نے پہنی تک نہیں اور میں تو چھت پر گیا ہی نہیں تھا ہاں البتہ

“رہنا نے مجھے۔۔۔۔۔۔

تقی نے قمیض آگے کرتے ہوئے شکن آلودہ پیشانی سے اب مالا کی طرف دیکھا جو بے یقینی سے اسے تاک رہی تھی

اور پھر بات کرتے کرتے وہ مبہوت ہوا، رمنہ کی آواز دماغ کی دیواروں سے ٹکرائی

”نہیں تقی۔۔۔ تمہیں نہیں معلوم مجھے کیا بات کرنی ہے، میں پریشان ہوں“

وہ واقعی میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گیا، رمناکا یہی تو وہ ادھوری بات تھی جس نے اس کے گزر جانے کے بعد

اسے تکلیف میں مبتلا رکھا تھا، کہ وہ ایسا کیا کہنا چاہتی تھی مجھ سے کیا وہ اتنی پریشان تھی پڑھائی کو لے کر کہ وہ

چھت سے ہی گر گئی تھی۔ وہ اس کی اس ادھوری بات کو کہاں کہاں نہیں جوڑتا تھا پر تھک ہار کر کوئی سرا بھی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ پر آج مالا کی عجیب و غریب، ناقابل یقین باتوں نے اسے الجھا دیا تھا۔

”جھوٹ بول رہے ہیں آپ، قمیض آپ کی تھی، آپ کی الماری سے نکلی، آپ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ نے یہ پہنی نہیں تھی، اور کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا یہ جیب بھٹی یہ بٹن ٹوٹا ہوا“

مالا نے پاگلوں کی طرح اپنی بات کی وضاحت دی، وہ بدحواس سا اسے دیکھ رہا تھا، دماغ مفلوج ہو رہا تھا آخر کو سامنے بیٹھی مالا گیارہ سال بعد یہ سب کہانی اس طرح کھول کر کیوں بیٹھ گئی تھی، لیکن مالا کی حالت تشویش ناک تھی

”مالا۔۔۔۔۔ مجھے تو لگ رہا ہے یہ سب تم نے خود کیا ہے قمیض کے ساتھ، تم پاگل ہو گئی ہو یہ قمیض تو میں نے کبھی نہیں پہنی اس کی حالت ایسے کیسے ہو سکتی ہے“

تقی نے تاسف سے سر ہوا میں مارتے ہوئے پوچھا، مالا کی بات پر تو عقل یقین نہیں کر رہی تھی پر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ مالا جو کہانیاں پڑھتی رہتی ہے یہ سب ان کا اثر ہو، مالا امتحانات کے بعد پھر سے رسالے پڑھ رہی تھی اکثر رات کو جب تقی اپنا کام کرتا تھا تو وہ رسالے پڑھتی تھی جس سے تقی نے اسے اب کبھی منع نہیں کیا تھا، شائے دوہ یہ سب انہی کہانیوں کے دماغ خراب ہونے کی وجہ سے کر رہی ہو۔۔۔۔۔ وہ اب پریشان حال مالا کی طرف دیکھ رہا تھا

پر وہ جواب میں چیخ اٹھی

”میں کیوں کروں گی ایسا؟۔۔۔۔۔ میں نے نہیں کیا یہ۔۔۔۔۔ یہ قمیض اسی حالت میں مجھے ملی تھی

آ۔۔۔ آپ کی کتابوں کی الماری میں سے میں سچ کہہ رہی ہوں“

مالا نے غصے میں اپنی بات کی وضاحت دی، تقی ایک پل کے لیے خاموش ہوا پھر بغور قمیض کی طرف دیکھا، وہ جس طرح رو رہی تھی اور جس طرح خوابوں کا ذکر کر رہی تھی وہ الجھتا تھا پر عقل یہ سب ماننے سے انکاری تھی۔

اس نے یہ قمیض فرزانہ کی شادی پر کیا کبھی بھی نہیں پہنی تھی اور اس کے بعد تو یہ سوٹ ایسا غائب ہوا تھا کہ

کبھی ملا ہی نہیں اور اس نے کبھی توجہ نہیں دی کہ اس کے الماری کے ڈھیر کپڑوں میں سے یہ قمیض شلوار غائب ہے۔

”تم نے اس بات کا ذکر کسی اور سے کیا؟“

تقی نے بھنویں اچکا کر متواتر روتی ہوئی مالا سے پوچھا، یہ بات اتنی عجیب و غریب تھی کہ وہ کیا کوئی بھی مالا کی بات پر یقین نہیں کرتا

”اماں سے کیا پروہ بھی آپ کی طرح مجھ پر یقین نہیں کر رہی ہیں، مجھ پر کوئی بھی یقین نہیں کر رہا اللہ۔۔۔۔۔“

مالا روتے ہوئے ہی فرش پر بیٹھتی چلی گئی تھی اور سر کو پلنگ سے ٹکائے دھیرے دھیرے پھٹے دماغ کو پلنگ کے ساتھ مارنے لگی۔

تقی تاسف سے گہرا سانس لیتا ہوا اس کے بالکل سامنے گھٹنوں پر ہاتھ دھر کر بیٹھا، کچھ دیر اسے یوں پاگلوں کی طرح پلنگ میں سر مارتے ہوئے دیکھا پھر فکر مندی سے گویا ہوا۔

”مالا میری طرف دیکھو۔۔۔۔۔ سنو تم بات ہی بے تکی اور عجیب کر رہی ہو، کوئی مرا ہوا انسان بھلا کیوں آئے گا کسی کے خواب میں اور وہ بھی اتنے سال بعد وہ آکر تمہیں یہ بتائے کہ مجھے کسی نے چھت سے دھکا دیا تھا، اسے کسی نے دھکا نہیں دیا تھا وہ پریشان تھی پڑھنا نہیں چاہتی تھی آگے مجھے اس نے بات کرنے کے لیے اوپر بلایا تھا، وہ مجھ سے یہی کہنا چاہتی تھی کہ وہ پڑھنا نہیں چاہتی ہے“

تقی اسے ساری بات بتا رہا تھا کہ وہ اس بات پر چونک کر چیخ پڑی

”ہاں تو پھر آپ نے غصے میں آکر دھکا دے دیا ہو گا کیونکہ نا پڑھنے والوں سے تو آپ کو ویسے بھی نفرت ہے“

مالا گلا پھاڑ کر چیخی تھی اور وہ جو اس پیار سے سمجھا رہا تھا ایک دم سے اس کی بد تمیزی پر ٹھٹھک گیا۔

”تمہارا دماغ۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ کیا بکو اس پر بکو اس کیے جا رہی ہو“

تقی نے حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثر میں اس کی طرف دیکھا، مالا پوری آنکھیں کھولے ناک پھلائے ساری محبت سارے پیار کو بالائے طاق رکھے اسے گھور رہی تھی۔

”یہ بکو اس نہیں ہے میری زندگی عزاب ہو گئی ہے رونا آپا مجھے سونے نہیں دیتی ہے رات کو میں جب بھی آنکھیں بند کرتی ہوں وہ مجھے نظر آتی ہے روتی ہے، اور یہ بٹن اس نے میرا جینا حرام کر دیا ہے“
مالا نے بٹن ہتھیلی میں سے نکال کر ایک طرف فرش پر پھینک دیا اب کی بار تقی کچھ نابول سکا وہ فرش پر بیٹھی رو رہی تھی اور وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔

دل کہیں نا کہیں اگر اس کی بات پر یقین کر بھی رہا تھا تو عقل زور کا ایک چمٹ جڑ کر نفی کر رہی تھی، وہ الجھ کر رہ گیا
”مالا اٹھو ادھر آؤ“

تقی نے اسکا بازو تھاما، مالا نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑوایا
”مجھے ہاتھ مت لگائیے۔۔۔۔۔“

وہ تقی کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے کہہ رہی تھی
”مالا تمہیں میری بات پر یقین نہیں“

تقی نے وثوق سے پوچھا، وہ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ اور منہ پھیرے بیٹھی تھی۔

”تمہیں اپنے بے بنیاد خوابوں پر یقین ہے، اور یہ فیض میں نے آج تک یہ پہنی بھی نہیں یہ تو پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا“

تقی نے جھنجھلا کر پہلی دفعہ کسی کو یوں صفائی دی اور یہ سب اسے عجیب محسوس ہو رہا تھا وہ کس بے تکی بات کو لے کر مالا کو صفائی یاں دے رہا ہے

”کہیں نہیں گیا تھا یہ قمیض تقی آپ کی الماری میں پڑا تھا اور یہ خواب بے بینا نہیں ہیں کچھ ایسے خواب جو آپ کو بار بار آئیں وہ خدا کی طرف سے کوئی اشارہ ہوتے ہیں، اور مجھے یہ سب اللہ نے دکھایا ہے خواب میں“

مالا اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی، گردن اکڑائے اپنے سامنے بیٹھے تقی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔

”اور تمہاری کسی بات سے میں متفق نہیں، استخارہ کیا خواب میں حقیقت جاننے کو کیا جاتا ہے جتنی عقل ہے اور جتنا علم ہے تمہاری سوچ وہیں تک محدود ہے، استخارہ کا جواب تمہیں کس نے کہہ دیا کہ خواب میں آتا ہے، اب مجھے صبح سے بتاؤ کہاں سے لی یہ قمیض اور کیا سوچتی رہتی ہو“

تقی نے اپنے لہجے کو متوازن رکھتے ہوئے سوال کیا، وہ پتا نہیں کیا کچھ سوچ کر اور کن باتوں کو لے کر یہ سب کہانی بنائے بیٹھی تھی۔

”میں نے یہ کہانی خود سے نہیں گھڑی اور آپ مجھے چھوٹا سمجھنا بند کریں، میں ایک ایک لفظ سچ کہہ رہی ہوں“

مالا نے چیختے ہوئے اپنی بات پھر سے کہی، چند لمحے خاموشی رہی تقی قمیض کو الٹ پلٹ کرتا رہا اور پھر اپنی جگہ سے ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اٹاری کے پھول دار فرش پر پشاوری چپل پہنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ بلقیس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے شک مالا کو وہ بری طرح جھٹلایا آیا تھا، پر اس کے خود کے اندر ایک عجیب سا تجسس سر اٹھانے لگا تھا وہ چاہ کر بھی مالا کی بات کو نظر انداز نہیں کر پارہا تھا۔

بلقیس کے کمرے کا دورازہ کھلا تھا اور پردہ اندر چلتے پنکھے کی ہوا سے ہل رہا تھا، تقی نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کے پٹ پر دستک دی۔

”کون۔۔۔“

بلقیس کی الکساہٹ بھری آواز ابھری، تقی فوراً کمرے میں داخل ہوا بلقیس ایک پلنگ پر لیٹی تھی جبکہ دوسرے پلنگ پر مبین سو رہا تھا، تقی کو دیکھتے ہی بلقیس نے لبوں پر انگلی دھر کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”اماں باہر آئی میں مجھے آپ سے بات کرنی ہے“

تقی نے جھنجلا کر ان کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے حکم صادر کیا، بلقیس نے متعجب نگاہ اس کے پریشان سرخ چہرے پر ڈالی اور پھر اثبات میں سر ہلاتی پلنگ پر سے اپنا دوپٹہ اٹھا کر سیدھی ہوئی میں

تقی کے پیچھے قدم اٹھاتی بلقیس باہر آگئی تھی جہاں اب تقی دائیں ہاتھ میں ہلکے شربتی رنگ کے قمیض کو تھامے، برآمدے میں تخت کے قریب آکر کھڑا ہو چکا تھا۔

پیچھے ہی بلقیس بھی بدن داں اور نا سمجھی کے تاثرات لیے آکر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”اماں یہ قمیض۔۔۔ یاد ہے“

تقی نے قمیض بلقیس کے آگے کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا، بلقیس نے قمیض اس کے ہاتھ سے تھامی جو خوف اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات چہرے پر سجائے کھڑا تھا۔

”یہ۔۔۔۔“

بلقیس نے قمیض کی پرکھ کے لیے تیوری چڑھائی، تقی نے پریشانی سے ماتھے پر دو انگلیاں رکھے پیشانی سہلائی، مالا کے انداز اس کی باتوں کی وجہ سے دماغ میں ہتھوڑے چلنے جیسا احساس جاگ اٹھا تھا۔ بلقیس اب قمیض کھولے جانچ رہی تھی پر ان کی یادداشت شائی داب کمزور ہو رہی تھی، تقی نے تاسف سے کندھے گرائے۔

”اماں کیا دیکھے ہی جا رہی ہیں، یاد نہیں کیا آپ کو یہ وہی قمیض ہے جو فرزانہ آپا نے دی تھی مجھے اور کہا تھا میری شادی پر لازمی پہننا، یاد آیا کچھ؟“

” بلقیس باجی۔۔۔۔ بلقیس باجی“

سکینہ نے عجلت میں پھولی سانس کے ساتھ اپنی بات مکمل کی، اس کی بات سنتے ہی تقی اور بلقیس جوا بھی تک اس کی حالت پر حیرت زدہ تھے بوکھلا کر وضو خانے کی طرف بھاگے، بلقیس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ میں پکڑی قمیض کو تخت پر پھینکا، سکینہ بھی ان کے ساتھ ساتھ وضو خانے کی طرف بھاگ رہی تھی۔

صحن کا فاصلہ بھاگتے ہوئے عبور کرنے کے بعد وہ تینوں وضو خانے تک پہنچے جہاں زمین پر منہا بے سدھ پڑی تھی، نیلے رنگ کے جوڑے میں زرد چہرہ لیے منہا چت زمین پر لیٹی تھی دوپٹہ سر پر کچھ اس انداز میں بندھا تھا جیسے وضو کرنے کو بیٹھی ہو۔

”منہا۔ ا۔ ا۔ ا۔ ا۔ ا۔“

بلقیس کی چیخ نما آواز ابھری، تقی بھاگ کر منہا کے قریب جاتے ہی دوزانو اس کے پاس بیٹھ چکا تھا، بیٹھتے ساتھ ہی سب سے پہلے اس نے منہا کی کلائی کو تھام کر نبض دیکھی اور پھر اس کی گردن کے پاس دو انگلیاں دھر کر اس کے گال تھپ تھپائے، منہا ہوش میں نہیں تھی، بلقیس کی توجان پر بن گئی، وہ بھی اب تقی کے قریب بیٹھی منہا کے کندھے کو ہلاتے ساتھ ریکارڈ رہی تھی۔

”منہا۔۔۔۔۔منہا۔۔۔۔۔“

تقی نے جلدی سے اسے بازوؤں میں بھرا اور ایک جھٹکا لگا کر پوری قوت سے اٹھا، بلقیس بھی بدحواس سی تیر کی طرح ساتھ اٹھی، تقی نے قدم بڑھائے

”سکینہ پانی لا جلدی سے“

بلقیس نے تقی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے بدحواس کھڑی سکینہ کو حکم دیا جبکہ تقی اب پریشان چہرے کے ساتھ منہا کو باہوں میں اٹھائے لمبے ڈگ بھرتا برآمدے کی طرف جارہا تھا، منہا کو یوں گود میں اٹھائے تقی کی گردن کی رگیں تک پھول چکی تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

برآمدے کے زینے چڑھتے ہی، تقی نے سامنے رکھے تخت پر منہا کے وجود کو لیٹایا، سکینہ پانی کا گلاس چھلکاتی اب اٹاری کا زینہ چڑھ رہی تھی جہاں تقی اب منہا کو ہوش دلارہا تھا اور بلقیس روندھائی آواز میں بار بار منہا کو پکار رہی تھی۔

مالا ابھی بھی کمرے میں نئے پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھی تھی باہر اٹاری میں اٹھتے شور اور ہلچل کی آوازوں پر تیزی سے اٹھ کر باہر آئی جہاں تخت کے پاس منظر دیکھ کر پریشان ہو کر آگے بڑھی۔

”میں نے ایک ہفتہ پہلے اس کو اور فرہاد کو کہا کہ شہر چلو میرے ساتھ، مجھے اس کے ٹیسٹ کروانے ہیں، یہ دونوں ایسے لاپرواہ کے آئے ہی نہیں“

تقی اب غصے میں بولتے ہوئے سکینہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس تھام چکا تھا، مالا متوش سی بلقیس کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”تائی اماں کیا ہوا منہا آپا کو“

پریشان سے لہجے میں منہ پر دوپٹہ رکھے روتی بلقیس سے پوچھا، تقی اب منہا کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ وہ واقعی میں کسمسا کر آنکھیں کھولنے کی سعی کر رہی تھی۔ لیکن نقاہت کا اتنا شکار تھی کہ ہوش آجانے کے باوجود اس کی آنکھیں مکمل طور پر نہیں کھل رہی تھیں۔

”اللہ تیرا شکر“

بلقیس ہاتھ اٹھائے دعا مانگتی ہی منہا کے قریب تخت پر ٹکی جبکہ تقی اب بھی منہا کا معائی نہ کرنے میں مگن تھا۔ کبھی اس کی آنکھ کا پوٹا پکڑ کر اوپر اٹھاتا تو کبھی بازو تھام کر دیکھتا، بلقیس اب منہا کی ہتھیلیوں کو ہاتھ میں لے کر بیٹھی ابھی بھی اس کا نام پکار رہی تھی جو ہوش میں ہو کر بھی بول نہیں پارہی تھی۔ تقی گھبرا کر سیدھا ہوا۔

”اماں برقعہ پہن کر آئی ہیں ہسپتال جانا ہے فوراً منہا کی حالت ٹھیک نہیں ہے“

تقی نے منہا کے پاس بیٹھی بلقیس کو پریشان سے لہجے میں حکم صادر کیا جو تاہنوز روئے جا رہی تھی، بلقیس اپنی جگہ سے اٹھی تو تقی نے پاس کھڑی مالا کی طرف دیکھا

”میری پینٹ شرٹ نکال دو اگر کوئی استری ہے تو ذرا جلدی“

اس پریشانی میں، تھوڑی دیر پہلے والی جھڑپ کو یکسر فراموش کیے، وہ مالا کو کپڑے نکالنے کا کہہ رہا تھا، مالا بھی پریشان حال کھڑی تقی کی بات پر فوراً کمرے کی طرف بھاگی۔

گیلے اونی کپڑے کا پوچا، ہلکے سیاہ رنگ کے چپس اور بجری سے بنے فرش پر دائی یں بائی یں حرکت کرتا ہوا فرش کو گایلا کر رہا تھا، یہ لمبی گیلری تھی جس کے ارد گرد مختلف وارڈ اور کمرے بنے تھے اور جگہ جگہ لکڑی کے گہرے بھورے رنگ کی چمکتی پالش کیے ہوئے پنجر رکھے لگے تھے جہاں مریض کے ساتھ آئے اضافی اہل خانہ تشریف رکھتے تھے، ڈیٹول اور جراثیم کش ادویات کے ملاپ والی تیز بوناک کے نتھنوں میں گھس رہی تھی، سر پر تکنونی

ٹوپی لیے اور ہلکے نیلے رنگ کی وردی میں ملبوس بوڑھا سا ملازم گیلری کے ایک سرے سے پوچا لگا تا اب آگے بڑھ رہا تھا۔ پر گیلری میں سے گزرتے مریض، نرسیں اور ڈاکٹر ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ گیلے پوچے پر پاؤں چھاپتے بے نیازی سے گزر رہے تھے۔

پچھلے تین گھنٹے سے تقی ایک ڈاکٹر کے ہمراہ ایمر جنسی وارڈ میں منہا کا معائنے کر رہا تھا۔ اور باہر اس گیلری میں وارڈ سے کچھ دوری پر مخالف سمت میں لگے بیچ پر بلقیس اور فرہاد خستہ حال بیٹھے تقی کے باہر نکلنے کے منتظر تھے۔ تقی نے ہسپتال پہنچتے ہی فرہاد کی دوکان پر پیغام بھجوادیا تھا کہ وہ منہا کو لے کر ہسپتال آیا ہے اور وہ بھی جلدی یہاں پہنچے۔ اور وہ اسی وقت دوکان پر لڈن کو بٹھا کر ہسپتال بھاگ آیا تھا۔ آجکل بیوپار کے لیے وہ اکیلا ہی شہر آتا تھا منیر میاں حویلی میں ہی رہتے تھے۔

بلقیس نم سی آنکھیں لیے منہ میں کلمات کا ورد کر رہی تھی جبکہ فرہاد دنوں ہتھیلیوں کو جوڑ کر ہونٹوں پر رکھے کہنیاں گھٹنوں پر دھرے نیچے کو جھکا سامنے خلا میں گھور رہا تھا۔ تقی نے پچھلے ہفتے جب اس کو منہا کے چیک اپ کے لیے شہر آنے کا کہا تھا تو اگلے دن منہا ہشاش بشاش تھی اور ہسپتال جانے سے بلکل انکاری تھی اس پر وہ بھی مطمئن ہو کر اس کی بات مان گیا تھا لیکن آج اس کی بات ماننے کا دلی افسوس ہو رہا تھا۔

ایمر جنسی وارڈ کا دروازہ ہلکی سی چرچر اہٹ کے ساتھ کھلا، تقی نے باہر قدم رکھتے ہی سامنے بیٹھے فرہاد اور بلقیس کی طرف دیکھا دونوں تیز قدموں کے ساتھ چلتے اب تقی کی طرف آرہے تھے۔

”تقی۔۔۔ کیسی ہے منہا ہوا کیا ہے اسے؟“

تقی کے قریب آتے ہی فرہاد نے مضطرب لہجے میں سوالوں کی بوچھاڑ کر دی، بلقیس زرد چہرہ لیے خاموش کھڑی سوالیہ نگاہیں تقی پر جمائے ہوئے تھی۔

”منہا ٹھیک ہے اسے ہوش آ گیا ہے“

تقی نے سنجیدگی سے گہری سانس باہر انڈ لیتے ہوئے جواب دیا تو ایک دم سامنے کھڑے دونوں نفوس کے چہرے پر پھیلا انتشار کم ہوا

”تقی۔۔ ہوا کیا تھا منہا کو مجھے تو کچھ بتاؤ“

فرہاد کانپتے سے لہجے میں اس کے یوں بے ہوش ہو جانے کا سبب پوچھ رہا تھا، تقی نے گھور کر فرہاد کی طرف دیکھا، ابھی وہ منہا کو لے کر ہسپتال پہنچا ہی تھا کہ اسے لاہور سے بھجوائے ہوئے خون کے نمونے کی رپورٹ بذریعہ ڈاک موصول ہوئی تھی اور وہ جو منہا کی صحت کو لے کر پہلے سے ہی پریشان تھا رپورٹ پڑھ کر اور پریشان ہو گیا، ڈاکٹر تسنیم کا شبہ بالکل درست ثابت ہوا تھا منہا کو کوئی دوا دی گئی تھی جس کے باعث اس کے بچے کا زندہ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور آج اس کی بے ہوشی اور نروس سسٹم کے کام چھوڑنے کا سبب بھی شائی داسی دوا کا اثر تھا جو ابھی تک مند مل نہیں ہوا تھا۔ وہ پتا نہیں کیا کیا سوچ چکا تھا اور اب فرہاد کے سامنے آ کر منہا کی حالت طلب کرنے پر وہ اپنا ضبط کھو بیٹھا۔

”کیا بتاؤں تمہیں ہاں۔۔ کیا بتاؤں یہ بتاؤں کہ کیسے اریب پھپھونے اسے پہلے زہر دے کر اس سے بچہ چھین لیا یا پھر یہ بتاؤں کہ وہ دوا ایسی زہریلی تھی کہ منہا اب تک ٹھیک نہیں ہو رہی“

تقی ایک دم سے فرہاد پر پھٹ پڑا، اور سامنے کھڑا فرہاد وحشت زدہ آنکھیں کھولے بے یقینی سے تقی کی طرف دیکھ رہا تھا تقی کے نفرت آمیز لہجے اور کہے گئے جملے نے اسے ہیبت میں مبتلا کر دیا۔

”تقی کیا بکو اس کر رہے ہو، عقل کرو کیا بولے چلے جا رہے ہو“

بلقیس نے گڑبڑا کر ایک نظر پہلے ششد کھڑے فرہاد پر ڈالی اور پھر رعب دار آواز میں کہتے ہوئے تقی کو گھورا جو اب لب بھینچے ماتھے پر بل ڈالے تقی کو دیکھ رہا تھا

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نہیں یقین تو یہ رپورٹ اس کے بلڈ ٹیسٹ کی جو میں نے لاہور بھیجی تھی پڑھو لو کسی بھی ڈاکٹر سے، اس کا مس کیرج نہیں ہوا تھا بلکہ قتل کیا گیا تم لوگوں کے بچے کو، اور تم کیا سب جانتے ہیں منہا سے گھر میں کون سب سے زیادہ نفرت کرتا ہے“

تقی نے دانت پیستے ہوئے چپ ہونے کے بجائے فرہاد کو اور سنادیں، فائل فرہاد کی طرف بڑھائی جو تاہنوز گنگ کھڑا تھا، فرہاد نے بے یقینی سے اس کی غضبناک آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے فائل کو پکڑا۔

”اماں چلیں منہا کو سہارا دیں حویلی چلنا ہے واپس، وہ یہاں رکنے کے لیے نہیں مان رہی ہے، میں ڈرپس وغیرہ لے کر چلتا ہوں گھر لگا دوں گا اسے“

تقی نے رُخ پاس کھڑی بلقیس کی طرف موڑا اور اس کے ماتھے کے بل اور غصے سے گھورتی آنکھوں سے بے نیازی برتتے ہوئے متوازن لہجے میں کہا۔ بلقیس اب تقی کے پیچھے وارڈ میں داخل ہوگئی تھی جبکہ فرہاد فائل کو کھولے بدحواس کھڑا تھا۔

گاؤں کی بتی گل تھی، جہاں پورا گاؤں اندھیرے میں ڈوبا تھا وہاں حاکم قصر کی درودیوار اور بیرونی حصہ اندھیرے میں غرق تھا، بس صحن میں فوارے سے لٹکتی قندیل کی مدھم روشنی سے حاکم قصر روشن تھا جہاں اس وقت ایک طوفان جیسا سماں تھا۔ بات ہی ایسی تھی جس نے حاکم قصر کے سب چھوٹے بڑے مکیں کو صحن میں لا کھڑا کیا تھا۔

فرہاد نے گھر آتے ہی بلقیس سے دوا کے بارے باز پرس شروع کر دی تھی اور پھر اریب کے لیے یہ بات کسی مبہم سے کم نہیں تھی جو اس کے سر پر تو فرہاد نے پھوڑا ہی تھا لیکن اریب نے اس کے نتیجے میں حویلی میں ایک بھونچال کھڑا کر دیا تھا۔ سب لوگ صحن کی چارپائیوں پر جمع تھے بس ایک کمرے میں سے موم بتی کی روشنی نظر آرہی

تھی وہاں منہا کو ڈرپ لگی تھی اور مالا اس کے پاس بیٹھی اسے ہوا دے رہی تھی۔ اریب نے چیخ چیخ کر پورا حاکم قصر سر پر اٹھا رکھا تھا۔

”یہ قدر ہوئی میری اماں۔۔۔۔ بول یہ قدر ہے میری کہ آج میرا بھتیجا مجھ پر میرے پوت کے قتل کا الزام لگائے کھڑا ہے“

اریب اتنی زور سے چیخ رہی تھی کہ اس کے منہ سے نکلتے تھوک کے ننھے قطرے دور تک ہوا میں اچھل کر زمین پر گر رہے تھے، تقی جو فرہاد کے ایک طرف مٹھیاں بھینچے کھڑا تھا آگے ہوا

”پھپھو الزام کی کیا بات کرتی ہیں آپ، میں یہ ثبوت آپ کے سامنے لیے کھڑا ہوں“

تقی نے تنک کر رپوٹ فائل آگے بڑھائی

”یہ کاغذ۔۔۔۔ میرے خون سے زیادہ گواہی دے گئے تھے، مجھے کیا پتا یہ کونسا جھوٹ کا پلندہ ہے، منہا میرے سگے بھائی کی اولاد ہے میں کیوں کروں گی منہا کے ساتھ ایسا؟؟“

اریب نے چیخ کر اپنی صفائی دی اس الزام پر اس کی رگیں پھول گئی تھیں چہرہ سرخ ہو رہا تھا، وہ تپاک سے آگے بڑھی اور تقی کے ہاتھ میں پکڑی فائل اٹھا کر ایک طرف اچھالی، فائل ہوا میں اڑتی ہوئی جا کر فوارے کے جنگلے میں پھنس گئی۔

”پھپھو آپ نے پھپھو بن کر کب گلے لگایا ہمیں جواب ساس بن کر منہا کو قبول کرتیں، آپ مان کیوں نہیں لیتیں کہ آپ نے نفرت میں یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے“

تقی تو آج آپے سے باہر تھا، وہ اریب کے برابر چیخ رہا تھا دماغ تو آج دوپہر سے گھوم گیا تھا اور پھر ایک کے بعد دوسرے واقعے نے اس کی اعصاب تن دیے تھے۔

”تقی بس کر بد تمیزی منہ توڑ دوں گا تیرا“

نقیب نے آگے بڑھ کر غصے میں کانپتی رعب دار آواز میں تقی کو جھاڑا، تمام نفوس پہلی دفعہ یوں چھوٹوں کی بد تمیزی بڑوں کے ساتھ دیکھ رہے تھے جس نے حیرت سے زیادہ صدمے میں مبتلا کر دیا تھا۔
”نقیبے۔۔۔ اور پڑھا۔۔۔ بنا اس کو ڈاکٹر۔۔۔ دیکھ آج کیسے اپنی ماں سے بھی بڑی پھپھی کے سر اتنا بڑا الزام منڈھ رہا ہے“

چوہدری حاکم کی بوڑھی آواز میں لغزش ضرور آچکی تھی لیکن رعب اور دبدبا نہیں کم ہوا تھا، وہ چارپائی پر گاؤتکے کے سہارے بیٹھے تھے۔

”میں اب اس حویلی میں ایک دن نہیں رکوں گی، منیر اٹھیں، ہمیں نہیں رہنا یہاں اب اور یہ جو روکا غلام یہ رہے یہیں اپنی بیوی کے ساتھ چائے تلوے اپنی بیوی کے اور اپنے پڑھے لکھے سالے کے میں تجھے کبھی نہیں بخشوں گی یاد رکھنا“

اریب نے غصے میں سرخ چہرے کے ساتھ پہلے منیر سے کہا اور پھر پھر کر رخ فرہاد کہ طرف موڑا، جو مضطرب سا پریشان حال کھڑا چکی کے دوپاٹوں میں پس گیا تھا۔

”اریب غصہ نا کر اس کے سر میں، میں جوتے لگاتا ہوں، تو کیوں جائے گی گھر چھوڑ کر، اس کا دماغ درست کرتا ہوں میں“

نقیب حاکم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اریب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا، اریب نے ایک جھٹکے سے نقیب کا اپنے کندھے پر رکھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا

”رہنے دو نقیب، بہت عزت کمالی، میں تو اب کبھی نہیں رکوں گی یہاں، منیر چلیں سامان باندھیں“
اریب نے ناک پھلا کر پاس بیٹھے منیر کی طرف دیکھ کر کہا اور پھوں پھوں کرتے اٹاری کی طرف قدم بڑھا دیے، نقیب حاکم ایک جھٹکے سے تقی کی طرف مڑا اور اس کا گریبان دبوچ لیا۔

”بیغرت چل مانگ معافی۔۔۔ مانگ معافی اپنی پچھی سے“

نقیب نے تقی کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا، تقی نے لب بھینچے نقیب حاکم کی طرف دیکھا
”جب تک یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی کہ منہا کو زہر دینے والی اریب پھو نہیں ہیں میں ان سے معافی نہیں
مانگوں گا“

تقی نے دو ٹوک لہجے میں ان کی بات سے انکار کیا، نقیب نے ہاتھ ہوا میں اٹھایا اور پھر ایک زوردار چماٹ کی آواز
سے ایسا سناٹا ہوا کہ صرف جھینگروں کی جھیں جھیں سنائی دے رہی تھی۔

”نقیب یہ ایک چماٹ اس۔۔۔ کبخت کے منہ پر بھی جڑ دیکھو یہ بھی گردن تان کر اپنی اماں کے آگے کھڑا ہو گیا،
ارے ناس پٹی اس ڈاکٹری کی پڑھائی کا ستیاس ناش جائے، ہمارے زمانے میں بھی یوں بیمار پڑ جاویں تھی بچیاں پہلی
بار میں، تو کیا سب کی ساسیں ان کو دوا دیے تھیں“

خدیجہ بیگم کی تیکھی آواز پورے صحن میں گونج رہی تھی، غزالہ اور بلقیس نے گردنیں نیچے گرائیں۔
”ابھی اسے بیمار ہوئے مہنیہ بھر تو گزرا ہے، چوہی سی جان ہے ناکھاتی ہے سہی سے ناپیتی ہے تو جان کیسے بنے گی،
منہ اٹھا کر لے آیا یہ دو پرچے اور اپنے باوا کی ماں جنی پر لگا دیا الزام“
خدیجہ بیگم کا لہجہ آخر میں روندھا گیا تھا، بلقیس تیزی سے آگے بڑھی

”بی جی بچہ ہے میں سمجھاتی ہوں ابھی معافی مانگے گا“

بلقیس نے خوفزدہ سی آواز میں کہا اور تقی کے طرف بڑھی اس کا بازو دبوچتے ہوئے اٹاری کی طرف بڑھی۔ تقی
غصے میں لب بھینچے ماں کے ساتھ گھسٹ رہا تھا۔

”منیر۔۔۔۔ منیر۔۔۔ آجائیں، اب اپنے کپڑے بھی رکھ لیجیے ٹرنک میں“

اریب نے اٹاری کے ستون کے پاس آکر رعب سے منیر کو ہانک لگائی، نقیب نے تیز تیز قدم اٹاری کی طرف بڑھائے، وہ ابھی زینے کے پاس پہنچا تھا کہ چوہدری حاکم کی آواز پر پاؤں تھم گئے

”میری بات سن لو سب غور سے کوئی نہیں جائے گا حویلی سے، تقی کی ہمیشہ سے ہی یہ خصلت ہے، اس کی ڈاکٹری نے دماغ خراب کر رکھا ہے اس کا اس کی بات میں ایک فیصد بھی صداقت نہیں ہے، اس کو کہو آکر پیر پکڑے اپنی پھپھو کے نہیں تو میں یہ حویلی چھوڑ کر چلا جاتا ہوں، میں جہاں بھی رہوں ڈیرے رہوں یا کہیں بھی پھر پیچھے سے سر پھاڑ لینا ایک دوسرے کا اور دھکے دینا ایک دوسرے کو“

چوہدری حاکم کی ہلکی لغزش زدہ آواز حاکم قصر کے صحن میں گونج اٹھی تھی۔ اور پھر نقیب بھی تیز تیز قدم چلتا اس کمرے میں چلا گیا تھا جہاں سے بلقیس اور تقی کی بحث کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور پھر کچھ دیر بعد تقی ضبط سے جبرے ایک دوسرے میں پیوست کیے باہر نکلا تھا اور پھر باری باری تقی اور فرہاد نے اریب سے معافی مانگی تھی صاف ظاہر تھا کہ ناتوا نہوں نے دل سے معافی مانگی تھی اور نا ہی اریب نے دل سے معاف کیا تھا، گم صم سے حاکم قصر کے مکین آہستہ آہستہ اٹھ کر اپنی چارپائی پر لیٹ رہے تھے اور تقی غصے میں بھرا چھت چڑھ گیا تھا۔

مالا نے پلنگ پر سے تکیہ اٹھایا اور صحن میں آکر غزالہ کے ساتھ چارپائی پر لیٹ کر اسے پیچھے سے باہوں کے حصار میں لیا، ماں کے ساتھ لگتے ہی خود بخود آج پورے دن کی باتیں اور اب کے ماحول کے باعث آنکھیں بھر آئیں، تقی اور بلقیس کے ہسپتال جانے کے بعد تخت پر پڑا قمیض وہ اٹھا کر پھر اندر لے گئی تھی اور اب گھر میں اس کشیدگی نے سب کو چپ کر دیا تھا، وہ یونہی سسکتی ماں کے ساتھ لگی رات کے کس پہر نیند میں گئی خبر نا ہوئی۔

اندھیرے میں حاکم قصر کے صحن میں موجود نیم کے درخت ٹھنڈی ہوا کے باعث کچھ یوں ہچکولے کھا رہے تھے جیسے ایک گھنے بالوں والی چڑیل آہستہ آہستہ کچھ پڑھتے ہوئے اپنا سر ہلارہی ہو اور درختوں سے کچھ ہی آگے

فوارے کے دائیں اور بائیں، قطار میں لگی چارپائی یوں پر سفید اور سیاہ ڈبیوں والے کھیس تانے نفوس سونے کی تیاری میں تھے اور کچھ تو سو بھی چکے تھے، کمرے اب بہت گرم ہو جاتے تھے اور صحن میں ٹھنڈی ہوا کے باعث تقریباً گھر والے قطار دار قطار چارپائی یاں ڈال کر صحن میں سونا شروع ہو چکے تھے۔

اس دن کے واقع کے بعد سے یہ تیسری رات بھی حاکم قصر کے تمام مکینوں کے لیے بھاری اور افسردہ تھی، بے شک چوہدری حاکم نے اس رات جھگڑے کو اپنی طرف سے ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کشیدگی ختم نہیں ہو سکی تھی۔

اریب بیگم تانہوز ناراض تھیں اور چوہدری حاکم کو اس بات پر راضی کر رہی تھیں کہ انہیں ان کا حصہ دے کر فارغ کیا جائے وہ اب مزید حاکم قصر کا حصہ بن کر نہیں رہنا چاہتی ہیں۔

تقی سے گھر میں کوئی بھی بات نہیں کر رہا تھا اور وہ تھا کہ ایک نئی ضد لگا بیٹھا تھا وہ منہا کو معافی نے اور ٹیسٹوں کے لیے لاہور لے جانا چاہتا تھا جس پر نقیب حاکم، بلقیس اور منہا خود اس کی اس ضد کو بے بنیاد قرار دے رہے تھے ان کے مطابق منہا اب پچھلے دو دن سے بالکل ٹھیک تھی، اس لیے تقی بلا وجہ کا او ویلا نا مچائے۔

اس دفعہ تو سب کے ساتھ فرزانہ آپا بھی تقی سے اچھی خاصی خفا ہو چکی تھی وہ اپنی ماں کی اس بے عزتی اور الزام پر تقی سے کبھی نابات کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

مالا دبے قدموں غزالہ کی چارپائی کے پاس آئی اور آہستگی سے لیٹی، تقی صبح کو نکل جاتا تھا اور رات گئے گھر لوٹتا تھا پھر کتنی دیر تک وہ بلقیس اور نقیب سے بحث کرتا رہتا تھا۔ اور جیسے ہی وہ کمرے کا رخ کرتا مالا صحن میں آ جاتی تھی

غزالہ نے مالا کا اپنے ساتھ لیٹنا محسوس کرتے ہوئے جھٹکے سے رخ موڑا تو مالا اس کی کمر کے گرد بازو حائل کیے لیٹنے کی کوشش میں تھی۔ آج تیسری رات تھی اور وہ آج بھی رات کو غزالہ کے ساتھ آکر لیٹ رہی تھی۔

”مالا۔۔۔مالا۔۔۔“

غزالہ نے آہستگی سے نیند سے بوجھل ہوتی بھاری آواز میں پکارتے ہوئے مالا کا کندھا ہلایا۔ وہ جو بڑے آرام سے غزالہ کے ساتھ سونے کی کوشش میں تھی چونک کر غزالہ کی طرف دیکھا غزالہ نے گردن گھما کر تقی کے کمرے کی طرف دیکھا جہاں دروازہ کھلا تھا اور کمرے کی بتی جل رہی تھی مطلب تقی جاگ رہا تھا

”مالا اٹھ۔۔۔اپنے کمرے میں جا کر سو“

بوجھل سے لہجے میں اسے حکم صادر کیا جواب پوری آنکھیں کھولے غزالہ کو گھور رہی تھی۔
”اٹھ جانا اب کیا دیدے پھاڑ کے دیکھے جارہی ہے، دورات سے دیکھ رہی ہوں تو میرے ساتھ آکر کیوں سو رہی ہے“

غزالہ دانت پیستے ہوئے آواز کو حد درجہ مدھم رکھے سوال کیا، تقی کے ذکر پر مالا کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ اب غزالہ کو کیا بتاتی کہ وہ کتنا الٹا سیدھا سوچ رہی ہے وہ تقی کو لے کر اب تک خائف تھی۔ اس دن کے بعد یہ معاملہ اتنا طول پکڑ چکا تھا کہ اس نے تقی سے بات تک نہیں کی تھی۔ اور اب غزالہ اسے کمرے میں جانے کا کہہ رہی تھی۔

”اماں۔۔۔وہ ان کا موڈ تھوڑا ٹھیک نہیں ہے تو۔۔۔“

مالا کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ غزالہ نے تنک مزاجی سے اس کی بات کاٹ دی
”اگر وہ پریشان ہے اور موڈ ٹھیک نہیں تو ایک بیوی ہونے کے ناطے یہ تیرا فرض بنتا ہے کہ تو اس کی دلجوئی کرے نا کہ اس سے دور رہے“

غزالہ نے تیوری چڑھائے اسے سمجھایا جو سراسیمگی کی حالت میں نظریں چرارہی تھی۔ غزالہ کو اگر وہ اس دن کے جھگڑے کے بارے میں بتاتی تو زیادہ پھنس سکتی تھی کیونکہ غزالہ نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ اس کا ذکر وہ کسی سے نہیں کرے گی۔

”اٹھ فوراً جا اپنے کمرے۔۔۔۔۔ اٹھ“

غزالہ نے غصیلے لہجے میں ڈپٹ کر کہا تو وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھی اور پھر چپل پہنتے ہی قدم اٹاری کی طرف بڑھا دیے۔

کمرے میں آئی تو تقی پلنگ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا بازو کو موڑ کر پیشانی پر ٹکا رکھا تھا اور ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں میں قینچی صورت پھنسا یا ہوا تھا۔ جیسے ہی مالا کمرے میں داخل ہوئی تقی نے ذرا کی ذرا آنکھوں کی پتلیاں گھما کر اس کی طرف دیکھا پر پھر خفگی سے رُخ موڑ لیا، جہاں ایک طرف منہ کا معاملہ کشیدگی کا باعث بنا ہوا تھا وہاں اب مالا کے سامنے آنے پر اس کو پر سوں دو پہر کا سارا منظر یاد آ گیا۔

مالا اب پلنگ کے پاس پہنچ چکی تھی اور شئی دا سے پلنگ پر چڑھ کر دوسری طرف لیٹنا تھا اس لیے چپ چاپ تقی کی ٹانگوں کو گھور رہی تھی۔ تقی نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ کر ٹانگیں سمیٹیں اور وہ گھٹنوں کے بل چڑھ کر پلنگ پر تقی سے فاصلہ بنا کر لیٹ گئی، تقی نے آہستگی سے رُخ موڑے اس کو دیکھا جس کی اس لمحے میں اسے اشد ضرورت تھی پر وہ اس سے باقی لوگوں کی نسبت بھی دور تھی۔

شام نے حاکم قصر کے پورے صحن میں اپنا سایہ پھیلا رکھا تھا، معمول سے ہٹ کر ملگجے سے اندھیرے والی شام تھی، ایسی شام جس میں سورج گرہن جیسا گمان ہو، مالا نیم کے درخت سے لٹکتے جھولے پر بیٹھی تھی اور رملہ اسے پشت سے دھکا دیتے ہوئے جھولا جھلارہی تھی۔

مالا نے جوش سے ہلکی سی گردن موڑے اپنے پیچھے کھڑی رملہ کو حکم صادر کیا اور خود مزے سے جھولے کی دائیں بائیں موجود دونوں رسیوں کو تھامے سر کو پیچھے گرایا، جھولا اور اوپر اٹھنے لگا۔۔۔

پھر اور لمبا اور اوپر-----اور اوپر-----

پھر اور اوپر۔۔۔ رسی لمبی ہو رہی تھی اور جھولا اوپر جا رہا تھا۔ مالا کو خوف آنے لگا جھولا اب اتنی اونچائی پکڑ رہا تھا کہ اس کی نگاہ حاکم قصر کی چھت کو دیکھ کر نیچے آرہی تھی۔ مالانے پریشان سی صورت بنائے نیچے دیکھا اور خوف سے ٹانگیں کانپ گئی ہیں، جھولا پھر سے اتنا اونچا ہوا کہ وہ چھت کے دیوار سے ٹکرانے لگی۔

”رملہ۔۔۔را۔۔۔ملا۔۔۔ا۔۔۔ا۔۔۔ا۔۔۔جھولارو کو میں گر جاؤں گی“

مالا نے خوف سے چیخ کر رولا کو پکارا پر رولا پیچھے نہیں تھی جھولا اب کی بار اور اونچا ہوا، دیوار کے قریب جا کر اس سے پہلے کے مالا دیوار سے زور سے ٹکراتی اس نے اچک کر چھت کے دیوار کو تھام لیا اب وہ دیوار کے ساتھ لٹک رہی تھی اور ٹانگیں مارتے ہوئے خوف سے چیخ رہی تھی۔

”بچاؤ میں چھت سے گر جاؤں گی۔۔۔۔۔ بچاؤ مجھے میں آیا کی طرح گر کر مر جاؤں گی“

وہ بدحواسی میں چنے جا رہی تھی کہ اچانک تقی کا سردیوار پر سے جھانکتا ہوا نظر آیا

”تقی۔۔۔ی۔ی۔ی۔مجھے بجائی پس“

مالا نے چیخ کر تقی کو مدد کے لیے پکارا وہ پچھلا خواب یکسر فراموش کیے ہوئے تھی، تقی نے اچک کر ہاتھ آگے بڑھایا اور مالا کا ہاتھ تھاما، پھر مالا کو چھت کی طرف کھینچ لیا، مالا چھت پر آتے ہی تیزی سے آگے بڑھی اور تقی کو اپنی باہوں کے حصار میں لے کر اس کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔ ایک دم سے سارا خوف زائل ہونے لگا۔ تقی کے گلے لگے اچانک اس کی نظر برساتی کی دیوار کی طرف اٹھی، برساتی میں سیدھی کھڑی چارپائی کی اوٹ میں کوئی چھپتا ہوا دکھائی دیا ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

”تقی کوئی ہے وہاں۔۔۔“

مالا نے گڑبڑا کر پیچھے ہوتے ہوئے لغزش زدہ آواز میں تقی کو بتایا، تقی نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا تو شرتی رنگ کے قمیض میں ملبوس کوئی پیٹھ موڑے پچھلے صحن کی دیوار کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کے بھاگتے ہی برساتی سے رمناباہر نکلی وہ رو رہی تھی

”اس کو پکڑو وہ بھاگ رہا ہے۔۔۔ وہ بھاگ جائے گا، وہ بھاگ گیا تو ایک اور قبر بنے گی“

رمنابھاگتے ہوئے وجود کی طرف انگلی کیے چیخ رہی تھی، مالا نے جلدی سے تقی کی طرف دیکھا، ذہن نے اچانک گواہی دی یہ حقیقت نہیں خواب ہے اور شکر ہے آج تقی ساتھ ہے

”تقی دیکھا۔۔۔ دیکھا۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بولتی دیکھو رمنابھاگتی ہے خواب میں وہ سامنے کھڑی ہے، اب تو یقین کریں گے نامیرا“

مالا نے جوش سے تقی کی طرف رخ کیے اسے یقین دلایا جو اس کی خوابوں کی سچائی کو سرے سے اس کا پاگل پن کہہ چکا تھا

”تقی۔۔۔۔۔ مالا۔۔۔۔۔ پکڑو اسے۔۔۔۔۔ ورنہ قبر بن جائے گی“

ر منا چیخ رہی تھی تقی نے دوڑ لگائی، مالا بھی پیچھے بھاگی وہ جو کوئی بھی تھا بھاگ کر پچھلے صحن میں کودا تھا تقی اس کے پیچھے ہی پچھلے صحن کی دیوار پھلانگ کر نیچے بنے بھینسوں کے لیے بنائے گئے کمرے پر کود گیا تھا مالا بھی اب دیوار سے پار پچھلے صحن میں دیکھ رہی تھی۔ صحن میں کوئی کھڑا تھا اور صحن کے وسط میں زمین کھود رہا تھا۔

”مالا رو کو اسے قبر مت کھودے“

مالا آنکھوں کو سکوڑے سامنے غور کر رہی تھی، کہ کون ہے جو قبر کھود رہا ہے، جب اچانک پیچھے سے ر منا کی آواز آئی مالا نے خوفناک چیخ ماری تھی۔

وہ ہڑبڑا کر اور چیخ کر خواب سے اٹھی، چیخ اتنی ہولناک تھی کہ اس کے ساتھ سویا تقی بھی اٹھ بیٹھا تھا مالا نے جھپٹ کر تقی کے سینے میں منہ چھپالیا، تقی کی پیشانی پر فکر مندی کے بل پڑے تھے کچھ ایسا عجیب تھا جسے اسے ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

”مالا۔۔۔۔۔مالا۔۔۔۔۔مجھے بتاؤ۔۔۔۔۔کیا۔۔۔۔۔کیا دیکھا، آج بھی خواب دیکھا تم نے؟“

تقی نے پیار سے اس کے چہرے کو اٹھا کر اپنی ہتھیلوں میں بھر لیا، وہ جو بری طرح کانپ رہی تھی، ایک دم سے تقی کے محبت بھرے لمس، اپنائیت اور خواب میں یہ حقیقت کھل جانے پر کہ وہ قاتل نہیں ہے پر سکون سی ہو کر تقی کے ساتھ لگ گئی اس کے سینے کے ساتھ گال چپکائے دھیمی سی آواز میں گویا ہوئی

”تقی۔۔۔۔۔مجھے معاف کر دیں۔۔۔۔۔مجھے معاف کر دیں۔۔۔۔۔وہ آپ نہیں تھے کوئی اور ہے جس نے آپا کو دھکا دیا۔۔۔۔۔اور اب وہ کسی اور کی قبر کھود رہا ہے“

مالا نے ایک دم ساکن ہوتے ہوئے تقی کو خواب کے متعلق بتایا

”مالا۔۔۔۔۔کون کس کی بات کر رہی ہو۔۔۔۔۔ایک منٹ“

تقی نے نا سمجھی میں اس کی باتوں پر غور کرتے ہوئے کہا اور پھر اسے کی باہوں کے حصار سے نکلتا ہوا پلنگ سے نیچے اترا، سوئی چ بورڈ تک گیا سوئی چ بورڈ پر سے بتی کا بٹن نیچے کرتے وہ مالا کی طرف بڑھا جو اسی طرح خوف سے پوری آنکھیں کھولے بیٹھی تھی۔ سیاہ رنگ کے جوڑے میں زرد چہرہ، آنکھوں کے نیچے گہرے ہوتے حلقے رات جب وہ ساتھ آ کر لیٹی تھی تب اس نے مالا کے چہرے پر اتنا غور نہیں کیا تھا لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا وہ ذہنی اور جسمانی طور پر کتنی بری طرح متاثر ہو چکی ہے۔

تقی نے گہری سانس لی اور اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا جو نام بیٹھی اس سے نگاہیں چرا رہی تھی، کیا کچھ نہیں بول دیا تھا اس نے تقی کو اور تف تھی اس کی عقل پر جس نے یہ سوچ لیا تھا کہ تقی قاتل ہے ر مناکا، وہ سر جھکائے خود کو ملامت کر رہی تھی اور تقی پریشانی سے اس کے الجھے سے بالوں والی مانگ کو تک رہا تھا، کیا رشتہ بن گیا تھا اس کا سامنے بیٹھی اس لڑکی کے ساتھ کہ اس کی پریشانی اور تکلیف تقی کو اپنی پریشانی اور تکلیف لگنے لگی تھی، کچھ پل کی خاموشی کے بعد تقی کی آواز نے کمرے میں ارتعاش پیدا کیا۔

”مالا مجھے نہیں معلوم یہ خواب کیا ہیں، تمہیں کس لیے آتے ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق ہے بھی کہ نہیں لیکن اس دن میں تمہیں اسی بات کا یقین دلارہا تھا کہ وہ قمیض میں نے کبھی نہیں پہنی بلکہ میں تو وہ اماں کے پاس پھینک آیا تھا کہ مجھے یہ رنگ نہیں پہننا مجھے شادی کے لیے کوئی اور سوٹ بنوا کر دیں اور پھر اماں نے مجھے اور جوڑا بنوا بھی دیا تھا، اس کے بعد وہ قمیض کہاں گئی کہاں نہیں مجھے تو علم تک نہیں ہوا اس کا بات کا“

تقی اسے بڑے تحمل سے ساری بات بتا رہا تھا اور وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی اس رات بھی اگر وہ ر مناکا کے اٹھ کر بیٹھنے سے پہلے خواب سے باہر نا آ جاتی تو شائ د اسی دن ہی اسے خبر ہو جاتی کہ ر مناکا کو دھکا دینے والا اور کوئی ہے، تقی نہیں۔

وہ آہستہ آہستہ آنسوؤں پر قابو کھو بیٹھی تھی اور اب گالوں پر گرم سیال رواں تھا، مالانے سسکیوں میں تقی کو سارا خواب سنایا اور وہ بھی سینے پر ہاتھ باندھے پیشانی پر افقی لکیریں ڈالے تحمل سے اس کا خواب سن رہا تھا پر عقل ابھی بھی عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ کچھ دیر یونہی گہری خاموشی رہی اور پھر تقی نے پلنگ پر آکر دھیرے سے اسے قریب کرتے ہوئے اپنے ساتھ لگالیا، اس کا وجود ساتھ لگتے ہی مالانے آنکھیں موند لیں پچھلے دس دن کی دوری اور اب اس کی یہ پریشانی وہ اپنی گرفت سے اسے اپنے ساتھ کا یقین دلا رہا تھا۔ اور پھر اس کی مانگ پر سے لب اٹھائے گویا ہوا

”مالا۔۔۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا چاہتا ہوں“

چہرہ نیچے جھکائے آہستگی سے اس کے کان میں سرگوشی کی، مالا سٹپٹا کر تھوڑا سا الگ ہوئی

”نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ تقی میں پاگل نہیں ہوں، آپ میرا یقین کریں۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔ جس نے رونا آپا کو مارا تھا اور اب وہ کسی اور کی قبر کھود رہا ہے مجھے ڈر لگ رہا ہے“

مالانے جھر جھری لے کر پھر سے اپنے خواب کو یاد کیا تھا، تقی نے نفی میں سر ہلایا اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیا، اپنے سر کو محبت سے اس کے سر کے ساتھ جوڑا

”اچھا مجھے یقین ہے میری مالا پاگل نہیں ہے، لیکن فلحال تم سو جاؤ اتنی راتیں جاگ جاگ کر اپنی آنکھوں کا کیا حال بنالیا“

تقی نے آہستگی سے چہرہ پیچھے کرتے ہوئے اپنے انگوٹھے کو نرمی سے اس کی آنکھوں پر پھیرا، مالانے دھیرے سے مسکرا کر آنکھیں بند کیں کتنے دن بعد وہ یوں تقی سنگ مسکرائی تھی۔

”چلو میں سلاتا ہوں“

تقی نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے لیٹا لیا۔ مالا کی حالت اب واقعی توجہ طلب تھی کچھ دیر بعد مالا تو تقی کی کمر کے گرد بازو حائل کیے سینے پر سر رکھے سارا بوجھ اس کے ذہن پر ڈالے سوچکی تھی لیکن وہ ساری رات اسے بچوں کی طرح خود سے لپٹائے پیلی روشنی میں نہائی چھت کو گھورتا رہا۔

پنکھے چلنے کی آواز کے ساتھ کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی، بلقیس قمیض کو ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی اور سامنے مالا مضطرب صورت بنائے کھڑی تھی، آنکھوں کی نیلی پتلیوں میں جواب کے انتظار کی بے چینی چمک رہی تھی۔

تقی کے جانے کی دیر تھی وہ الماری سے قمیض نکالے بلقیس کے پاس پہنچ چکی تھی اس کی بے چین روح کو ایک پل کا سکون نہیں تھا، آنکھیں رات وہ تقی کے لیے موندے لیٹ تو گئی تھی پر نیند کمبخت کس کو آئی تھی، تقی تو اسے پاگل سمجھنے لگا تھا، یہ جنگ اس کی اور اس کے خوابوں کی تھی اسے خود ہی ہمت کرنی تھی کیونکہ اب بات رمنا کی موت کے قاتل تک پہنچنے کی نہیں تھی بلکہ اس کو بچانے کی تھی جس کی قبر کھودی جا رہی تھی۔

بلقیس کچھ دیر قمیض کو دیکھتی رہی پھر گہری سانس لیے گویا ہوئی

”ہاں تو یہ تقی کو فرزانہ نے کاڑھ کر دی تھی قمیض، نواب زادے کو رنگ ہی نہیں پسند آیا تھا کہ لڑکیوں جیسی ہے، تو میں نے باہر برانڈوں میں بھجوا دی تھی کہ کوئی ملازم پہن لے شادی پر نیا جوڑا“

بلقیس نے متوازن لہجے میں جواب دیا اور پھر مالا کے ساکن وجود سے لا پرواہی برتتے ہوئی تیوری چڑھائی

”اب یہ بات میری سمجھ سے باہر کی ہے کہ یہ قمیض گھر واپس کیسے آئی اور یہ تم اور تقی اب اس کی کھوج میں کیوں لگے ہو؟“

بلقیس آبرؤ اچکائے مالا سے سوال کر رہی تھی اور حیرت سے پوری آنکھیں کھولے کھڑی تھی، مالا ایک دم سے چونک کر سیدھی ہوئی

”تائی۔۔۔ اماں۔۔۔ کون۔۔۔ کس ملازم نے پہنی تھی یہ قمیض؟ بتائیں مجھے؟“

مالا کی آواز میں اس کے وجود کی طرح ہی لغزش تھی، بلقیس کی پریشانی بڑھ رہی تھی

”یہ تو نہیں معلوم مجھے، ہاں تاری بوا کو دی تھی میں نے تو اس کو معلوم ہو گا رک ذرا“

بلقیس اب اس کی پریشانی کے پیش نظر خود بھی تشویش میں مبتلا ہو چکی تھی، کمرے کے دروازے کے پاس جا کر

اٹاری میں تخت کے نیچے بیٹھی خدیجہ بیگم کے پاؤں دھوتی تاری بوا کو ہانک لگائی

”تاری بوا۔۔۔ بات سننا ذرا کی ذرا“

بلقیس تاری بوا کو بلوانے کے بعد پھر سے کمرے کے وسط میں آکر کھڑی ہو چکی تھی، جہاں بدحواس سی مالا کھڑی

تھی، تاری بوا کے کمرے میں آتے ہی بلقیس نے قمیض تاری بوا کے سامنے کی

”تاری بوا فرزانہ کی شادی سے پہلے میں نے کچھ مردانہ جوڑے ملازموں کو بھیجے تھے تمہارے ہاتھ، یہ والا جوڑا

کس ملازم نے لیا تھا؟“

بلقیس نے بھنویں اچکائے سوال کیا اب سوچ کے گھوڑے دواڑانے کی باری تاری بوا کی تھی، جو گال پر انگلی دھر

چکی تھی اور مالا دم سادھے کھڑی تھی۔

”بلقیس بیٹا جوڑے تو تین چار تہہ شدہ تھے، میں تو ایسے ہی تہہ شدہ لڈن میاں کے حوالے کر آئی تھی کہ

ملازموں میں بانٹ دیجیو، لیکن مجھے اتنا یاد ہے یہ قمیض ایسے ہی چھت میں دھلے کپڑوں کے ساتھ نیچے آئی تھی

تب پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی، پھر ملا ہی نہیں“

تاری بوا نے جو بتایا وہ اور الجھا گیا تھا، مالا کی سانس اٹک گئی تھی بازو پر موجود روئنگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

”لڈن کو بلو او جلدی سے تاری بو۔۔۔“

مالا نے اچانک جوش سے آگے بڑھتے ہوئے تاری بو اسے کہا اور خود تیز تیز قدم چلتی باہر اٹاری کے ستون کے پاس آئی۔۔۔

”سکینہ۔۔۔۔۔ سکینہ۔۔۔۔۔“

وہ پوری قوت سے ستون کے ساتھ لگی چیخ رہی تھی، آواز اتنی اونچی تھی کہ کانوں کے پردے پھاڑ دے وہ کانپ رہی تھی، چہرہ زرد ہو رہا تھا، سکینہ باورچی خانے سے بھاگتی ہو اٹاری کی طرف لپکی

”لڈن کو بلا کر لا ابھی کے ابھی۔۔۔۔۔ جلدی جا۔۔۔۔۔“

مالا نے کانپتی پر رعب دار آواز میں چیخ کر حکم صادر کیا وہ اس وقت پاگل لگ رہی تھی، اس کے پیچھے تاری بو اور بلیقیں اور تخت پر بیٹھی خدیجہ اور اریب سب حیرت سے مالا کو دیکھ رہی تھیں۔

”آخر کو ایسی کیا آفت آن پڑی۔۔۔۔۔ کا ہے چیخ رہی پاگلوں کی طرح“

خدیجہ بیگم نے تخت پر بیٹھے بیٹھے پورا وجود مالا کی طرف موڑ کر پوچھا، مالا نے کوئی جواب نہیں دیا، غزالہ بھی مالا کی آوازیں سن کر اب کمرے سے باہر آگئی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی تہ بند سنبھالے اور کندھے پر پٹکا درست کر تالڈن میاں گیٹ سے داخل ہو کر اب صحن کی طرف آ رہا تھا جہاں مالا حواس باختہ کھڑی تھی۔

لڈن میاں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اب اٹاری کے پاس پہنچ چکا تھا نگاہ اٹھائے سامنے کھڑی مالا کو حیرت سے دیکھا اب تک تو منہا منیر میاں اور فرزانه بھی اپنے بیٹے کو گود میں اٹھائے سب کمرے سے باہر آچکے تھے۔

اب اٹاری میں حویلی کے تمام مکین کا ہجوم سالگ گیا تھا، یہ ناشتے کے بعد تقریباً صبح ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔ مالا نے آنکھیں سکڑ کر لڈن کی طرف دیکھا اور پھر لب کھولے

”لڈن بھائی یہ قمیض دیکھیے“

مالا نے قمیض لڈن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، لڈن نے نا سمجھی کے شکن ماتھے پر نمودار کیے آگے ہوا اور ہاتھ بڑھا کر مالا کے ہاتھ سے قمیض لیا، وہ بغور قمیض کی طرف دیکھ رہا تھا اور سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسوائے غزالہ ہر کسی کی آنکھوں میں تجسس تھا، لڈن کی نا سمجھی کو دیکھتے ہوئے مالا نے اسے مزید وضاحت دی ”یہ جوڑا فرزانہ آپا کی شادی سے پہلے تائی اماں نے برانڈوں میں ملازموں کے لیے بھیجا تھا یاد کیجیے یہ اس وقت آپ سب میں سے کس ملازم نے لیا تھا اور ولیمے پر یہ جوڑا پہنا بھی تھا“

مالا پوری تفصیل سے لڈن کو آگاہ کیے اب اس سے سوال پوچھ رہی تھی سامنے کھڑے لڈن کے ڈیل ڈول سے تو صاف ظاہر تھا کہ یہ قمیض آج سے دس سال پہلے بھی اس کو بہت لمبی اور تنگ ہوگی اور یہی وجہ تھی مالا اپنے ذہن میں خود ہی یہ اندازہ لگا چکی تھی کہ یہ قمیض پہننے والا اور رونا کو دھکا دینے والا لڈن نہیں ہو سکتا۔ چند منٹ یو نہی خاموشی میں گزر گئے پھر لڈن نے قمیض پر سے جھکی نگاہ کو اٹھائے سامنے کھڑی مالا کی طرف دیکھا ”مالا بی بی اب سہی تو نہیں یاد سب پر یہ جوڑا تو بہادر کے حصے میں آیا تھا کیونکہ یہ تنقی باؤ کی قمیض اسی کو ہی پوری آتی ہے ہمیشہ سے“

لڈن اپنی ہی کہی بات پر شاک تھا لیکن ساتھ ہی اس نے تنقی اور بہادر کے قد کاٹھ کے متعلق جو وضاحت پیش کی تھی اس سے تو صاف ظاہر تھا کہ یہ قمیض بہادر نے ہی پہنی ہوگی، لڈن کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ مالا کی پوری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ وہ بدک کر چند قدم آگے آئی

”بہ۔۔۔۔۔ بہادر۔۔۔۔۔ کہاں ہے وہ۔۔۔۔۔؟ لڈن بھ۔۔۔۔۔ بھائی بلاؤ اس کو فوراً اس کو کہو اندر آئے“

مالا کی آواز میں لغزش در آئی تھی اور وہ یہ بات بھی فراموش کیے بہادر کو اندر بلانے کا حکم صادر کر رہی تھی کہ بہادر کا حویلی کے اندر آنا منع ہے۔ تمام لوگ اب اور حیرت اور تشویش میں مبتلا مالا کو تاک رہے تھے جسے اس وقت کچھ ہوش نہیں تھا

”کیا باولی ہو چلی ہے ایسی بھی کیا آفت آن پڑی ہے جو بہادر کو اندر بلارہی ہے، ہمیں تو کچھ بتا دے پہلے، رک جا لڈن میاں مت بلا کے لائیو بہادر کو پہلے مجھے پوچھ لینے دے کہ ایسی بھی کیا بات ہو گئی ہے“
خدیجہ بیگم جو کب سے حیران و پریشان کبھی مالا تو کبھی قمیض کو دیکھ رہی تھیں ہانک لگا کر لڈن کو رکنے کے لیے حکم دے دیا جو مالا کے جلتے دماغ کو اور سلگا گیا۔

”لڈن بھائی۔۔۔ نہیں تم جاؤ بلا کر لاؤ بہادر کو۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔“

مالا تو غصے میں کانپ رہی تھی اور پھر اپنی ہی بات پر رک کر تیزی سے زینے اترتے ہوئے صحن کی طرف بڑھی
”بلکہ رک جائیں میں خود چلی جاتی ہوں باہر“
وہ جوش میں کہتی ہوئی اب تیز تیز قدم اٹھاتی بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے دوپٹے کو سر پر اوڑھ رہی تھی۔

”غزالہ کیا بدھی کام کرنا چھوڑ چکی ہے اس خرافہ کی، کہاں کو بھاگ رہی ہے چنڈال کہیں کی، اپنے داجی سے چوٹی پٹو الیوے گی پکڑ اس ناہنجار کو“

خدیجہ بیگم تیزی سے تخت پر سے ٹانگیں سیدھے کر رہی تھیں، غزالہ گڑبڑا کر آگے ہوئی کہ منیر میاں تیزی سے آگے بڑھے

”مالا بیٹا۔۔۔ مالا بیٹا رک جاؤ میں بلاتا ہوں اس کو یہیں پر تم باہر برانڈوں میں کیوں جاؤ گی“

منیر میاں نے زینے اترتے ہوئے ہاتھ کھڑا کر مالا کو حویلی کی روش پر ہی روک دیا اور خود تیز تیز قدم اٹھاتے پھولی سانس کے ساتھ مالا کے پاس پہنچا، مالا اب دوپٹے کے پلو کو سر پر ٹکاتے رک چکی تھی چہرہ اضطراب اور اندرونی کرب کے باعث دہک رہا تھا۔

”منیر پھپھا اگر کچھ دیر میں وہ حویلی میں نا آیا تو میں باہر آ جاؤں گی“

مالا نے انگلی کو ہوا میں معلق کیے منیر کو تنبیہ کی

”چلو تم میں لے کر آتا ہوں اس کو اندر، تم چلو ادھر“

منیر میاں نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا تو وہ ناک بھینچے واپس صحن کی طرف چل دی جہاں خدیجہ بیگم متواتر اسے ہی کو س رہی تھیں۔

”ہمیں تو بک دے کچھ کہ کیا کرتی پھر رہی ہے تو کس کی قیض ہے کاہے کو اٹھائے پھر رہی ہے، ناس پٹی ایسی ڈھیٹ ہے اپنی مرضی سے زبان کھولتی ہے“

خدیجہ بیگم اس سے مسلسل قیض کے بارے میں سوال کر رہی تھیں اور وہ تھی کہ دم سادھے ہمت جمع کر رہی تھی جو ابھی کچھ دیر میں اسے بہادر کے آگے دکھانی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بہادر کے ساتھ چوہدری حاکم، نوازش، نقیب، لڈن اور گاما بھی ماتھے پر بل ڈالے گھر میں داخل ہوئے تھے، رعب سے قدم اٹھاتے چوہدری حاکم سب سے آگے تھے اور باقی لوگ ان کے پیچھے تھے، بہادر سر کو حد درجہ جھکائے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ منیر نے باہر جا کر بات ہی کچھ اس انداز میں کی تھی کہ چوہدری حاکم اس بات کی تشویش کے پیش نظر سب کو لے کر اندر آ چکے تھے۔ روش سے اٹاری تک کا فاصلہ عبور کرنے کے بعد اب

چوہدری حاکم مالا کے بالکل سامنے کھڑے تھے جو اٹاری کے زینے کے پاس نیچے کھڑی تھی اور باقی سب اوپر تھے۔

”ہاں۔۔ کیا آفت آن پڑی۔۔؟“

چوہدری حاکم نے کٹیلے لہجے میں پوچھا اور گھور کر مالا کی طرف دیکھا جو اس وقت سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ سپاٹ چہرہ لیے کھڑی تھی۔

”مجھے بہادر سے کچھ سوال کرنے ہیں اور باقی سب آپ کو بہادر ہی اپنی زبان سے بتائے گا“

مالا نے سپاٹ لہجے میں چوہدری حاکم کی بات کا جواب دیا اور پھر غصے میں قمیض کو ہاتھ میں جھلاتی بہادر کے بالکل سامنے آنکھڑی ہوئی۔

”پاگل ہوگئی ہے، کیا ہوا ہے؟؟، مجھ سے بات کر پہلے، ہوا کیا ہے اس کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی ہے“ چوہدری حاکم نے دانت پیستے ہوئے مالا کو حکم صادر کیا جو غصے میں تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ اور اب بہادر کے بالکل سامنے کھڑی تھی

”داجی میں نہیں یہ بتائے گا۔۔۔ یہ بتائے گا سب کو۔۔۔ یہ قمیض دیکھ رہے ہو، بھول کیسے ہو اس کو، بولو یہ قمیض تم نے پہنی تھی فرزانہ آپا کے ویلمے کے دن، اور اب یہ حویلی میں میرے ہاتھ میں کیوں ہے“ مالا کو تو آج چوہدری حاکم کے غصے، رعب اور دبدبے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی وہ تو خونخوار شیرنی کی طرح پھر کر بہادر کے آگے کھڑی اس سے سوال کر رہی تھی۔ بہادر نے حیرت سے آنکھیں حد درجہ پھیلانے قمیض کی طرف دیکھا اور اس کی گردن میں گلٹی نے اوپر سے نیچے سفر طے کیا

”نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ مالا بی بی میں نے فرزانہ آپا کی شادی پر نہ ویلمے پر کسی دن بھی یہ قمیض نہیں پہنی تھی میں نے تو ویلمے کے روز سفید قمیض شلوار پہنی تھی، اور یہ تو بعد میں پھٹ گئی تھی ایک دفعہ میں نے یہاں دھلائی کو دی ملی نہیں پھر میں نے لڈن کے ہاتھ پیغام بھی بھیجا تھا ایک دو دفعہ کہ میری قمیض ہے حویلی میں“

بہادر نے حیرت سے بھنویں اچکائی اور پھر سب لوگ جو حیران اور ہم تن گوش تھے ان کی طرف دیکھا۔ لڈن نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات کی تصدیق کی۔

مالا نے لب بھینچے اور بازو جھٹک کر قمیض اس کے پھر سے سامنے کی

”جھوٹ۔۔۔ بلکل جھوٹ یہی پہنی تھی، تقی کا یہ جوڑا تم نے ہی لیا تھا بس اتنا بتاؤ پہلے“

مالا اب تنک مزاجی سے سوال بدل کر پوچھ رہی تھی مسوائے غزالہ کے سب کے ماتھے پر نا سمجھی کے شکن نمودار تھے، غزالہ کے چہرے پر جہاں مالا کی اس حرکت پر خوف تھا وہاں رمنہ کے ذکر پر کرب کی جھلک بھی تھی۔ مالا کے اب والے سوال پر گاما تھوڑا سا آگے ہوا۔

”جی بی بی یہ جوڑا تو مجھے یاد ہے، یہ بہادر نے ہی اٹھایا تھا، کل چار جوڑے تھے جن میں سے نقیب میاں کے دو جوڑے میں نے اور ایک لڈن نے لیا تھا اور چوتھا یہ تقی میاں کا بہادر نے اٹھایا تھا پرویلیمے کے روز تو رمنہ بی بی کے حادثے کے بعد کسی کو کوئی ہوش ہی نہ رہا کہ دیکھتے کس نے کونسا جوڑا پہنا ہے، پر ہوا کیا ہے بیٹی“

گامے نے ناک پر عینک درست کرتے ہوئے بات کی تصدیق کر دی اور ساتھ ہی اس ^{تفشیش} کا سبب پوچھا، مالا نے گامے کے سوال کا جواب دینے کے بجائے گھور کر بہادر کی طرف دیکھا

”ہاں یہ جوڑا میں ہی لے کر گیا تھا،۔۔۔ پر۔۔۔ پرویلیمے کے روز یہ نہیں پہنا تھا میں نے“

بہادر نے بدحواسی میں مالا کی بات سے انکار کیا، وہ نفی میں گردن ہلاتا تھا اور ساتھ ساتھ ارد گرد سب کو کچھ یوں دیکھ رہا تھا کہ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔

”میں جانتی ہوں سب سچ کیا تھا تم یہاں سب کو یہ بتاؤ تم نے رمنہ آپا کو چھت سے کیوں دھکا دیا تھا؟“

مالا نے مٹھیاں بھینچے سوال کیا، سب دم بخود اب مالا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بہادر کی تو آنکھیں پھٹ کر باہر آگئی تھیں اور مالا بڑی باریکی بینی سے بہادر کی تمام حرکات کو جانچ رہی تھی۔

”رمنہ آپا کو چھت سے دھکا کیوں دیا تھا“

مالا نے بہادر کے سامنے کھڑے ہو کر چیختے ہوئے پھر سے وہی سوال دہرایا، جہاں بہادر نے چونک کر سر اوپر اٹھا کر مالا کی طرف دیکھا تھا وہاں باقی سب مکیں بھی دنگ کھڑے تھے کہ وہ اس طرح کیوں چیخ رہی تھی۔

”م۔۔۔ مالا بی بی ک۔۔۔ کیا بات ہے، ہوا کیا ہے؟۔۔۔“

بہادر ابھی بے ربط سے الفاظ ہی ادا کر رہا تھا کہ چوہدری حاکم آگے بڑھے اور مالا کا کندھا جھٹکتے ہوئے اپنی طرف موڑا

”یہ کیا بے تکی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہے ہوا کیا ہے؟ اتنے سال بعد ر منا کی موت کا ذکر کہاں سے آگیا؟“

چوہدری حاکم نے وہ تمام سوال مالا سے کیے تھے جو اس وقت یہاں کھڑے تمام نفوس کے ذہنوں میں گردش کر رہے تھے۔ مالا نے چوہدری حاکم کے غصے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے بہادر کی طرف دیکھا۔

”مہ۔۔۔ مالا بی بی یہ آپ کہہ کیا رہی ہیں میں۔۔۔ میں بھلا کیوں دھکا دوں گار منابی بی کو اور میں تو حویلی کے اندر“

بہادر نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ مالا نے پھر سے بات کاٹی

”شادی کے دنوں میں تمہیں تھی اجازت تم گھوم رہے تھے آرام سے صحن میں اس لیے جھوٹ بولنا اب بند کر دو اور بتاؤ صاف صاف سب کو تم نے میری آپا کو کیوں دھکا دیا اور اب تم کس کو مارنے والے ہو ہم میں سے جلدی بتاؤ نہیں تو تمہارا خون پی جاؤں گی میں“

مالا متواتر چیخ چیخ کر سوال کر رہی تھی، چوہدری حاکم نے غصے سے نوازش اور نقیب کی طرف دیکھا جن کی شادی د غیرت ہی سو گئی تھی۔

”بی بی جی۔۔۔۔۔ مجھ غریب پر اتنا بڑا الزام مت لگائی خدا قسم میں نے ر منابی بی کو دھکا نہیں دیا تھا“

بہادر ہاتھ جوڑے کھڑا تھا، سب بدحواس، انگشت بدنداں کھڑے تھے اور وہ چیخ رہی تھی۔ نوازش اور نقیب چوہدری حاکم کی گھوری پر آگے بڑھے تھے اور پھر مالا کے دونوں بازو دبوج لیے تھے۔

”تم نے ہی دیا ہے اللہ پاک کی جھوٹی قسم مت کھا ذلیل انسان۔۔۔۔۔ میری بہن کو کیوں مارا۔۔۔۔۔؟ اور اب کس کی قبر کھود رہا ہے بتا دے مجھے“

وہ چیختی ہوئی نوازش اور نقیب کے ہاتھوں سے اپنے بازو چھڑوا رہی تھی، چوہدری حاکم نے مالا کی تشویش ناک حالت دیکھ کر قدم آگے بڑھائے

”بہادر تو جا یہاں سے، منیر بہادر کو لے کر جا باہر“

چوہدری حاکم نے ہاتھ کھڑا کیے رعب سے حکم صادر کیا

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ کہیں نہیں جائے گا۔۔۔۔۔ یہ بھاگ جائے گا۔۔۔۔۔ یہ خواب میں بھی بھاگ گیا تھا، اب اس کو مت جانے دو میں سچ کہہ رہی ہوں“

چیچ کر مالا کا گلا بیٹھ رہا تھا سب لوگ اب منہ پر ہاتھ رکھے یہ عجیب و غریب تماشہ دیکھ رہے تھے، نقیب اور نوازش مالا کو گھسیٹتے ہوئے حاکم قصر کے صحن سے اٹاری میں لے آئے تھے وہ تو بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی، چوہدری حاکم نے ضبط سے کچھ یوں بوڑھی جھری دار لب بھینچے کہ ان کے جڑے کی ہڈیاں باہر کو ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”مالا۔۔۔۔۔ چپ بلکل چپ“

چوہدری حاکم کی گرجدار آواز سے حاکم قصر کے درو دیوار کانپ اُٹھے، مالا ایک دم سے چپ ہوئی، چوہدری حاکم نے لڈن، گامے اور بہادر کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا بہادر پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ان کے ساتھ باہر کو بڑھ گیا، چوہدری حاکم نے رُخ مالا کی طرف موڑا

”اب بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے سارا، غزالہ ادھر آ۔۔۔۔۔“

چوہدی حاکم نے رعب سے بیٹی کی جگہ ماں کی پیشی لگائی، مالا اب روتے ہوئے سر کو نفی میں ہلا رہی تھی، غزالہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی یاں اڑے چہرے کے ساتھ، چوہدی حاکم کے سامنے آکھڑی ہوئی اور پھر نگاہیں جھکائے

الف سے بے تک ساری داستان گوش گزار کی سب دم سادھے یہ عجیب سی کتھاسن رہے تھے جو ان کے نگوڑے کانوں نے آج تک نہیں سنی تھی اور عقل چیخ چیخ کر اس داستان سے انکاری تھی۔ غزالہ اب سارا قصہ بیان کرنے کے بعد سر جھکائے مجرموں کی طرح رو پڑی تھی، چوہدی حاکم نے بغور مالا کی طرف دیکھا اور چند پل کے توقف کے بعد گہری سانس لے کر بات شروع کی

”مالا وہ خدا کی قسم کھا رہا ہے، اور وہ کوئی اب سے ہمارے گھر کا ملازم نہیں اس کے باوا ہمارے ہاں کام کرتے ہیں، اس کا باپ آج بھی ہمارے کھیتوں میں ٹریکٹر چلاتا ہے اور اس کے کپڑے پہلے بھی اکثر گھر میں دھلتے ہیں یہ قمیض بعد میں بھی یہاں آسکتی ہے“

چوہدی حاکم کی آواز اٹاری کی خاموشی کو چیرتی ہوئی سب کے کانوں میں داخل ہو رہی تھی، مالا اس وقت بھی غم و غصے کی ملی جلی کیفیت میں ضبط سے کھڑی تھی۔

”اور تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں اپنے بے بنیاد خوابوں کے علاوہ اس لیے اس سب کو خواب سمجھ حقیقت میں تماشے مت لگا“

چوہدی حاکم نے آخری بات ذرا اونچی آواز میں ڈپتے ہوئے کہا اور غزالہ کی طرف دیکھا

”غزالہ ٹھنڈی لسی پی آمالا کو۔۔ اس کے پاگل دماغ کو سکون ملے جس کے ساتھ رہتی ہے اس کی ہی صحبت کا اثر لے بیٹھی ہے پہلے ایک پاگل کم تھا حویلی میں ایک یہ اس کی ہم جولی پیدا ہو گئی ہماری ناک کٹوانے کو“

چوہدری حاکم نے تخت سے اٹھنے کے لیے ہاتھ کو آگے بڑھایا نقیب نے جلدی سے چوہدری حاکم کا ہاتھ تھاما اور پھر وہ سب آگے پیچھے حویلی سے باہر چلے گئے تھے جب کے تلمالتی مالا اب بھی آنکھوں کو سکوڑے کھڑی تھی جسے غزالہ زبردستی اب کمرے کی طرف گھسیٹ رہی تھی۔ اور پوری اٹاری میں چہ مोगیاں ہونے لگی تھیں۔

حویلی کے پچھلے دروازے سے چار زنانہ قدم باہر نکلے تھے، اور اب تیز تیز مٹی سے لدی کچی سڑک پر چل رہے تھے، جیسے جیسے وہ قدم بڑھ رہی تھیں مٹی اڑا کر ان کے پاؤں پر پڑ رہی تھی، عصر کی اذان چاروں طرف گونج رہی تھی، چکی کی کو۔۔۔ کو نے اس خونی سی شام کو اور سحر انگیز بنا رکھا تھا۔ دوراگر سڑک پر سیدھا دیکھو تو سورج نارنجی اور پیلی ملی جلی روشنی سے آسمان کو رنگ رہا تھا۔

سارے گھر والوں کے پرسکون ہوتے ہی وہ سکینہ کو لے کر چوری چھپے گھر سے باہر آگئی تھی اور اب وہ بہادر کے گھر کی طرف رواں دواں تھیں۔ بہادر عصر کے بعد اپنے گھر چلا جاتا تھا اور مالا کو معلوم تھا یہاں رات ہوئی وہاں بہادر اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

مالا نے سیاہ چادر کے ایک کونے کو موڑ کر اپنے لبوں میں دبا رکھا تھا اور ایک طرف سے چادر کو پکڑ کر سر پر ٹکا رکھا تھا، سکینہ حواس باختہ سی اپنی چٹنی سر پر سنبھالتی قدم سے قدم ملائے اس کے ساتھ چلنے کی کوشش میں نہال ہو رہی تھی

”مالا میری بات سن۔۔۔ تو نے اُدھر صبح سب کے سامنے اُس بٹن کا ذکر کیوں نہیں کیا یہ ثبوت تھا تو تیرے پاس بول۔۔۔ بتایا کیوں نہیں چوہدری جی کو“

سکینہ نے حیرت اور تشویش سے سوال کیا، مالا نے چادر سنبھالے اس کی طرف دیکھا، نیلی آنکھوں پر خون سوار تھا جسے دیکھ کر سکینہ گھبراگئی اور دل میں ہی خود کو کوساکیوں اس کے ساتھ حویلی سے چل پڑی اللہ جانے کیا ہو

--

”میں نے جان بوجھ کر نہیں بتایا اسے، میں اس کے چہرے پر خوف دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ خوف کھاتا ہے کہ نہیں کہ یہ سب مجھے کیسے پتا چلا، اگر بٹن کا بتاتی پہلے تو اماں اور سب کی طرح وہ بھی میرے اندازے سمجھ کر شیر ہو جاتا، اب جلدی قدم اٹھاؤ گھر سے بھاگ نا جائے“

مالا نے جوش سے اسے حکم صادر کیا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کنویں کے پاس سے گزر رہی تھیں جہاں بہت سی عورتیں جمع لگائے پانی کے گھڑے بھر رہی تھیں۔ سکینہ کے چہرے پر اب گھبراہٹ واضح تھی۔

بہادر کے گھر کے سامنے جاتے ہی مالا نے ایک لمحے کے توقف کیے بنا لکڑی کا دروازہ دھاڑ دھاڑ کی آواز سے بجا ڈالا، اور کچھ دیر میں دروازے کے دونوں پٹ کھول کر سامنے بہادر ہی کھڑا تھا اور مالا کے کہنے کے عین مطابق مالا کو یہاں دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔

”مالا۔۔۔ بی۔۔۔ بی یہاں۔۔۔ کہ۔۔۔ کہ۔ کیا ہوا؟“

وہ حواس باختہ ٹوٹے پھوٹے ٹکڑوں میں بٹے لفظ ادا کر رہا تھا، مالا نے نگاہ اٹھائے اس کے پیچھے دیکھا، اس کے بال پیچھے کچے صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھی بوڑھی عورت اور ایک جوان عورت حیرت سے دروازے کی ہی طرف تاک رہی تھیں یقیناً ایک اس کی ماں اور دوسری بیوی تھی۔

”بتاتی ہوں تمہیں۔۔۔ ہٹو ذرا“

مالا نے اسے سامنے سے ہٹنے کا اشارہ کیا

”مالا بی دیکھو یہ بات غلط ہے میں حویلی میں سارا معاملہ نمٹا کر آیا ہوں آپ ادھر کیوں آئی ہیں“

بہادر نے بوکھلاہٹ میں دروازے سے ہٹے بنا جواب دیا

”تم بھی جانتے ہو میں کیوں آئی ہوں کیونکہ اگر میں یہاں نا پہنچتی تو تم آج رات کو ہی بھاگ جاتے اب ہٹو پیچھے“
مالا نے اب تقریباً اسے دھکادیا تھا وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوا مالا اب تیز تیز چلتی صحن کے وسط میں چارپائی کے پاس آچکی تھی

”مالا بی بی یہ کیا کر رہی ہو یہ غلط کر رہی ہو میں کہہ رہا ہوں میں چوہدی جی کو بتادوں گا سب“
بہادر گڑبڑا گیا تھا اور تیز تیز قدم چلتا قریب آیا اور وہ اب بہادر کی ماں کے سر پر کھڑی تھی۔
”اُو یہاں۔۔۔۔۔ اپنی ماں کی سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ تم نے ویلیسے پروہ قمیض نہیں پہنی تھی“
مالا نے دانت پیستے ہوئے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا، سکینہ جو ابھی تک دروازے کا کواڑ تھا مے کھڑی تھی گھبرا کے وہاں سے واپس پلٹی۔

بہادر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا، سامنے کھڑی یہ لڑکی جس کے سر پر خون سوار تھا اسے کسی بھی صورت بخشنے کو تیار نہیں تھی۔
”مالا بی بی میں اپنی اماں کے سر کی قسم کیوں کھاؤں میں بتا چکا ہوں کہ میں نے نہیں پہنی تھی قمیض تو بس نہیں پہنی تھی“

بہادر نے جھنجھلاہٹ اور غصے میں سر گھماتے ہوئے قسم کھانے سے انکار کیا، چارپائی پر بیٹھی جوان عورت ایک جھٹکے سے چارپائی سے اُٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی اور اب دیدے پھاڑ پھاڑ کر بہادر کو دیکھ رہی تھی۔
”ہاں تو اگر سچ بول ہی رہے ہو تو کھاؤ اپنی اماں کی قسم، خدا کی بھی تو کھاگئے تھے، ماں کو کھونے کا اتنا ڈر ہے اور وہ جو ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے اس کا کوئی ڈر نہیں“

”رُکو۔۔۔ رُکو اب کہاں جاتے ہو ذلیل انسان۔۔۔۔۔ اب قسم کھاتا کیوں نہیں“

”کھولو دروازہ۔۔۔۔۔ دروازہ کھولو میں کہتی ہوں، نکلو باہر“

“_____”

”تقی۔۔۔ وہ بہادر تھا۔۔۔ وہ بہادر ہی تھا۔۔۔ اس کو باہر نکالو، اس سے پوچھو سب کیوں دھکا دیا تھا آپا کو اور اب کون ہے جس کی قبر کھود رہا ہے یہ“

مالا کانپتی سی تقی کا گریبان تھا مے ہوئی تھی، تقی نے گھور کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر لب بھینچے جیسے ہی دروازے کے پاس گیا بہادر پہلے دروازہ کھول چکا تھا اور اب سر جھکائے کھڑا تھا

بہادر نے کانپتے سے ہاتھ تقی کے آگے جوڑے تھے، تقی کو لگا سر پر کوئی آسمان آگرا ہوا بے ساختہ اس نے اپنا ماتھا تھام لیا تھا اور پھر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ کر بہادر کا گریبان دبوچ لیا

تقی تو ہوش کھو بیٹھا تھا، دل پھٹنے کی حد تک آگیا تھا دل کیا وہ پل واپس آجائیں وہ رونا کا ہاتھ تھام کر کھینچ کر چھت پر جانے سے روک دے اور کہے بتاؤ کیا بات ہے۔ مالا اب منہ پر ہاتھ رکھے زور زور سے رو رہی تھی۔

تقی بہادر کے منہ پر گھونسے جڑ رہا تھا اور وہ آرام سے مار کھا رہا تھا، اس کے ناک سے خون بہہ نکلا تھا پر اس کی نگاہ جھکی ہی تھی تقی مسلسل اس سے کیوں؟ کیوں؟ پوچھ رہا تھا پر وہاں وہ چپ سادھے کھڑا تھا۔

تقی نے اس کا گریبان دبوچ کر اسے اوپر اٹھایا تھا پھر جھٹکے سے نیچے کیا

”بتا اب اور کس کو مارنا ہے تو نے بتا کس کو مارنا چاہتا ہے رمنّا کے ساتھ کیوں کیا ایسا بتا کیوں دھکا دیا“

تقی پاگل ہو گیا تھا۔۔۔ وہ بے حال سا اسے مارے جا رہا تھا اور سوال پر سوال کر رہا تھا بہادر ادھ موہو گیا تھا، پھر اس کی کانپتی سی آواز گونجی

”تقی میں نے رمنابی بی کو دھکا نہیں دیا تھا، میں تو ان کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا، دھکا کسی اور نے دیا تھا“

وہ کرب سے لب بھینچے بول اٹھاتا، تقی کا ہاتھ ایک دم سے تھم گیا

”کون۔۔۔ کس نے دیا۔۔۔ کس نے دھکا دیا تھا“

مالا نے گڑ بڑا کر آگے ہوتے ہوئے سوال کیا، چند لمحے کی ہولناک خاموشی کے بعد بہادر کی آواز گونجی

”منہا۔۔۔۔۔“

بہادر کے منہ سے جو نام نکلا تھا وہ سامنے کھڑے دونوں نفوس کو مجسم بنادینے کے لیے کافی تھا۔۔۔ عقل دنگ تھی تو زبان گنگ۔ بہادر تقی کے بالکل سامنے زمین پر بیٹھا تھا، دو قدم کی دوری پر مالا آنکھیں پوری کھلے کھڑی بہادر کی طرف دیکھ رہی تھی، تقی نے بھنویں بے یقینی سے سیکڑیں، جبرے ضبط اور غصے کی پیش نظر باہر کو ابھرے

”کہ۔۔۔ کک۔۔۔ کس کا نام لیا ابھی تم نے پھر سے۔۔۔ پھر سے لو؟“

تقی کی زبان لڑکھڑاگئی تھی، ایسا ہی کچھ حال ساتھ کھڑی مالا کا تھا جس کی بے یقینی اور حیرت نے اس کی چہرے کو زرد کر دیا تھا اور صحن میں کھڑی خواتین میں سے سکینہ کا ہاتھ منہ پر تھا تو باقی دونوں بھی متحوش حالت میں کھڑی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ منہابی بی نے دھکا دیا تھا ر منہابی بی کو“

بہادر نے نگاہیں جھکا دیں تھیں اور اب اس کی جھکی نگاہیں بھی وہ چہرہ رہا تھا، سر کو زمین پر جھکائے وہ دھیرے سے تاسف میں دایں بائیں جنبش دیتا ہوا ماتم کی سی کیفیت میں لگ رہا تھا، مالا اچانک پلکیں جھپکاتی آگے بڑھی ”تقی یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ جھوٹ بول رہا ہے، بکو اس کر رہا ہے۔۔۔ منہا آپا ایسا کیوں کرے گی جھوٹ بول رہا ہے یہ، اس کو مارو تقی، اسے زندہ نا چھوڑنا“

مالا نے چیخ کر تقی کے کندھے کو ہلایا، وہ پاگلوں کی طرح حیرت میں ڈوبے کھڑے تقی کو ہلاتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی، بہادر نے فوراً گڑبڑا کر چہرہ اوپر اٹھایا ”نہیں۔۔۔ مالا بی بی۔۔۔ میں۔۔۔“

بات کو ادھورا چھوڑ کر بہادر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا تھا اور پھر صحن کے وسط میں موجود چارپائی پر بیٹھی اپنی ماں کے سر پر جا کھڑا ہوا، کانپتا سا ہاتھ اٹھا کر اپنی ماں کے سفید چادر سے ڈھکے سر پر رکھ دیا۔

”مالا بی بی۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، یہ جوڑا میں نے ہی پہنا تھا اور یہ جیب بھی ر منہابی بی ہی نہیں پھاڑی تھی، پر اس دن چھت پر ر منہابی بی کو دھکا میں نے نہیں منہابی بی نے دیا تھا میں نے تو لپک کر ان کو بچانے کی کوشش کی تھی جس میں ناکام رہا میرا یقین کرو“

سورج غروب ہو گیا تھا اور اندھیرا کچے صحن، کچی مٹی کی دیواروں اور یہاں مجسم کھڑے نفوس کو اپنے لپیٹ میں لے رہا تھا، اندھیرا صرف درو دیوار میں نہیں پھیل رہا تھا بلکہ یہاں کھڑے تمام نفوس کے دل بھی اس اندھیرے کی لپیٹ کے باعث سیاہ ہو رہے تھے اور چہرے پر دھواں بھر رہا تھا، چند پل کی ہولناک خاموشی کے بعد بہادر تقی کی طرف بڑھا تھا، من من بھاری ہوتے قدم اٹھاتا وہ حیران سے کھڑے تقی کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا۔

”تقی بھائی پہلے سب ٹھیک چل رہا تھا۔۔۔۔۔ جب رمنابی بی بھی سکول جاتی تھی، میں رمن اور منہابی بی کو ان کے سکول سے لیتا، پھر فرہاد باؤ کو ان کے سکول سے اٹھاتا اور حویلی چھوڑ دیتا“

بہادر نے سر مزید جھکایا اس کا لہجہ ندامت سے چور تھا، جسم میں ہلکی سی لغزش تھی پیشانی، گردن اور ماتھے پر پسینے کے ننھے قطرے تھے۔

سن 1986 جون کی چلچلاتی دھوپ، لڑکیوں کے سکول کے گیٹ کے آگے تار کول میں لیٹی گاؤں کی واحد پکی سڑک لک کی طرح تپ رہی تھی۔

سڑک پر سکول کے گیٹ کے بالکل پاس کھڑی حاکم قصر کی گاڑی بھی تپنے لگی تھی، بہادر لڑکیوں کے سکول کے باہر گاڑی لگائے منہا کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا، منہا سکول کی چھٹی ہو جانے کے بعد بھی دس پندرہ منٹ بعد ہی دوستوں سے گپ شپ لگا کر نکلتی تھی، پہلے جب ر مناسکول جایا کرتی تھی، تو وہ منہا کو بھی گھسیٹ کر جلدی باہر لے آتی تھی لیکن اب جب سے ر منانے سکول چھوڑا تھا بہادر کو منہا کے لیے یو نہی انتظار کی سولی پر لٹکنا پڑتا تھا۔ بہادر خان کا سفید چہرہ چلچلاتی دھوپ کے باعث سرخ پڑ گیا تھا، وہ بالکل اپنے باپ پر گیا تھا، لمبا قد خوب روچہرہ، بہت زیادہ سفید رنگت، اس کا باپ پٹھان اور ماں پنجابی تھی جس کے عشق میں گرفتار ہو کر بہادر کا باپ اکبر خان اسے بھگا کر اس گاؤں میں لے آیا تھا اور پھر یہاں چوہدری حاکم کے ہاں ملازمت کرنے لگا وہ پہلے کسی شہر کارہائی شتی تھا اور اُدھر بس ڈرائی یور تھا، ڈرائی یونگ تو جانتا ہی تھا اس لیے یہاں چوہدری حاکم کے کھیتوں میں ٹریکٹر چلانے لگا، وہ اور اس کی بیوی خالی ہاتھ بھاگ کر گاؤں آئے تھے اس لیے اب غربت کے باعث بہادر کو پڑھا نہیں سکے تھے، بہادر بچپن سے ہی حویلی کے برانڈوں میں چھوٹے موٹے کام کرنے لگا اور تھوڑا سا بڑا ہوا تو نقیب حاکم نے اسے گاڑی چلانا سیکھا کر حاکم قصر کا ڈرائی یور بنا دیا۔

وہ سولہ سال کا تھا تب سے ہی حاکم قصر کی گاڑی چلانے لگا۔ وہ زیادہ تر حویلی کے معمول کے کاموں کے لیے گاڑی چلاتا تھا جس میں بچوں کو سکول لے کر جانا اور واپس لانا، خواتین کو بازار لے جانا، اریب بیگم تو آئے دن بازار جاتی تھیں۔

وہ صبح منہا اور فرہاد کو سکول چھوڑ کر تفتی کو شہر کالج چھوڑ کر آتا تھا، تفتی کیونکہ کالج کے بعد ٹیوشن بھی لیتا تھا اس لیے وہ واپس گاؤں آجاتا تھا یہاں سے منہا اور فرہاد کو گھر چھوڑنے کے بعد وہ شام کو تفتی کو پھر سے شہر سے واپس لینے جاتا تھا۔

اب بھی وہ منہا کے سکول کے سامنے کھڑا اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا، سارا سکول خالی ہونے والا تھا اور منہا تھی کہ نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھی، اُسے اب منہا کا سکول کے سامنے انتظار کرنا بہت کوفت میں مبتلا کرتا تھا، منہا رونا سے بہت مختلف تھی، شوخ چنچل اور باتونی اور یہی وجہ تھی وہ سکول میں چھٹی ہونے کے بعد بھی دوستوں سے باتیں کرتی رہتی تھی۔

وہ یونہی بے زار صورت بنائے تپتی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا جب منہا تفتی لگاتی سکول کے گیٹ سے باہر نکلی، بہادر نے شکر کا کلمہ پڑھا اور جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ منہا سر پر بڑی سے سیاہ چادر جماتی، بستے کو کندھے پر درست کرتی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی، بہادر گھوم کر ڈرائی یونگ سیٹ پر آچکا تھا۔

بہادر نے سر جھکائے گاڑی سٹارٹ کی اور پھر شائستگی سے منہا کو پکارا جو پیچھے بیٹھی گود میں بستہ دھر کر انگلی میں پا پڑ ڈالے اسے کڑک۔۔۔ کڑک۔۔۔ کی آواز کے ساتھ کھانے میں مصروف تھی۔

”منہا بی بی۔۔۔ آپ بہت دیر لگاتی ہو جلدی سکول سے نکلا کرو“

بہادر نے بڑے مہذب لہجے میں منہا سے سکول جلدی باہر آنے کی درخواست کی تھی پر منہا تو اس کی اس جرأت پر ہتھے سے اُکھڑ گئی۔

”کیوں۔۔۔ آپ کو کیا مسیٰ لہ ہے انتظار کر لیا کریں“

منہانے ناگواری سے پیشانی پر بل ڈالے اور منہ چڑانے کے انداز میں دائیں بائیں گھماتے ہوئے پھر سے پاڑ کھانے لگی۔ بہادر گاڑی سٹارٹ کر چکا تھا

”منہابی بی پر آپ بہت زیادہ دیر لگاتی ہیں پھر فرہاد میاں کو بھی لینا ہوتا ہے سکول سے وہ پھر مجھے جھاڑتے ہیں“ بہادر اسے شائستگی سے وضاحت دے رہا تھا جواب لب بھینچے بہادر کی بات برداشت کرنے کے انداز میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی، آج پہلی دفعہ اس کی یوں بہادر کے ساتھ بات ہو رہی تھی۔

”اس لنگور کو لینا ہی کیوں ہوتا ہے گاڑی پر، اپنی سائی یکل پر کیوں نہیں جاتا وہ سکول، آیا بڑا مہاراجا، اتنا پاس تو سکول ہے اس کا“

منہانے تنک مزاجی سے فرہاد کی بات پر اور غصہ دکھایا، بہادر نے لب بھینچے اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا، منہا غصے سے تھوڑا سا آگے کھسکی اور سیٹ پر کہنی ٹکائے گھور کر بہادر کو دیکھا

”اور ہاں خبردار جو آج کے بعد مجھ پر اس طرح کا حکم چلایا تو میری مرضی میں جب بھی سکول سے نکلوں، آپ کون ہوتے ہیں مجھ پر حکم چلائیں جلدی آؤ باہر“

منہانے غصے سے ناک کے نتھنے پھلائے بہادر کو اس کی اوقات یاد دلائی، بہادر خاموشی سے گاڑی لڑکوں کے سکول کے آگے روک چکا تھا، گاڑی کو دیکھتے ہی سکول کے گیٹ کے پاس بیٹھا چوکیدار اٹھ کر آگے آیا۔

”فرہاد تو چلا گیا ہے حویلی“

چوکیدار نے ہاتھ لمبا کرتے ہوئے بہادر کو فرہاد کے جانے کی خبر دی، بہادر نے تاسف سے گردن ہلائی، وہ آج بھی انتظار کر کے چلا گیا تھا۔ بہادر نے پہلی دفعہ منہا کو اس کی غلطی باور کروانے کی غرض سے گاڑی کے شیشے کی اوٹ سے پیچھے دیکھا وہ پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بہادر کے یوں دیکھنے پر اس نے بڑی ادا سے کندھے اچکا دیے اسے تو فرہاد سے ویسے بھی بہت چڑھتی تو کیا ہوا اگر انتظار کر کے چلا گیا تھا تو۔۔۔ بہادر اب حویلی کے رستے پر گاڑی موڑ چکا تھا۔

چھت پر لگے پتکھے کی گھوں گھوں منہا کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی، یہ بلقیس اور نقیب حاکم کا کمرہ تھا جہاں ایک طرف دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں کے بالکل سامنے منہا سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑی تھی اور سامنے کرسی پر نقیب حاکم غصے سے سرخ چہرہ لیے بیٹھے تھے۔

”تمہیں شرم نہیں آتی اگر وہ بیچارہ گھر کا ڈرائیور ہے تو کیا وہ انسان نہیں، کتنی دھوپ ہوتی ہے جہاں وہ باہر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوتا ہے اور تم ہو کہ نکلتی ہی نہیں سکول سے“

نقیب حاکم رعب دار آواز میں اسے جھڑک رہے تھے اور وہ تھی کہ اس بات پر اندر سے اُبل رہی تھی، بہادر کی اتنی جرأت اس نے ابا کو اس کی شکایت لگا دی تھی کہ وہ سکول سے دیر سے نکلتی ہے۔

”خبردار اب اگر دیر سے نکلی تو سکول سے، اب جاؤ یہاں سے۔۔۔ ایک تو یہ تقی کی ضد بھی عجیب ہے نہیں تو جب اباجی نے رونا کو گھر بیٹھایا تھا میں تمہیں بھی ساتھ ہی بیٹھالیتا تو اچھا ہوتا“

نقیب حاکم نے غصے سے ڈپتے ہوئے اسے جانے کے لیے کہا تو منہا جھرجھری لے کر تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ نقیب حاکم کی وہ لاڈلی تھی پر جس دن وہ کبھی یوں اسے ڈانٹ دیں تو بس اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے اور آج تو ساتھ میں بہادر پر غصہ بھی تھا۔

اتنی ذلت پر تو ایک دم سے گرم سیال گالوں پر بہہ نکلا تھا، وہ نا صرف نقیب کی لاڈلی تھی بلکہ فرزانہ، تقی، فرہاد اور مناسب سے چھوٹی تھی اس کے بعد تقی اور مالا بہت دیر بعد اس دنیا میں آئے تھے اس نے کافی عرصہ سب سے

لاڈا اٹھاوائے تھے۔ پھر اس کے بعد پیدا ہونے والی مالا تو ایسی آفت کی پرکالا ثابت ہوئی تھی کہ تفتی کے علاوہ کوئی بھی اسے پیار نہیں کرتا تھا۔

رمناتو اسے اپنی چھوٹی بہن مالا سے بھی زیادہ چاہتی تھی دونوں میں عمروں کا لے دے کر بس دو سال کا فرق تھا اس لیے رمناک کی اس سے بہت دوستی تھی۔

منہا گالوں پر لڑھکتے آنسو صاف کرتی اب اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جب اٹاری کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی رمنانے اس کو دیکھا اور پھر جلدی سے پریشان صورت بنائے اس کے ساتھ قدم ملاتی اس کے کمرے میں آچکی تھی۔

”ارے منہا۔۔ کیا ہوا رو کیوں رہی ہو؟“

رمنانے پریشان سے لہجے میں اس کے رونے کا سبب پوچھا، وہ ایسی ہی تھی بات بات پر پریشان ہو جانے والی سب کا خیال رکھنے والی۔

”رمنانے۔۔ میرا دل کر رہا ہے اس بہادر کے بچے کا گلابادوں میں بد تمیز کہیں کا“

منہانے غصے سے ماتھے میں بل ڈالے روندھائی آواز میں کہا رمنانے پریشانی پرنا سمجھی کے شکن ڈالے اسے دیکھا

”ہیں۔۔۔ کیا ہوا بہادر نے کیا۔۔ کیا؟“

رمناک کی چہرے پر اب حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی تھی، منہانے لب بھینچے چہرہ اوپر اٹھایا

”اس نے ابا کو میری شکایت لگادی کہ میں چھٹی کے وقت دیر سے سکول سے نکلتی ہوں ابانے مجھے اتنا ڈانٹا مت پوچھو“

منہا اب روہانے لہجے میں اسے ساری بات سے آگاہ کر رہی تھی، اور وہ معصوم سی صورت پر پوری آنکھیں کھولے منہا کو دیکھ رہی تھی۔

”ہا۔۔۔۔۔ بہادر ایسا لگتا تو نہیں“

رمنانے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں

”نہیں۔۔۔۔۔ جی اب وہ نہیں رہا بہادر، بھائی کے ساتھ شہر جاتا ہے تو پتا نہیں خود کو سمجھنے کیا لگا ہے، کل پتا ہے کتنی بد تمیزی کی اس نے میرے ساتھ“

منہانے آنسو صاف کیے رمنان کی طرف دیکھا رمناب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی

”مجھے کہتا۔۔۔۔۔ منہابی بی جلدی سکول سے نکلا کرو بہت دیر لگاتی ہو“

منہانے براسا منہ بناتے ہوئے بہادر کی نقل اتاری، رمنان نے نظریں چرائیں۔

”منہا۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ یہ بات اتنی غلط بھی تو نہیں کہی نا اس نے، تم جلدی نکل آیا کرو، مجھے پتا ہے تم ہمیشہ کی طرح حمیرا کے ساتھ کاناباتی میں جُت جاتی ہوگی“

رمنانے خفگی سے منہا کو گھورتے ہوئے اس کی غلطی باور کروائی تھی، رمناب سکول جاتی تھی تو چھٹی کے وقت زبردستی اسے گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ باہر لے آتی تھی۔

”چل۔۔۔۔۔ تیری ایک کمی تھی تو بھی مجھے ہی غلط کہہ لے“

منہانے دکھ بھرے لہجے میں خفگی کا اظہار کیا، تو رمناب آہستگی سے مسکرا دی

”جھلی۔۔۔۔۔ سمجھا رہی ہوں تمہیں، اگر تم اس وقت ہی اس کی بات پر عمل کر لیتی اور جلدی آنے کا کہہ دیتی تو وہ یوں شکایت نا لگاتا تا جی کو“

رمنانے بڑے رسان سے سے اسے سمجھایا تھا

”تم دیکھنا میں اسے صبح اچھی سنائوں گی، سمجھتا کیا ہے خود کو“

منہانے دانت پیستے ہوئے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا

”منہا غلط بات۔۔۔ خبردار بات کی اس سے تو بس بات کو ختم کرو، کیوں طول دوگی“
رمنہ نے پیشانی پر بل ڈالے اسے سمجھایا پھر اس کے پھولے گال کو کھینچتے ہوئے گلے لگایا۔ پر منہا کے اندر جو آگ
جل رہی تھی وہ کہاں بجھنے کو تھی۔ وہ دانت پیسے سامنے دیوار کو گھور رہی تھی

منہا آج پورے وقت پر پھوں پھوں کرتی سکول سے باہر نکلی تھی، بہادر نے اسے حیرت سے دیکھا اور جلدی سے
آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔
گاڑی میں بیٹھتے ہی منہا نے گاڑی کا دروازہ پوری قوت سے مارا تھا، بہادر اب گھوم کر ڈرائی یونگ سیٹ پر آ رہا تھا۔
بہادر جیسے ہی گاڑی میں بیٹھا منہا غصے سے کھسک کر سامنے والی دونوں نشستوں کے درمیان میں آئی۔
”تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟“

منہا نے غراتے ہوئے سوال کیا، بہادر کا گاڑی کی چابی کو گھومنے کے لیے بڑھا ہاتھ وہیں تھم گیا، نا سمجھی میں سامنے
دیکھا وہ کبھی بھی بلا وجہ حویلی کی خواتین کو نہیں دیکھتا تھا۔
”جی۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ بی بی جی؟“

اور اب بھی بہادر نے بنا پیچھے دیکھے بھنویں سیٹ کر اس کے یوں کہنے کی وجہ طلب کی
”تم نے ابا کو میری شکایت لگادی، ابا نے مجھے اتنا ڈانٹا، تمہیں ذرا شرم نہیں آئی، آخر کو میں کتنا دیر سے نکلتی تھی
بس پانچ منٹ، تو کیا اس میں تم جل کر مر جاتے“

منہا غصے میں اس پر برس پڑی تھی اور وہ حواس باختہ اب سامنے لگے بیک مر میں اسے دیکھ رہا تھا۔
”منہا۔۔۔ بی بی ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ“

منہا کی زبان کو بریک نالگتی دیکھ کر بہادر نے گڑبڑاتے ہوئے اسے روکا تھا

”بی بی میں نے تو صاب کو ایسا کچھ نہیں بتایا“

بہادر نے انگلی ہوا میں معلق کیے اپنی بات وثوق سے کہی پر منہا کا تو غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا
”جھوٹ بولتے ہو تم، تم نے ہی بتائی ہے ابا کو، اتنا ڈانٹا ابا نے زندگی میں پہلی دفعہ مجھے“

منہا درشت لہجے میں گویا ہوئی وہ آج اتنے غصے میں تھی کہ بہادر کو آپ کے بجائے تم تم کہہ کر مخاطب کر رہی تھی
، بہادر نے منہا کی بات پر لب بھینچے اور سنجیدگی سے گاڑی سٹارٹ کی، اور پھر بنا پیچھے دیکھے گردن کو تھوڑا سا خم دیا
”آپ کو میری بات پر یقین کرنا ہے کرو نہیں کرنا کرو، میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا، میں نے کسی کو کوئی شکایت
نہیں لگائی“

پہلی دفعہ منہا نے بہادر کو یوں اکڑ کر بات کرتے ہوسنا تھا اور بہادر کی یہ اکڑ اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی
دل میں کچھ سوچتے ہوئے وہ پیچھے ہوئی اور گاڑی کی نشست کی پشت سے ٹیک لگادی

سورج کی تیز تپش اور جسم کو جلاتی گرم ہوا جلد پر تپتے تھپڑوں کی مانند لگ رہی تھی، سفیدے کے لمبے درخت
گرم ہوا کے جھکڑ چلنے سے ہولے ہولے دائیں بائیں جھولتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔
لڑکیوں کے سرکاری سکول کی اس عمارت میں جگہ جگہ لگے سفیدے کے درختوں کے نیچے رکھے لکڑی کے بیچ،
درختوں کی بخشی ہلکی چھاؤں کے باعث اتنے گرم نہیں تھے، منہا سپاٹ چہرہ لیے بیچ پر بیٹھی تھی، سانولے رنگ
کی پرکشش نقش رکھنے والی یہ لڑکی پہلی دفعہ اپنے اندر موجود ضد سے اس بری طرح آشنا ہوئی تھی۔

بچپن سے ہی فرہاد سے تو چڑھتی ہی کیونکہ فرہاد کو چھوڑ کر سب اس سے لاڈ کرتے تھے لیکن فرہاد کی سب کے
ہاتھوں ہو جانے والی درگت اسے اندر سے سرشار کر دیتی تھی اور ضد کو تھپکی مل جاتی تھی پر بہادر کے معاملے میں
سب کچھ الٹ تھا بہادر گھر کا ملازم تھا جس کا ذکر ہو کھل کر کسی سے کر بھی نہیں سکتی تھی اور جتنے لوگوں سے کیا بھی

تھاسب نے بہادر کو ہی درست قرار دے دیا تھا اور اب بچہ پر اسی ضد کے طوفان میں بیٹھی وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

اس کے برابر میں بیٹھی حمیرا نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے، کتاب بستے میں رکھی اور گردن گھما کر گہری سانس باہر اندیلتی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”چل اب بس کر بیس منٹ ہونے کو آئے ہیں، اب تو اٹھ جا، اگر اس نے شکایت لگا بھی دی تھی تو کچھ غلط نہیں کیا، تو واقعی ہی بہت ضدی ہو رہی ہے، اس چھوٹی سی بات کو لے کر“

حمیرا نے سنجیدگی سے اسے وہی بات سمجھائی جو وہ صبح سے اسے بیسوں بار، اور ر مناتین دن سے بار بار سمجھا چکی تھی، وہ تین دن سے دوبارہ دیر سے سکول سے باہر نکلنے لگی تھی، ذہن غصے اور ذلت جیسے احساس میں جکڑا گیا تھا اور وہ بلاوجہ ہی بہادر سے ضد لگا بیٹھی تھی بس جتنی عمر تھی دماغ کی سوچ اس سے آگے نہیں بڑھی تھی، عمر کا یہ دور ایسا ہی ہوتا ہے جب تمام محسوسات کا درجہ بہت اونچائی رکھتا ہے یہ انسان کی عمر کا بہت نازک دور ہوتا ہے لڑکپن سے نکل کر جوانی میں قدم رکھنے کا دور اور وہ اسی دور میں قدم رکھ چکی تھی جہاں لڑکپن کی بہت سی عادات اب جوانی کے جذبول سے ملاپ کرتے ہوئے اس کی شخصیت کو پروان چڑھا رہی تھیں۔

ہاں ہم جب بھی بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھتے ہیں یا لڑکپن سے جوانی میں تو عمر کے پچھلے درجے کی عادات اگلے درجے کے جذبول کے ساتھ ملاپ کر کے ہماری شخصیت بناتی ہیں۔ اور وہ بچپن سے لڑکپن اور اب لڑکپن سے جوانی میں اپنی ضد کی عادت کو اپنے جذبول کے ساتھ لپیٹتی اپنی شخصیت کا خاصہ بناتے ہوئے پروان چڑھ رہی تھی، جبکہ ر منا اس کے برعکس اپنی عمر سے زیادہ عقل مند تھی۔

حمیرا کی بات پر اسے بھی احساس ہوا کہ آج تو واقعی اس نے دیر کر دی، سر جھکائے اٹھی اور چادر سر پر درست کرتے، گیٹ کی طرف حمیرا کے ساتھ قدم بڑھا دیے، باہر آئی تو گیٹ پر نانا تو بہادر تھا اور نہ ہی کوئی گاڑی تھی۔

حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ کیا اتنی اکڑ میں آگیا کہ اس کے دیر سے نکلنے پر آج واپس ہی چلا گیا۔

پیشانی پر اس اچانک وارد ہونے والی افتاد پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے، حویلی جانے کا راستہ اتنی گرمی میں وہ اکیلی ہرگز طے نہیں کر سکتی تھی۔

ایک غصہ تھا دوسرا اب بہادر کی اس اکڑ پر رونا آ رہا تھا، حمیرا نے بھی اس کی پریشان صورت دیکھی اور اپنے گھر کی طرف بڑھتے قدم روک کر اس کے قریب آگئی۔

”پریشان ناہو کیا پتا آج آیا ہی ناہو“

حمیرا نے اس کی پریشانی کے پیش نظر اپنے خیال کا اظہار کیا، وہ جو دھوپ کی تپش اور غصے کی تلملاہٹ میں تپ رہی تھی آنکھوں کو اور لبوں کو ایک ساتھ سکڑا۔

”نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا، اگر کبھی ایسا ہو تو ابا خود دوسری گاڑی پر لینے آ جاتے ہیں مجھے وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے“

منہانے پریشان سی صورت بنائے غصے میں وضاحت دی اور لب بھینچے ایک جھٹکے سے بستے کو کندھے پر درست کیا

”اچھا اتنا پریشان ناہو منہا، چلو میرے گھر چلتے ہیں وہاں سے پھر اماں کو کہتی ہوں تمہیں حویلی تک چھوڑ آئی گی“

حمیرا نے اسے یوں اکیلے پریشان اور غصے میں کھڑے دیکھ کر مشورہ دیا، منہانے جزبہ کیفیت میں اس کی طرف دیکھا وہ ابھی یونہی پریشان کھڑی تھی جب سامنے پکی سڑک پر فراٹے بھرتی اور دھول اڑاتی گاڑی پر نگاہ پڑی، گاڑی جو نہی ان کے قریب آ کر رکی بہادر تیزی سے گاڑی سے باہر نکلا، منہا بھی غصے میں تلملاتی برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھی اور جیسے ہی وہ گھوم کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنے کے لیے اس کے قریب آیا، منہانے بنا سوچے سمجھے، اس کے پاس جا کر، اس کے گال پر زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا۔

بہادر گال پر ہاتھ رکھے ہکا بکا کھڑا تھا، اسی لمحے گاڑی کی پچھلی نشستوں کی طرف کا دروازہ کھلا اور فرہاد تیزی سے باہر نکلا، وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا گاڑی کے پچھلی نشست کے شیشوں کے آگے پردے لگائے گئے تھے جن کے باعث منہا کو پہلے فرہاد کے پیچھے بیٹھے ہونے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔

”منہا۔۔۔ پاگل ہوگئی ہو کیا؟“

منہا کی اس حرکت پر فرہاد کا منہ کھل گیا، منہا نے ایک نظر فرہاد کو دیکھا اور پھر حیرت سے بہادر کی طرف دیکھا جو اب سر جھکائے کھڑا تھا

”ایک تو تم دیر سے نکلتی ہو سکول سے اس پر اگر میں نے اسے کہہ دیا کہ منہا ڈھیٹ ہے تم مجھے پہلے لے لیا کرو تو تم نے اس بچارے کے تھپڑ جڑ دیا“

فرہاد نے تاسف سے ناک بھینے اسے سنائی

”کوئی بچارا نہیں یہ، اس نے ابا کو بھی اس بات کی شکایت لگا دی تھی، مجھے ہو جاتی ہے کبھی دیر سکول سے نکلنے کو کیونکہ آخری جماعت ریاضی کی ہوتی ہے، پر یہ ہے کہ۔۔۔۔ اس نے میری شکایت لگا دی ابا کو“

منہا مٹھایاں بھینے فرہاد کو اپنے غصے کی اصل وجہ بیان کر رہی تھی، فرہاد نے تاسف سے سر کو دائیں بائیں ہلایا

”وہ سب میں نے بتایا تھا ماموں کو اس نے نہیں، آئی بڑی، پاگل کہیں کی“

فرہاد نے جیسے ہی اسے حقیقت کا بتایا تھا منہا نے چونک کر بہادر کی طرف دیکھا، وہ نگاہیں جھکائے نادم کھڑا تھا، وہ جو اس دن سے غصے میں بیچ و تاب کھا رہی تھی ایک دم سے دل ڈوب گیا اور بری طرح اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ ایسی ہی تھی غصے میں بے قابو ہو کر سوچے سمجھے بنا انتہائی قدم اٹھالیتی تھی اور پھر جب اپنی غلطی کا احساس ہوتا تو ندامت کا احساس بھی اندر ایسے کچھ کے لگانے لگتا کہ وہ بے حال ہو جاتی۔

”اب بیٹھو گاڑی میں کیوں ایسے کھڑی ہو“

فرہاد نے اس کے یوں مجسم بن جانے پر اسے ٹھوکا تھا، وہ پریشان سی چور نگاہ بہادر پر ڈالتی، سر ہلاتی وہ فرہاد کے ساتھ پیچھے بیٹھ رہی تھی اور

بہادر خاموشی سے ڈرائی یونگ سیٹ کی طرف جارہا تھا۔

گرم موسم کی عید کے باوجود بھی گاؤں کی گہما گہمی دیدنی تھی، گاؤں کے چوک میں کتنے ہی ٹھیلے والوں کی تو خوشی کا کوئی سماں ناتھارنگے برنگے کپڑوں میں ملبوس بچے صبح سے ہی گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ مسجد کے گنبد سے وقفے وقفے کے بعد لوگوں کی طرف سے آنے والے ہدیے کے لیے اعلان ہو رہے تھے، گاؤں کے لوگ رمضان میں مولوی صاحب کی خدمات کے پیش نظر عید پر مسجد کو ہدیہ دیتے تھے اور مولوی ان کا نام مسجد کے سپیکر میں بول کر شکریہ ادا کر رہا تھا۔

حاکم قصر میں عید الفطر کا اہتمام ہی نہ رہا تھا، پورا خاندان حویلی میں جمع تھا اور افراتفری کے سماں میں قہقہے اور بچوں کی نوگرانی پوری حویلی میں گونج رہی تھی۔

مرد حضرات سارے عید کی نماز کے لیے گئے ہوئے تھے جہاں عید کی نماز کے بعد کتنی دیر تک باہر برانڈوں میں بیٹھک ہوتی تھی جہاں گاؤں کے تمام لوگ چوہدی حاکم سے عید ملنے آتے تھے اور پھر دوپہر کے کھانے سے پہلے تمام مرد حویلی کے اندر آتے تھے۔

جہاں آج چھوٹے سے لے کر بڑے تمام افراد کے چہرے عید کے پر مسرت موقع پر کھل رہے تھے وہاں ایک منہما کا چہرہ تھا جو اتر اتر تھا ایک مہینے پہلے کے واقع کے بعد اب ذہن پر ضد کے بعد پچھتاوا سوار تھا، اس دن کے بعد سے سکول سے رمضان اور گرمی کے باعث چھٹیاں ہو گئی تھیں اور وہ اس سارے عرصے کے دوران بہادر کے گال پر مارے گئے تھپڑ اور اس کے چہرے کو ذہن سے نہیں نکال پائی تھی جب رات کو سونے کے لیے لیٹی

تھی وہی منظر آنکھوں کے آگے گھوم جاتا، بہادر کو گھر میں آنے کی بلکل اجازت نہیں تھی اس لیے وہ اس پورے مہینے میں بمشکل اسے دو یا تین دفعہ سرسری سا نظر آیا تھا۔

رنگارنگ پکوان کی اشتہا انگیز خوشبو حویلی کے ہر کونے سے اُٹھ کر بھوک کو بڑھا رہی تھی، سویاں، کھیر جن پر سونے اور چاندی کے اوراق کی سجاوٹ کی گئی تھی باورچی خانے کے ایک طرف بڑی بڑی مٹی کی بنی پرات میں ڈال کر برف کے پیتلوں میں رکھے گئی تھیں اور اب حویلی کے اندر اور باہر براندلوں میں عید ملنے آنے والوں کے آگے پیش ہو رہی تھیں۔

تمام مرد عید کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد سب سے عید ملتے ملا تے اب حویلی پہنچے تھے اور ساتھ ہی پورے حاکم قصر میں عید مبارک، عید مبارک، کی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔ سارے چھوٹے بچوں کو فجر کی نماز کے فوراً بعد ہی نہلا دھلا کر نئے جوڑے زیب تن کروا دیے گئے تھے اور اب وہ مرد حضرات کے آنے کے انتظار میں تھے جیسے ہی گھر میں بڑے قدم رکھتے تھے ان سے عید مانگنے کا دور شروع ہو جاتا تھا۔

چوہدری حاکم، کے پیچھے سب بڑوں کے پیچ تقی سفید گر تازیاب تن کیے جیسے ہی گیٹ سے صحن میں داخل ہوا پانچ سالہ مالا جو ہلکے جامن رنگ کے فراک میں ستون کے گرد باہیں ڈالے جھول رہی تھی، بھاگتی ہوئی اٹاری کے زینے اتر کر سب سے بے نیازی برتی تقی کی ٹانگوں سے جا چمٹی، تقی نے مسکراتے ہوئے نیچے جھک کر اس کو باہوں میں اٹھالیا، تمام بچے اب بڑوں سے عید مانگ رہے تھے۔

مالا نے تقی کی گردن کے گرد بازو حائل کی گئی اور اس کی کان کے گرد اپنے ننھے سے ہاتھ کو گول گھما کر رکھتے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”تقی میں اپنی ڈھیر ساری عیدی جمع کروں گی اور پھر تمہیں جمع کروادوں گی تم مجھے شہر سے مٹھائی لا دینا“

وہ اپنی باریک آواز میں تقی سے مٹھائی کی فرمائی ش کر رہی تھی تقی اس کی مخصوص فرمائی ش پر بے ساختہ مسکرا دیا

"ہم آج سب شہر جائیں گے سیر کے لیے تم اپنی پسند سے لے لینا مٹھائی ٹھیک ہے"

تقی نے اسی کے انداز میں اس کے کان میں جواب دیا تو وہ چہک اٹھی، تقی اسے یو نہی اٹھائے اٹاری میں پہنچا اور تخت پر خدیجہ بیگم کے قریب براجمان ہوا، شفقت لینے کے لیے سران کی طرف جھکا دیا

"عید مبارک بی جان"

مودب لہجے میں عید مبارک کہتے ہوئے سران کے آگے جھکا دیا، خدیجہ بیگم نے ناصر ف دست شفقت سر پر رکھا بلکہ آگے ہوتے ہوئے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا دفعتاً نگاہ مالا پر پڑی جو بڑے لاڈ سے تقی کی گود میں بیٹھی تھی اور اس کے جوتے سے مٹی تقی کی قمیض کے دامن پر لگ رہی تھی۔

"اتار اس کو گود سے دیکھ اس کے کھسے سے ساری مٹی تیرے سفید قمیض کو لگ رہی ہے"

خدیجہ بیگم نے مالا کے کھسے کی طرف دیکھتے ہوئے نخوت سے ناک چڑھائی، تقی نے ان کی بات کو یکسر نظر انداز کیا پر مالا خدیجہ بیگم کی گھوری پر تقی کی گود میں سے نکل گئی تھی۔

دستر خوان بچھنے لگا تھا اور اب اس پر کھانا سج رہا تھا، زیب بھی اپنے بچوں سمیت عید کرنے حاکم قصر ہی آتی تھی اور اسلم میاں پھر عید کی دعوت کھا کر ہی واپسی کے لیے روانہ ہوتے تھے۔

عید کا یہ کھانا معمول کے کھانے کے وقت سے ہٹ کر لگایا جاتا تھا کیونکہ صبح بس سویاں اور کھیر کھا کر ہی ناشتہ کیا جاتا تھا اور پھر عید کی نماز اور بیٹھک کے بعد ہی کھانا لگایا جاتا تھا۔

کھانے کے بعد کتنی دیر تک دستر خوان پر ہی بیٹھے تمام افراد خوش گپوں میں مصروف تھے، فرہاد نے تقی کو کن اکھیوں میں اشارہ کیا جس پر تقی نے آہستگی سے آنکھیں موند کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سب بچے مل کر آج شہر

جانے کا منصوبہ بنا چکے تھے جس کے لیے تقی کو چوہدری حاکم کو راضی کرنا تھا۔ تقی نے چوہدری حاکم کی طرف متوجہ ہو کر ہمت جمع کی

”داجی آپ سے اجازت لینی تھی ایک بات کی“

تقی نے آہستگی سے گلا کھنکارتے ہوئے بات شروع کی، چوہدری حاکم نے شیر خورمہ کی چیچ منہ میں ڈالتے ہوئے نگاہ اٹھا کر تقی کی طرف دیکھا جواب بات کی تمہید باندھنے کے لیے الفاظ کو ذہن میں دہرا رہا تھا۔ وہ تقی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے

”داجی ہم بچے سب شہر جانا چاہتے تھے تھوڑی دیر کے لیے، اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم بہادر کو لے کر گاڑی پر چلے جائیں“

تقی نے ڈرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی اور اب تقی سمیت سب بچے جواب طلب نگاہیں چوہدری حاکم پر مرکوز کیے ہوئے تھے، چوہدری حاکم نے جواب دینے کے بجائے گھور کر نقیب حاکم کی طرف دیکھا، نقیب تو گڑبڑا کر تقی کو گھورنے لگا تھا جبکہ اسلم میاں مسکراتے ہوئے آگے ہوئے

”اباجی جانے دیں میں بھی ساتھ ہوں چلیں بچے تھوڑا گھوم پھر لیں گے“

اسلم میاں نے مسکراتے ہوئے اجازت دلوائی تو تمام بچوں کے کی باچھیں کھل اٹھیں، اسلم کی بات تو چوہدری حاکم بہت کم ٹالتے تھے اس لیے دھیرے سے اثبات میں سر ہلادیا۔

گاڑی کے پیسے شہر کی پکی سڑک پر رواں دواں تھے اور اس وقت گاڑی میں منہا، رمنا، تقی، فرہاد، مالا اور تقی موجود تھے۔ جو گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھتے ہوئے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

—

"نہیں بھائی کھانا ہے قلفہ۔۔۔۔۔۔، ر مناتم کہو نا بھائی تمھاری بات مان لیں گے"

منہانے تقی سے بات کرتے ہوئے اچانک رمناکے کان میں سرگوشی کی تھی، جس پر رمناتوبدک کرنفی میں سر ہلانے لگی جبکہ منہاکی آوازجو کہ گود میں بیٹھی مالا کے کانوں میں بھی پڑگئی تھی وہ بے ساختہ بول اُٹھی "مجھے قلفہ کھانا ہے، مجھے قلفہ کھانا ہے"

مالانے یوں قلفہ کھانے کاراگ الاپنا شروع کیا تو تقی نے مسکراتے ہوئے پیچھے دیکھا تو وہ رمناکے گود میں بیٹھی سر کونفی میں ہلاتے بار بار ایک ہی جملادہرا رہی تھی، تقی نے رمناکے طرف دیکھا اور پھر بے ساختہ سب قہقہہ لگا اُٹھے کیونکہ مالا کہے اور تقی نامانے

"بہادر چلو پھر موڑو گاڑی قلفہ کھا کر ہی چلتے ہیں"

تقی نے بے ساختہ خفیف قہقہہ لگاتے ہوئے سب کاساتھ دیا، بہادر نے تقی کے حکم پر بڑے مؤدب انداز میں گاڑی کاسٹیرنگ موڑ لیا تھا۔

کچھ دیر سڑک پر دوڑنے کے بعد گاڑی ایک چھوٹی سی دوکان کے سامنے رک گئی تھی، دوکان سڑک کے مخالف سمت میں تھی اور بہادر گاڑی کو سڑک کے دوسری اطراف میں دوکان کے سامنے لگا چکا تھا، دوکان کے باہر ایک چبوترابنا تھا جہاں پر مٹی کے گھڑوں میں قلفہ بھر کر رکھا گیا تھا، گھڑوں پر سرخ کپڑے لپٹے تھے اور چبوترے کے ارد گرد قلفہ لینے والوں کا ہجوم لگا تھا۔

تقی گاڑی سے باہر نکلا تو ساتھ ہی پچھلی نشست سے فرہاد بھی باہر نکل چکا تھا، منہانے دونوں کو جاتے دیکھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے رمناکے کان میں بہت ہی مدھم آواز میں سرگوشی کی "رمناء۔۔۔ موقع اچھا ہے وہ بات کرو تم بہادر سے"

منہا کی بات پر رمنانے گھور کر منہا کی طرف دیکھا جو اب روہانسی صورت بنائے رمناسے نگاہوں میں ہی منت کر رہی تھی۔ رمناجو آنکھوں میں بات نا کرنے کے اشارے کر رہی تھی منہا کی منت پر بد مزہ صورت بنائے کندھے ڈھیلے کئے

"بہادر بات سنو"

رمنانے گلا صاف کرتے ہوئے آہستگی سے بہادر کو پکارا، وہ جو گاڑی کی کھڑکی سے باہر تھی کو اور فرہاد کو سڑک کے پار جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا چونک کر متوجہ ہوا

"جی۔۔بی بی جی"

بڑے ہی ادب سے کہا، منہا اب رمناکو مزید بات آگے بڑھانے کا اشارہ کر رہی تھی، وہ ہمیشہ کی طرح یہ بات بھی رمناسے چھپا نہیں سکی تھی اور اس نے بہادر پر غصے سے لے کر تھپڑ تک کی ساری بات رمناکی گوش گزار کر دی تھی۔

رمنانے اپنی عادت کے مطابق ہمیشہ کی طرح اسے سمجھایا ہی تھا کی وہ بلا وجہ اب اس بات کو بھی سر پر سوار کر رہی ہے اگر اس نے بہادر کو تھپڑ مار دیا تھا تو فرہاد نے اسی وقت بہادر کا ساتھ دیتے ہوئے اسے جھاڑ بھی دیا تھا لیکن منہا تھی کہ اس بات کو ذہن سے چپکا کر بیٹھ چکی تھی اور اب یہی وجہ تھی کہ وہ رمناکو بات کرنے پر اکسار ہی تھی۔

"بہادر دیکھو اس دن منہا نے جو تمہیں تھپڑ مارا تھا، وہ بس غلط فہمی تھی وہ اپنی اس حرکت پر اب بہت شرمندہ ہے تم اسے معاف کر دو"

رمنانے بڑے طریقے سے اور شائستگی سے بات مکمل کی تھی، حالانکہ وہ اس طرح کا معاملہ یوں چھپ کر براہر است بہادر کے ساتھ حل کرنے کے حق میں ہر گز نہیں تھی اس نے منہا سے بارہا کہا کہ وہ فرہاد کے ذریعے

ہی بہادر کی طرف معافی کا پیغام بھیج دے لیکن منہا نے اس بات پر بہت خفگی دکھائی کہ وہ فرہاد کو بیچ میں لا کر اپنا تماشا نہیں بنانا چاہتی ہے۔

رمنہا کی بات پر بہادر جو خاموشی سے سر جھکائے سن رہا تھا ایک دم سے سیدھا ہوا پر نگاہیں جھکائے رکھیں "کیسی باتیں کر رہی ہیں رمنہا بی مجھے تو یاد بھی نہیں رہا تھا یہ سب اور غلطی تو میری بھی تھی، مجھے یوں ان کو بتائے بنا فرہاد صاحب کو لینے نہیں جانا چاہیے تھا"

بہادر نے اپنی بات سر جھکائے ہی مکمل کی تھی، بہادر کی بات پر منہا نے تھوک نگلا اور رمنہا کا ہاتھ تھام کر بات کرنے سے روکتے ہوئے خود گویا ہوئی

"نہیں پھر بھی میں شرمندہ ہوں مجھے بہت غصہ تھا اور وہ سب غصے میں ہی ہوا تھا"

منہا نے گھٹی سی آواز میں وضاحت دی جس کے جواب میں بس بہادر سر اثبات میں ہلا کر رہ گیا۔ چہرہ پھر دایں طرف گاڑی کی کھڑکی میں موڑ لیا۔

منہا کی بات کا جواب نادینے پر منہا بری طرح پہلو بدل چکی تھی جبکہ رمنہا اب مسکرا کر منہا کو دیکھ رہی تھی۔

"بس میں کہہ تو رہی تھی تمہیں اس دن سے کہ تم ایسے ہی پریشان ہو رہی ہو اتنے دن سے، بہادر بھائی بہت اچھے ہیں ان کے دل میں کوئی بات نہیں ہوگی"

رمنہا نے مسکراتے ہوئے منہا کی طرف دیکھ کر اسے تسلی دی جبکہ وہ اب بھی چوری سے بہادر کے چہرے کے تاثرات دیکھنے میں مصروف تھی۔ کچھ پل کے بعد ہی تقی اور فرہاد ہاتھ میں قلفے کے پیالے تھامے گاڑی کی طرف آ رہے تھے اور ان کو آتا دیکھ کر منہا نے اپنی نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

سفید رنگ کی سکول وردی میں ملبوس لڑکی نے لکڑی کی کرسی پر پڑی لوہے کی کھونٹی کو اٹھایا اور رسی سے لٹکتی سنہری گھنٹی پر پوری قوت سے مارا۔۔۔ گھنٹی کی ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ آواز پورے سکول میں گونج اُٹھی۔۔۔ چھٹی ہوتے ہی پورے سکول میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔

جیسے ہی چھٹی کی گھنٹی ٹن ٹن بجی تھی منہا فوراً ڈیسک میں سے اپنی کتابیں اُٹھا کر بستے میں ٹھونسنے کے انداز میں رکھنے لگی۔ پاس بیٹھی حمیرا نے اسے عجلت میں کتابیں رکھتے دیکھ کر حیرت سے آنکھیں سکوڑیں کیونکہ وہ تو چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی سر کو ڈیسک پر گرا لیتی تھی اور پھر دن بھر کی باتیں کرتے ہوئے وہ اور حمیرا بستے میں آہستہ آہستہ کتابیں رکھتی تھیں۔

گرمیوں اور عید کی چھٹیوں کے بعد وہ آج پہلے دن سکول آئی تھیں اور منہا کے رویے میں بہت تبدیلی دیکھ رہی تھی، وہ گم صم اور چپ چاپ تھی حمیرا اس کے دن بھر کے رویے کو تو نظر انداز کرتی رہی تھی پر اب یوں بستہ بند کرنے کے بعد اُٹھ کر اس کا چادر درست کرنا حمیرا کو تشویش میں مبتلا کر گیا، کہاں وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اتنی چھٹیوں کے بعد آج مل رہے ہیں تو منہا کے پاس اس کو بتانے کے لیے بہت سی باتیں ہوں گی، پر یہ کیا وہ تو اس سے کوئی بھی بات کیے بنا بستہ کندھے پر لٹکا چکی تھی۔

"منہا کیا ہوا۔۔۔؟"

حمیرا نے بھنویں اچکائے تشویش کا اظہار کیا، منہا جو کندھے پر بستہ لٹکا چکی تھی ایک اچھٹی سی نگاہ حمیرا کے حیرت زدہ چہرے پر ڈالی۔

"چھٹی ہوگئی ہے ظاہر سی بات ہے گھر جا رہی ہوں"

منہا نے کندھے اچکا کر عجلت میں جواب دیا اور پھر قدم کمرہ جماعت کے دروازے کی طرف بڑھا دیے، عید کے روز بہادر سے معافی مانگے پورا مہینہ گزر چکا تھا اور وہ جو سوچ رہی تھی کہ اب معافی پر اس کے دل اور دماغ کی بے

چینی کو سکون مل جائے گا ایک نئی ہی مصیبت سے دوچار ہو چکی تھی اور اب کی بار کا جذبہ اس کے دماغ کے ساتھ اس کے دل کو بھی قابو کر چکا تھا۔

وہ بہادر کے بارے میں ایسے خیالات پنپنے لگی تھی جو اس وقت کی عمر کے سب سے خطرناک خیالات ہوتے ہیں اور پہلی دفعہ ایسا تھا کہ وہ ان خیالات کے بارے میں رونا سے چھپا رہی تھی۔

تیز تیز قدم اٹھاتی وہ گیٹ سے باہر آئی تھی اور بہادر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، جسے دیکھتے ہی اس ایک مہینے میں اپنے تمام خیالات کے پیش نظر منہا کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

من من بھاری ہوتے قدم اٹھاتی وہ اب گاڑی کی طرف جارہی تھی جہاں بہادر اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

منہانے چور نگاہ بہادر پر ڈالی، کتنے عرصے بعد وہ آج بہادر کو دیکھ رہی تھی وہ یونہی نگاہیں جھکائے اب دروازہ بند کر رہا تھا۔

جوانی میں جہاں جسم اور جذبات میں حکم الہی سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہاں شیطان کو بھی موقع مل جاتا ہے کہ وہ انسان کے ان ابھرتے جذبے کے ساتھ کھیلتا ہو اس پر حرام محبت کا غلبہ ڈال دیتا ہے، یہ وہ عمر ہوتی ہے جہاں لڑکپن سے جوانی میں پہلا قدم دھرتی لڑکیاں اور لڑکے ابھی اچھے برے کی کوئی پہچان نہیں کر پاتے وہاں شیطان انہیں حرام محبت جیسے احساس سے روشناس کروا دیتا ہے جس کی نئی نئی لذت اس کچی عمر کے بچے اور بچیوں کے ذہن میں بد، نیک، اچھے برے کی پہچان ختم کر دیتی ہے۔

ہاں وہ بھی لڑکپن سے جوانی میں پہلا قدم رکھتے ہی غصے سے ضد، ضد سے بد تمیزی، بد تمیزی سے بے وجہ کی شرمندگی اور پھر بے وجہ کی شرمندگی سے حرام محبت کی مر تکب ہو چکی تھی۔

اس کا بہادر پر غصہ کرنا نہیں بنتا تھا ناوہ غصہ کرتی ناوہ ضد بنتی ناضد میں آکر وہ تھپڑ جڑتی، ناضد میں تھپڑ جڑتی ناہے وجہ کی شرمندگی دل کا گھیراؤ کرتی، ناہے وجہ شرمندگی میں خود کو گھول کر معافی مانگتی اور نا آج یہ معافی پر بہادر کے تاثرات حرام محبت میں تبدیل ہوتے، لیکن اب یہ ایک حرام عمل سے شروع ہونے والا عمل ایک سلسلہ پکڑ چکا تھا جس کا اختتام بہت بھیانک ہوتا ہے۔

ہاں وہ بہادر سے اپنے جذبے باندھ چکی تھی جسے وہ محبت کا نام دے رہی تھی بہادر گاڑی چلا رہا تھا اور وہ پچھلی نشست پر بیٹھی اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں سیک رہی تھی کل تک جس بہادر کی طرف اس نے کبھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا آج پندرہ سال کی عمر میں وہ اس بہادر کے لیے جذبے پال رہی تھی۔

گاڑی حویلی کے آگے رکی تھی اور وہ ٹھنڈی آہ بھرتی گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔۔۔۔۔

شیطان کا غلبہ ناصرف اس کو ان جذبوں کی لذت میں گھول رہا تھا بلکہ ایک عجیب سی ہمت بھی دے رہا تھا، وہ اب بہادر سے اپنی اس محبت کے اظہار کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

حاکم قصر میں پھیلی یہ رات عجیب سی وحشت لیے ہوئے تھی، پورے صحن میں فوارے کے دائیں اور بائیں چارپائیاں بچھی تھیں جن پر حویلی کے مکین رات کے اس پہر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔

دکھن کی ہوا جہاں نیم کے درخت کے پتے کو ہلا کر ہلکی ہلکی سرسراہٹ کی آواز پیدا کر رہی تھی وہاں جھینگروں کی جھیں جھیں کے ساتھ نیم کے درخت سے کچھ دوری پر بچھی چارپائی سے بار بار کروٹ بدلنے کی وجہ سے چرچراہٹ کی آواز بھی ابھر رہی تھی۔

چارپائی پر رونا کے ساتھ دائیں کروٹ لیٹی منہا کی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔

چل نکلا تھا وہ سلسلہ جو کوئیل کے کھلنے پر بھاری ہو جائے، جہاں سنبھل کر پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا وقت ہو اور کوئی بس خود کو ہاتھ پھیلائے ہو کے ازدحام کے حوالے کر دے، جب جذبات کے لاوے ابل کر ہر پردہ عقل پر سرکانے لگیں، وہ اسی حال کو پہنچی بن پانی کی مچھلی کی طرح چارپائی پر کروٹ بدل رہی تھی۔ خود کو اس حال پر پہنچانے میں اس کے بے قابو جذبات تھے جو بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑے ہی چلے جارہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ اپنے قدموں کے نیچے زمین نہیں کسی کی چادر اور منڈاسا روند رہے ہیں۔

وہ آج پورے دو ہفتے تڑپنے کے بعد، سکول کی چھٹی کے وقت، بہادر کو اپنی محبت کے بارے میں بتا چکی تھی، لے کر تو ایک خط گئی تھی مگر وہاں بہادر کی زبانی ہی پتا چلا کہ وہ پڑھنا تو جانتا ہی نہیں ہے۔ افس یہ بات تو وہ بھی اس کے بارے میں نہیں جانتی تھی جانتی بھی کیسے پہلے نا تو کبھی اسے جاننے جیسے نوبت آئی اور نا ہی کوئی ایسا تعلق تھا کہ وہ اس کے بارے میں یہ سب جانتی۔

فرہاد کے امتحانات ہونے کو تھے وہ سکول نہیں آتا تھا، بہادر کے اس نکشاف پر کہ وہ پڑھنا نہیں جانتا ہے، منہانے اسے اپنے جذبات سے آگاہی اپنی زبان سے ہی دے دی تھی اور وہاں بہادر کا حال کچھ ایسا ہی ہوا تھا جیسا اس نے سوچ رکھا تھا۔

بہادر کی آنکھیں اس خبر پر پوری کھل گئی تھیں کچھ لمحے تو نشائی داس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں رہا تھا۔ اور بدحواسی ایسی چھائی تھی کہ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔

بات تھی بھی ایسی جو کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نا تھی اور سامنے بیٹھی چوہدری حاکم کی پوتی اس سے اپنی پسندیدگی اور محبت کا اظہار کر رہی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ وہ محبت کے نام سے ناواقف تھا یہ تو وہ لفظ تھا جس کی بازگشت وہ اپنے گھر میں سنتے ہوئے پروان چڑھاتا تھا پر یہاں منہا کے منہ سے اس کے جذبات سن کر وہ دم بخود رہ گیا۔

منہا اس پر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے بعد اسے سوچنے اور پھر جواب دینے کی مہلت کا کہہ کر خاموش ہو گئی تھی جبکہ وہ جس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ گیا تھا۔ کچھ پل یو نہی ساکن رہنے کے بعد ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا اور پھر ایک دم سے بوکھلا کر گاڑی سٹارٹ کی، گاڑی نے بیس منٹ کا سفر دس منٹ میں طے کیا تھا اور حویلی کے بیرونی گیٹ کے آگے آکر رکی تھی، منہا خاموشی سے اس کو پریشان حال چھوڑ کر آگے قدم بڑھا چکی تھی۔

پر اب رات کے اس پہر تک وہ کوئی ہزاروں دفعہ اس لمحے کو بار بار ذہن میں دہرا رہی تھی۔ جب تک جذبات اس تک محدود تھے وہ اتنی پریشان نہیں تھی لیکن آج جب وہ ہمت جمع کیے سارے جذبات اور محبت کا اظہار بہادر سے کر چکی تھی تو اب بے چینی مزید بڑھ چکی تھی۔

وہ کیا سوچ رہا ہو گا؟۔۔۔

وہ کیا جواب دے گا؟۔۔۔۔

اس کا رد عمل کیا ہو گا؟۔۔۔۔۔

کتنے ہی سوال دل دماغ سے تو کبھی دماغ دل سے کر رہا تھا اور وہ یو نہی ساری رات کانٹوں کے بستر پر لوٹتی رہی۔

ساری رات یو نہی آنکھوں میں گزر گئی اور اب وہ آسمان کے اندھیرے کو نیلے رنگ کی ہلکی روشنی میں تبدیل ہوتا دیکھ رہی تھی۔ جو اپنے ساتھ اس کے ارادوں کی پختگی اور بہادر کے لیے جذبات کا بہاؤ لائی تھی۔

یہ دنیا پور کا تنگ سی گلیوں پر مشتمل، بڑی نہر کے پل سے گزرنے کے بعد واحد بازار تھا جس کے شروعات میں ہی بہت سے ٹھیلے والے قطار دار دیوار کے ساتھ ٹھیلے لگائے کھڑے تھے، یہ بازار کی تار کول میں لپٹی سڑک یہاں سے اندر کی طرف ہلکی ڈھلوان لے لیتی تھی اور ٹھیلے والے جو ہر دوکان کے باہر کھڑے تھے ان کی بڑھتی تعداد بازار کو آگے سے آگے مزید تنگ کر رہی تھی۔

گاڑی کی اگلی نشست پر بہادر اور پچھلی نشستوں پر بلقیس، فرزانہ اور منہا بیٹھی تھیں۔ بہادر سے سوال کیے دو ہفتے بیت چکے تھے۔ مالا سکول میں داخل ہو چکی تھی جس کے باعث منہا بہادر سے کوئی بات نہیں کر پائی تھی اور وہ تھا کہ خاموش بے تاثر چہرہ لیے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جیسے دو ہفتے پہلے کچھ ہوا ہی ناہو۔ گاڑی کے بازار کی ایک گلی کے آگے رکتے ہی بہادر جلدی سے اگلی نشست سے اتر کر فرزانہ کے طرف کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"چلو اترو منہا۔۔۔"

بلقیس نے گاڑی کی نشست سے اپنا پرس اٹھایا، کندھے پر لٹکایا، فرزانہ نے بھی اپنا برقع درست کیا، جبکہ گاڑی کے دائیں شیشے والی طرف سیاہ شیشوں کی سندھی کڑھائی کی ہوئی چادر اوڑھے بیٹھی منہا سست روی سے گاڑی سے اتری۔

فرزانہ کی شادی کو چند مہینے رہتے تھے اور آئے دن شہر کے اور بازار کے چکر لگتے تھے۔ آج بلقیس کو بھی بچیوں کی اور اپنے جوڑے کی خریداری کرنی تھی، اریب بیگم نے ان کے ساتھ فرزانہ کو بھی بھیج دیا تھا، جس کی خریداری عروج پر تھی

وہ تینوں گاڑی سے اتر کر ابھی چند قدم کی دوری پر ہی گئی تھیں جب منہا نے اچانک پیچ سڑک میں رک کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بلقیس نے جب اس کو ان دونوں سے چند قدم پیچھے ہی کھڑے پایا تو ماتھے پر بل ڈالے پلٹی

"منہا۔۔۔ کیا ہوا ہے یہاں کیوں رک گئی"

بلقیس الجھی سی اسے پکارتی اس تک آئی تھی جو سر کو اب دونوں ہاتھوں میں تھامے زمین پر بیٹھتی چلی جا رہی تھی۔ بلقیس کو اس کی حالت نے اور پریشان کر دیا، فرزانہ بھی حواس باختہ سی صورت بنائے واپس مڑ رہی تھی۔

"منہا۔۔۔ کیا ہوا ایسے کیوں نیچے بیٹھ رہی ہو"

بلقیس اب منہا کا کندھا تھام کر اس پر جھکی پوچھ رہی تھی، فرزانہ بھی پاس پہنچ کر اسی حالت میں اس پر جھک گئی

"اماں مجھے چکر آرہے ہیں بہت برے چکر، چلا ہی نہیں جا رہا ہے"

منہا نے روہان سے لہجے میں سبب بتایا تو جھکے دونوں چہروں پر تشویش کے ساتھ پریشانی بھی جھلکنے لگی

"ناشتہ نہیں کرتی تو یہی حال ہو گا نا، چلو گاڑی میں پانی پو پہلے"

بلقیس نے اسے کندھے سے پکڑا اور فرزانہ نے بھی ایک طرف سے سہارا دیتے ہوئے اسے اس جگہ سے اٹھایا وہ اب دونوں کے سہارے کے ساتھ بھی نقاہت لیے چل رہی تھی سست روی سے یونہی قدم اٹھاتے جب وہ تینوں گاڑی کے پاس واپس پہنچیں تو گاڑی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا بہادر ان کو دیکھ کر حیرت سے سیدھا ہوا۔ بلقیس اب بہادر کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

بہادر نے حیرت سے بھنویں سکڑے عجلت میں گاڑی کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا بلقیس نے منہا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا جبکہ فرزانہ پانی کی بوتل سے پانی اب بوتل کے چھوٹے سے گلاس نما ڈھکن میں انڈیل رہی تھی۔ منہا نے سر کو تھامے ہی گلاس کو منہ لگایا اور پانی ختم کرنے کے بعد آہستگی سے ہتھیلی کی پشت سے منہ صاف کیا۔

"ہاں اب بہتر ہوئی کچھ طبیعت، اب تو نہیں آرہے چکر، گھر ہی بتا دیتی ایسے ہی گھر سے اتنی دور شہر آئے، کل سے رٹ لگائی ہے مجھے خود کپڑے پسند کرنے ہیں وہ رونا بھی تو ہے ایک دفعہ بھی اس نے چوں تک کی جولا کر دو وہ پہن لیتی ہے"

بلقیس نے اس کی طبیعت پوچھتے ساتھ ہی اس کو جھاڑ بھی دیا تھا، منہا نے نقاہت سے سر کو نفی میں ہلایا "اماں نہیں مجھے نہیں لگتا چل سکوں گی، اب مجھے معلوم تھوڑی تھا یوں میری طبیعت خراب ہو جائے گی"

منہا نے پھیکی سی آواز میں جواب دیا، بلقیس نے پریشانی سے پاس کھڑی فرزانہ کی طرف دیکھا

"ممائی مت ڈائٹس اسے، واپس چلتے ہیں کچھ دن بعد آجائیں گے کوئی دقت نہیں"

فرزانہ نے لب بھینچے نرم لہجے میں مشورہ دیا تو منہانے فوراً نفی میں گردن ہلاتے ہوئے فرزانہ کی طرف دیکھا
"نہیں فرزانہ آپا، آپ اور اماں چلی جائیں میں گاڑی میں بیٹھ جاتی ہوں کچھ دیر، اب اتنی دور بازار آئے ہیں تو
ایسے میری طبیعت کی وجہ سے آپ اپنی بھی خریداری نہیں کریں گی کیا؟؟، میں آنکھیں موند کر بیٹھ جاتی ہوں
آپ دونوں جلدی آجائے گا"

منہانے شرمندہ سے لہجہ میں فرزانہ کا تراچہرہ دیکھ کر مشورہ دیا تو بلقیس بھی چند لمحے سوچنے کے بعد تائی ید میں سر
ہلا گئی۔ حویلی کے اتنے کام کاج چھوڑ کر اس کے لیے آنا ممکن تھا، غزالہ ویسے بھی ان کاموں سے جان چھڑا کر
سب بلقیس کے کندھوں پر ڈال دیتی تھی اور اب بھی بلقیس کو ہی ساری خریداری کرنی تھی ان ساری سوچوں کے
پیش نظر اسے منہا کا مشورہ ٹھیک لگا تھا۔

"بہادر منہا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، یہ یہاں پیچھے بیٹھی ہے، ہم کچھ دیر میں واپس آتے ہیں"
بلقیس نے بہادر کو منہا کی طبیعت کی آگاہی دی جس پر وہ آہستگی سے سر ہلا گیا اور فرزانہ اور بلقیس طمانت سے ایک
طرف چل دیں۔

ان کے جانے کی دیر تھی کی منہا ہشاش بشاش ہو کر لب بھینچے گردن موڑ کر ان دونوں کے دوری پر جانچتی نگاہ ڈال
کر سیدھی ہوئی۔ ایک چور نگاہ بہادر پر ڈالی جو سٹیرنگ پر سر رکھے بیٹھا تھا۔
"بہادر۔۔۔ مجھے میری بات کا جواب چاہیے"

منہا کی آواز با آسانی آگے بیٹھے بہادر کے کانوں میں پڑی تھی۔ بہادر نے فوراً سراو پر اٹھایا اور پھر پہلو بدلے، پر اس
کی گہری خاموشی سکینڈ کے بجائے منٹوں میں تبدیل ہونے لگی تھی۔

"بہادر۔۔۔"

منہانے پھر سے اس کا نام پکارا ہی تھا کہ بہادر نے فوراً کھر درے سے لہجے میں بات کاٹی
 "منہابی بی۔۔۔ مجھے آپ کی مشکل باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں آپ۔۔۔ آپ مجھ سے بات ناکیا کریں کسی نے
 دیکھ لیا تو۔۔۔"

بہادر کے لہجے میں خوف تھا، التجا تھی جو اس انوکھی اور نئی ڈگر کی مسافر کو کہاں ہضم تھی
 "پر میں کیا کروں۔۔۔ بولو۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے تم مجھے میری بات کا جواب دوہاں میں یا نا میں میرے دل کو چین
 آئے"

منہانے ہتھیلیوں کو آپس میں پھنسائے آہستگی سے اسے اپنی بے چینی سے آگاہ کیا، بہادر نے ہاتھ مضبوطی سے
 سٹیرنگ پر جمائے اور پھر سر نیچے کیا

"منہابی بی۔۔۔ میرے پاس آپ کی اس بات کا جواب نہیں ہے"

بہادر نے سامنے دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا، منہا تڑپ کر آگے ہوئی

"میں۔۔۔۔ تمہیں۔۔۔۔ بہت چاہنے لگی۔۔۔ ہوں بہادر، ایسا کیسے ہو سکتا ہے تم نہیں چاہو مجھے"

منہا کے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے جس پر بہادر گڑبڑا کر جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
 بہادر کے انکار اور رد عمل پر منہا کی بے بسی اب غصے میں بدلنے لگی تھی، وہ کیسے مجھے انکار کر سکتا ہے کیا اسے نظر
 نہیں آتا دو ہفتوں سے میں کیسے تڑپ رہی ہوں، کیسے اس کو سکول آتے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہوں۔

وہ غصے میں تملاتی ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور بہادر کے قریب آ کر دانت پیستے ہوئے گویا
 ہوئی

"ٹھیک ہے تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تو مجھے بھی یہاں نہیں رہنا میں جارہی ہوں، وہ سامنے نہر دیکھ رہے ہو؟؟
 میں اس میں کو دجاؤں گی اور پھر سب تم سے پوچھیں گے"

منہا نے چادر سے ناک ڈھانپنے، غصے سے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ بہادر حواس باختہ منہا کی طرف بھاگا۔
"منہابی بی رک جائے یہ کیا پاگل پن ہے"

بہادر تیز رفتاری سے آگے بڑھا اور منہا کا بازو پکڑتے ہوئے اسے قدم آگے بڑھانے سے روکا وہ ڈگمگا کر رکی پر اسی لمحے بہادر کی آنکھوں سے ہوا تصادم اس کے جذبات کی سچائی کا ثبوت بن کر اسے سچے عاشق ہونے کی جھوٹی تصدیق دے گیا۔

وہ لمحہ جہاں بہادر پر بہت بھاری تھا وہاں اس کے جذبات کی بھی تصدیق تھا۔ وہ جو بہت عرصے سے منہا کے بدلے رویے کو اپنے دماغ کا فقط ایک خلل تصور کرتا تھا منہا کے اظہار پر دم بخود رہ گیا تھا اور پھر دل نے منہا کی جذبات کو آگے بڑھ کر گلے لگا لیا تھا لیکن اس کی عقل ان پر بہت اچھے سے حاوی تھی وہ عمر میں ناصرف منہا سے بڑا تھا بلکہ اس کے تجربے بھی بڑے تھے۔

ایک سکینڈ میں ہی وہ اپنے ذہن کو جھٹک کر خوف سے منہا کو لے کر آگے بڑھ رہا تھا جواب پوری قوت سے اس سے اپنا بازو چھڑوانے کی سعی میں تھی۔

"چھوڑو مجھے میں نہیں رہنا چاہتی اب زندہ، تم مجھ سے محبت نہیں کرتے میں نہر میں کود کر جان دے دوں گی"
وہ جذبات کی رو میں بہہ کر سب بھولے ہوئے تھی، بہادر لب بھینچے اسے کار کے قریب لایا تھا اور پھر کار کا دروازہ کھولے ایک جھٹکے سے منہا کو اندر بیٹھایا، گہری سانس لیے مسکین صورت لیے دیکھا
"منہابی بی۔۔ میں آپ کے قابل نہیں ہوں، دیکھیں رحم کریں مجھ پر بھی اور خود پر بھی"

بہادر نے التجا کے لہجے میں ہاتھ جوڑے تھے، منہا نے نگاہ اٹھائے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہ نگاہیں چرا رہا تھا
"تم میرے قابل نہیں ہو تو کیا ہوا، میں تمہارے قابل بن جاؤں گی"
منہا اب بھی اپنی بات پر بضد تھی، بہادر نے بے بسی سے نگاہ اٹھائی

"آپ کیا چاہتی ہیں مجھ سے منہابی بی؟ کہ میں بھی ایک دفعہ پھر سے ابا کی ہی کہانی کو دہرا دوں، میرے اور آپ کے پاس یہاں سے بھاگنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہو گا اور اگر ایسا ہو تو پھر سے کوئی بہادر ان پڑھ رہ کر ساری عمر کہیں غلامی کرے گا، میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں پر خدا اس محبت کو یہیں دفن کر دیں کیونکہ اس کا انجام میں روز اپنے گھر میں دیکھتا ہوں"

بہادر کے الفاظ تھے یا کوئی سحر جس میں وہ جکڑی گئی تھی اس کی بات تو کیا ہی سمجھ آتی وہ تو اس کے الفاظ اور اس کی سمجھ کو دیکھ کر اور دیوانی ہو گئی تھی، وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا۔۔۔

دل جیسے بلیوں اچھلنے لگا تھا چار سو چھائے سنائے میں ایک ارتعاش پیدا ہوا تھا اور وہ اس شور و غل میں زور زور سے بجتے دل کے ساتھ ہر انجام، ہر مشکل، ہر پریشانی فراموش کر دینے کو تیار تھی۔

بہادر اس کی خاموشی کو اس کی عقل مندی سمجھتے ہوئے اب گاڑی کے ایک طرف جا کر کھڑا ہو چکا تھا پر وہ کیا جانے اس انجان ڈگر پر جب ننھے قدم اور کم عقل والے ذہن چل نکلتے ہیں تو واپسی ان انجاموں کے خوف سے نہیں ہوا کرتی ہے واپسی تو کسی حادثے اور کسی نقصان پر ہی ہوتی ہے۔ وہ گاڑی کی نشست کی پشت سے ٹیک لگائے مسکرا رہی تھی۔

سُرمئی سی شام عصر کی اذان کے فوراً بعد اپنے سایے پھیلا رہی تھی، رنگ برنگے قمقوں سے سچی حویلی عجیب ہی رنگ ڈھنگ لے کر جگمگانے لگی تھی۔ فرزانہ کے مایوں کے بعد کا دن تھا اور حویلی میں مہمانوں سے بھری پڑی تھی

-

ر مناصحن سے زرد چہرہ لیے اٹاری کے زینے چڑھتی ارد گرد نگاہ گھماتی منہا کو تلاش کر رہی تھی، وہ جو زیب پھپھو کے ساتھ بازار گئی تھی، ایک دوکان کے سامنے زیب اسے اپنا چھوٹا بیٹا پکڑا کر خود اکیلی ہی دوکان میں گھس گئی تھی۔

وہیں بہادر نے موقع غنیمت دیکھ کر ر منا کو منہا کے پاگل پن کے بارے میں آگاہی دی تھی کیونکہ اس دن کے بعد سے منہا کا پاگل پن اب جنون میں تبدیل ہونے لگے تھا وہ آئے دن بہادر کو خود کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دینے لگی تھی۔

کبھی کسی نوکیلی چیز سے اپنی کلائی کاٹ لیتی اور بہتا خون بہادر کو دکھاتی تو کبھی اسے گندم میں رکھنے والی گولیاں، یا فصلوں میں ڈالنے والی زہریلی ادویات کھا کر جان دینے کی دھمکی دینے لگتی۔ وہ بہت پریشان ہو چکا تھا اور اسے ر منا کو اس سب سے آگاہی دینے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا۔

ر مناجب سے شہر سے واپس لوٹی تھی بولائی بولائی سی منہا کو تلاش کر رہی تھی۔ اور جیسے ہی اسے منہا فرزانہ آپا کے کمرے میں نظر آئی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس تک پہنچی۔ منہا کا بازو پکڑ کر وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ باہر لے آئی۔

حویلی مہمانوں سے کھپا کھچ بھری تھی کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں وہ سکون سے منہا سے یہ بات کر سکتی اچانک چھت کا خیال آتے ہی وہ زبردستی منہا کو اپنے ساتھ چھت پر لے آئی تھی۔ منہانا سمجھی سے اس کی طرف دیکھتی اس کے ساتھ چھت پر آگئی۔

چھت کے ایک کونے میں آتے ہی ر منانے ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا اور خود غم اور غصے کے ملے جلے تاثر کے ساتھ گھورتی ہوئی اس کے سامنے ہوئی۔

"منہا۔۔۔ بہادر جو کچھ تمہارے بارے میں کہہ رہا ہے کیا وہ سچ ہے؟"

ر منا کا سوال تھا یا ایٹم بمب تھا جو منہا کے سر پر پھٹا تھا، زندگی میں پہلی بات اس نے ر منا سے چھپائی تھی یہ بات ہی ایسی تھی جو وہ کسی سے بھی بانٹنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی لیکن بہادر کا بار بار انکار اس کی محبت کو جنونیت میں بدلنے لگا تھا وہ ہر حال میں بہادر کو اپنی محبت میں مبتلا دیکھنا چاہتی تھی۔

اس کا سفید پڑتا چہرہ دیکھ کر ر منا کو اچانک اپنے سوال کی غلطی کا احساس ہوا، لب بھینچے اپنے لہجے کو حد درجہ دھیمّا کیا "منہا۔۔۔ دیکھ میری بہن سچ بول۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ بہادر جو سب کو اس کر رہا ہے تیرے بارے میں وہ سچ ہے؟"

ر منا کے لہجے میں اس کے لیے فکر مندی تھی وہ منہا کو چپ دیکھ کر اور پریشان ہو رہی تھی۔ منہا دم سادھے کھڑی تھی جہاں اس کا سر شرم سے جھک جانا چاہیے تھا وہاں اچانک دل زور زور سے ندامت کے بجائے ذلت کے احساس کے کچوکے لگانے لگا اور پھر وہ ایک جھٹکے سے ر منا کے بازو اپنے کندھوں سے ہٹا چکی تھی۔

"ہاں۔۔۔ بہادر نے جو کہا ہے وہ سچ ہے میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں"

منہا کے منہ سے الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ ر منا کی آنکھیں بے یقینی سے دکھ کے تاثر میں تبدیل ہوئیں اور اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

"محبت۔۔۔ یہ لفظ تم نے سیکھا کہاں سے۔۔۔۔۔، اور وہ سب جو اسے کہہ رہی ہو تم کہ۔۔۔ کچھ کھا کر مر جاؤں گی یہ سب کہاں سے سیکھا منہا بول۔۔۔ کہاں سے سیکھا"

ر منا نے تھپڑ اس کی گال پر مارا تھا لیکن آنسو خود کی آنکھوں میں چمکنے لگے تھے، وہ منہا کی ہمت، بے باکی، پاگل پن پر حیرت زدہ تھی۔

ہاں وہ جانتی تھی وہ بچپن سے تھوڑی ضدی تھی پر یہ سب یہ نہیں سوچ سکتی تھی وہ کبھی بھی منہا کے بارے میں۔

"کہیں سے نہیں سیکھا میں نے، محبت سیکھی نہیں جاتی ہو جاتی ہے میں بہادر کے بغیر نہیں رہ سکتی اگر وہ مجھے یہاں سے نالے گیا تو میں مر جاؤں گی"

منہابول رہی تھی اور رمناسے پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی وہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اور اس کی باتیں سن کر رمناسے سر میں ہتھوڑے چلنے لگے تھے۔

"من۔۔ منہا۔۔۔ تو پاگل ہو گئی ہے کیا۔۔۔ محبت بہادر سے"

رمناسے کی آواز میں کرب تھا، آنکھوں میں آنسو تھے

"ہاں۔۔۔ محبت۔۔۔ اور تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کوئی انوکھا کام کر دیا ہو میں نے، کیا تم نہیں کرتی بھائی سے محبت، کیا بھائی نہیں کرتا تم سے محبت"

منہانے ناک پھلائے غصے میں اس کی طرف دیکھا

رمناسے حیرت سے اس کی طرف دیکھا جو اس کی بات سمجھنے کے بجائے الٹا اس کے اور تنقی کے رشتے کے ساتھ اپنی محبت کا موازنہ کیے اس سے سوال کر چکی تھی۔

"بولو کیا تم اور بھائی نہیں کرتے ایک دوسرے کے ساتھ محبت"

منہادانت پیسے رمناسے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھا اور اب وہ حیرت سے منہ وا کیے کھڑی رمناسے کے سامنے تن کر کھڑی جواب کی منتظر تھی۔ کچھ پل کی خاموشی کے بعد رمناسے کی آواز گونجی

"میری اور تنقی کی بات یہاں کہاں سے آگئی منہا"

رمناسے حیرت کو ختم کیے، تیوری چڑھائے اس سے سوال کیا جو اس وقت رمناسے کو خونخوار نگاہوں سے گھور رہی تھی، رمناسے اپنی بہن سے بڑھ کر چاہتی تھی اور ہر اچھی بری بات میں ہمیشہ سمجھاتی رہی تھی۔

اسی غرض سے وہ اب بھی اس کو سمجھانے کے لیے ہی اوپر لائی تھی لیکن بات ہی ایسی تھی کہ غصے میں اسے تھپڑ جڑ گئی شائ دہیں پر اس سے خطا ہوئی اور منہا جو پہلے سے ہی دل و دماغ سے باغی ہو چکی تھی ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"آتا ہے سوال تم مجھے اتنی حقارت سے کہہ رہی ہو کہ میں محبت کیوں کرتی ہوں بہادر سے اور تو اور مجھے تھپڑ تک مار دیا جیسے میں نے بہت بڑا گناہ سرزد کیا ہو، لیکن کیا تمہیں خود کا پتا ہے تم بھی تو کرتی ہو میرے بھائی سے محبت اور بھائی تم سے"

منہا کا یہ روپنا صرف رمناء کے لیے حیرت کا باعث تھا بلکہ ساتھ ساتھ اس کا یہ رویہ تکلیف بھی دے رہا تھا، وہ غصے میں سرخی مائل چہرہ لیے اس کے ساتھ ہر محبت اور پیار کو اس چار دن کے نئے جذبات کے لیے فراموش کیے کھڑی تھی۔

"منہا تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تقی سے محبت کے بارے میں میں نے تمہیں نہیں تقی کو بتایا ہو یا اس سے میں چھپ کر ملنے کے تقاضے کرتی ہوں، میرے اور اس کے دل میں اگر ایک دوسرے کے لیے جذبے ہیں بھی تو ہم نے ان کو خود تک محدود کر رکھا ہے، میں اگر تم سے یہ دل کی بات بانٹ چکی ہوں کہ میں تقی سے محبت کرتی ہوں تو کیا یہ تمہاری بہادر کے لیے محبت کے برابر ہو گئی بولو"

رمنانے نے تاسف سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی، اور پھر آگے ہوتے ہوئے اپنائیت سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے، منہا کا ناک نخوت سے اوپر چڑھا اور لبوں پر استہزائی یہ مسکراہٹ نے گھیرا کیا

"ہاں برابر ہی ہوئی، محبت فقط محبت ہوتی ہے، جیسے تم بھائی سے کرتی ہو میں بہادر سے کرتی ہوں تم یہاں کھڑی ہو کر مجھے گناہ گار اور خود کو پار سا ثابت نہیں کر سکتی"

منہانے ہاتھ اوپر اٹھا کر اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے جھٹک دیے، رمنہا لکاسا جھٹکا کھا کر پیچھے ہوئی پھر پورے
وٹوق سے گویا ہوئی

"نہیں ہوئی برابر۔۔۔۔۔ یہ محبت جو تم کر رہی ہو تم اس کا انجام اچھے سے جانتی ہو ر سوائی اور ذلت کے علاوہ اور
کچھ نہیں"

رمنہا کے لہجے میں نرمی تھی، محبت سے اس کے چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا
"کیسی ذلت، یہ میری زندگی ہے میری خوشی بہادر کے ساتھ جڑی ہے میں اس کے ساتھ ہر حال میں خوش رہوں
گی، وہ جہاں جس حال میں رکھے گا، مجھے صرف بہادر چاہیے کوئی ڈاکٹر نہیں کوئی شہزادہ نہیں"
منہانے ناک پھلائے بڑے عزم سے جواب دیا، وہ بھرگئی تھی رمنہا کی ہر بات کا جواب تھا اس کے پاس
در حقیقت وہ کچھ بھی سمجھنا چاہتی ہی نہیں تھی۔

یہ حالت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہر اپنا بھی دشمن لگنے لگتا ہے، ہر صبح بات بھی غلط لگتی ہے۔
"یہ صرف کہنے کی باتیں ہوتی ہیں منہا، یہ جو جذبے ہیں یہ چند دن کی مشکلات کی مار بھی نہیں سہہ پاتے، اماں مجھے
کہتی ہے شادی کے بعد کی زندگی بہت کٹھن ہوتی ہے ذمہ داریوں کا بوجھ جذبات سے کہیں زیادہ ہو جاتا ہے اور
محبت کا اصل حق دار وہ ہوتا ہے جس سے نکاح ہوتا ہے اور نکاح کس سے ہو گا یہ اللہ جانتا ہے اس لیے نکاح سے
پہلے یوں کسی بھی غیر محرم سے محبت کا اظہار کرنا اور اس سے محبت کی بھیک مانگنا یہ سب غلط ہے"
رمنہا نے اپنی عقل کے مطابق اور غزالہ کی سمجھائی گئی باتوں کے پیش نظر اسے بات سمجھانے کی کوشش کی تھی
"تو تمہارا بھی تو بھائی سے نکاح نہیں ہوا کیا پتا تمہاری بھائی سے شادی ہی نا ہو پھر۔۔۔ پھر تو تم بھی گناہ کی مرتکب
ہوئی نا"

منہا کا چہرہ غصے سے لال بھبھو کا تھا، وہ تک مزاجی سے اس کے ہر سوال کا جواب دے رہی تھی

"ہاں میں یہ کب دعویٰ کرتی ہوں کہ میری شادی تقی سے ہی ہوگی اور تم کیوں میرے اور تقی کے رشتے کو بار بار بیچ میں لا کر مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہو، تمہارا اور بہادر کا کوئی جوڑ نہیں اور جب جوڑ ناہو تو زبردستی جوڑ بنانے میں ہم اللہ کے بہت سے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں، جیسے کہ ظاہری بات ہے، داجی کبھی تمہاری اور اس کی شادی کے لیے نہیں مانیں گے تو ایسے میں تم اس کو حاصل کرنے کے لیے غلط اقدامات اٹھاؤ گی اور تم جو بھی کرو گی اس میں بہت سے کام اسلام اور حکم الہی کے خلاف کرو گی اس لیے تمہاری محبت میری محبت کے برابر نہیں ہے"

ر منا ایک ہی سانس میں اسے بہت کچھ سمجھانے کی ناکام سعی میں تھی پر وہاں وہ نفرت بھری نگاہوں سے اپنے سامنے کھڑی اپنی جان عزیز سہیلی کو دیکھ رہی تھی جو آج اسے اپنی سب سے بڑی دشمن لگ رہی تھی۔

"کیسے۔۔۔؟ محبت میں سب جائی زہے جب میں اس سے محبت کرتی ہوں تو سب کروں گی اسے پانے کے لیے"

منہانے تاہنوز سپاٹ لہجے میں اپنا اگلا موقف پیش کیا، ر منانے گہری سانس خارج کی سینے پر ہاتھ باندھے

"یہیں سے ثابت ہو گیا کہ تمہاری محبت اور میری محبت میں زمین آسمان کا فرق ہے، میں تو اس سے خاموش محبت کرتی ہوں ایسی محبت جس کے ہر جذبے کو میں نے نکاح کے بعد کے لیے سنبھال رکھا ہے، حتیٰ کہ میں نے آج تک تقی سے برملہ اپنی محبت کا اظہار تک نہیں کیا اور اگر کل میری شادی اس سے نہیں ہوگی تو مجھے دکھ ہو گا لیکن ملامت نہیں۔۔۔۔۔ کیونکہ میں نے اس سے یا اس نے مجھ سے اپنے کسی بھی قسم کے جذبات کا تبادلہ نہیں کیا اور میرے وہ جذبات صرف ایک کے لیے ہی ہوں گے، بے شک ابھی میں تقی کے لیے محسوسات رکھتی ہوں لیکن میں ان محسوسات کو اس پر ظاہر کر کے ناپاک نہیں کرنا چاہتی دعا مانگتی ہوں فقط کہ اس سے میری شادی ہو جائے اور اگر ہوگی تو پھر ان محسوسات کو ایک پاک رشتے میں باندھ کر اس پر آشکار کر دوں گی"

ر منانے نہایت ملائی م لہجے میں اسے اپنی اور اس کی محبت کا فرق باور کروا دیا تھا

"محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے اس میں جو بھی ہوتا ہے انسان کی اختیار میں نہیں ہوتا ہے"

منہا نے آنکھوں میں موٹے آنسو سجائے کانپتے ہوئے کہا، بہادر پر غصہ آرہا تھا بجائے اس کی محبت کا جواب محبت میں دیتا اس نے رونا کو سب بتا کر اسے اس کی ہی نظروں میں گرا دیا تھا

"ہاں میں تمہاری اس بات سے بھی اتفاق کرتی ہوں محبت ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی، لیکن ہر معاملے میں جذبات کو قابو میں رکھنا ہمارے اختیار میں ہوتا ہے یہ نفس کی جنگ ہے جس میں جیت کے لیے صرف اللہ کی طرف دیکھنا ہوتا ہے لوگوں سے بھیک نہیں مانگی جاتی محبوب سے بھی نہیں اگر کوئی پتھر بھی تمہیں پسند آگیا ہے تو اسے تمہاری قسمت میں اللہ ہی لکھتا ہے، تم سب اللہ پر چھوڑ دو"

رمنانے اب کی بار اس کے کندھے پر دباؤ ڈالے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو جیسے اس کے تپتے دماغ کو سکون ملا اور لگا کہ رمنانے اس کے ساتھ ہے، آنکھوں میں اٹکے آنسو گال پر لڑھک گئے۔

"رمنانے میں بہت پریشان ہوں۔۔۔ میرا ساتھ دو کیا کروں؟؟ مجھے ایسا لگتا ہے میں بہادر کے بنا جی نہیں سکوں گی، مجھے دن رات اس کا خیال رہتا ہے دل چاہتا ہے بس جلدی سے سارا دن اور رات گزر جایا کرے اور وہی لمحہ آجایا کرے جس میں۔۔۔ میں اسے دیکھتی ہوں وہ میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتا ہے اور میں اس کے پاس سے گزر کر گاڑی میں بیٹھتی ہوں، رمنانہ مجھ سے محبت کرتا ہے میں جانتی ہوں میرا دل جانتا ہے پر وہ کیوں نہیں آگے بڑھتا"

منہا کانپتے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ لیے اسے اپنے پاگل پن سے آگاہ کر رہی تھی، رمنانے کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے، منہا کی یہ حالت اس کے اندر ایک خوف اتار رہی تھی، جیسے کچھ بہت برا ہونے والا ہے، اپنے خوف پر بروقت قابو پانا بہت ضروری تھا کیونکہ منہا کو اس وقت صرف وہی انسان اچھا لگ رہا تھا جو اس کی محبت میں ساتھ دینے کے لیے بات کرے

"منہامیری بات سنو گڑیا۔۔۔"

رمنانے بڑی محبت سے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا تھا وہ اب پہلے رویے کے بالکل برعکس رمنان کی طرف دیکھ رہی تھی، اسے منہا سے بے حد لگاؤ تھا اور یہی وجہ تھی وہ اس کی تھوڑی دیر پہلے والی تلخی بھلائے اسے پھر سے سمجھا رہی تھی۔

"تم بہادر سے بات کرتی ہو اس کو ڈر ہے کہ کوئی اگر دیکھ لے گا تو تمہیں نہیں اسے غلط سمجھے گا، تم اللہ پر سب چھوڑ دو اگر تمہاری بہادر کے لیے محبت سچی ہوگی تو تمہارے دل سے وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوگی اور اللہ سے دعا کرتی رہنا اگر وہ تمہیں مل جائے تو سمجھنا تمہارا پیارا سچا تھا اگر نالے تو اس کو بھی اللہ کی رضاماننا"

رمنانے بہت محبت سے اسے سمجھایا تھا جس پر وہ آہستگی سے سر ہلا کر رمنان کے گلے لگ گئی، رمنان اب محبت سے اس کی پشت سہلا رہی تھی۔

"میری باتوں کو ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ سوچنا، اور آج کے بعد تم بہادر سے کوئی بات نہیں کرو گی"

رمنان دھیرے سے اس کے کان میں رس گھول رہی تھی اور وہ فقط رور رہی تھی دل تھا کہ جذبات سے پھٹنے کو تھا۔

چھت اندھیرے میں ڈوب چکی تھی اور ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ گانے کی آوازیں چھت پر بھی سنائی دے رہی تھیں۔

دوپہر کا وقت تھا سورج پوری تمازت سے حویلی کے اوپر آسمان پر چمک رہا تھا، نیم اور پیپل کے درختوں کو چھوڑ کر پورے صحن کو دھوپ نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

حویلی کے صحن، اٹاری اور کمروں میں دور دراز سے آنے والے مہمانوں کی رونق لگی تھی۔ خواتین کی کھی کھی اور بچوں کی ریں ریں نے شور و غل برپا کر رکھا تھا۔

درختوں کے نیچے چارپائی یوں پر، کمروں میں اور جن کو کچھ زیادہ ہی سردی لگتی تھی وہ صحن کی دھوپ میں چارپائی ڈالے بیٹھے تھے۔

کہیں کوئی کھانا کھا رہا تھا تو کہیں کوئی چائے کے ساتھ لڈو کھا رہا تھا۔ فرزانہ کو مایوں میں بیٹھے آج چوتھا دن تھا وہ اس دن والے ہی پیلے جوڑے میں ملبوس بس ایک کمرے کی ہو کر رہ گئی تھی۔

رمنانے آہستگی سے برانڈے کے زینے چڑھے وہ بڑی احتیاط سے ہاتھ میں چائے کی پیالیوں سے بھری ٹرے تھامے ہوئی تھی، ٹرے کو تخت پر خدیجہ بیگم اور چند بوڑھی خواتین کے سامنے رکھا اور پھر تیز قدم اٹھاتی منہا کے کمرے کی طرف بڑھی اس کو اب بھی کام کے لیے بہت سی آوازیں پڑ رہی تھیں جنہیں نظر انداز کرتی وہ اب منہا کے کمرے کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

رمنانے دروازے کے کواڑ پر ہاتھ رکھا تو ہلکی سی کھٹ کی آواز پر سامنے لکڑی کے کرسی پر براجمان منہا جو اپنے پیروں پر جھکی تھی، نگاہ اٹھائے اس کی طرف دیکھا اور پھر چہرے کو اسی انداز میں جھکا کر سیاہ رنگ کے سکول کے جوتوں سے اپنے پاؤں آزاد کرنے لگی۔ وہ سکول کی وردی میں ملبوس تھی، چہرہ ہنوز اس تھا رمناب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس تک پہنچ چکی تھی جو جوتوں کو لکڑی کے کرسی کے نیچے کھسکا کر اپنی جگہ سے اٹھ رہی تھی، جیسے ہی اپنی جگہ سے اٹھی رمناب بالکل سامنے کھڑی تھی۔

"تم سکول کیوں گئی تھی آج؟"

رمنانے لہجے میں تھوڑی سی سخت در آئی تھی، چھت والے واقعے کے بعد آج تیسرا دن تھا اور وہ اس واقعے کے بعد سے ہر پل منہا کو جانچ رہی تھی، اور منہا کی حالت صاف صاف بتا رہی تھی کہ اس دن چھت پر وہ اس کے گلے لگ کر اس پاگل پن سے نکلنے کا کہہ تو چکی تھی لیکن اس پر رمنانے کی باتوں کا اثر زیادہ دیر نہیں رہا تھا۔ اس کی بے چینی، اس کا گم صم انداز سب رمنانے کے لیے تکلیف کا باعث تھا۔

اب بھی وہ خاموشی سے، رمناسے بے نیازی برتے، اپنا دوپٹہ ایک طرف رکھ کر پلنگ کے نیچے سے اپنی چپل نکالنے کے لیے جھکی

"منہا میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں، شادی کو تین دن رہ گئے ہیں، گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے، تم آج سکول کیوں گئی تھی"

رمنانے اس کے چپل تلاش کرنے کے بعد کھڑے ہوتے ہی اس کے کندھے کو گھما کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔
"وہ جماعت ٹیسٹ تھا بہت ضروری اس لیے جانا پڑا"

منہانے اس سے نگاہیں چرا کر جھوٹ بولا، رمنانے تاسف سے ایک پل رک کر اس کو گھورا
"جھوٹ بول رہی ہو تم، تم بہادر کو دیکھنے گئی تھی"

رمنانے حد درجہ دھیمے لہجے میں کہا، منہانے جزبہ انداز میں چپل اپنے پاؤں میں اڑائی۔

رمنانے صبح اٹھتے ہی معمول کے مطابق مہمانوں کی خدمتوں میں لگ گئی تھی جب احساس ہوا کہ منہا آج کہیں نظر نہیں آرہی، نہیں تو وہ اس کے ساتھ بھاگ دوڑ کر رہی ہوتی تھی اس خیال کے آتے ہی وہ بلقیس کے پاس گئی تھی جہاں سے اسے آج منہا کے سکول جانے کی خبر ملی اور اس خبر پر اس کا ماتھا بری طرح ٹھنکا۔

"ہاں گئی تھی، بہادر کو دیکھنے نہیں، اس سے دو ٹوک بات کرنے گئی تھی، کیونکہ میں چاہتی ہوں وہ ہمارے رشتے کو جائی زکرے وہ اپنے ابا سے کہے کہ داجی سے میرا رشتہ مانگیں"

منہانے سپاٹ لہجے میں اپنی بابت بتائی اور سامنے کھڑی رمنانے کو حیرت کا شدید دھچکا لگا

"منہا تم پاگل ہو گئی ہو اور کچھ نہیں، یہ وقت یہ عمر ہے کیا تمہاری اس سب کے لیے اور تقی۔۔۔ وہ تو تمہیں اتنا پڑھانا چاہتا ہے"

ر منا کو اس کی بیوقوفی پر حیرت تھی وہ کیوں ایک ہی بات کو ذہن پر سوار کیے ہوئے تھی کیا تھا جو اس کے اندر کالا وا ٹھنڈا نہیں ہونے دے رہا تھا

"نہیں میں پاگل نہیں ہوں، تمہارا بھی تو رشتہ ہو گیا ہے، فرزانہ آپا کا بھی ہو گیا تھا اس عمر میں، پھر میری دفعہ تمہیں کیوں برائی نظر آرہی ہے، میری ہر بات کو کیوں غلط قرار دے رہی ہو"

منہانے دانت پیس کر بے تکا سا جواز پیش کیا، ر منانے فوراً اپنی پیشانی کے بل کم کیے

"پھر کیا کہا بہادر نے؟"

منہانے ٹھنڈی سانس خارج کیے اس سے سوال کیا، جانتی تھی وہ اس وقت کسی کو بھی اپنا نہیں سمجھ رہی ہے اس لیے سمجھانے کا کوئی فائی دہ نہیں تھا اس دن چھت پر بھی ایک گھنٹہ سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا دراصل وہ خود ہی کچھ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

"انکار۔۔۔ ہمیشہ کی طرح انکار وہ صرف نام کا بہادر ہے وہ بزدل انسان ہے مجھ سے محبت کرتا ہے مگر ہمت نہیں ہے"

منہانے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے دل برداشتہ لہجے میں جواب دیا

"وہ بزدل نہیں تم سے عمر میں بڑا ایک سمجھدار لڑکا ہے اور تم بھی اب سمجھدار ہو جاؤ یہ وقتی جذبہ ہوتا ہے خود کو سنبھالو دیکھنا کچھ دن تک سب بھول جاؤ گی"

ر منانے محبت سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی

"ہممم یہ تو وقت ہی بتائے گا"

منہانے بمشکل آنسو روکتے ہوئے جواب دیا اور اس کے ایک طرف سے نکلتی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ ر منا وہیں خاموش کھڑی تھی دل عجیب طرح سے ڈوبنے لگا تھا، رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے۔

ایک انوکھا سا احساس تھا بزاری سی ہر چیز سے ہر انسان سے وہ دل میں تہیہ کر چکی تھی اب نا تو منہا کے بارے میں سوچے گی اور نا ہی اسے سمجھائے گی، گہری سانس باہر انڈیلتی وہ دل کا بوجھ کم کرتی باہر آئی۔

باہر قدم رکھتے ہی ارد گرد سے پھر سے آوازیں ابھرنے لگی تھیں، ر منایہ کر دو، ر منامیری بات سنو۔۔۔ وہ خاموشی سے ایک کے بعد دوسرا کام کر رہی تھی۔

لیکن منہا کی فکر تھی کہ ذہن کو بری طرح جکڑ چکی تھی وہ ایسی ہی تھی شروع سے ہر رشتے کی فکر میں گھل جانے والی

نوازش حاکم جب حویلی چھوڑ گیا تھا تو ر منایہ نے اپنی ماں کو کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر روتے دیکھا تھا۔ وہ سات سال اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھدار اور حساس بنا گئی تھی اور اب یہی وجہ تھی وہ منہا جو اس کی چچا زاد تھی اس کی فکر دل سے لگا بیٹھی تھی اور اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔

فرزانہ کے ویلیے کا دن تھا، صحن میں تمام مہمان تیاری مکمل کیے کھڑے تھے، بسیں اور گاڑیاں بس نکلنے کو تیار کھڑی تھیں۔

ر مناپریشان، بے حال صورت بنائے تقی کے کمرے سے باہر نکلی تھی اور قدم اب ٹاری کے زینے اترتے ہی چھت کے زینوں کی طرف تھے، وہ زرد پڑتے چہرے کے ساتھ زینے کے جنگلے کو تھامے اوپر چڑھ رہی تھی۔

اب تقی کو سب بتانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا وہ تیار ہونے کے بعد اریب بیگم کے حکم پر گاڑی میں فرزانہ آپا کا کچھ قیمتی سامان رکھنے باہر گئی تھی۔ جیسے ہی گاڑی میں سامان رکھ کر پلٹی، بدحواس سا بہادر بلکل اس کے پیچھے کھڑا تھا جو چورنگا ہوں سے ارد گرد سب کو جانچ بھی رہا تھا کہ کوئی ان کو دیکھ تو نہیں رہا۔ اس سے پہلے کے ر منا کچھ پوچھتی وہ حد درجہ دھیمے مگر فکر مند لہجے میں گویا ہوا۔

"ر منابی بی۔۔۔ منہابی بی کو بچا لو وہ کچھ دیر پہلے یہاں آئی تھی اور پاس سے گزرتی مجھے یہ کہہ گئی ہے وہ آج کچھ کھا کر مر جائے گی، اگر میں نے کوئی ہمت نہیں کی تو وہ اپنی جان دے دی گی"

بہادر کانپ رہا تھا اور الفاظ بھی بمشکل ادا کر رہا تھا، شائ دوہ منہا کے جذبات سے حد درجہ خوف کھانے لگا تھا یا پھر یہ اس کی محبت تھی۔

ر منانے ارد گرد سب کی طرف دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلاتی اسے تسلی دے کر حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھی، دماغ میں ہتھوڑے چلنے لگے تھے زندگی میں پہلی دفعہ اسے منہا پر اتنا غصہ آ رہا تھا کہ جی چاہا خود اس کا گلا دبا دے جسے کسی کی عزت کا خیال نہیں تھی بس ایک محبت کا بھوت سوار تھا۔

اس کا رخ سیدھا تقی کے کمرے کی طرف تھا اور اب وہ تقی سے اوپر آنے کا کہنے کے بعد چھت پر جا رہی تھی، آہستگی سے چھت کے زینے چڑھ کر جب وہ اوپر آئی تو سامنے کا منظر دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

سامنے صحن کی طرف کی دیوار سے کچھ دور منہا زرعی ادویات کا بوتل ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی اور اس کے سامنے بہادر ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ر منا تقریباً بھاگتی ہوئی ان تک پہنچی، بہادر نے جیسے ہی ر منا کی طرف دیکھا منمناتا ہوا اس کی طرف بڑھا

"ر منابی بی یہ دیکھیں کیا کر رہی ہیں منہابی بی، ان کو روک لیں"

بہادر کی التجا پر ر منانے خوف سے منہا کی طرف دیکھا جو جنون کی حد تک سرخ آنکھیں لیے تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ وہ بہادر کو جان بوجھ کر ذہنی اذیت دے رہی تھی دل کو ایک پل سکون نہیں تھا کہ وہ اس کی محبت میں بالکل اس کی طرح ہی کیوں نہیں تڑپ رہا ہے اسی لیے وہ پھر سے باہر جا کر اسے اپنے دوپٹے کی اوٹ میں چھپی یہ زہریلی بوتل دکھا کر آئی تھی۔

بہادر بدحواس ہو کر اس کے پیچھے ہی حویلی چلا آیا تھا اور پھر مہمانوں سے نگاہ بچاتا وہ چھت پر آچکا تھا، اور وہ جس کے سر پر خون سوار تھا پتا نہیں اس کو یہ ساری ہمت کون سی طاقت دے رہی تھی۔ رمنّا گڑبڑا کر آگے بڑھی "منہا تم۔۔۔ تم۔۔۔ پاگل پن مت کرو سمجھی یہ دو مجھے۔۔۔ دو مجھے بوتل"

رمنّا اس کے قریب آرہی تھی اور منہا پیچھے ہٹی جا رہی تھی بہادر بھی ساتھ ساتھ بدحواس سی صورت بنائے آگے بڑھ رہا تھا، وہ اب تقریباً دیوار کے قریب پہنچ چکے تھے

"پہلے اس سے کہو کہ اپنے ابا سے بات کرے میں سب کچھ سنبھال لوں گی بھائی کو بھی منالوں گی اور اگر یہ اب نہیں کر سکتا تو مجھے بھگا کے لے جائے یہاں سے"

منہا نے روتے ہوئے اپنی ازل کی ضد دہرائی، بہادر کی لاپرواہی اور محبت سے انکار اور پھر رمنّا تک اس بات کا پہنچنا سب مل جل کر اسے اور ضد اور پاگل پن پر اکسا چکے تھے، جذبات کو ایک عجیب سا ہیجان تھا جو دماغ کو مفلوج کر رہا تھا اسے رمنّا اور بہادر کی آپس میں اس کے لیے یہ بات بری طرح کھل رہی تھی وہ دنوں کیوں اسے پاگل سمجھ رہے تھے۔

رمنّا تو اس کے اس پاگل پن پر ششدر کھڑی تھی جبکہ بہادر حواس باختہ قریب ہوا

"منہا۔۔۔ بی بی۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں راضی ہوں، میں محبت کرتا ہوں آپ سے، میں ابا سے بات نہیں کر سکتا پر ہم بھاگ جائیں گے یہاں سے"

بہادر نے ڈرتے ہوئے اپنی بات کہی، رمنّا نے چونک کر بہادر کی طرف دیکھا

"بکو اس مت کرو۔۔۔ بھاگنا اس سب کا حل ہے کیا اور ابھی تقی آرہا ہے اوپر میں اس کو یہ سب بتانے والی ہوں"

رمنّا کے منہ سے نکلے الفاظ تھے کہ منہا کے ہاتھ سے ایک دم بوتل چھوٹ کر نیچے جا گری، وہ تنک کر آگے ہوئی اور رمنّا کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر دیوار کے رخ سیدھا کیا

"تم۔۔۔ پاگل ہوک۔۔۔ کیا۔۔۔ بھ۔۔۔ بھائی، رمناتم۔۔۔"

"رکو تم بھی کہیں نہیں جاؤ گے، تقی کو سب بتاؤ میرے ساتھ مل کر منہا کے بارے میں"

منہا نے حواس باختہ ہو کر التجا کی، رمنانے گردن ہلا کر انکار کیا

ر منا کو اس کا دماغ ٹکانے پر لانے کا اس سے بہتر حل کوئی نہیں لگ رہا تھا اس وقت، منہا نے جوش میں ایک قدم آگے بڑھایا

ایک جھٹکادیا تھا اس نے رمناکو جس پر اس کا توازن ایسا بگڑا کہ اس کی کمر دیوار سے ٹکرائی ایک سکینڈ کے بارہویں حصے میں بہادر نے اپنا بازو لمبا کیا تھا مدد کے لیے پرر مناس کے کف کو تھامنے کے باوجود اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکی تھی۔

منہا کے حلق سے ایک خوفناک چیخ برآمد ہوئی، دونوں ہتھیلیوں کو ایک ساتھ ملائے وہ اپنے منہ پر رکھے پھٹی آنکھوں سے سامنے دیوار کو تاک رہی تھی جہاں ایک سکینڈ پہلے رونا کھڑی تھی وہ اب وہاں موجود نہیں تھی۔ دھڑکتے دل، کانپتے وجود کے ساتھ وہ برق رفتاری سے بائیں طرف کے زینے کی طرف بھاگی، پورے جسم کے رونگٹے کھڑے تھے اور ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے، دماغ سائی میں سائی میں کرنے لگا تھا۔

یہ زینہ زیادہ طرف چھت پر جانے کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا یہاں کاٹھ کباڑ، سمینٹ کی بوریاں اور اینٹیں رکھی ہوئی تھیں، وہ زینے نیچے اتر رہی تھی جبکہ صحن میں موجود تمام نفوس اس وقت ایک جھمگٹے کی صورت رونا پر جھکے تھے وہ اتنی تیزی سے زینہ اتر کر نیچے آئی تھی کہ کسی کی نگاہ بائیں طرف کے بیلوں میں ڈھکے جنگلے والے زینے کی طرف گئی ہی نہیں جبکہ کے وحشت سے آنکھیں پھاڑے کھڑے بہادر نے اسی پل گڑبڑا کر برساتی کی طرف دوڑ لگادی۔

وہ برساتی میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے لمبائی رخ کھڑی چارپائی یوں کے پیچھے دبک کر کھڑا ہو گیا تھا، اس اچانک افتاد پر روح تک کانپ گئی تھی، دل خوف کے باعث اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ بائیں طرف کے کندھے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔

ایک دو سکینڈ کے بعد ہی جہاں نیچے سے ہولناک چیخ و پکار سنائی دینے لگی تھی وہاں، دگڑ۔۔ دھپ۔۔ دگڑ۔۔ کی آواز کے ساتھ بہت سے پاؤں چھت پر بھی آئے تھے لیکن چھت پر کسی کو ناپا کر اسی رفتار سے نیچے چلے گئے۔ بہادر اسی طرح دم سادھے وہاں کھڑا رہا پھر آہستگی سے چارپائی یوں کے پیچھے سے نکل کر پچھلے صحن کی دیوار کی طرف گیا۔

اچانک نگاہ اپنی قمیض کی طرف گئی جس کی جیب پھٹ کر نیچے لٹک رہی تھی، جلدی سے قمیض کو کو اتارا اور برساتی کے ایک طرف چارپائی پر پھینک دیا، نامعلوم ذہن میں ایک دم سے یوں پھٹی جیب والی قمیض سے باہر جانا

خوف میں کیوں مبتلا کر گیا تھا، اور وہ اسی سوچ کے پیش نظر قمیض اتار رہا تھا کہ منہا سے کہہ کر پھر یہاں سے قمیض منگوالے گا، قمیض کھولنے کے بعد وہ تیزی سے پچھلے صحن کی دیوار پھلانگ کر بھینسوں کے ڈالے گئے چھپر پر چھلانگ لگا چکا تھا۔

اندھیرے میں ڈوبا کچی مٹی اور توڑی سے لیپ کیا ہوا صحن چھ نفوس کی موجودگی میں بھی سناٹے سے سائی یں سائی یں کر رہا تھا۔ نظام تنفس تو سب کا کام کر رہا تھا پر وہ بے جان تھے۔

جہاں تین نفوس فقط ورطہ حیرت میں تھے وہاں باقی تین نفوس کی تو آنکھیں کرب سے پتھرا گئی تھیں۔
تقی تو کچھ یوں کھڑا تھا مانو جسم کا ٹوٹو خون ناہو، مالا جو بہن کی موت پر بچپن میں ناروی تھی آج آنکھیں بھل بھل آنسوؤں کی ندیاں بہا رہی تھیں وہ نیلے کٹورے جیسی آنکھوں میں ایسا غم لیے کھڑی تھی جس سے دم رکے۔
آہ۔۔۔ ایک ٹیس اٹھی تھی سینے میں اور سر اٹھا کر کوئی بھی راہ نالنے پر معدوم بھی ہو گئی۔

"نہیں تقی تمہیں نہیں پتا مجھے کیا کہنا ہے تم سے"

ر منا مضطرب کھڑی تقی کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ گزرے لمحے فقط ایک کرب بن جاتے ہیں جن کو موڑ کر کبھی اپنی مرضی سے بدلہ نہیں جاسکتا ہے۔۔۔

بہادر سر جھکائے زمین پر دیوار کے سہارے سے بیٹھ چکا تھا اب اس کے بلبلانے جیسی صدائی یں گونج رہی تھیں۔
"تقی بھائی۔۔۔۔۔ معاف کر دو مجھے۔۔۔۔۔ میں نے بہت گناہ کمایا۔۔۔۔۔ تقی بھائی شیطان کے بہکاوے میں آ گیا تھا
۔۔۔۔۔ تقی بھائی۔۔۔۔۔"

مالا نے آنسوؤں سے ترچہ اوپر اٹھائے تقی کی طرف دیکھا جو بے یقنی کے عالم میں ساکن وجود لیے یوں کھڑا تھا کہ بھس بھرا کوئی پتلا ہو جو ہلکے سے دھکے سے دھپ زمین بوس ہو گا۔

مالا پاؤں گھسیٹے چند قدم کہ دوری پر بیٹھے بہادر کے قریب آئی یوں لگ رہا تھا اتنی دیر کھڑے رہنے سے پاؤں شل ہو گئے ہیں اور اب باریک سے کیڑے پاؤں اور ٹانگوں پر رینگتے ہوئے پاؤں اوپر اٹھانے کی سکت بھی وجود میں نہیں پیدا کرنے دے رہے۔

وہ دوزانو بہادر کے سامنے آ بیٹھی تھی، ہوش و حواس تو پہلے ہی گم تھے اب تو چند بازگشت تھیں جو ذہن کی دیواروں سے ٹکرا کر ایک ہیجان سا پیدا کر رہی تھیں۔

"اُسے بچا لو مالا"

"پکڑو اس کو وہ بھاگ جائے گا اگر وہ بھاگ گیا تو ایک قبر اور بنے گی"

ر منا کی پیٹھ کے پیچھے پیوست خنجر، اس کا دلہن سے سفید کفن میں لپیٹ میت بنا، کسی کو بچانے کی منت کرنا، اس کو خوابوں کی سمجھنا آنے پر دھکے دینا، بٹن کا قمیض سے جڑنا اور پھر خواب میں آنا

یہ سب۔۔۔ یہ سب اشارے صرف ر منا کی موت سے نہیں جڑے تھے یہ اس انسان کو مرنے سے بچانے کے لیے جڑے تھے جس کو بچانے کا ر منا کہہ رہی تھی وہ اپنے قاتل کی کھوج نہیں چاہتی تھی وہ تو کسی کو بچانا چاہتی تھی اور وہ کون ہے جس کے ظلم کو وہ ختم کرنے کا کہہ رہی تھی۔ مالا کے ذہن کو جھٹکا لگا تھا اور گڑبڑا کر آنسو پونچھے اس نے بہادر کی طرف دیکھا

"اب۔۔۔ اب کس کو۔۔۔ کس۔۔۔ کی۔۔۔ قبر بنا رہے ہو تم دونوں"

مالا کے سوال پر بہادر جو لگاتار سردیوار سے لگائے دائیں بائیں سر کو جنبش دیتا رہا تھا ایک لمحے کے لیے ساکن ہوا اور بے یقینی کی کیفیت میں مالا کی طرف دیکھا

"ہاں۔۔۔ بتاؤ اب کون ہے جس کی قبر بن رہی ہے۔۔۔"

مالا اب کی بار چیخ اٹھی، بہادر بدک کر سیدھا ہوا

"کہ۔۔۔ کس کی۔۔۔ قب۔۔۔ برمالابی بی"

وہ بڑا گیا پر اس کی گھبرائی سی حالت مالا کے ہج میں بڑھا وادے گئی تھی وہ غصے میں کانپ اٹھی۔

"بولو کون ہے وہ جو جس کو ر منا خواب میں بچانے کا کہتی ہے بولو؟؟"

مالا پاگلوں کی طرح اس پر چیخ رہی تھی وہ اپنے سوالوں کے سارے جواب آج ہی چاہتی تھی۔ اتنے سالوں سے ابھی دور سلجھی بھی تو کیسے تھی۔

بہادر نے نگاہیں چرائی یں تقی جواب مالا کی آواز پر متوجہ ہوا تھا ایک دم سے ایسے آگے بڑھا جیسے بے جان جسم میں روح پھونک دی گئی ہو لمبے لمبے ڈگ بھر کر اس نے چار قدموں کا فاصلہ دو قدموں میں طے کیا اور ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھے بہادر کا گریبان اپنے مضبوط ہاتھ میں دو بوچے اسے اوپر اٹھالیا، اس کے قدم زمین سے کچھ اونچے اوپر فاصلے میں ہل رہے تھے۔

"بولو کون ہے۔۔۔ نہیں تو چند سانسیں جن کی مہلت دینے والا ہوں ان سے پہلے جان لوں گا تمہاری"

تقی کی پوری کھلی آنکھیں اور گرج دار لہجے سے کچی مٹی کی درو دیوار کانپ اٹھیں، سکینہ کے دائیں طرف کھڑی سفید چادر میں لپٹی بڑھیا ہڑا کر آگے بڑھی

"تقی باؤ۔۔۔ میرے بیٹے نے سب سچ بتا دیا، سارا قصور منہا دھی کا ہے میرے پتر کو کچھ مت کرنا تجھے اللہ کا واسطہ"

"

وہ کانپتی سی حقیر آواز میں کہتی تقی کے قریب ہاتھ جوڑے کھڑی تھی، بوڑھے جھری دار ہاتھ جو جھریوں کے باعث ایک دوسرے سے جڑ بھی نہیں رہے تھے جھٹکا دے کر چھوڑے ہوئے سپرنگ کی طرح لغزش زدہ تھے۔

"تقی بھائی میں آپ کو سب بتاتا ہوں اور ہر سزا منظور ہے مجھے، مجھے جان سے مار دو یا سر قلم کر دینا پر منہا بی بی کو کچھ مت کرنا"

"رمنابی بی کے گزر جانے کے بعد جیسے منہابی بی کو چپ لگ گئی، وہ ایک دم سے ایسی بدلی کہ اس نے مجھ سے بات کرنا تو دور میری طرف دیکھنا بھی بند کر دیا"

بہادر سر جھکائے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے الم کی کیفیت میں بات شروع کر چکا تھا۔
 "یہاں۔۔۔ یہاں مجھ سے غلطی ہوئی"

آواز میں لغزش پیدا ہوئی

"جہاں اب منہابی بی کی محبت نے مجھ سے منہ موڑا پتا نہیں کیوں میرے دن رات کا سکون ختم ہو گیا، اس ہیبت ناک سچ کے گواہ ہم دونوں تھے اور ہم دونوں ہی چپ سادھ چکے تھے، ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تک نہیں تھے"

بہادر بول رہا تھا اور سب نفوس ایک بار پھر سے ہم تن گوش تھے

"کتنے ہی سال یو نہی گزگئے، میں خود کو سمجھاتا رہا پر میں ہار گیا۔۔۔۔۔ اس دن۔۔۔۔۔ جس دن منہا بی بی کا رشتہ فرہاد بھائی سے طے پایا۔۔۔۔۔"

بہادر نے ندامت سے گردن کو کچھ یوں نیچے گرایا جیسے بے جان ہو

"میری شادی طے ہوگئی تھی، اس سے پہلے میں بس آخری دفعہ ان سے ملنا چاہتا تھا اور پھر مجھے یہ موقع مل گیا، ان کی دوست حمیرا کی شادی پر میں ان کو لے کر گیا اور واپسی پر۔۔۔۔۔۔۔"

بہادر نے کھوئے سے لہجے میں رک کر سانس لی۔۔۔

رات کے اندھیرے میں کچی سڑک پر گاڑی دھول اڑاتی آگے بڑھ رہی تھی، جہاں کچے پکے مکانوں کی مدھم زرد بتیاں جل رہی تھیں وہاں گاڑی کے سامنے کی بتیاں سڑک کو روشنی بخش رہی تھیں۔ بہادر لب بھینچے گاڑی چلا رہا تھا اور پچھلی نشست پر سر جھکائے منہا بیٹھی تھی کالی چادر کے نیچے سے زرد رنگ کا چمچا تا جوڑا ہلکی سی روشنی میں بھی چمچم کر رہا تھا۔

اچانک گاڑی کی رفتار سست ہوتے ہوتے بالکل بند ہوئی، منہا نے جھک کر اٹھائے چونک کر دیکھا، گاڑی سنسان سی سڑک پر ایک درخت کی اوٹ میں رکی تھی۔

آج حمیرا کی مہندی تھی جس کی واپسی پر بہادر اسے لینے آیا تھا وہ گئی تو نقی کے ساتھ تھی لیکن نقی وہیں سے کہیں اور کھسک گیا تھا اور اب واپسی میں وہ گاڑی میں اکیلی تھی۔

بہادر کا یوں اچانک گاڑی روکنا اس کے لیے کسی اچنبھے سے کم نہیں تھا، وہ مضطرب سی سامنے دیکھ رہی تھی جہاں بہادر گاڑی کے سٹیرنگ سے ہاتھ ہٹا چکا تھا۔ اور شائی دیکھ کہنے کی ہمت جمع کر رہا تھا۔

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔ کیسی ہیں؟"

بہادر کی آواز نے کار میں چھائے سنائے کو چیرا، منہا نے پتھرائی آنکھوں کو پلکیں جھپکا کر زندہ میں شمار کیا پر کوئی جواب نادیا، کچھ دیر جواب کی انتظار میں بیٹے۔

"آپ۔۔۔ خوش ہیں؟"

پہلے سوال کا جواب ملنا تھا کہ اس بے کل ہوئے مجنوں نے دوسرا سوال داغ دیا، منہا اب بھی خاموش بیٹھی تھی ایسی خاموش جس نے اسی دن چپ کاروزہ رکھ لیا تھا جس روز دن دھاڑے اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنی ہی پچا زاد بہن کے خون سے رنگ لیا تھا۔

منہا کی طرف سے کوئی جواب ناپا کر بہادر نے گہری سانس کچھ یوں باہر انڈیلی جیسے اندر کھلبلی مچاتی تکلیف اس عمل سے مند مل ہو جائے گی، زور سے سر کو سیٹ کی پشت پر دے مارا، کان ترس گئے تھے، اسی محبت کے راگ کو سننے کو جو وہ پورا سال آلاپتی رہی تھی۔

دل میں کسک اٹھتی تھی اسی محبت کی کھوج کے لیے جس میں پاگل وہ خود کو مارنے تک آپہنچی تھی پر کوئی جواب، کوئی ہوں ناہاں۔۔۔۔

"م۔۔م۔۔ میں۔۔ آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔۔۔۔ بس اتنا بتا دیں۔۔۔۔ آپ اس شادی سے خوش ہیں نا؟"

ایک اور سوال جواب کی امید میں کر تو بیٹھا تھا لیکن جواب نہ داد۔۔۔، بہادر نے اندر اٹھتی تکلیف کے باعث آنکھیں موند کر کھولیں

خاموشی۔۔۔۔ فقط خاموشی۔۔۔۔ گہری خاموشی۔۔۔۔

"آپ کی محبت کو ٹھکرانے کی سزا دی ہے رب نے مجھے منہا بی بی، مجھے ایک پل کو چین نہیں سات سالوں سے، تڑپ تڑپ کر اب ہمت جواب دینے کو ہے، جانتا ہوں ملن نہیں لکھا اس دنیا میں اور۔۔۔ اور نا ہی یہ حقیر اس کی خواہش کر رہا ہے، ب۔۔ بس دل آپ کو اپنی بے تابی بتانا چاہتا تھا، آپ کی آواز سننے سالوں بیت گئے، رحم کھائی یں بس ایک دفعہ اپنی زبان سے میرا نام پکاریں"

بہادر کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں آواز کی لغزش اس کی محبت کی سچائی کی گواہ تھی، پروہ تو پیچھے کسی زندہ لاش کی طرح بیٹھی تھی جس پر بہادر کے رونے کا بھی اثر نہیں تھا۔ بہادر بے آواز آنسو بہا رہا تھا۔۔۔ ایک لمحہ، دوسرا،

تیسرا، چوتھا،۔۔۔۔ پھر پانچواں

"مجھ سے شادی کرو گے"

بہادر آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا جب اچانک اس کی آواز گونجی اور وہ چونک کر پلٹا، اس کی آواز تھی یا ایک میٹھی سی کوک جس نے اس کے کانوں میں گھستے ہی تن بدن میں ایک لہر دوڑادی تھی۔

وہ ایک دم سے قدموں میں جان دے دینے والے غلام کی طرح مڑا۔

"میں تم سے شادی کروں گی پر۔۔۔۔۔ اس دفعہ ہم شادی کے لیے خالی ہاتھ نہیں بھاگیں گے، فرہاد سے شادی کسی صورت نہیں ٹل سکتی میں نے بہت کوشش کی"

منہاسپاٹ لہجے میں بول رہی تھی اس کے لہجے میں ناتار تھا ناچڑھاؤ، ناغزش تھی نا کرب نا ٹرپ تھی نا ملال "آ۔۔ آپ فرہاد سے شادی کریں گی تو۔۔ تو پھر مجھ سے..."

بہادر نے الجھ کر سوال کیا

"فرہاد۔۔۔ کو زہر دوں گی اور سارا زیور جو شادی پر مجھے ڈالا گیا ہو گا وہ لے کر بھاگ جائیں گے ہم" منہا کسی خونی چڑیل کے مترادف لگ رہی تھی، بہادر کا دل دہل گیا، جسم کانپ گیا۔۔۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑا تھا اور پھر بنا پیچھے دیکھے پوری رفتار سے گاڑی بھگا چکا تھا۔

نا پیچھے دیکھنے کی سکت تھی نا کانوں کو کچھ دیر پہلے منہا کے منہ سے نکلے الفاظ پر یقین تھا۔

گاڑی حویلی کے بیرونی گیٹ کے آگے رکی تو وہ انسان کے روپ میں جلاد جیسے دل والی، سپاٹ چہرے کے ساتھ چادر میں منہ چھپائے گاڑی سے اتری اور بیرونی گیٹ کی دونوں باغوں کے درمیان کی روش پر چل دی بہادر پھٹی آنکھوں، خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

سیاہ رنگ کی گاڑی بھرے بازار کی تنگ گلی کے آگے دیوار کے قریب رکی، صبح دس بجے کے قریب ہی بازار میں رونق شروع ہو جاتی تھی اور اب تو پھر ساڑھے گیارہ کا وقت تھا لیکن اب بھی کچھ دوکاندار اور ٹھیلے والے دوکان کے

آگے سے صاف صفائی کا کام کر رہے تھے اور کچھ دوکان کی چیزیں جو وہ رات کو سمیٹ کر اندر رکھ جاتے تھے اب لا کر باہر سجا رہے تھے۔

گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھیں منہا اور بلقیس اپنی چادریں درست کرنے لگی تھیں کیونکہ بہادر کے گاڑی روکتے ہی ان کو اترنا تھا۔

گاڑی کے رکتے ہی بہادر جلدی سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پہلے بائیں طرف کا دروازہ کھولا، بلقیس دروازے سے باہر نکلی بہادر تیزی سے چلتا ہوا دائیں طرف لپکا اور دروازہ کھولا، منہا آہستگی سے چادر کو سمیٹتی باہر نکلی، بہادر نے کن اکھیوں سے بلقیس کو دیکھا جو ہاتھ میں پکڑے تھیلے درست کر رہی تھی، بلقیس کی نظروں سے بچتے اس نے منہا کے کان کے قریب سرگوشی کی

”آج رات جب سب سو جائیں گے، حویلی کی چھت پر برساتی کے پاس آپ کا انتظار کروں گا“

بہادر نے حدردھیمی آواز میں سرگوشی کی، منہا نے چونکتے ہوئے پیچھے مڑ کر بلقیس کی طرف دیکھا جو گھوم کر اس کی طرف ہی آرہی تھی، اس نے جزبز حالت میں بنا بہادر کی طرف دیکھے چادر درست کی اور تیز تیز قدم بلقیس کے ہمقدم ہونے کے لیے بڑھا دیے۔

بہادر نے گہری سانس خارج کی اور گاڑی کے دروازے کی پشت سے ٹیک لگائے آسمان کی طرف دیکھا۔

وہ ہارچکا تھا۔۔۔ بہت برے طریقے سے ہارچکا تھا۔۔۔ سوچا تو یہ تھا کہ اس کی شادی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا، لیکن یہ اس کی بھول تھی۔

اس کی شادی کو سات ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا لیکن وہ اپنی بیوی کے لیے کسی قسم کے جذبات دل میں ابھارنے سے قاصر تھا، ذہن میں وہ سیاہ رات چپک کر رہ گئی تھی جس دن منہا نے اس سے فرہاد کو زہر دینے کی بات کی تھی۔

اس رات تو وہ گھبرا گیا تھا مگر اب بار بار منہا کی اس پیش کش کو ذہن میں دہرا کر ضمیر مرنے لگا تھا۔
 خود غرض محبت، ہاں یہ محبت کی قسم کچھ ایسا ہی نشہ چڑھا دیتی ہے، جب محبت جیسے خالص جذبے میں خود غرضی کا
 عنصر گھلنے لگے اس کا رنگ خود غرضی کے رنگ کے پیچھے پھیکا پڑنے لگتا ہے، ایک شخص کی محبت کے پیچھے باقی تمام
 رشتے بیکار اور بے معنی لگنے لگتے ہیں، ایسا لگتا ہے، اگر وہ ناملا تو سب رشتے اپنی وقعت کھو دیں گے، ایسا لگ رہا تھا
 زندگی کی ہر خوشی اس سے کچھ اس طرح جڑ گئی ہے کہ سانس لینا تک دشوار ہو رہا ہے۔
 کوئی تھا جو ذہن کو چیخ چیخ کر کچھ کے لگانے لگتا تھا کہ تو مرد ہو کر کچھ نہیں کر سکتا وہ عورت ہو کر اپنی محبت میں سب
 کرنے کو تیار ہے، وہ تمام زیور لے کر گھر سے بھاگے گی فرہاد بلقیس کا اکلوتا بیٹا، منہا تنہی کی اکلوتی بہن دونوں طرف
 کا زیور ان کو اچھی رہائی لیش اور زندگی کی بہتر شروعات میں مدد دے سکتے ہیں۔
 منہا اور فرہاد کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور وہ تھا کہ یہ سب سوچ کر اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی یوں
 لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت قیمتی چیز کو کھو دے گا۔ اور اس سارے احساس کے بڑھنے کی ایک وجہ آئے دن منہا
 اور بلقیس کا اس کے ساتھ بازار جانا تھا، ہر رات جہاں وہ خود کو سمجھا کر اس خود غرضی کو تھپک کر سوتا تھا صبح ہوتے
 ہی منہا کا وجود بجھتی راکھ میں چنگاری کا کام کر دیتا تھا۔
 اور آج وہ اس نعل در آتشگی کے ہاتھوں اپنی تمام تر خوف کا گلا گھونٹ کر منہا سے ملنے کی درخواست کر چکا تھا۔

رات کے اندھیرے میں ڈوبی حویلی اور بخ بستہ ہوئی ہر چیز، بہادر پچھلے صحن کے چھپرے سے حویلی کی چھت تک پہنچا
 تھا۔

وہ آج رات گھر جانے کے بجائے گاڑی کی صفائی کے بہانے پچھلے صحن کا باہر برانڈوں کی طرف کھلنے والا دروازہ پہلے سے کھول چکا تھا، اب جب سب سو گئے تھے وہ اسی دروازے سے با آسانی پچھلے صحن اور پھر صحن کے چھپرے سے لکڑی کی سیڑھی لگا کر چھت پر آچکا تھا۔

برساتی کے قریب پہنچ کر آہستگی سے چلتا ہوا وہ دیوار کے قریب ہوا اور صحن میں جھانکا، چاروں طرف سناٹا تھا۔ برساتی کے ایک کونے میں دیوار سے لگ کر وہ کچھ اس طرح بیٹھ گیا کہ دونوں اطراف کے زینے با آسانی دیکھ سکتا تھا، وہ کبھی دائیں دیکھ رہا تھا تو کبھی بائیں۔

ہولے ہولے لرزتے دل کو پوری اُمید تھی منہا اوپر آئے گی، یونہی بیٹھے، ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑ رگڑ کر گرم کرتے اسے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ سیاہ اور سفید رنگ کے ڈبیوں والے کھیس میں لپٹا وہ کھلی چھت کی ٹھنڈی ہوا سے لڑتے سردی کے وار سے مزاحمت کر رہا تھا۔

امید ایک گھنٹے کے بعد ہی خوف اور مایوسی کی لپیٹ میں آنے لگی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا، چند قدم ہی سرخ اینٹوں والی چھت کے فرش پر چلا تھا، جب سناٹے میں قدموں کی چاپ واضح سنائی دی، ایک لمحے کو دل دھڑکنا بھولا اور رونگٹے کھڑے ہوئے، خوف سے کانپتے وجود کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا وہ سیاہ شال میں لپٹی چند قدم کے فاصلے پر پیچھے کھڑی تھی۔ شال گھٹنوں تک آرہی تھی اور ہلکے بھورے رنگ کی شلوار اندھیرے میں گہرے بھورے رنگ کی لگ رہی تھی۔

ایک لمحہ۔۔۔ دوسرا۔۔۔ تیسرا۔۔۔ چوتھا

"آپ آگئی ہیں۔۔۔ مجھے لگا تھا۔۔۔ مجھے لگا نہیں آئی گی"

بہادر کے لب کھلے تو سفید رنگ کی منہ سے اڑتی، ہوا میں گھلتی، بھاپ کے ساتھ سرگوشی نے تیخ بستہ سناٹے میں ارتعاش پیدا کیا۔

بے تاثر، سردی میں سرد لہجہ، وہ چہرہ سیاہ چادر میں کچھ یوں چھپائے کھڑی تھی کہ صرف آنکھیں اور ناک کی اوپری سطح واضح تھی۔

بہادر رکاندھوں پر ڈالے کھیس کو درست کیا، ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑا، مضطرب چہرہ ذہن میں ترتیب دیے تمام جملوں کے بے ترتیب ہونے کی عکاسی کر رہا تھا۔

”میں آپ کا ساتھ، ہر حال میں چاہتا ہوں“

لمحہ منجمند-----وہ بہادر کی حیرت سے بے نیازہ برتنی کلام کا سلسلہ جوڑ چکی تھی

منہا کسی ٹرانس کی کیفیت میں بول رہی تھی، بہادر تیزی سے دو قدم آگے بڑھا

بہادر نے ٹھٹھرتے اور خشک ہوتے لبوں کو بھیچے راز دارانہ انداز میں کہا، منہا نے نگاہیں اٹھائے اس کی طرف دیکھا

Whatsapp : 03335586927

بہادر نے بڑے رازدانہ انداز میں اسے ایک اہم بات سے آگاہ کیا، وہ اس راز سے بہت سال پہلے ہی واقف ہو چکا تھا جب اس نے ایک دفعہ شہر میں منیر میاں کو دو بچوں کے ساتھ دیکھا تھا پھر چھپ کر ان کا پیچھا کرنے پر اسے یہ راز افشاں ہوا تھا کہ وہ چھپ کر نکاح کر چکا ہے، اس بات کا ذکر جب اس نے گھر میں اپنے باپ سے کیا، تو اس نے اسے اپنی زبان بند رکھنے کا کہا، وہ تب سے خاموش ہو گیا تھا لیکن آج وہ چاہتا تھا کہ منہا بجائے فرہاد کو مارنے کے اس راز کا پردہ فاش کرتے ہوئے کچھ کرے۔

اس بات پر منہا ایک لمحے کے لیے چونکی مگر دوسرے ہی پل آہستگی سے سرنفی میں ہلا دیا۔
”اس سے کیا ہو گا، کچھ نہیں ہو گا، زیور حاصل کرنا ہمارا اصل مقصد ہے جو شادی سے پہلے کسی بھی صورت میری دسترس میں نہیں آسکتے ہیں، اس لیے شادی کرنا مجبوری ہے، تمہیں زہر تیار کروانا ہو گا، میں شادی کے بعد تمہیں زہر خریدنے کے پیسے دوں گی“

منہا تو اپنی بات پر ڈٹی تھی اور ایک طرح سے وہ درست تھی زیور ابھی اس کی دسترس میں نہیں تھا جو شادی کے بعد ہی مل سکتا تھا مگر یہ زہر اور فرہاد کی موت۔۔۔۔ ایک لمحے کو بہادر کو پھر سے اپنے اردائے سے ڈگمگائی پر یہاں بھی وہ درست تھی فرہاد کے نکاح میں آنے کے بعد وہ نکاح پر نکاح نہیں کر سکتے تھے اس کے لیے فرہاد کا مرنا لازمی تھا۔

دونوں طرف خاموشی کی فضا چھائی تھی، بہادر گہری سوچ میں ڈوبا تھا اور منہا چھت کی دیوار کو گھور رہی تھی۔
ایک لمحہ۔۔۔ دوسرا۔۔۔ تیسرا۔۔۔

”اچھا میں چلتی ہوں، تم میں ہمت نہیں ہے کچھ بھی کرنے کی“

منہا ایک دم سے پلٹی
”رکیں۔۔۔ رکیں۔۔۔“

”میں۔۔۔ کروں گا سب کچھ آپ کے لیے۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہماری محبت کے لیے“

”ٹھیک ہے، میں شادی کے بعد تمہیں بتاؤں گی کیا کرنا ہے، تم بس کسی پنساری سے رابطہ کرو اور اس سے اس دوا

منہا نے دو ٹوک لہجے میں اپنی بات کہی اور پھر تیزی سے پلٹتے ہی قدم آگے بڑھا دیے

”رکیں۔۔۔۔“

بہادر کی آواز پر قدم تھمے مگر وہ پلٹی نہیں، بہادر نے دو قدم گھسیٹ کر چھت کی مٹی کو روندتے ہوئے بڑھائے

”چہرہ۔۔۔ تو دکھا دیں اپنا، اس ٹھنڈ میں بھی آنکھیں جل رہی ہیں۔۔۔ شامی دیکھ سرور ملے“

بہادر کے گھمبیر لہجے میں جذبات کی گرماہٹ موجود تھی بڑے حق اور وثوق سے وہ یہ بات کہہ گیا تھا اور اب لب مسکرا رہے تھے کہ وہ پلٹے گی اور چہرے پر سے سیاہ چادر کو ہٹا دے گی، وہ یونہی رُخ موڑے مجسم کھڑی تھی اور پھر تیزی سے قدم آگے بڑھا گئی۔

بہادر جو ہاتھوں کو آپس میں ملتا مسکرا رہا تھا اور اس کے دید کی خوشی چہرے پر گلال کھلا رہی تھی ایک دم سے حیرت میں اسے زینے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ زینہ اتر چکی تھی۔

بے یقینی سے خالی چھت کو دیکھا جہاں کچھ پل پہلے وہ کھڑی تھی، گہری سانس خارج کی اور پچھلے صحن کی دیوار کی طرف قدم بڑھا دیے

* * * * *

”یا میرے اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!!“

مالا نے پھٹے دل کے ساتھ منہ پر ہاتھ رکھا اور بے ساختہ چند قدم پیچھے ہوئی، حقیقت ایسی روح پرور تھی کہ سانس تک اٹک گیا۔ اُس کے لیے منہا آپا کا ایسا روپ ناقابل یقین تھا۔

تقی بدحواس پھی آنکھوں سمیت بہادر کی طرف دیکھ رہا تھا، دل چاہ زمین پھٹے اور وہ پورے کا پورا اس میں سما جائے، منہا سے محبت کے سارے مناظر ایک ایک کر کے ذہن کے پردوں میں بھڑکتی آگ سے جل کر راکھ ہو رہے تھے۔

بوڑھی عورت کے ساتھ کھڑی بہادر کی بیوی منہ پر ہاتھ رکھے سسکنے لگی تھی، بہادر کی خود سے بے اعتنائی کو سہتے دو برسوں کا سبب آج پتہ چلا تھا۔

”اس کے بعد۔۔۔ منہابی بی نے مجھے اپنی ایک انگوٹھی اور ایک سونے کا کڑا بیچنے کو دیا، میں نے وہ بیچ کر زہر خریدہ اور منہابی بی کو دے دیا“

بہادر سپاٹ لہجے میں بول رہا تھا اور سننے والے وجود بھی کان بن چکے تھے

”بعد ازاں منہابی بی چپ سادھ گئیں، میں نے بہت بار ان سے بات کرنے کی کوشش کی پر انہوں نے آگے کے بارے میں مجھے کوئی آگاہی نہیں دی“

بہادر اب جھکے سر کو آہستگی سے دائیں بائیں جنبش دیتے ہوئے بات کر رہا تھا، ایک سکینڈ کے توقف کے بعد اس نے وہیں سے سلسلہ کلام جوڑا

”مجھے ایک دن جوش آیا۔۔۔ اور میں نے اپنے ایک جاننے والے سے منیر میاں کے راز پر ایک خط لکھوا کر حویلی بھیج دیا، میں چاہتا تھا اس خبر سے منہابی بی کچھ اشارہ سمجھے گی اور بات آگے بڑھائے گی مجھے کچھ بتائے گی کہ اب کب تک ہم یہاں سے بھاگیں گے پر اس کے بعد ہماری کوئی بات نہیں ہوئی“

بہادر نے ہتھیلی کی پشت سے ہونٹوں کی اوپری سطح پر آیا پسینہ صاف کیا اور آہستگی سے نیچے ڈھلکا سر اوپر اٹھایا۔
کانپتے سے ہاتھ تقی کے سامنے جوڑے

”تقی بھائی بہک گیا تھا، منہابی بی کی باتوں میں اور محبت میں آکر سب کیا پر اب یہ چاہتا ہوں مجھے کڑی سے کڑی سزا ملے“

بہادر نے ہاتھ جوڑے نگاہیں جھکائی یں، مالا جو بدحواس کھڑی یہ سب سن رہی تھی تیزی سے تقی کی طرف بڑھی، ساکن کھڑے تقی کے بالکل سامنے آکر چہرہ اوپر اٹھایا
”تقی۔۔۔ جلدی گھر چلیں۔۔۔ ہمیں فرہاد بھائی کو سب بتانا ہو گا، ان کو بچانا ہو گا، اگر منہا آپا ان کو اس وقت سے زہر دے رہی ہیں تو۔۔۔۔“

مالا سوچی آنکھوں اور سرخ ناک لیے بمشکل روندھائی آواز میں بول رہی تھی، اس کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھے جب تقی اس سکتے کے عالم سے باہر آیا، سلگتے دماغ اور کنپٹی کی ابھرتی نسوں میں شدید درد تھا، اعصاب کا تناؤ اتنا بڑھا تھا کہ اب سر میں ہتھوڑے سے برسنے جیسا احساس تھا۔
تقی نے پیشانی کے دونوں اطراف کنپٹی کو نسوں پر انگلیاں رکھیں، ابھی بہادر کے جرم کی سزا سے فرہاد کو بچانے کی اہمیت زیادہ تھی۔ اس نے ایک دم ہاتھ نیچے گرائے، تیزی سے قدم بیرونی دروازے کی طرف بڑھائے تو مالا بھی بدحواس سی ساتھ ہوئی سکینہ نے ایک نفرت بھری نگاہ بہادر پر ڈالی اور بھاگتی ہوئی دروازے سے نکلتے تقی اور مالا کے ہمراہ ہوئی۔

بہادر اب سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا اور پھر لکڑی کے دوپٹ والا دروازہ ٹھک، ٹھک کی آواز کے ساتھ لگنے کے بعد چٹنی اوپر چڑھنے کی آواز آئی۔

تین قدم صحن میں پہنچے تو ٹھٹھک کر رک گئے، صحن کا منظر ہی عجیب تھا، حویلی کے سارے مکیں ہوائیاں اڑے چہرے لیے صحن میں موجود تھے۔

فرہاد نے منہا کو بازؤں میں اٹھا رکھا تھا، سب نے ایک ساتھ ان تینوں کی طرف دیکھا، بلقیس اور غزالہ برق رفتاری سے ایک ساتھ مالا اور تقی کی طرف بڑھیں، بلقیس بھاگتی ہوئی تقی کے پاس پہنچی جو نا سمجھی سے بھنویں سکیڑے سامنے کے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

وہ تو سوچ رہا تھا، منہا کو بالوں سے نوچتے ہوئے صحن میں لا کر بیٹھے گا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلابوچ کر اسے جان سے مار دے گا۔

”تقی کہاں تھا تو۔۔ دیکھ بہن کو کیا ہو گیا ہے؟، ہوش میں نہیں آرہی ہے، آنکھیں ہی نہیں کھول رہی ہے کب سے، دیکھ اسے۔۔۔۔۔“

بلقیس کی پھٹتی آواز خوف سے کانپ رہی تھی، ممتا کا کلیجہ کسی نے مٹھی میں لیا ہو جیسے، غزالہ پریشان صورت لیے
مالا کے قریب ہوئی

”مالا۔۔ کہاں تھی تو کب سے ڈھونڈ رہی ہوں تجھے“

غزالہ نے حد درجہ دھیمے لہجے میں پوچھتے ہوئے ساکن کھڑی مالاکاندھا جھنجوڑ ڈالا جو سامنے کے منظر کو پھٹی سے آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

تقی اب مضطرب سا بلقیس کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، جہاں صحن میں فرہاد اب تقی کو دیکھ کر منہا کو چارپائی پر لیٹا چکا تھا۔

تقی نے ایک نگاہ فرہاد کے چہرے کی طرف دیکھا جو منہا کی اس حالت سے پریشان حال پیشانی پر شکن ڈالے کھڑا تھا اور پھر چارپائی پر لیٹی منہا پر جھک گیا۔

صحن میں جلتے پیلے بلب کی تیز روشنی میں وہ با آسانی منہا کا چہرہ دیکھ سکتا تھا، اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گال کے پاس سے نیلے رنگ کے ہو رہے تھے، اس کے لبوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا وہ بھی ہلکے نیلے اور سیاہ رنگ کے ہو رہے تھے جن پر جمی پیڑی سفید رنگ کی تھی۔ تقی نے اس کے زرد پڑ مردہ سے بازو کو اوپر اٹھایا ”مجھے زہر لادو گے، یہ زہر انسان کو اندر سے آہستہ آہستہ کھوکھلا کر دیتا ہے“

بہادر کے کہے جملے تقی کے ذہن میں گونجتے ہی اس کے اوسان خطا کر چکے تھے، دل ایک دم سے دہل گیا، اس کی نبض کی رفتار بہت آہستہ تھی، تقی نے جلدی سے اس کی آنکھ کے پوٹے کو اپنے انگوٹھے سے اوپر کیا ”ڈاکٹر تقی مجھے پورا یقین ہے، منہا کے بے بی کی ڈیتھ کی ریزن کوئی دوا ہے“

ڈاکٹر تسنیم ناک پر چشمہ درست کر رہی تھیں، تقی نے منہا کے آنکھ کی پتلی میں نیلی دھاریوں کو دیکھا ”تقی یار یہ کوئی دوا کے اثرات ملے تو ہیں خون میں پران کی مقدار اتنی کم ہے کہ سہی سے معلوم نہیں ہو رہا، میں نے رپورٹ تمہیں تار کے ذریعے بھیج دی ہیں“

نمیر کی آواز کانوں میں گونجی تھی، تقی نے ایک جھٹکے سے منہا کو گود میں اٹھایا اور حویلی کے بیرونی گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔

ڈب۔۔۔ ڈب۔۔۔ ڈب۔۔۔ دل کی دھڑکنے کی آواز کانوں میں بجنے لگی تھی، وہ پوری قوت لگا کر جتنا تیز چل سکتا تھا چل رہا تھا، اب مضبوط بازو کی رگیں بھی کپٹی کی نسوں کی طرح ابھر گئی تھیں۔

آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھلا تو آلہ تنفس سے آتی ٹوں۔۔۔ ٹوں کی آواز کے ساتھ کمرے کے دروازے کی چرچاہٹ کی آواز شامل ہوئی، تقی ہلکے نیلے رنگ کی چیکدار شرٹ کے اوپر سفید کورٹ میں ملبوس کمرے میں داخل ہوا، تقی کے پیچھے ہی ایک اور سنیر ڈاکٹر بھی کمرے میں داخل ہوا۔

ڈاکٹر وقاص ہسپتال کے سنیر ڈاکٹر میں شمار ہوتا تھا لیکن تقی سے اس کی بہت دوستی تھی منہا کا معاملہ مکمل طور پر ایک پولیس کیس بن رہا تھا لیکن تقی سے دوستی کی بنا پر ڈاکٹر وقاص اس معاملے کو چھپانے میں اس کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔

رات بھر انتہائی نگہداشت میں رکھتے ہوئے معدہ واش کرنے کے باوجود اب معاملہ سنگینی اختیار کرنے لگا تھا کیونکہ منہا کی حالت تشویش ناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

تقی اور ڈاکٹر وقاص آہستگی سے چلتے ہوئے اب منہا کے بیڈ کے قریب آچکے تھے، منہا پر نگاہ پڑتے ہی تقی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا۔ ماں جانی ہونا شاید اسے ہی کہتے ہیں، آج اسے یہ بات باخوبی سمجھ آ رہی تھی ”تقی مجھے لگتا ہے اسے بڑے شہر لے جانا چاہیے، لاہور یا کہیں اور“

ڈاکٹر وقاص نے ایک نگاہ منہا پر ڈالی اور لب بھینچے پریشان حال کھڑے تقی کی طرف دیکھا۔ تقی نے چونک کر منہا پر جھکا چہرہ اوپر اٹھائے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

وہ رات ہی منہا کو لے کر فوراً شہر آگئے تھے، اس وقت فرہاد، نقیب حاکم، نوازش حاکم اور منیر باہر موجود تھے، تقی ان سب سے بھی منہا کے متعلق ہر بات چھپائے ہوئے تھا۔

”ابھی۔۔۔ اس کی حالت۔۔۔ آکسیجن کے بنا مطلب یہ کچھ مشکل لگ رہا ہے مجھے“

تقی نے پیشانی کو پریشانی سے سہلاتے ہوئے بے ربط سے جملے ادا کیے، اس کی یہ گھبرائی ہوئی حالت سامنے لیٹی منہا کی وجہ سے تھی، ڈاکٹر وقاص نے آگے بڑھ کر تقی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”دیکھو تقی آنسٹلی سپیکنگ۔۔۔ پیشنٹ کی حالت بہت کریٹیکل ہے، زہر کاسب سے زیادہ اثر سٹمک اور گردوں پر ہوا ہے فوری علاج کے لیے بہترین طبعی سہولیات درکار ہیں جو یہاں دنیا پور میں تو بالکل نہیں ملیں گی تمہیں، میرا مشورہ یہی ہے آج رات ہی تم پیشنٹ کو لے کر کسی بڑے شہر کے لیے روانہ ہو جاؤ“

ڈاکٹر وقاص نے اب کی بار دو ٹوک لہجے میں اپنی بات مکمل کی، تقی کے کندھے کو تھپ تھپایا اور کچھ توقف کے بعد تقی کو یونہی پر سوچ چھوڑ کر باہر نکل گیا، تقی نے نگاہ اٹھائے سامنے بے حال لیٹی منہا پر ڈالی۔

وہ شاید پچھلے تین ماہ سے یا اس سے کم عرصے سے زہر لے رہی تھی اور زہر کی یہ مقدار آہستہ آہستہ اس کے اندر بہت سے اعضا کو بری طرح اثر انداز کر چکی تھی۔

تقی نے بے بسی سے منہا کے چہرے کی طرف دیکھا، کہاں تھی کل اس کے لیے دل میں اٹھنے والی نفرت، کہاں تھا وہ غصہ جو اسے منہا پر تھا، اس وقت تو سوائے رحم کہ اسے منہا پر کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ چاہے ذہن کو بار بار جھٹلا رہا تھا، لیکن وہ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے باخوبی جانتا تھا منہا کا بچنا اب بہت مشکل تھا۔ اس کا ہسپتال نا آنے کی ضد کرنا دوالینے میں کوتاہی برتنا وہ یہ سب جان بوجھ کر کرتی رہی تھی اور۔۔۔ اریب پھپھو پر جو وہ انجانے میں الزام لگا چکا تھا سب کچھ اندر سے ایسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

☆☆☆☆

گہرے بھورے رنگ کی کپڑوں کی الماری کے دونوں پٹ کھلے تھے، تقی خالی ذہن اور مضطرب چہرہ لیے سامنے کھڑا تھا۔ کندھے ڈھلکے ہوئے تھے اور اعصاب بھاری بوجھ تلے دبے ذہن کو مفلوج کر رہے تھے۔

کمرے کی اس ہولناک خاموشی کا ساتھ صرف اُس کا ہی وجود نہیں تھا، چند قدم کی دوری پر سرا سیمگی اور تاسف میں ڈوبی مالا بھی کھڑی تھی جو سست رفتاری سے پلنگ پر پڑے جوڑے اٹھا کر ان کو ہاتھوں میں گھماتی پلنگ پر پڑے سیاہ رنگ کے بیگ میں رکھ رہی تھی۔

تقی نے تاہنوز اسی حالت میں ہاتھ بڑھا کر سامنے پڑے دو جوڑے اٹھائے اور پلٹا، جیسے ہی پلٹا تو پیچھے کمرے میں داخل ہوتی بے حال بلقیس کو دیکھ کر وہیں تھم گیا، وہ مضطر سے آگے بڑھی۔

"تقی تو بس مجھے لے جاسا تھا لاہور، دیکھ میں یہاں پل پل مرتی رہوں گی اس کی فکر میں اور پھر اس کی دیکھ بھال کون کرے گا یہ سب وہاں۔۔۔"

بلقیس روندھائی آواز میں تقی سے التجا کر رہی تھی، تقی کچھ دیر پہلے ہی شہر سے حویلی پہنچا تھا اور آتے ہی اس نے مالا کو اپنے ساتھ لاہور جانے کا حکم صادر کر دیا تھا۔

وہ اب جہاز کے ذریعے منہا کو لاہور لے جا رہے تھے، وہاں وہ نمبر اور بلال کے ساتھ بات کر چکا تھا وہ دونوں لاہور کے اچھے ہسپتال میں ملازمت کر رہے تھے اور اب وہیں منہا کا علاج ہونا تھا۔

بلقیس کا یہ درد اور دکھ سے بھر اچہرہ وہ جانتا تھا وہ ماں ہیں اور منہا کی یہ حالت ان کے لیے بہت پریشان کن ہے لیکن منہا کی اس حالت کے پیچھے موجود حقیقت سے صرف مالا ہی واقف تھی اسی لیے وہ مالا کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

"اماں۔۔۔اماں۔۔۔ فکرنا کریں آپ، مالا سنبھال لے گی سب۔۔۔"

تقی نے بلقیس کے کندھے پر ہاتھ رکھے تسلی دی مگر اس کی یہ تسلی کارآمد ثابت نہیں ہوئی تھی وہ جانتا تھا اس بارے میں۔

"مالا اتنی چھوٹی ہے اسے کہاں وہاں سب سنبھالنا آئے گا، تو فکرنا کر میں ساتھ چلتی ہوں"

بلقیس اب بھی پریشان حال تھی، تقی نے گہری سانس لیتے ہوئے رُخ موڑا، وہ ہاتھ میں پکڑے پکڑے پلنگ پر رکھ چکا تھا۔

مالا اب ان کپڑوں کو بھی اٹھا کر تہہ لگانے کے بعد بیگ میں رکھ رہی تھی، نگاہیں بار بار تقی اور بلقیس پر اٹھ رہی تھیں، وہی دونوں نہیں پورا حاکم قصر اسی میں ڈوب گیا تھا، ابھی تو ایک جوان موت کا غم قصر کی مکینوں کے دلوں سے مند مل نہیں ہوا تھا تو دوسرا۔۔۔۔۔

بلقیس کے مالا کو یوں چھوٹا اور نا سمجھ کہنے پر تقی نے جھنجلا کر بلقیس کی طرف دیکھا
 ”نہیں ہے وہ چھوٹی اماں، بہت سمجھدار ہے، آپ سے نا تو جہاز کا سفر ہو پائے گا اور نا وہاں ہسپتال میں اتنی بے آرامی کاٹی جائے گی، میں ہوں فرہاد ہے ابابہیں ہم سب سنبھال لیں گے“
 تقی نے تسلی آمیز لہجے میں بلقیس کے کندھے پر زور دیتے ہوئے پھر سے وہی جواب دیا، تقی کے یوں اس کو سمجھدار کہنے پر مالا نے ایک لمحے کے لیے پلکوں کی گھنی جھالراٹھائے اسے دیکھا۔

شکن آلودہ شرٹ، بکھرے سے بال، تنے اعصاب کے باعث کچھ سا چہرہ، رتجگے سے اوپر کو چڑھی، تھکی سی آنکھیں، بے اختیار دل چاہتا ئی اماں کمرے میں نا ہوتی تو تقی کے سینے سے جا لگتی اس کی تکلیف اس کے دکھ کو اپنے اندر کہیں سمیٹ لیتی اس کی یہ کرب ناک حالت دل میں کسک پیدا کر رہی تھی۔

ایک متوازن ڈگر پر چلتی زندگی یوں پلٹا کھائے گی ان میں سے کسی نے سوچا بھی نا تھا۔ تقی اب ایک بازو کے حصار میں بلقیس کو اپنے ساتھ لگائے ان کے سر پر بوسہ دے رہا تھا۔

”آپ بس یہاں رہیں اور دعا کریں اس کے لیے ان شاء اللہ وہ صحت یاب ہو کر لوٹے گی“

تقی کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، مالا نے چونک کر تقی کی طرف دیکھا، بلقیس تو شاید اس کے لہجے میں چھپی مایوسی کو جانچ نہیں سکیں تھیں لیکن مالا تقی کی رگوں میں بہتے خون کی روانی سے بھی محبت کرتی تھی وہ کیسے اس کے لہجے میں موجود دکھ اور مایوسی کو نا جانچ پاتی۔

بلقیس آنسو صاف کرتی پاؤں گھسیٹتی کمرے سے باہر نکلی تو تقی گم صم سی کھڑی مالا کی طرف متوجہ ہوا۔

”میرے کپڑے تیار ہیں؟ اور تم بھی جلدی تیار ہو جاؤ، آدھے گھنٹے میں نکلنا ہے ہمیں“

تقی نے مصروف سے لہجے میں اس سے نگاہیں چرائے حکم صادر کیا، مالانے دلگیر نگاہ اس پر اٹھائی وہ اس سے کیوں نگاہیں چرا رہا تھا، اس لیے کہ مالایہ سوچ رہی ہوگی کہ اُس کی بہن، اس کی بہن کی قاتل ہے اور وہ اسے سزا دینے کے بجائے اس کی زندگی بچا رہا ہے۔

مالا کا دل ڈوب کر اُبھرا، تیزی سے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کے دونوں پٹ کھٹ کھٹ کی آواز سے مارتی پٹی اور ایک جست میں اس کے اور اپنے درمیان کا فاصلہ ختم کرتی اس کے سینے سے جا لگی۔

تقی کے کپڑے اٹھانے کی خاطر اوپر کو اٹھے بازو ہوا میں ہی معلق رہ گئے، دائیں گال کو اس کے سینے سے چپکائے، اس کے وجود سے اٹھتی سوندھی سی مہک کو اپنے اندر اتارتی وہ اس کے اور اپنے غم کو تھپک رہی تھی۔

ایک پل یو نہی گزرا، مالانے آہستگی سے چہرہ اوپر اٹھائے تقی کی طرف دیکھا جو ہنوز باہیں ہوا میں ہی معلق کیے کھڑا تھا، جو نہی چہرہ اوپر کیا اسی لمحے تقی کی آنکھ کی پتلی سے ٹوٹ کر آنسو سیدھا اس کے لبوں پر گرا۔

آہ۔ہ۔ہ۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھیج ڈالا تھا۔ تقی نچلے لب کو بے دردی سے کچلتے ہوئے آنسوؤں کو رکنے کی ناکام کوشش میں تھا، چہرہ سرخ ہو رہا تھا، جسے وہ آہستگی سے دائیں بائیں گھما کر مالا سے آنسو چھپانے کی کوشش میں تھا، ضبط کے آخری دہانے کے بند ٹوٹ چکے تھے۔

مالانے تڑپ کر اسے کندھوں سے تھام کر پلنگ پر بیٹھایا، وہ کندھے اور گردن ڈھلا کچکا تھا، وہ مضبوط ڈیل ڈول رکھنے والا اونچا لمبا تقی آج اس کے سامنے پہلی دفعہ رو رہا تھا، اس کے متواتر بہتے آنسو اس کے گال بھگورے تھے، وہ اب اوپری لب کو دانتوں سے کھینچتا ہوا مالا سے نگاہیں چرا رہا تھا نادام چہرہ سامنے کھڑی مالا سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں تھا۔

ہاں وہ کل سے یہی سوچ رہا تھا، وہ جس نے بچپن سے لے کر اب تک ایک ایک خواب کے موتی کو پرو کر اب ایک لڑی تیار کی تھی جو اسے اس کے بہن کے قاتل اور اس کے خوابوں کی سچائی تک لے آئی تھی وہ کیسے اب یہ چاہے گی کہ منہانچ جائے۔

تقی کی آنکھوں سے بہتے آنسو اس کے دل پر گرے تھے، ایک جھٹکے سے تقی کے چہرے کو ساتھ لگائے وہ اور قریب ہوئی، وہ پلنگ کے پاس بلکل اس کے سامنے کھڑی تھی اور تقی پلنگ پر بیٹھا تھا۔
تقی کے بے آواز آنسو اس کی گردن ہی نہیں اس کے دل تک کو بھگور رہے تھے، اس کا سر گرم تھا اس کی خاموشی وہ باخوبی سن سکتی تھی، بار بار اس کے بے ترتیب بالوں پر اپنے لب رکھے وہ اسے اپنی بے پناہ، بے لوث محبت کا یقین دلارہی تھی۔

وہ خاموش آنسو بہاتا اپنی بہن کی محبت میں بے بس اس سے اس کی بہن پر کئے گئے ظلم کی معافی مانگ رہا تھا۔ ایک سسکتا لمحہ یونہی گزرتا مالا نے آہستگی سے پیچھے ہو کر تقی کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا، تقی نے بے ساختہ اس سے چراتی نگاہیں اٹھائے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

گہری نیلی متورم نگاہوں میں محبت، اپنائیت کے سوا کچھ نہیں تھا، نہ بدلے کی آگ نا نفرت کی جھلک۔
"تقی ہمیں آپا کو ہر حال میں بچانا ہے، یہ اشارے جو مجھے خواب میں ملتے تھے، یہ منہا آپا کے لیے ہی ملتے تھے، وہ جس کو ر منا آپا بچانا چاہتی تھیں اپنی زندگی میں بھی اور اپنے گزر جانے کے بعد بھی وہ کوئی اور نہیں منہا آپا ہی ہیں، ہمیں آپا کو بچانا ہے ہر حال میں اور میں آپ کے ساتھ ہوں ہمیشہ"

مالا تقی کے چہرے کو ہاتھوں میں لیے اپنائیت اور محبت سے چور لہجے میں بولتی اسے حیران کر رہی تھی، وہ کہاں تھی نا سمجھ۔۔۔ بہت چھوٹی۔۔۔

وہ تو اس وقت فقط اس کی شریک حیات تھی، اس کے غم اور دکھ کو اپنے اندر سمیٹ کر اپنے الفاظ سے وہ اس کے اندر موجود اذیت کو ختم کر گئی تھی جس میں وہ کل سے مبتلا تھا۔

"میں ہر فیصلے ہر قدم میں آپ کے ساتھ ہوں"

مالا کی بھیگی سی آواز پر وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور اسے پوری قوت سے اپنی باہوں کی حصار میں لیے پر سکون ہو گیا۔

ملال، الم، مایوسی کے بادل اس نازک سے وجود نے اپنے اندر سمیٹ کر اسے پھر سے چست اور توانا کر دیا تھا، باہوں میں سمٹی یہ نازک سی لڑکی اس کی زندگی کا بہترین تحفہ تھی اس کو اس بات کا آج اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ بہت خاص تھی، وہ جسے وہ ایک کھوٹا سا سمجھا تھا وہ تو ایک نایاب ہیرا تھی۔

☆☆☆☆☆

کانپتے وجود، ہانپتے حواس اور زور زور سے دھڑکتے دل کے ساتھ جب وہ چھت سے اتر کر سب کی نظروں سے بچتی، صحن میں پہنچی تو رمناکے گرد ایک جھمگٹا لگ چکا تھا، غزالہ کی دلخراش چیخوں سے پاس کھڑے تمام نفوس کے کانوں کے پردے تک ہل کر رہ گئے تھے۔

بدحواس سی اٹاری کا زینہ چڑھتی وہ رمناکو دیکھنے کے لیے اوپر ہوئی اور اس پر نگاہ پڑتے ہی دل پھٹنے جیسا احساس ہوا، دماغ میں طوفان کے جھکڑ چل پڑے، سائیں۔۔۔۔۔ سائیں کی آوازوں سے آس پاس کی آوازیں بند ہونے لگیں، گال تپنے لگے، اعصابوں پر بوجھ اس قدر بڑھا کہ آنکھیں پوری کھولنی مشکل ہونے لگیں۔ رمناک صحن میں فوارے کے قریب بے سدھ لیٹی تھی، اس کے سر اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

بولو کیا تم اور بھائی نہیں کرتے ایک دوسرے کے ساتھ محبت "

"میری اور تقی کی بات یہاں کہاں سے آگئی منہا"

"میں اگر تم سے یہ دل کی بات بانٹ چکی ہوں کہ میں تقی سے محبت کرتی ہوں تو کیا یہ تمہاری بہادر کے لیے محبت کے برابر ہو گئی بولو"

"تو تمھارا بھی تو بھائی سے نکاح نہیں ہوا کیا پتا تمھاری بھائی سے شادی ہی نا ہو پھر۔۔۔"

"کیا پتا تمھاری بھائی سے شادی ہی نا ہو پھر۔۔۔"

"کیا پتا تمھاری بھائی سے شادی ہی نا ہو پھر۔۔۔"

"ہاں میں یہ کب دعویٰ کرتی ہوں کہ میری شادی تفتی سے ہی ہوگی"

"اور آج کے بعد تم بہادر سے کوئی بات نہیں کرو گی"

رمنادھیرے سے اس کے کان میں رس گھولا۔۔۔۔۔

منہا نے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ بے ساختہ اس کی ہولناک چیخ ابھری، وہ چیخ رہی تھی دل پھٹ کر باہر آنے جو تھا۔

وا۔ وا۔ واپس۔۔۔۔ واپس۔۔۔۔ چلا جائے وقت۔۔۔۔ اللہ۔۔۔۔ یہ خواب۔۔۔۔ ب۔ ب۔ ہے۔۔۔۔ دل کانپ رہا تھا۔۔۔۔ ذہن میں ہتھوڑے برسنے لگے تھے

ہاتھ پاؤں بے اختیار ٹھنڈے ہونے لگے، نقیب حاکم رونا کو گود میں اٹھا چکا تھا اور اب سب حویلی کے گیٹ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ غزالہ چیخ رہی تھی۔

"ہائے۔۔۔۔ میری بچی۔۔۔۔ کیا ہو گیا۔۔۔۔ رونا۔۔۔۔ رونا۔۔۔۔ ا۔ ا۔ رونا۔ ا۔ ا۔ اٹھ جا میری بچی"

اچانک اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ گہرے سایے لہرانے لگے اور وہ ستون کو تھامے پیچھے کو گری، کسی نے تھام لیا تھا جو آخری لمحہ دھندلی ہاتھوں آنکھوں نے دیکھا وہ یہ تھا کوئی اس کے گال تھپ تھپا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

دیوار کے درمیان میں نصب ایئر کنڈیشنر بخیر بستہ ہو کر اکرے کے اندر پھینک کر اسے باہر کی گرمی سے بالکل برعکس سرد کر دئے ہوئے تھا۔

یہ ہسپتال کا نجی کمرہ تھا جہاں ایک طرف ایک لکڑی کا جدید طرز کا صوفہ پڑا تھا، صوفے کے پاس ہی ایک لوہے کا میز تھا جس پر پانی کا جگ اور گلاس پڑا تھا، ایک طرف لوہے کا ہی پلنگ تھا جس پر سفید چادر بچھی تھی اور نیچے سمینٹ اور بجری کے بنے ملائم فرش پر ملا جائے نماز پر بیٹھی تھی، ہاتھ ہوا میں دعا کی صورت اوپر اٹھے تھے، آنکھیں بند تھیں۔

وہ آج رات ہی لاہور پہنچے تھے، منہا کو انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا تھا اور اس کی حالت یہاں کے ڈاکٹر بھی تشویش ناک ہی بتا رہے تھے۔

یہاں بلال نے ان کو دو کمرے دیے تھے جن میں سے ایک میں اس وقت وہ اکیلی موجود تھی، فرہاد، تقی اور نقیب حاکم باہر تھے۔ تہجد کی نماز کے بعد وہ جائے نماز پر دعا کی غرض سے ہاتھ اٹھائے بیٹھی تھی۔

روندھا بھاری لہجہ عجلت لیے ہوئے تھا، تقی نے آہستگی سے سر نیچے جھکایا

مالا کے سوال پر اس کا یوں سر جھکا لینا مالا کو بے چین کر گیا، بے کلی سے تقی کے جھکے سر کو اس کی ٹھوڑی پکرا پر اٹھایا، اس کی آنکھوں سے جھلکتی مایوسی نے دل کو ایک لمحے کے لیے منجمد کر دیا۔

"تقی۔۔ کیا ہوا منہا آپا کو۔۔ آپ ایسے کیوں بیٹھ گئے ہیں کچھ بولیں تو۔۔ کیا کہتے یہاں کے ڈاکٹر، وہ ٹھیک ہو جائیں گی نا؟"

تقی کی چپ مالا کے دل کو دہلا رہی تھی، اس نے جھنجھلا کر تقی کے کندھے کو ہلایا

"منہا کو مامیں چلی گئی ہے، اس نے زہر کی مقدار اتنی زیادہ لے لی تھی کہ۔۔۔"

بہت پھسکی سی آواز تھی جو بمشکل اس کے حلق سے نکل کر مالا کے کانوں تک سفر طے کر پائی تھی، مالا نے یک لخت سینے پر ہاتھ رکھا آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔ کو ما کو تو آدھی موت ہی مانا جاتا تھا۔

"تقی تو اب۔۔۔ اب۔۔۔ کیا ہو گا؟"

مالا نے گڑبڑاتے ہوئے ہاتھ ہوا میں اٹھائے سوال کیا، مالا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دبیز تہہ چمکنے لگی تھی، تقی نے سر اوپر اٹھائے اس کی طرف دیکھا۔

"کو ما کی واپسی کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا، وہ چاہے تو اس کو ابھی چند گھنٹوں میں ہوش ہو جائے اور کیا پتہ سالوں بیت جائیں۔۔"

تقی نے لب بھینچے کرب زدہ لہجے میں اپنی بات مکمل کی، مالا اب رو دی تھی، تو ابھی آزمائش باقی تھی۔

اگر کبھی ہوش نا آیا آپا کو تو؟؟؟۔۔۔ تو کیسے ان کو بتاؤں گی کہ ر منا آپا آپ سے خفا نہیں ہیں، وہ تو آج بھی آپ کو بچانا چاہتی ہیں، گناہ کی دلدل سے نکالنا چاہتی ہیں۔ سوچوں کے بھنور دل کو مایوسی کے گہرے سمندر میں دھکیل رہے تھے۔

تقی نے آہستگی سے اپنے جوتوں سے پاؤں آزاد کیے اور وہیں دائیں کروٹ سمٹ کر مالا کے گھٹنے پر سر رکھے بچوں کی طرح آنکھیں موند لیں۔ ہلکے گرے رنگ کی ٹی شرٹ کے نیچے وہ سیاہ رنگ کی پینٹ پہنے ہوئے برسوں کا تھکا ہوا مسافر لگ رہی تھی۔

دو دن سے مسلسل دن رات جاگنے کے سبب اس کے اعصاب کا تناؤ اتنا بڑھ چکا تھا کہ اس وقت یوں خود کو مالا کے حوالے کر دینے کے بجائے کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسی کا وجود تھا جو بلقیس کی ممتا کے بعد اس کو سکون بخش رہا تھا۔ مالانے آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو تقی نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کو اپنی جلتی آنکھوں پر دھر لیا۔ مالا کے گداز اور ٹھنڈی انگلیوں کا لمس آنکھوں کے دکھتے، جلتے پیٹوں کو سکون دے رہا تھا، وہ دھیرے دھیرے سے دوسرے ہاتھ سے سر دبانی لگی اور چند منٹ کے بعد ہی تقی یونہی اس کے گھٹنے پر سر رکھے فرش پر لیٹے گہری نیند میں چلا گیا۔

وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ مالانے اسے اٹھانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے قریبی صوفے سے سرٹکا دیا۔ کچھ دیر میں ہی فجر کی اذان ہونے والی تھی اور اس وقت تک تقی کی یہ گہری نیند اس کے لیے بہت ضروری تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گھپ اندھیرے میں ڈوبا کمرہ قبرستان جیسی خاموشی لیے ہوئے تھا، کمرے کے دروازے کے دونوں پٹ سختی سے بند تھے۔ شب کا درمیانی پہر تھا جب ہر ذی روح نیند کی آغوش میں تھا، اور روحیں بدن سے پرواز کیے خوابوں کے بھنور میں گھوم رہی تھیں۔

حاکم قصر کے اس کمرے میں منہا پلنگ پر گھٹنوں میں چہرہ دیے اور دونوں بازوؤں میں وجود کو لپیٹے بیٹھی تھی۔ چہرہ اور گردن مسلسل کتنے گھٹنوں سے جھکے رہنے کی وجہ سے اب قلب خون کی ترسیل کی رفتار کو سر تک پہنچانے میں سست ہو رہا تھا، اور سر میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔

یوں لگ رہا تھا بس کسی لمحے اور کہیں سے رونا آئے گی دروازہ کھولے گی اور اسے گلے لگا کر کہے گی

"میں زندہ ہوں پگلی۔۔۔ بس تجھے سبق سکھا رہی تھی" لیکن نہیں وہ جا چکی تھی بہت۔۔۔ بہت۔۔۔ دور جہاں سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

جب تک وہ سوئی رہتی تھی یا بے ہوش رہتی تھی تب تک ہی سکون میں رہتی تھی، سب گھروالے اس کی اس حالت کو فقط رونا کے گزر جانے کا صدمہ سمجھ رہے تھے مگر یہ صرف وہ جانتی تھی کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔

"رمنکو ابھی جانا تو نہیں تھا، اس کی عمر ہی کیا تھی، اس کو تو کوئی بیماری بھی نہیں تھی، اس کے یوں بے وقت چلے جانے کی وجہ میں ہوں صرف میں۔۔۔"

گھٹنوں میں منہ دیے وہ سسکا اٹھی، بہادر سے محبت، ضد، جنون اور پاگل پن سب۔۔۔ سب کچھ پل بھر میں ہی بھک سے اڑ گئے۔ اب دل ویران صحرا بن گیا تھا جہاں جگہ جگہ ریت سے بنی قبریں تھیں۔

ضد کی قبر۔۔۔

جنونیت کی قبر۔۔۔

محبت کی قبر۔۔۔

پاگل پن کی قبر۔۔۔

جوش اور غصے کی قبر۔۔۔

جوانی کے ہیجان کی قبر۔۔۔

جذبات کی قبر۔۔۔

کمرے سے باہر قدم رکھتی تو رونا، آنکھ کھلتی تو رونا، ہنستی تو رونا، تفتی، غزالہ اور نوازش چچا کی طرف دیکھتی تو رونا اسے ہر جگہ رونا نظر آتی تھی۔

غزالہ کابلک بک کارونا، نوازش چچا کے حالت، تفتی کی حالت سب کی ذمہ دار وہی تو تھی۔ سب کو یہ دکھ اسی نے تو دیا تھا وہ قاتل تھی۔

اس نے رونا کا ناحق قتل کر دیا تھا، ایک ضد ایک نامحرم کو بچانے کی خاطر اس کی جان ہی گنوا دی، کس کو بتاتی کیا کرتی سب کچھ سمجھ سے باہر تھا، ذہن مفلوج تھا، دل پھٹتا تھا، ضمیر نادم تھا۔
سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ چیخ اٹھی۔۔۔۔۔

کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ وقت واپس آجائے رونا اسے پھر سے چھت پر لے کر جائے سمجھائے اور وہ اس کے گلے لگ کر کہے۔

"رونا تم بالکل ٹھیک کہتی ہو، مجھے یوں بہادر کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے، بس میں آج کے بعد صرف اللہ سے اس مانگوں گی"

پھر ر منا سے اپنی باہوں میں بھینچ لے اور کہے
"شباباش مجھے تم سے اسی سمجھداری کی امید تھی"

اور پیچھے ہوتے ہوئے اس کا ماتھا چوم لے وہ بارہا آنکھیں زور سے میچ کر کھولتی کہ شائد وقت پلٹ کر وہیں آ جائے،
شائد یہ سب ایک بھیانک خواب ہو پر نہیں۔۔۔۔۔ وقت واپس نہیں آیا کرتا ہے جو پل گزر جائیں جو خطائیں سرزد
ہو جائیں ان کی تلافی کے طور پر خدا کبھی بھی وقت کی سوئی کو واپس نہیں گھماتا ہے کہ لے میرے بندے وہی لمحہ
دے دیا اب اس کو سدھار لے، نہیں وقت پلٹا نہیں کرتے جو لوگ ایک دفعہ چلے جائیں وہ کبھی کسی قیمت نہیں
لوٹ سکتے۔

"اب میں چاہیے جتنا رولوں، سسک لوں اور گر گڑا لوں ر منا تو کبھی نہیں آئے گی واپس، کبھی نہیں۔۔۔۔۔"
مجھے مر جانا چاہیے ہاں میں صبح وہی سپرے کی بوتل پی لوں گی مار لوں گی خود کو کیونکہ ایسے سوچ۔۔۔ سوچ کر میں
پاگل ہو جاؤں گی اور بہادر!!!!!!..

بہادر کسی دن تو، کبھی تو، کسی کو تو بتائے گا یہ سچ کہ ر منا کو دھکا میں نے دیا تھا۔ وہ جانتا ہے قاتل میں ہوں۔
"اللہ۔۔۔۔۔ ہ۔۔۔۔۔ ہ۔۔۔۔۔ مجھے بھی اٹھالے"

وہ بالوں کو دونوں ہاتھوں میں جکڑے چیخ رہی تھی۔ ناکوئی سن رہا تھا اور نا وہ کسی کو سنا سکتی تھی۔ جس کو ہر بات بلا
جھجک سنا دیا کرتی تھی وہ تو اب جاچکی تھی کبھی نا واپس آنے کے لیے۔

☆☆☆☆☆☆

گلاب دیوی چیسٹ ہاسپٹل لاہور کے وسیع و عریض عمارت کے بالکل اوپر آسمان میں سورج پوری تمازت سے چمکتے
ہوئے گرمی کو عروج بخش رہا تھا۔

اسی ہسپتال کے وی آئی پی پیشنٹ کمرے میں موجود بیڈ پر مختلف آلہ جات میں جکڑی منہا کو آج کو ما میں گئے دوسرا دن تھا۔ ان چار دنوں میں وہ نچڑ کر ڈھانچے جیسی دکھائی دینے لگی تھی۔ آلہ تنفس اور مختلف نالیوں سے چہرہ جکڑا ہوا تھا۔

یہ کافی بڑا کمرہ تھا جو ان کو تنقی کے ہی توسط سے ملا تھا۔ تنقی نے اسی ہسپتال میں ہاؤس جاب اور ملازمت کی تھی اور یہاں بلال اور نمیر کے علاوہ بھی اس کے کئی ہم جماعت ڈاکٹری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ کمرے میں ایک طرف منہا کے لیے بیڈ لگا تھا اور دوسری طرف دیوار کے ساتھ بڑے بڑے کاؤچ اور ایک چھوٹا پلنگ لگا تھا جس کے چوڑائی اور لمبائی دونوں عام پلنگ کی نسبت کم تھی۔ کمرے کے ایک طرف لکڑی کی چھوٹی میز رکھی گئی تھی جس پر اس وقت بہت سے تھیلے اور معمول کی چیزیں موجود تھیں۔ بائیں طرف کی دیوار میں ملحقہ واش روم تھا۔ یہاں منہا کے ساتھ ایک وقت میں صرف دو نفوس کی موجودگی کی اجازت تھی۔ اور اس وقت فرہاد اور مالا کمرے میں موجود تھے۔

فرہاد صوفے سے پشت ٹکائے سر پیچھے گرائے بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا اور مالا کہنی کو گھٹنے پر اور چہرے کو ہاتھ کی مٹھی پر ٹکائے سامنے منہا کو دیکھتے ہوئے خاموش دعا گو تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز پر مالانے ہاتھ کی بند مٹھی پر سے چہرہ اوپر اٹھایا، فرہاد بھی سیدھا ہوا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ فرہاد کے دروازہ کھولتے ہی تین نرسیں لوہے کی بنی ایک ٹرائی گھسیٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔

سفید وردی اور سلیقے سے سروں پر سفید کریب کے دوپٹے سجائے وہ اب کمرے کے وسط میں پہنچ چکی تھیں۔
"آپ باہر چلے جائیں پلینز، پیشنٹ کا چینجنگ ٹائم ہے"

تینوں نرسوں میں سے ایک نے فرہاد کی طرف دیکھتے ہوئے شائستگی سے درخواست کی، فرہاد نے سر جھکایا اور باہر نکل گیا۔

وہ تینوں اب صوفے پر بیٹھی مالا سے بے نیازی برتتیں منہا کے بیڈ کی طرف بڑھ گئیں، بیڈ کے قریب جاتے ہی تینوں مختلف کاموں میں جت گئیں، کوئی منہا کا یورن بیگ بدل رہی تھی، تو کوئی اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کی صاف صفائی کر رہی تھی۔ مالا اب یک ٹک ان کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ وہ کسی محلول سے منہا کے بازو اور ہاتھ صاف کر رہی تھیں جس کی مہک ایک دم پورے کمرے میں پھیل چکی تھی۔ تیز مہک کے ناک کے نتھنوں میں گھستے ہی مالا کو اچانک ہی عجیب گھبراہٹ کے احساس نے گھیرا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی، سانس لینے میں جہاں دقت محسوس ہوئی وہاں دل بھی بری طرح متلایا تھا، وہ کمرے کے ایک طرف ملحقہ واش روم کی طرف بڑھی۔

ایک دم سے پورا کمرہ اور سب چیزیں گھوم گئیں، سر اس بری طرح چکرایا کہ آنکھوں کے آگے گہرا سایہ لہرایا وہ لڑکھڑا کر نیچے گری، جیسے ہی وہ نیچے گری تینوں نرسوں نے ایک ساتھ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اوہ اسے کیا ہو گیا؟"

ان میں سے جو سب سے آگے کھڑی تھی تیزی سے مالا کی طرف بھاگی۔ باقی دونوں بھی اب منہا کو چھوڑ کر مالا کی طرف متوجہ تھیں

"ڈاکٹر کو لے کر آؤ جلدی اور ان کے ساتھ جو میل تھا ان کو بلاؤ"

دوسرے نمبر والی نرس نے تیسری کو ہاتھ کے اشارے سے حکم صادر کیا اور خود پہلی نرس کی مدد سے مالا کو اٹھا کر پلنگ پر لٹانے لگی۔

"بی پی چیک کرو اس کا"

ایک نے دوسری کو حکم صادر کیا وہ بھاگتی ہوئی بلیڈ پریشر کو جانچنے والے آلے کی طرف بڑھی، مالا اب بھی بے ہوش تھی۔ نرس ابھی مالا کا بی پی ہی چیک کر رہی تھی جب دروازہ کھول کر نرس اور ایک عد دلیدی ڈاکٹر ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ کمرے میں نرس کے ہمراہ داخل ہونے والی لیدی ڈاکٹر شیریں تھی جو اس وقت قریبی وارڈ میں راؤنڈ پر تھی۔

"کیا ہوا اسے؟"

شیریں حیرت سے پوچھتے ہوئے آگے بڑھی، سفید کورٹ اور گلے میں سٹیٹھ سکوپ ڈالے وہ آہستگی سے چلتی ہوئی مالا تک پہنچی۔

"ڈاکٹر یہ پیشینٹ کے ساتھ ہیں ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑیں"

بی پی چیک کرتی ہوئی نرس نے بلیڈ پریشر چیک کرنے کے بعد بینڈ کو مالا کے بازو کے گرد سے اتارتے ہوئے شیریں کو آگاہی دی۔

"اچھا ہٹیں ذرا یہاں سے اور بی پی نوٹ کریں ان کا"

شیریں نے مالا کے قریب پلنگ پر بیٹھتے ہوئے پاس کھڑی نرس کو حکم صادر کیا اور خود مالا کی نبض کو جانچنے کے لیے کلائی ہاتھ میں پکڑی، نرس نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑے گتے نمار جسٹر پر بی پی نوٹ کرنے کے بعد شیریں کی طرف بڑھایا۔

شیریں نے مالا کی آنکھوں کے پوٹے اٹھائے معائنہ کیا اور گہری سانس لیتے ہوئے پیچھے ہوئی۔

"ہمممم آئی تھنک شی از پرگیمنٹ، ان کے ساتھ کون ہے؟، بی پی بہت لو ہے"

شیریں نے چہرہ اوپر اٹھائے، بھنویں اچکا کر پاس کھڑی نرس سے سوال کیا

"میم ایک میل تھے اب باہر نظر نہیں آرہے"

نرس نے ہاتھ کا اشارہ دروازے کی جانب کرتے ہوئے جواب دیا۔ شیریں نے سر اثبات میں ہلایا اور پریسکریشن بک پر جھکی

"او کے تم جاؤ یہ انجکشن لے کر آؤ"

شیریں اب پریسکریشن بک پر انجکشن کا نام لکھ رہی تھی، لکھ کر نرس کی طرف بڑھایا، نرس نے ہاتھ سے کاغذ تھاما اور باہر نکل گئی۔

"روحی آپ دیکھو ان کے ساتھ کون ہے لے کر آؤ انہیں روم میں"

شیریں نے پاس کھڑی نرس کو کہا اور خود مالا کے گال کو ہلکے سے تھپ تھپایا۔ دوسرے نمبر والی نرس بھی اب کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

کمرے میں پیلے بلب کی پھیلی زرد روشنی میں منہا کا چہرہ اور زرد لگ رہا تھا، رو کر آنکھوں کے پوٹے سو ج رہے تھے۔ وہ تین دن سے مسلسل روئے جا رہی تھی۔

اتنا تو وہ فرہاد کے ساتھ نسبت ہو جانے پر نہیں روئی تھی جتنا آج شادی کی تاریخ رکھ دینے اور تقی کے شادی سے منع کر دینے پر رو رہی تھی۔

احساس جرم سے چور ضمیر کو اتنے سالوں میں چین تو ایک پل نہیں آیا تھا۔ بہادر کو دیکھنا تک چھوڑ چکی تھی، مگر پھر بھی ایک عجیب سے گناہ کا احساس تھا جو وہ چڑھتی جوانی کے جذبات میں کر چکی تھی اپنی پچھلی باتیں یاد کرتی تو سر ندامت سے جھک جاتا تھا اور وہ بہادر جس کے لیے جان دینے کو تیار تھی وہ شادی بھی کر چکا تھا، خود پر کڑوڑوں بار بھی تف کرتی کم تھا۔

وہ جو خود کو بڑی بہادر سمجھ رہی تھی بہت بار خود کو مارنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھی۔ اور اس کی ایک جھٹکے کی موت ر منا کی قتل کی تلافی کہاں تھی۔

وہ سات سال اس جرم کے ساتھ پلتے پلتے ذہنی طور پر مفلوج ہو چکی تھی۔

نماز پڑھنے کھڑی ہوتی تو یوں لگتا فرشتے اس کے چاروں اور کھڑے اس کو دیکھ کر ستہزائیہ مسکرا رہے ہیں۔ نادن کو چین تھانارات کو سکون اور اب تقی کے شادی سے انکار کر دینے پر احساس جرم اور بڑھنے لگا تھا۔ آج اگر ر مناز نہ ہوتی تو اب اس کی ساتھ تقی کی شادی ہو رہی ہوتی، دونوں کتنے خوش ہوتے، تقی کے شادی سے انکار نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ وہ آج بھی ر منا کو نہیں بھولا ہے اور اب یہی بات اسے اندر سے کچو کے لگار ہی تھی۔

☆☆☆☆☆

تقی تیزی سے ہسپتال کی راہداری میں قدم بڑھا رہا تھا، مالا کو کیا ہو گیا دل کی دھڑکن تھم رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ منہا کی کچھ ادویات لے کر لوٹا تھا جب ریسپشن پر کھڑی نرس نے اسے پہچان کر مالا کی طبیعت کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ پریشانی کی عالم میں اسی لمحے کمرے کی طرف بڑھا۔ سلیٹی رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس، آستین کو کہنیوں سے تھوڑا نیچے فولڈ کیے، بکھرے سے بالوں کی کچھ لٹیں پیشانی پر بکھیرے وہ بے حال سالبے لمبے ڈگ بھر کر آس پاس سے گزرتے لوگوں سے کتراتا ہسپتال کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

منہا کی حالت سے اعصاب پہلے کچھے ہوئے تھے اور اب یوں مالا کی طبیعت اور بے ہوش کر گر جانے نے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔

☆☆☆☆☆

مالا نے آہستگی سے پیشانی پر شکن ڈالتے ہوئے آنکھیں کھولیں، جہاں ذہن ہوش میں آ رہا تھا وہاں آنکھوں کے سامنے کے منظر کو دھندلے سے صاف ہونے میں چند سکینڈ لگے تھے۔

وہ کمرے میں موجود پلنگ پر چت لیٹی تھی اور اس کے بالکل پاس ایک ڈاکٹر اس پر جھکی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ میں سوئی پیوست تھی جس کے ساتھ ملحقہ نلی سٹینڈ پر لٹکتی ڈرپ کے اندر موجود محلول اس کی رگوں میں اتار رہی تھی، کچھ دیر پہلے کا سارا منظر کسلمندی سے ذہن نے دہرایا، وہ تین نرسیں اب کمرے میں موجود نہیں تھیں۔

"کیسا فیل کر رہی ہیں اب آپ؟"

شیریں نے نہایت ملائم لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا، مالا نے آہستگی سے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیا۔۔۔ ہوا تھا۔۔۔ مجھے؟"

اس نے شیریں کی بات کا جواب دینے کے بجائے پھیکی سی آواز میں سوال پوچھ ڈالا جس پر شیریں بے ساختہ نرماہٹ سے مسکرا دی۔

"ابھی بتاتی ہوں، پہلے اپنا نام بتائیے؟"

شیریں نے معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر سجائے، پریسکر میشن بک پر نگاہیں جھکائیں، مالا شیریں کے انداز سے الجھتی کبھی اپنے ہاتھ پر لگی ڈرپ کو دیکھ رہی تھی تو کبھی شیریں کے لبوں پر سچی مبہم سی مسکراہٹ کو۔

"مالا۔۔۔ مالا ہے نام میرا"

مالا نے الجھے سے لہجے میں خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا، کمرے میں ارد گرد نگاہ دوڑائی، "تقی کہاں ہیں" ذہن نے پریشان ہو کر سوچا

"ماشا اللہ بیوٹی فل نیم لائک یو، تو مالا۔۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ آپ۔۔۔ ماں بننے والی ہو"

شیریں نے اپنائیت بھری مسکراہٹ لبوں پر سجائے مالا کو خوشخبری سنائی تو وہ ایک لمحے کے لیے یوں ساکن ہوئی جیسے اپنے ہی سماعت پر یقین نا ہو، جہاں دل دھڑکنا بھولا وہاں خوشی کی بھرپور لہر تن بدن میں سرایت کر گئی، بات ہی ایسی تھی

"آپ کے ہسپینڈ کو بلایا ہے، ابھی آرہے ہیں، یہ کچھ ادویات میں نے لکھ دی ہیں یہ منگو لیجیے گا"

شیریں نے پریسکرپشن بک کے اوپری ورق کو الگ کیا اور مالا کی طرف بڑھایا، وہ جواب تک بے یقینی کے عالم میں تھی سراسیمگی کے حالت میں ہی کاغذ شیریں کے ہاتھ سے تھام لیا۔

کمرے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلا اور پھولی سانسوں کے ساتھ جیسے ہی تقی نے کمرے میں قدم رکھا تو سامنے بیٹھی شیریں کو مالا کے پاس بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھک کر رکا، ایک سکینڈ کے ہزارویں حصے میں وہ حیرت سے بھنویں اچکائے شیریں کو پہچان چکا تھا۔

شیریں جو تقی کو یوں سامنے دیکھ کر منجمد ہوئی، ذہن کے حواسوں میں آتے ہی گزشتہ یادوں کے باعث چہرے پر گہرا سایہ لہرا گیا۔

تقی اب آہستگی سے چلتا ہوا پاس آ گیا تھا، شیریں یونہی ورطہ حیرت میں ڈوبی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی، مالا ہاتھ میں کاغذ تھامے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ کو چھپائے گلال ہوتے ہوئے خود کو ابھی تک اتنی بڑی خوشی ملنے کی یقین دلار ہی تھی۔

"تقی۔ ی۔ ی۔۔۔ تم۔۔۔ یہاں۔۔۔؟"

شیریں نے سامنے بیڈ پر لیٹی منہا اور پھر مالا کی طرف دیکھ کر اب چہرہ تقی کی طرف گھمائے حیرت سے سوال کیا۔
"کیسی ہو شیریں؟"

تقی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے شناسائی کی مسکراہٹ سجائے سوال کیا، مالا جو شرمیلیں نگاہوں سے تقی کی جانب دیکھ رہی تھی، تقی کی توجہ اپنے بجائے شیریں کی طرف مبذول دیکھ کر اور اس کے شیریں سے کیے گئے سوال کو دیکھ کر ششدا آنکھیں ٹپٹپائیں۔

"میں ٹھ۔۔ ٹھیک ہوں؟ تم کیسے۔۔ ہو؟ یہاں۔۔ کیسے خیریت؟"

شیریں اب بھی حیرت میں مبتلا پھر سے منہا اور کبھی مالا کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھی۔

"نہیں خیریت نہیں ہے۔۔ دراصل ہمیشہ کو لے کر آیا ہوں، شی ازان کریٹیکل سچویشن"

تقی نے سنجیدگی سے لب بھینچے منہا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا اور نگاہ اسی لمحے مالا پر اٹھی

"مالا کیا ہوا تمہیں؟۔۔ ٹھیک ہونا؟"

تقی پریشانی سے تفتیشی انداز میں مالا کی طرف بڑھا، شیریں جو منہا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چونک کر مالا اور تقی کی طرف دیکھا، تقی اب مالا کے بالکل سامنے بیٹھ کر اس کی کلائی تھام چکا تھا، اور پھر سوالیہ نگاہیں شیریں کی طرف اٹھائیں جو حیرت زدہ کھڑی تھی۔

تقی کی سوالیہ نگاہوں کو جانچتے ہوئے شیریں نے بمشکل اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے لب کھولے

"تم۔۔ میرا مطلب تمہاری کیا لگتی ہیں یہ؟"

جانتی تھی یہ اس کے سوال کا جواب تو نہیں عجیب سا سوال عجیب سے وقت پر کیا تھا، مگر وہ بے ساختہ پوچھ چکی تھی

"اوہ۔۔۔ سوری۔۔ یہ میری وائف ہے مالا۔۔ اور مالا یہ ڈاکٹر شیریں ہیں یونیورسٹی میں میری ہم جماعت بھی تھیں

"

تقی نے پیشانی پر ہاتھ رکھے، شائستگی سے تعارف کروایا 'مالا جو اس وقت سے ان دونوں کے انداز پر عجیب کشمکش میں مبتلا تھی تعارف پر دم سادھے اب شیریں کو جانچنے لگی اور یہی حال شیریں کا تھا وہ کالا کو اب تقی کی بیوی کی طور پر گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"شیریں از ایوری تھنگ اوکے نا، کیا ہوا میری وائف کو؟"

تقی اب ایک مضطرب سی نگاہ مالا پر ڈال کر شیریں سے سوال کر رہا تھا، شیریں جو ٹکٹکی باندھے مالا کی طرف دیکھ رہی تھی چونک گئی

"ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔وہ۔۔۔کانگریجو لیشن یور وائف۔۔۔از ایکس پکٹنگ"

شیریں کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی اس کا چہرہ متعجب تھا، تقی نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں سکڑیں اور پھر اگلے ہی لمحے بات سمجھ آنے پر بے ساختہ جہاں تمام مسکراہٹوں میں سب سے حسین مسکراہٹ نے لبوں کا گھیراؤ کیا وہاں خجالت سے انگلیاں پیشانی کو سہلانے لگیں۔

اپنی بے پناہ اڈ آنے والی خوشی کو بمشکل قابو کیے ایک محبت پاش نگاہ مالا پر ڈالی اور پھر نجل ہوتے ہوئے پریسکریشن کاغذ مالا کے ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا ہوا۔

شیریں چہرے کا تاسف چھپائے بمشکل مسکرا رہی تھی۔ تقی سے ملاقات کچھ ایسے ہوگی کبھی نہیں سوچا تھا۔ دل کیا بھاگ جائے یہاں سے۔ تقی اب پیشانی کو سہلاتے ہوئے پریسکریشن پڑھ رہا تھا۔

"سب ٹھیک ہے، بس بی پی بہت لو ہو گیا تھا جس کی وجہ سے بے ہوش ہوئیں، میں نے میڈیسن لکھی ہیں، تم بھی چیک کر لینا"

شیریں نے سنجیدگی سے کہا اور بغور مالا کی طرف دیکھا، بلاشبہ سامنے پلنگ پر لیٹی لڑکی بہت حسین تھی اور تقی کی طرح ہی ہر قسم کی مصنوعی زیبائش سے پاک تھی۔ سادہ سے نیلے رنگ کے جوڑے پر سیاہ بڑی سی چادر اوڑھے وہ

نبلی آنکھوں اور سفید شفاف چہرہ لیے معصوم سی لڑکی اسے آئینہ دکھا گئی۔ بے شک محبت چکاچوند کی محتاج نہیں ہوتی۔

وہ اپنی بھرپور زندگی جی رہا ہے اور میں کتنی بیوقوف ہوں، آج بھی دل میں کسی اور کو اس کے مقام پر نامیٹھا سکی اور نا شادی کی۔

"تھنکیو بروقت آکر چیک کرنے کے لیے۔۔۔ اور سناؤ کیسی جارہی ہے جاب؟"

تقی کے پوچھے گئے سوال پر وہ چونک کر پلکیں جھپکائے مالا پر سے توجہ ہٹاتی سیدھی ہوئی۔ وہ شیریں کی موجودگی میں اپنی خوشی کو بالائے طاق رکھے اب مالا کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

"جاب ٹھیک جارہی ہے۔۔۔ تم بتاؤ سسٹر کو کیا ہوا ہے اور مجھے کیوں نہیں بتایا تم یہاں آئے ہوئے ہو؟"

شیریں نے بھنویں سیٹھے منہ کی طرف رخ کرتے ہوئے شکوہ کیا، تقی کے چہرے پر پھر سے پریشانی کے سایے لہرا گئے جو خوشی کی وجہ سے لمحہ بھر کے لیے مندمل ہوئے تھے۔

گہری سانس لیتا ہوا وہ منہ کے بیڈ کی طرف بڑھا تو شیریں بھی آہستگی سے قدم اٹھاتی اب منہ کے بیڈ کے قریب تقی کے بلکل سامنے کھڑی تھی اور تقی اب اسے منہ کی حالت کے متعلق تمام آگاہی تفصیل سے دے رہا تھا۔ مالا جو تب سے شیریں اور تقی کی بات چیت کی وجہ سے الجھی ہوئی تھی اب اور الجھ گئی، دماغ ایک سو ایسی کی رفتار سے خالص بیویوں والی سوچ میں دوڑنے لگا، تقی کے سامنے کھڑی لڑکی ناصرف اس سے ہزار درجے حسین تھی بلکہ پڑھی لکھی ڈاکٹر اور تقی کی ہم عمر تھی۔

جہاں دل میں ایک پھانس سی اٹکی وہاں ذہن کی سوچ دل کے ساتھ مل کر وسوسے پالنے لگی، شیریں کے چہرے کے بدلتے رنگ اور لب و لہجے کا انداز ایسا کھٹکا کہ دل نے ذہن کے اندر اٹھنے والے وسوسوں کی تصدیق کر دی۔

"کہیں تقی اور یہ ڈاکٹر ایک دوسرے کو۔۔۔ کیا تقی اس سے محبت کرتے تھے، اسی لیے شادی کے بعد مجھ سے دور رہے اور یہ ڈاکٹر۔۔۔ دیکھو تو کیسے دیکھ رہی ہے تقی کو۔۔۔"

دل کی دھڑکن رُک رہی تھی اور ذہن سوچ رہا تھا، تقی اب منہا کی فائل کھولے سنجیدگی سے شیریں سے گفتگو کر رہا تھا اور وہ بھی لب بھینچے تقی کی باتوں پر سر ہلارہی تھی۔

ان دونوں کی گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا اور عجیب سی احساس کمتری اندر گھٹن پیدا کرنے لگی۔

"تقی تم پریشان ناہو میں آج ہی ماموں جان سے بات کرتی ہوں"

شیریں نے اپنائیت سے تقی کو کہا، شیریں کے ماموں اسی ہسپتال کے سنیر اور مشہور ڈاکٹر تھے۔

"تمہارا بہت بڑا احسان ہو گا مجھ پر، ایکجولی میں خود کل سے ان کو اپروچ کر رہا ہوں لیکن۔۔۔"

تقی نے تشکر آمیز لہجے میں شکریہ ادا کرتے ہوئے لب بھینچے

"تقی شرمندہ مت کرو، کیا میں اتنا نہیں کر سکتی تمہارے لیے"

عجیب سی کسک تھی شیریں کے لہجے میں جو تقی تو بالکل نہیں سمجھ سکا البتہ کچھ دوری پر لیٹی مالا کی سانس اٹک کر رہ گئی۔

۔

"آج اگر میں نا آتی تو تم اور بلال تو مجھے بتاتے تک نا کیا اتنا گیا گزرا سمجھ لیا تھا، میں یہ فائل لے جا رہی ہوں، تم فکر مت کرو، میں آج ہی ان کو لے کر آتی ہوں"

شیریں نے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر فائل تھامے بنا مالا کی طرف دیکھے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"شیریں کے باہر جاتے ہی تقی نے فوراً گردن گھما کر مالا کی طرف دیکھا تو وہ جو اسی طرف گھور رہی تھی جلدی سے افسردہ چہرہ سیدھا کیے چھت کو گھورنے لگی۔

تقی بھرپور مسکراہٹ لبوں پر سجائے آگے بڑھا جو وہ شیریں کی موجودگی میں روکے ہوئے تھا۔

مسکراہٹ دبائے پلنگ پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے پر جھکا جو اپنی ہی الٹی سیدھی سوچوں کے باعث اڈ آنے والی خفگی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے جو دل بلیوں اچھل رہا تھا اب افسردگی کا شکار تھا۔

"ہاں جی۔ ی۔ ی۔۔۔ ادھر دیکھو تو۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی تھی ڈاکٹر؟"

اس کے اندرونی کشمکش اور جلن سے بے خبر تقی نے میٹھی سی مسکراہٹ سے لب سکوڑے اور اس کی ناک کو پکڑتے ہوئے چہرے کا رخ اپنی طرف کیا۔

"آپ نے بھی تو سن ہی لیا۔۔۔ کیا کر رہی تھی ڈاکٹر"

باوجود کوشش کے وہ اپنے اندر کے وسوسے کے اثرات اپنے لہجے میں نالانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ تقی جو بے انتہا خوشگوار موڈ میں بیٹھا تھا اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات پر ایک دم پریشان ہوا اور لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔

"مالا۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ پریشان کیوں ہو؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی کیا ابھی؟"

تقی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ کی پشت رکھے تشویش ظاہر کی۔

"اس حالت میں اس طرح کی طبیعت ہو جاتی ہے، پریشان کیوں ہو رہی ہو"

تقی نے محبت سے اس کی گال پر ہتھیلی رکھتے ہوئے تسلی دی اور وہ جو اتنی دیر سے دل کے اندر بھرے غبار کو تھپک رہی تھی بے ساختہ رو دی۔

"مالا۔۔۔ پاگل ہو کیا۔۔۔؟ ارے کچھ نہیں ہوا تمہیں"

تقی اس کے یوں رونے پر پہلے حیران ہوا اور پھر بے ساختہ ہنس دیا، ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو آنسو روک رہی تھی

"تمہیں تو بچے اتنے پسند ہیں پھر ایسے کیوں رو رہی ہو۔۔۔"

گہری نگاہیں اس کی متورم نگاہوں میں گاڑے سوال کیا، مالانے پلکیں گرائیں اور سر اثبات میں ہلادیا
 "بچے پسند ہیں پر اب میں آگے کیسے پڑھوں گی؟"

مالانے بھیگے سے لہجے میں اپنے رونے کی بے تکی وجہ بتائی تو تقی بے یقینی سے ایک لمحے کے لیے ساکن ہوا اور پھر
 اس پریشانی میں بھی اپنے بے لگام قہقہے کو ابھرنے سے نہیں روک سکا۔

"یہ۔۔۔ یہ تم کہہ رہی ہو؟"

ہنسی پر قابو پاتے ہوئے حیرت سے سوال کیا، مالاجو گزشتہ پندرہ منٹ میں ہزار وسوسے اور بے شمار بدگمانیاں پال
 چکی تھی تک کر تقی کی طرف دیکھا۔

"ہاں کیوں مجھے آگے نہیں پڑھنا کیا؟ ڈاکٹر بننا ہے مجھے بھی"

مالانے دانت پیستے ہوئے جواب دیا، نجانے کیوں تقی پر غصہ آگیا تھا اور اس وقت خود کو بہت کمتر محسوس کر رہی
 تھی، تقی جو اپنی ہنسی کو تقریباً روک ہی چکا تھا پھر سے ہنس دیا۔

"اس کو ہو کیا گیا ہے اچانک" ہنسی تو آہی رہی تھی ساتھ ہی اس کا یہ انداز الجھا بھی رہا تھا۔

"میں نے کب روکا ہے تمہیں، میں تو چاہتا ہوں کہ تم بہت زیادہ پڑھو اور ڈاکٹر، استانی جو بننا چاہتی ہو بنو، پر اس میں
 ہمارا بچہ رکاوٹ تھوڑی ہے جو تم خوش ہونے کے بجائے یوں رو رہی ہو، اور مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا کچھ دیر
 پہلے والی بات تم نے ہی کی ہے نا"

تقی نے محبت سے اس کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیا اور لبوں میں مسکراہٹ دبائے شرارت
 سے سوال کیا۔ مالانے بنا مسکرائے تقی کی طرف دیکھا۔

"آج اپنی محبت کو اپنے سامنے یوں دیکھ کر یہ کیسے ہسنی جا رہے ہیں" دماغ بدگمانی کی وجہ سے اتنا آلودہ ہو گیا تھا کہ
 اس کو تقی کی خوشی بھی شیریں سے جڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"اچھا چلو بعد کی بعد میں سوچیں گے، ابھی میں تمہارے لیے کچھ کھانے کے لیے لے کر آتا ہوں، تب تک ڈرپ بھی ختم ہو جائے گی"

تقی نے محبت سے اس کے تھامے ہاتھ پر دباؤ ڈالا اور اپنی جگہ سے اٹھا، کچھ دیر منہا کے پلنگ کے پاس جا کر اس کا معائنہ کیا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اور وہ دل مسوس کر رہ گئی کل تک کبھی ایسی سوچ تک ذہن میں نہیں آئی تھی کہ تقی اس سے زبردستی کا رشتہ نبھا رہا ہے لیکن آج ڈاکٹر شیریں کو دیکھ کر دل عجیب کملاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

بہادر کی آواز پر منہا نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔ بہادر اس سے محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ لمحہ تھم گیا تھا۔ وہ اس سے سوال پر سوال کر رہا تھا اور منہا منجمند بیٹھی تھی۔ ذہن تیزی سے سوچوں کے بھنور میں گردش کرنے لگا۔

"ہاں بہادر۔۔۔۔۔ بہادر مجھے وہ زہر لادے گا جس کے متعلق میں نے پڑھا ہے، اسی زہر سے اذیت ناک موت ہی میری سزا ہے"

مختلف طریقوں سے بارہا خودکشی میں ناکام ہو کر اس نے گھر میں موجود ایک کتاب سے اس جڑی بوٹی کے متعلق پڑھا تھا، جو انسان کو آہستہ آہستہ اندر سے کھوکھلا کرتے ہوئے ابدی نیند سلا دیتی ہے۔

بہادر اس سے سوال پر سوال کر رہا تھا اور وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی، اس وقت نا تو اسے بہادر کے لیے محبت کا احساس جاگا اور نا اس کے رونے پر دل میں کوئی رحم جیسا احساس جاگا۔

احساس تو سب کب کے ختم ہو چکے تھے، اب تو اذیت تھی فقط اپنے ہی وجود سے نفرت تھی فقط جواب شادی کے دنوں میں اور جاگ گئی تھی، اچانک ذہن میں اڈتے منصوبے کے پیش نظر اس نے لب کھول دیے

"تم مجھ سے شادی کرو گے"

بہادر آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا جب اچانک اس کی آواز گونجی اور وہ چونک کر پلٹا
 "میں تم سے شادی کروں گی پر۔۔۔۔۔ اس دفعہ ہم شادی کے لیے خالی ہاتھ نہیں بھاگیں گے، فرہاد سے شادی کسی
 صورت نہیں ٹل سکتی میں نے بہت کوشش کی"

بہادر کو راضی کرنے کے لیے اس سے بہتر منصوبہ اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا

"آ۔۔ آپ فرہاد سے شادی کریں گی تو۔۔ تو پھر مجھ سے..."

بہادر نے الجھ کر سوال کیا

"فرہاد۔۔۔ کو زہر دوں گی اور سارا زیور جو شادی پر مجھے ڈالا گیا ہو گا وہ لے کر بھاگ جائیں گے ہم"

دل پھٹ رہا تھا یہ الفاظ کہتے ہوئے، پروہ جانتی تھی وہ اس سے بھی بری سزا کی مستحق ہے۔ بہادر نے تیزی سے
 جواب دینے کے بجائے گاڑی بھگا کر اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

گاڑی حویلی کے بیرونی گیٹ کے آگے رکی تو وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ چادر میں منہ چھپائے گاڑی سے اتری اور
 بیرونی گیٹ کی دونوں باغوں کے درمیان کی روش پر چل دی۔

☆☆☆☆☆☆

دودھیا گداز ہاتھ میں پکڑا تیز چاقو سب کی اوپری سرخ چھلکے کو بڑی نفاست سے چھیل رہا تھا، مالا پلیٹ پر جھکی اس
 چاقو کو ہاتھ میں تھامے سب کاٹ رہی تھی۔

گلاب دیوی ہسپتال کے اس کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی ٹھنڈی ہوا پھینکنے کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی، نقیب حاکم اسی صوفے پر مالا سے کچھ دور بیٹھے اخبار کے دونوں اوراق چہرے کے آگے پھیلائے اخبار کی موٹی سطروں کو پڑھنے میں مگن تھے۔

منہا تاہنوز نالیوں میں جکڑی کچھ دور بیڈ پر آنکھیں موندے اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے خبر تھی، اسے کوما میں گئے اور ان کو ہسپتال میں آج تیسرا دن تھا۔

اس وقت کمرے میں مالا اور نقیب حاکم موجود تھے اور تقی اور فرہاد کمرے سے باہر تھے۔ وقفے وقفے سے ڈاکٹر منہا کا معائنہ کرنے کمرے میں آتے تھے۔

مالا نے سیب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر پلیٹ میں سجایا اور نقیب حاکم کے ساتھ صوفے پر رکھ دیا، سیب کے چھلکے پھینکنے کے لیے کمرے میں موجود ایک کونے میں رکھے کوڑا دان کی طرف بڑھی ہی تھی جب کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد ہی دروازہ خود بخود کھل گیا۔

مالا اور نقیب حاکم نے ایک ساتھ دروازے کی طرف دیکھا، شیریں ہاتھ میں فائل تھا مے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

نقیب حاکم نے اسی لمحے ہاتھ میں پکڑی اخبار کو تہہ کیا اور شائستگی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شیریں اب فائل تھا مے کمرے کے وسط میں پہنچ چکی تھی۔ وہ ہلکے گلابی کے رنگ کے نفیس جوڑے میں آج اور بھی دلکش لگ رہی تھی۔

وہ کل شام ہی ڈاکٹر عرفان کو لے کر منہا کے معائنے کے لیے آگئی تھی۔ ڈاکٹر عرفان ناصرف اس کے ماموں تھے بلکہ اس ہسپتال کے مایہ ناز اور مشہور ڈاکٹر بھی تھے۔

"اسلام علیکم، تقی نہیں ہے کیا کمرے میں؟"

شیریں نے آہستگی سے نگاہیں گھماتے ہوئے نقیب حاکم کی طرف دیکھ کر تفتی کے متعلق دریافت کیا "وعلیکم سلام۔۔۔ بیٹا۔۔۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی کمرے سے باہر گیا ہے، میں ابھی بلا کر لاتا ہوں، آپ بیٹھو" نقیب حاکم نے بڑے احترام اور پیار سے شیریں کو بیٹھنے کا کہا اور خود تفتی کو اس کے آنے کی اطلاع دینے کی غرض سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

مالا جو کن اکیہوں سے ابھی تک شیریں کے دلکش سراپے کا جائزہ لینے میں محو تھی اس کے پلٹتے ہی جھجک کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، شیریں مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے نگاہیں چرا رہی تھیں۔

شیریں صوفے پر ایک طرف بیٹھی تو مالا نے آہستگی سے سیب کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ "نہیں۔۔۔ نہیں شکریہ"

شیریں نے مبہم مسکراہٹ سجائے ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے منع کیا۔ مالا آہستگی سے سر ہلاتی ایک طرف بیٹھ گئی۔ چور سی نگاہ شیریں پر ڈالی۔

وہ کتنی مکمل حسن کی مالک تھی، خوب گلابی کھلتی رنگت، مناسب قد کاٹھ، سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اور پھر پڑھائی لکھائی کا شخصیت میں رعب اور دب دبا، مالا ذہن میں اس کی شخصیت کو سراہے بنا نازہ سکی اس کے سامنے اپنا آپ بے معنی سا لگ رہا تھا۔

شیریں نے فائل کھولتے ہی جزبز نگاہ مالا پر ڈالی، تفتی کے انکار اور نکاح کے اعتراف کی شام کا منظر ذہن کے پردوں میں سرکنے لگا۔

اس وقت تو وہ یہی سمجھی تھی کہ تفتی ایک دقیانوسی دیہاتی خاندان سے تعلق رکھتا ہے، جہاں کسی سے بھی پکڑ کر اس کا نکاح کر دیا گیا ہو گا مگر کل جب مالا کو دیکھا تو اس کی خود سے برتی بے اعتنائی اور روکھے پن کا جواز مل گیا۔

مالا ایک دنگ کر دینے والے حسن کی مالک لڑکی تھی، چندن جیساروپ، نیلی پتلیوں والی نایاب آنکھیں، معصوم سے نقوش والا خوبصورت چہرہ، ترقی جیسا لڑکا کیسے اسے چھوڑ کر میرے عشق میں گرفتار ہوتا۔

وہ یونہی پرکھتی نگاہوں سے مالا کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اچانک مالانے بھی نگاہ اٹھائی تو نگاہوں کا تصادم ہونے پر شیریں پہلے گڑبڑائی اور پھر ہلکا سا مسکرا کر گڑبڑاہٹ پر قابو پایا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے آج؟ میڈیسن منگوالی تھی"

ملائم سے لہجے میں مالا سے اس کی طبیعت دریافت کی، مالا جو اس کے یوں دیکھنے پر سوچ رہی تھی کہ وہ یقیناً اس کو جانچ رہی ہوگی کہ کس دیہاتی لڑکی نے میرے اور ترقی کے رشتے کو ختم کر دیا، اس کے اچانک مدھر سے لہجے میں سوال کرنے پر بوکھلا گئی۔

"اف۔۔۔۔۔ کتنا اچھا بولتی ہے یہ، اور میں۔۔۔ مجھے تو بولنے تک کی تمیز نہیں" مالانے اس کے سوال پر ذہن میں مناسب جواب کو ترتیب دیا۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔ جی لے لی ہی میڈیسن ترقی لے آئے تھے"

مختصر جواب جھجکتے ہوئے دیا، لگ رہا تھا کچھ غلط بول دی گی تو کہاں کی عزت رہ جائے گی اس کے سامنے "گڈ۔۔۔"

شیریں نے مختصر جواب دیا، اور نگاہیں پھر سے فائل پر جھکا دیں اسے مالا کا انداز عجیب سا لگا مگر ذہن کو جھٹکا۔
"اتنی خوبصورت ہے اتنا مغرور ہونا تو بنتا ہے"

شیریں اب فائل پر نگاہیں جھکائے، مگن ہو چکی تھی اور مالا بار بار اضراری کیفیت سے دوچار اس کے سراپے کو دیکھ رہی تھی۔

"پڑھ لکھ کر شخصیت کا نکھار ہی اور ہوتا ہے، یہ ڈاکٹر کتنی پیاری اور جدید طرز کے فیشن کیے ہوئے ہے اسی لیے تو تقی کو میں اچھی نہیں لگتی"

مالا نے ایک نگاہ اس کے جدید فیشن سے لیس کپڑوں اور بنا دوپٹے کے سر پر ڈالی اور پھر خود کا جائزہ لیا، نارنجی رنگ کے سادہ سے قمیض شلوار کے نیچے پاؤں میں کھسہ اور سر سے لے کر گھٹنوں تک آتی سیاہ چادر جس کو وہ سر پر سلیقے سے اوڑھے ہوئے تھی۔

صبح فجر کی نماز کے وضو سے دھلا چہرہ اور بار بار متلی جیسی کیفیت سے دوچار ہونے کی وجہ سے پیڑی زدہ گلابی ہونٹ، مالا نے بے دلی سے گردن پلٹ پر جھکا دی۔

شیریں نے فائل پر جھکا سر اٹھایا اور دیوار پر نصب کلاک کی طرف دیکھا اور پھر سے نگاہ بے اختیار مالا پر جاٹکی "کتنی سادگی بھرا حسن ہے اس کا اسی لیے تو میرے اس قدر جدید فیشن سے لیس حلیے پر کبھی تقی نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تک نہیں تھا" شیریں نے سوچتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔

عورت کا یہی المیہ ہے اسے ہر دوسری عورت کے ساتھ اپنا موازنہ کرنا ہوتا ہے اور ہمیشہ اپنی خوبصورتی اور خاصیت کو نظر انداز کیے وہ دوسری عورت کو خود سے زیادہ خوبصورت گردان کر خود احساس کمتری کا شکار رہتی ہے، اس بات سے یکسر بے خبر کہ اسی وقت وہ عورت اس کے بارے میں یہی سوچ رکھے ہوئے ہوتی ہے۔ درحقیقت عورت ایک ایسی مخلوق ہے جو کبھی بھی مطمئن نہیں ہو سکتی اور یہی حال یہاں مالا اور شیریں کا تھا۔ وہ دونوں یونہی اپنی اپنی سوچ میں گم تھیں جب دروازہ اپنی مخصوص چرچر اہٹ کی آواز کے ساتھ کھلا اور تقی کے ساتھ ڈاکٹر بلال اور فرہاد بھی کمرے میں داخل ہوئے۔

ان کے داخل ہوتے ہی شیریں اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کی طرف بڑھ گئی، چاروں ایک ساتھ منہا کے قریب کھڑے ہو چکے تھے۔ اور اب منہا کے متعلق ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت میں مگن تھے، بس ایک فرہاد تھا جو مالا کی طرح خاموش کھڑا ان کو دیکھ رہا تھا۔

مالا دم سادھے ان کو دیکھ رہی تھی جو ایک فائل کو تھامے پتا نہیں کیا۔۔ کیا۔۔ بول رہے تھے۔ بہت مشکل الفاظ تھے جو اس کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے، اس نے کبھی تعلیم کی اہمیت کے بارے میں آج سے پہلے یوں نہیں سوچا تھا، جیسی سوچ اب اس کے ذہن میں گردش کرنے لگی تھی۔

کل تک تو وہ یہی سوچتی تھی جب بچے ہوں گے، وہ تقی کو منالے گی اور آگے کبھی نہیں پڑھے گی پر پتا نہیں کیوں اب ایسا لگ رہا تھا کہ ایک پڑھے لکھے انسان کی شخصیت میں اور ان پڑھ کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق آجاتا ہے، بھلے آج تقی اس سے ہی محبت کرتا ہے لیکن شیریں کو دیکھ کر اس سے موازنہ تو کرتا ہو گا، اس کے دل میں آتا تو ہو گا کہ کاش شیریں ہی میری بیوی ہوتی۔

"اف اللہ کیا سوچے جا رہی ہوں میں بھی" جھنجلا کر اپنے آپ کو لتاڑا۔

وہ چاروں اب بات کرتے ہوئے باہر جا رہے تھے اور پھر ان سب کے جانے کے بعد وہ اکیلی ہی کمرے میں بیٹھی تھی۔

"اللہ مجھے اچھے نمبروں میں پاس کرنا مجھے اب آگے پڑھنا ہے ہر حال میں۔۔۔ مجھے تقی کے لیے اور خود کے لیے اپنے آپ کو ہر لحاظ سے مکمل بنانا ہے" دل میں معصوم سی دعا مانگتی وہ سیب کے ٹکڑے کو اپنے منہ میں رکھ رہی تھی

☆☆☆☆☆☆

فرہاد اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنارہا تھا، اور اسے اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کی محبت کی دیکھ کر خود سے ہی گھن آ رہی تھی۔

"کیا وہ اس قابل تھی کہ کوئی اسے اتنا چاہے۔۔۔ نہیں وہ ہرگز اس قابل نہیں تھی، وہ تو ایسے لڑکی تھی جس نے اپنے جذبات کی روانی اس خوبصورت لمحے سے پہلے ہی ایک نامحرم کے گوش گزار کر دی تھی" سینے میں گھٹن بڑھنے لگی تھی اور ضمیر زور زور سے کچوکے لگا رہا تھا۔

"بتاؤ تو تمہیں پسند آئی؟"

فرہاد نے تھوڑا سا جھکتے ہوئے محبت سے پوچھا، وہ کتنا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ دل میں ایک پھانس سی انگلی اور وہ سر اثبات میں ہلا گئی۔

"اتنی خاموش تم ہو تو نہیں، جتنی آج بیٹھی ہوئی ہو کچھ تو بولو چلو لڑھی لو مجھ سے"

فرہاد نے اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا سائے کھلتے ہوئے کہا۔

افس اس کی اتنی محبت گلے میں جیسے آنسوؤں کا گولہ اٹکنے لگا، بہادر کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی، وہ اس دن کتنے حق سے چہرہ دکھانے کی بات کر رہا تھا۔

دل کیا زمین پھٹے اس میں سما جائے یا پھر آسمان نکل لے، خود سے ہی گھن آئی۔۔۔

"م۔۔۔ مجھے نیند آرہی ہے سونا ہے مجھے"

سپاٹ لہجے میں کہا اور ہاتھ فرہاد کے ہاتھ سے کھینچ لیا تھا، وہ جو منہا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھا تھا اس کے ہاتھ یوں ہی ہوا میں ہی معلق رہ گئے، پھر گہری سانس لے کر پاس پڑے گاؤ تکیے پر بازو دھرا

"آج تو نہیں سونے دوں گا"

فرہاد نے شریر سے لہجے میں کہا، اللہ۔۔۔۔۔ کیسے سمجھاؤں اس شخص کو میں کہاں اس کی اتنی محبت اور اپنائیت کے قابل ہوں کل جب بہادر سے اسے میرے بارے میں پتا چلے گا تو؟۔۔۔۔۔ دل تیزی سے انجانے خوف کے باعث دھڑکنے لگا، وہ بیڈ سے اترنے کے لیے آگے ہوئی

”منہا۔۔ کیا ہوا؟“

فرہاد نے فوراً سیدھے ہوتے ہوئے پریشان سے لہجے میں پوچھا، کیا بتاتی اس کیا کیا ہوا ہے اس کے ساتھ، وہ ایک نا محرم سے محبت کے اظہار کرنے والی، اپنی ہی بہن کو اس غیر کے لیے دھکا دے کر جان سے مار دینے والی ڈائن ہے

”کچھ نہیں سونا ہے مجھے بہت تھک گئی ہوں“

آہستگی سے تھوک نگلا

”منہا مانتا ہوں بچپن سے اب تک بہت تنگ کرتا آیا پر یہ بھی سچ ہے بہت محبت کرتا ہوں میں، امی سے لڑ کر یہ رشتہ کروایا ہے میں نے“

فرہاد محبت بھرے لہجے میں اپنی سارے جذبے اس کے گوش گزار کر رہا تھا، اور وہ اپنے آپ کو ان جذبوں کے قابل کہاں سمجھتی تھی۔

”فرہاد میں بہت تھکی ہوئی ہوں“

منہا کی آواز کپکپائی تھی۔

”اچھا۔۔۔ پریشان ہو؟ سرد بادوں تمھارا“

محبت سے اس کے قریب ہوتے ہوئے پیش کش کی، اس کی اتنی چاہت پر آنسوؤں آنکھوں کی پتلیوں پر اٹنے لگے

"نہ۔۔۔ نہیں سر میں درد نہیں ہے بس نیند آرہی ہے سونا چاہتی ہوں"

بمشکل آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو روکا اور پھر فوراً پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چھن چھن کی آواز کے ساتھ سنگھار میز تک پہنچی اور پھر زیور اتار کر سنگھار میز کے دراز میں رکھنے لگی۔

فرہاد کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا پھر پلنگ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا، فرہاد اس کے عقب میں آکر کھڑا ہوا دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے تھام کر قریب ہوا، اس کے یوں قریب آنے پر منہا فوراً پٹی۔

"سوئیں اب۔۔۔۔۔۔"

پلکیں لرزاتے ہوئے پھکی سی آواز میں کہتی وہ اس کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھی اور پھر فرہاد کو وہیں چھوڑ کر، پلنگ کے لحاف کو کھینچتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔

آنکھ سے آنسو چھلک ہی پڑے تھے۔

فرہاد کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر دل میں سراٹھاتی الجھن کے سبب شکن پیشانی پر ابھارے پلنگ پر آیا۔ پلنگ پر بیٹھتے ہی کہنی کے بل منہا پر جھکا، اور لحاف اس کے چہرے پر سے ہٹایا

"منہا۔۔۔"

محبت بھری سرگوشی تھی، مگر اس محبت کا جواب اس کے پاس محبت میں نہیں تھا وہ تو کھوکھلی ہو چکی تھی، آنکھیں زور سے میچ کر اس سے چھپا کر آنسو صاف کیے۔

☆☆☆☆☆☆

ہلکے بھورے رنگ کا لکڑی کا دروازہ تھا، جس پر لگی سیاہ پلیٹ پر سفیر رنگ سے نام لکھا تھا،

"ڈاکٹر بلال ناظم"

شیریں نے گہری سانس خارج کی اور بالوں کی لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑستی آگے ہوئی، جھجکتے ہوئے ہاتھ کو دروازے پر رکھا اور دستک دے دی۔

جانتی تھی اس وقت بلال یہیں موجود ہو گا اور ایسا ہی ہوا تھا، دستک دینے کے چند سکینڈ کے بعد ہی اس کی گھمبیر آواز گونجی۔

"یس۔۔۔ کم ان"

شیریں نے آہستگی سے لکڑی کے دروازے پر لگا لوہے کا ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہوئی، بلال میزے کے پیچھے کرسی پر براجمان تھا اور اب سامنے کھلی فائل سے نگاہ اٹھائے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ت۔۔۔ تم۔۔۔ آؤ"

حیرت تو یقینی تھی، ایک ہی ہسپتال میں ہوتے ہوئے بھی شیریں پہلی دفعہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ جھجکتے ہوئے میز کے سامنے سے کرسی پیچھے کھینچتی ہوئی اس پر براجمان ہوئی جبکہ بلال اب بھی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

شیریں نے دونوں بازو کہنیوں تک میز پر دھرے اور ہاتھوں کو آپس میں ملایا، وہ ذہن میں لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی۔

بلال کے ساتھ اس کو ایک ہی ہسپتال میں کام کرتے ہوئے کافی سال ہو چکے تھے، اور ایک ماہ پہلے ہی اس نے شیریں سے اس کے لیے اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی اور رشتہ بھیجنے کی اجازت مانگی تھی، جسے اس نے دو ٹوک الفاظ میں رد کر دیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی ہے مگر اب پچھلے دو دن سے ذہن عجیب طرز میں سوچنے لگا تھا۔

تقی۔۔۔ جس کے لیے وہ روگ لیے بیٹھی تھی اور شادی نہیں کر رہی تھی۔ ایک ضدباندھ لی تھی، اپنے ماں باپ تک کو پریشان کر رکھا تھا۔

وہ اپنی کتنی مکمل زندگی جی رہا تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ خوش باش تھا اور ایک وہ تھی۔۔۔۔۔

بلال ناصر ایک قابل ڈاکٹر تھا بلکہ ایک خوب رو نوجوان بھی تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود جو بات آج شیریں کو اس کے سامنے بیٹھائے ہوئے تھی اس کی احترام کی نگاہ تھی جو اتنی پسندیدگی اور تلقی اور اس کے بارے میں جاننے کے باوجود قائم تھی۔

بلال ہونق بنا اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے مضطرب کیفیت میں بیٹھی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مڑوڑ رہی تھی۔

"ڈاکٹر شیریں۔۔۔ پلینز بلا جھج کہیے۔۔ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

بلال نے اس کی جھج ختم کرنے کے لیے شائستگی سے کہا، شیریں نے گہری سانس لیتے ہوئے چہرہ اوپر اٹھایا۔

"وہ۔۔۔ ایک ماہ پہلے آپ نے مجھ سے۔۔۔ میرے گھر رشتہ بھجوانے کی بات کی تھی۔۔۔"

شیریں نے آہستگی سے بات شروع کی اور سر جھکا دیا جبکہ بلال ساکن ہم تن گوش تھا۔

"میں۔۔۔ چاہتی ہوں آپ۔۔۔ آپ اپنے پرنس کو بھیج دیں میرے گھر"

شیریں نے جھکے سر کے ساتھ ہی نوید سنائی تو سامنے ماتھے پر نا سمجھی کے شکن ڈالے بلال کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"آ۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔"

بلال کی سمجھ سے باہر تھا وہ اپنی خوشی کو کیسے قابو کرے اور اس وقت کیا کہے، شیریں نے اچانک چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کے یہ بادل بیتاب سی حالت پر ہنسی چھوٹ گئی۔

بلال جو اس کے یوں پیش کش پر بوکھلایا سا تھا، اس کے ہنسنے پر جیسے دم میں دم آیا اور پھر کندھے گرائے اس کے سنگ ہنس دیا۔ شیریں لبوں پر ہاتھ رکھے آج اتنے مہینوں کے بعد کھل کر ہنسی تھی۔

انسان بعض اوقات انجانے میں ہی خود سے زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے جبکہ خوشیاں اس کے آس پاس ہی ہوتی ہیں بلکہ اکثر اس کے اندر ہی چھپی ہوتی ہیں۔

شیریں کا حساب بھی کچھ ایسا ہی تھا تقی ایک سیراب تھا اس کے لیے جس کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ آس پاس کی خوشیوں کو ٹھکرائے ہوئے تھی، پر تقی کا یوں سامنا اور مالا کے ساتھ اس کی محبت اس کو آئینہ دکھائی۔
اپنے سامنے بیٹھے ہنستے ہوئے شخص کو پر سکون ہو کر دیکھا تو دل میں طمانت بھر گئی۔

☆☆☆☆☆☆

وہ بہادر سے زیور کے عوض زہر منگوا چکی تھی، بس اب اس زہر کو باقاعدگی سے کھانا تھا، ہر روز وہ جب زہر کو کھاتی تھی تو یوں لگتا کہ جیسے وہ انصاف کر رہی ہے۔

خود کے ساتھ انصاف۔۔۔۔

رمن کے ساتھ انصاف۔۔۔

اس جیسے انسان کا انجام یہی ہوتا ہے جو اس کا ہونا تھا، اس کا کسی خوشی پر کوئی حق نہیں تھا اور نا ہی فرہاد جیسے مخلص انسان کی پاک محبت پر۔

فرہاد اس سے سچی محبت کرتا ہے۔ یہ دل باخوبی جاننے لگا تھا مگر جب بھی وہ اس کی محبت کی طرف ایک قدم بھی بڑھانے کا سوچتی عجیب طرح کا احساس جاگنے لگا تھا، کیا اس کو یوں ہنسی خوشی شادی شدہ زندگی گزارنے کا حق ہے۔
تقی اور مالا کی دوری واضح تھی جو اسے اندر ہی اندر رمن کی یاد دلاتی تھی۔ اسے سب سے چھپ کر زہر کھاتے ہوئے بیس دن ہو چکے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز یو نہی سوچوں میں گم تھی جب اچانک دل بری طرح متلانے لگا۔ وہ بادل نخواستہ کمرے کے دروازے کی طرف بھاگی تھی مگر اٹاری کے زینے اترتے ہی ابکائی کی صورت وہ زینہ اور اپنے جوتے بھر چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

رات کے ایک بجے گلاب دیوی ہسپتال کی سفید عمارت رات کے اندھیرے میں ڈوبی سیاہ لگ رہی تھی، ہسپتال کی بجلی میں کوئی خرابی کے باعث پچھلے آدھے گھنٹے سے پورے ہسپتال کی عمارت گھپ اندھیرے میں غرق تھی۔ کمرے میں دیوار کے ساتھ لگے چھوٹے سے میز پر رکھی موم بتی کی ہلکی سی پیلی روشنی پورے کمرے کو پیلاہٹ زدہ روشنی بخش رہی تھی۔

گرمی کے باعث تقی نے کمرے کی کھڑکی اور دروازہ پورا کھول رکھا تھا جو کمرے میں مدھم سے ہوا کے جھونکے لانے کا باعث بن رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ سو رہے تھے اس لیے ہسپتال کے وارڈز اور راہداریوں میں خاموشی معمول سے زیادہ تھی۔

مالا دیوار سے لگے لکڑی کے پلنگ پر چت لیٹی تھی اور تقی کچھ دور کمرے کے وسط میں موجود صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے سر اوپر کیے بیٹھا تھا۔ منہا کو کومے میں گئے آج چھ دن ہو چلے تھے اور ہر گزرتا دن اس کی واپسی کی امید کم کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔

دن میں مالا کے ساتھ کمرے میں فرہاد اور نقیب حاکم باری باری قیام کرتے تھے اور رات کو تقی ہوتا تھا۔ مالا کی طبیعت کے باعث تقی کی پریشانی دو گنی ہو گئی تھی، وہ تین دن سے عجیب کچھی کچھی سی رہنے لگی تھی۔ نابات کا جواب پوری توجہ سے دے رہی تھی اور ناخود سے اس سے کوئی بات کر رہی تھی۔

وہ یہ پچھلے دودن ڈاکٹر عرفان کے ساتھ اس قدر مصروف رہا تھا کہ چاہ کر بھی اس کے طبیعت کا نہیں پوچھ سکا اور آج بھی جس وقت کمرے میں آیا وہ سوچکی تھی۔

وہ اس پریشانی کے عالم میں بھی بچے کی خوشی کو لے کر سرشار تھا، پر پچھلے دودن سے مالا کی بے رخی بری طرح کھل رہی تھی۔ تقی نے گردن کا رخ موڑے پلنگ کی طرف دیکھا۔

"تقی کتنے اجنبی ہو گئے ہیں مجھ سے، اب ایسی بھی کیا بے اعتنائی کے مجھے بھول ہی گئے، کمرے میں آتے بھی ہیں تو بس منہ کا چیک اپ شیریں اور دوسرے ڈاکٹرز سے باتیں"

دل پر وزن بڑھنے لگا تھا اور آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

وہ دونوں بالکل خاموش اپنی اپنی سوچوں میں مگن تھے اور گھڑی کی ٹک ٹک کمرے کی خاموشی کو مزید وحشت ناک بنا رہی تھی۔ آنسو آنکھ کے کونے سے بہہ نکلے تو مالانے ہاتھ اٹھا کر نم کونے انگلی کی پور سے دبائے۔

وہ جو سمجھ رہا تھا کہ مالا آج پھر سوچکی ہے اس کے ہاتھ کی جنبش کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدم کی دوری پر پلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔

مالا جو اپنے خیالوں میں گم لیٹی تھی اس کے یوں پاس آ کر کھڑے ہونے پر ہلکی سی گردن کو خم دیے دیکھا۔

"مالا۔۔۔ طبیعت کیسی ہے؟"

فکر مندی سے اس کی طبیعت دریافت کرتا وہ اس پر جھکا۔ مالانے اس کا خود پر جھکا وجود دیکھ کر چہرے کا رخ ناچاہتے ہوئے بھی دوسری طرف موڑ لیا۔

"آگیا خیال میرا بھی۔۔۔" دل مسوس کر سوچا

"جی ٹھیک ہوں"

مختصر جواب مگر لہجہ ڈھکی چھپی خفگی کا غمازی تھا۔

"لگ تو نہیں رہی تم ٹھیک؟ ادھر دیکھو"

تقی نے لب بھینچے اس کے چہرے کو پھر سے سیدھا کیا، وہ اس طرح کے نخرے اسے پہلی دفعہ دکھا رہی تھی اور وہ ان نخروں کی کوئی وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں آپ پریشان ناہوں، آرام کریں صبح اٹھنا بھی ہے"

مالا کا لہجہ ہنوز ویسا ہی تھا، تقی نے حیرت اور نا سمجھی کے ملے جلے اثرات میں بھنویں اچکائیں "ہوا کیا ہے مجھے بتاؤ کس بات کی پریشانی ہے، طبیعت زیادہ تنگ کر رہی ہے تو واپس بھیج دیتا ہوں اماں کو بلوالیتا ہوں"

تقی نے اپنے ذہن میں فوری ایڈ آنے والے خیال کے زیر اثر پوچھا

"نہیں۔۔۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے یہاں، سارا دن آرام ہی کرتی ہوں باقی سارا کام تو نرسیں کرتی ہیں، آپ بلا وجہ کے وہم مت پالیں"

اکھڑے سے لہجے میں جواب دیا

"یہ بات کیسے کر رہی ہے مجھ سے" تقی کی پیشانی پر افقی لکیریں ابھریں، اب اس کی یہ بے رخی غصہ دلارہی تھی۔

"سیدھے سے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ میں ویسے بھی پریشان ہوں اور تم پریشانی میں اضافہ کر رہی ہو"

تقی نے اب کی بار کچھ سخت لہجے میں استفسار کیا، وہ جو پہلے ہی منہ پھلائے ہوئے تھی اس کی یہ توجہ اب لطف دینے لگی۔ اتنے دن کی بے اعتنائی کے بعد تو وہ یوں مہربان ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے نہیں بتانا چاہتی تو مت بتاؤ"

اس کی خاموشی سے چڑ کر تقی اکھڑے سے لہجے میں کہتا سیدھا ہوا اور ماتھے پر بل ڈالے واپس صوفے پر آکر اسی طرح بیٹھ گیا جیسے پہلے بیٹھا تھا، مالا کا منہ حیرت سے کھل گیا، دونوں طرف پھر سے خاموشی کا دور دورہ چل نکلا۔

مالا نے سرگھما کر تقی کی طرف دیکھا، یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا دل تو چاہ رہا تھا وہ کچھ دیر اور منائے پر۔۔۔۔۔ وہ اپنی جگہ درست تھا وہ یہاں اس کی پریشانی میں اضافہ کرنے نہیں آئی تھی ایک دم سے خفگی ندامت میں بدل گئی۔ کمرے کی خاموشی ہولناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی، مالا کو اب وحشت سی ہونے لگی اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ صوفے کی طرف بڑھی اور چند قدم کا فاصلہ طے کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھے تقی کے پاس آگئی۔ خفگی کس بات کی اپنے ہی ذہن کے اڈتے وہم تھے وہ کیوں ان کی سزا تقی کو دیتی، بری طرح خود کو ملامت کیا۔ وہ اسی طرح سر صوفے کی پشت سے ٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ مالا کے قدموں کی چاپ سے بھی سیدھا نہیں ہوا۔ مالا آہستگی سے اس کے پاس بیٹھی اور پھر اس کے گھٹنے پر سر رکھے دائیں کروٹ سمٹ کر لیٹ گئی، مالا کے یوں لیٹتے ہی اس نے سر نیچے کیا اور اسے یوں معصومیت سے گھٹنے پر سر رکھے لیٹے دیکھ کر مبہم مسکراہٹ نے لبوں کا گھیراؤ کیا۔ "ہو گئی ناراضگی دور؟"

مسکراتے ہوئے سوال کیا، مالا نے بنا اس کی طرف دیکھے سر کو آہستگی سے ہلایا۔

"یہ بلا وجہ کی ناراضگی مجھے قطعاً پسند نہیں منانا نہیں آتا مجھے"

تقی نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور انگلیاں اس کی کینٹی سے سر کی طرف چلائی شروع کر دیں۔ مالا نے اس کے گود میں دھرے دوسرے ہاتھ کو آہستگی سے اپنے ہاتھوں میں لیا۔

"آپ کو منانا نہیں آتا اور مجھے زیادہ دیر ناراض نہیں رہنا آتا"

خفیف سے لہجے میں کہتی وہ اس کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کی انگلیاں پھنسا رہی تھی۔

"ناراض ہونے کی کوئی وجہ کوئی جواز تو ہو یہ کیا بس ناراض ہوں، وجہ سرے سے کوئی ہے نہیں اور میرا سوچ سوچ کر دماغ پھٹ رہا ہے کہ میں نے کوئی غلطی کر دی کیا؟"

تقی نے مصنوعی خفگی سے اس کے گال پر ہلکا سا تھپڑ رسید کیا

تقی کے ہاتھ کو اپنے چہرے پر دھرتے ہوئے معصومیت سے کہا، وہ مسکرا کر سر ہلا گیا اور ذہن اتنا تھکا ہوا تھا کہ اس کے اس جھوٹے سبب پر ہی ایمان لے آیا۔

مالانے کروٹ کو سیدھا کیا اور اس کے ہاتھ پر اپنے ملائم ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔ تقی نے یونہی اس کے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، ہلکی پیلی سی روشنی میں وہ اب ناراضگی ختم کیے پیشانی پر فکر مندی کے لکیریں ابھارے ہوئے تھی۔

تقی دھیمے سے لہجے اور روانی سے ساری بابت کہہ رہا تھا، تقی کی بات پر اس کا بھی دل بیٹھ گیا، دونوں طرف پھر سے خاموشی چھا گئی۔ اور چند سکینڈ کے وقفے کے بعد خاموشی کا سکوت مالا کی آواز نے ہی توڑا۔

"میں یہ سوچ رہی تھی کہ منہا آپا نے اکیلے ہی بہت پریشانی اور تکلیف کو سہا ہے، پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہوں گی، اور مجھے پورا یقین ہے انہوں نے بہادر سے وہ زہر فرہاد بھائی کے لیے نہیں اپنے لیے منگوایا تھا"

مالا کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تقی کے چہرے پر سایہ لہرا گیا۔

"ہم۔م۔م فرہاد کو نہیں دے رہی تھی، وہ زہر خود لے رہی تھی، میں نے فرہاد کا خون لینے کے بہانے ٹیسٹ لے لیے ہیں اس کے، آخری دن منہا نے اس زہر کی مقدار معمول سے زیادہ لی تھی شاید۔۔۔۔"

تقی نے دلگیر لہجے میں اپنی سوچ بتائی، مالا ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھی انگلی کو کچھ یاد آ جانے کے انداز میں ہوا میں معلق کیا۔

"شائد۔۔۔۔۔ میں نے جو قمیض کو لے کر اوایلا مچا دیا تھا حویلی میں۔۔۔ اس کی وجہ سے انہوں نے۔۔۔"

مالا کرب کی کیفیت میں لب بھینچ گئی۔ تقی نے آہستگی سے آنکھیں موند کر صوفے کی پشت سے سرٹکایا۔

"ہاں۔۔۔ اسی وجہ سے تم نے بہادر سے کچھ گچھ شروع کی تو اس نے خوف زدہ ہو کر زہر کی زیادہ مقدار لے لی"

تقی نے تکلیف دہ آہ بھرتے ہوئے اس کی بات کی تصدیق کی جبکہ چہرہ چھت پر اٹھائے ہوئے تھا۔ اور مالا کا رخ بھی اس کے چہرے کی طرف ہی تھا۔

"تقی بہادر کو سزا ملنی چاہیے اسے معاف نہیں کریں گے ہم اور۔۔۔ کیا پتا اب تک تو وہ بھاگ گیا ہو گاؤں سے۔۔۔"

مالا نے دانت پیستے ہوئی ضبط میں بات مکمل کی، تقی کی خاموشی کچھ پل قائم رہی اور پھر وہ اسی لہجے میں گویا ہوا۔

"اس وقت منہا کے زندہ بچ جانے کے علاوہ اور کچھ نہیں سجھائی دے رہا مجھے، مجھے اس کی زندگی چاہیے بس، میں اس کو یوں دنیا سے جانے نہیں دے سکتا"

مالا نے حوصلہ دینے کی خاطر نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ دھر دیا۔

"فرہاد نے میری وجہ سے اریب پھوپھو پر شک کرتے ہوئے ان سے ہر تعلق توڑ دیا تھا، اب اسے کیسے بتاؤں؟ کیا کہوں اس سے کہ میں غلط تھا، منہا کو زہر اریب پھوپھو نہیں دیتی تھیں بلکہ وہ زہر وہ خود کھا رہی تھی"

تقی نے کرب ناک لہجے میں جملہ ادا کیا، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے میں اتنے مگن تھے کہ، دروازے پر ساکت کھڑے نفس سے لا پرواہی برت گئے جو ان کی اس گفتگو پر دروازے کے بیچ و بیچ کھڑا مجسم ہو

چکا تھا، جیسے ہی اس نے لڑکھڑاتے جسم کو سنبھالنے کی خاطر کواڑ تھامتا تو دروازے کی چڑچڑاہٹ خاموش کمرے میں گونج گئی، مالا اور تقی نے ایک ساتھ چہرہ اوپر اٹھایا۔

اور سامنے کھڑے فرہاد کے چہرے کے رنگ دیکھ کر دونوں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

☆☆☆☆☆☆

منہانے حیرت اور خوشی کے ملے جلے اثرات سے آنکھیں کھولے سامنے کھڑی دائی اماں کو دیکھا جواب فرہاد سے پیسے لے رہی تھی۔

اپنی ہی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا، کیا اللہ نے سچ میں اس پر مہربانی کر دی تھی۔ بلقیس اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھی اور پلنگ کے پاس کھڑے فرہاد کی خوشی دیدنی تھی، آج پہلی دفعہ وہ کچھ دور کھڑی اریب پھپھو کے چہرے پر بھی اپنے لیے نرمی کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

خوشی سے سرشار ہوتے ہوئے نگاہ اٹھائے فرہاد کی طرف دیکھا، وہ کتنا خوش تھا، چہرے پر انگنت خوشی کے رنگ رقص کر رہے تھے۔ باچھیں کھلائے اب جوش سے اریب کے گلے لگ چکا تھا۔ وہ کتنا جہیہ تھا، کتنا سادہ، دل کی دھڑکن ہلکی سی لے میں دھڑک اٹھی۔

وہ ماں بننے والی تھی۔ اتنے سالوں بعد کسی انوکھی سی خوشی نے اپنے حصار میں لیا تو وہ اپنے پچھلے سارے غم پس پشت ڈال بیٹھی، سرہانے کھڑے محبتیں لٹاتے وجود کے لیے دل میں عجیب سا احساس اٹھنے لگا۔

بلقیس اور اریب اس کا ماتھا چوم کر باہر نکلیں تو وہ جوان کے ہی جانے کے انتظار میں تھا والہانا انداز میں آگے بڑھا۔ "سن لیا مناسب جو ابھی ممانی اور امی نے ہدایات دیں، کوئی کوتاہی نہیں کرنے دوں گا سمجھی"

فرہاد کا لہجہ سرشار تھا اور انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ منہانے سرا سیمگی کی حالت میں گردن اثبات میں ہلائی، وہ جو آج فرہاد کے لیے محسوس کر رہی تھی پہلے کبھی نہیں کیا تھا اور دل انہیں محسوسات پر حیرت زدہ تھا۔

محببتیں تو وہ پہلے بھی نچھاور کرتا ہی تھا پر آج اس کی محبت اس کے لمس اور باتوں سے دل کو عجیب سا سرور آنے لگا۔
 "میں کتنی ناشکری تھی اللہ۔۔۔۔۔ تو نے مجھے احساس دلادیا، میں اب وہ زہر پھینک دوں گی کبھی نہیں کھاؤں گی۔
 میں جس دن ماں بن رہی ہوں گی اس تکلیف کے دوران میں تجھ سے معافی مانگوں گی، سنا ہے تو ماں بننے جیسے عظیم
 عمل پر سارے گناہ دھو دیتا ہے"

فرہاد اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے، پتا نہیں آنے والے وقت کے متعلق کیا کیا خواب بن رہا تھا۔ اور وہ آج پہلی دفعہ اسے اتنی محبت سے تاک رہی تھی۔

منہا نے بمشکل اٹاری کے ستون کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا تو وہ گرنے لگا، دل کانپ گیا تھا، سامنے کے منظر نے پچھلے ایک ماہ کی ساری خوشیاں ملیا میٹ کر دی تھیں۔ چوہدی حاکم ہاتھ میں خط تھامے کھڑے تھے اور اریب پھپھو تخت پر بیٹھی بین کر رہی تھیں۔

سب لوگ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ کچھ دور لٹھے کی طرح سفید پڑتا چہرہ لیے کھڑی منہا کے سر میں اس سارے منظر کو دیکھ کر ہتھوڑ نے چلنے لگے ہیں۔ بہادر کچھ نہیں بھولا تھا۔ اس کو جس غلط فہمی کا شکار وہ کر چکی تھی، اب وہ اس سے آسانی سے باہر نہیں آنے والا تھا۔

منیر پھپھا کے خفیہ نکاح کے بارے میں صرف بہادر جانتا ہے یہ یہاں صرف اسے معلوم تھا۔ اور اس نے یہ پردہ فاش کس لیے کیا ہے۔ اس بات کا خوف اس کے دل میں سایے پھیلانے لگا۔ وہ پچھلے ایک ماہ سے فرہاد کے ساتھ خوش رہنے لگی تھی، خاموش رہنا تو طبیعت کا خاصہ بن گیا تھا لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ اب جینے لگی تھی اور فرہاد سے محبت کرنے میں وہ اس بات کو تو یکسر فراموش کر بیٹھی کہ بہادر کو وہ ایک جھوٹی آس دلا چکی تھی۔

دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا، طبیعت تو پہلے سے ہی بو جھل رہتی تھی اوپر سے یہ نئی افتاد نے ہاتھ پاؤں پھلاد دیے تھے۔

بہادر کی طرف سے اٹھایا ہوا یہ انتہائی قدم اسے اچھی طرح باور کروا گیا تھا کہ وہ کسی صورت نہیں بھولا کچھ اور اس کا دیوانہ پن اب بھی قائم ہے اور وہ اس کے جواب اور اگلے عمل کا منتظر ہے۔

"اگر۔۔۔ اگر میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا تو۔۔۔ اللہ کیا کروں؟؟؟ میں نے یہ کیا کیا؟۔۔۔ کیوں کیا تھا وہ سب؟؟؟۔۔۔ اب کیا کروں؟، اسے سمجھا دوں کہ میں خوش ہوں اب۔۔۔ اگر وہ نامانا تو؟

۔۔۔۔۔ وہ جانتا ہے میں نے رونا کو دھکا دیا تھا اور اب۔۔۔ زیور بیچ کر زہر۔۔۔ افس میرے خدا۔۔۔"

دل میں پھانس اٹکنے لگی، دل خوف کے مارے لرز رہا تھا۔ اپنی بیوقوفیوں کا یہ بھگتان بھگتنا پڑے گا کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ گھر کا ماحول کشیدگی اختیار کر گیا تھا۔

گھر میں اتنا تناؤ اس کے ذہن کو مفلوج کر رہا تھا، وہ خوف زدہ سی ٹرانس کی حالت میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ باہر سے بین کی اور رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆

منہانے پلنگ پر چت لیٹے آہستگی سے گردن گھما کر سامنے دیکھا، فرہاد سامنے لکڑی کے صوفے پر چپ چاپ بیٹھا تھا، شیو بڑھی ہوئی غمناک آنکھیں۔ وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔

فرہاد کو اتنا دکھی اور چپ اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فرہاد کی خود پر سے توجہ ایک دم سے ختم ہو جانا، اس کا یوں اندوہ گیس ہو جانا، آئے دن گھر میں منیر میاں کی طلاق، بچوں کو لے کر جھگڑے کی فضا، اریب پھپھو کا بلکنا بین کرنا، فرزانہ آپا کا اتر اچھا اور بی جی کی اداسی سب۔۔۔۔۔ سب۔۔۔ کی قصور وار وہ تھی۔

اور اب تو منیر پھپھا کے ان بچوں کے ماں سے جدا ہو جانے کا گناہ بھی اسی کے سر ہی تھا۔ وہ اتنے دن سے عجیب بے کلی کا شکار تھی۔

فرہاد اپنے غم میں مبتلا تھا اس کو دلاسا دینا چاہتی تھی لیکن ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے پاس جاتی تو یوں لگتا کہ جب اسے بہادر سے سب پتا چلے گا تو اس کا کیا حال ہو گا۔ احساس جرم جو کم ہوا تھا وہ پھر سے سراٹھانے لگا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ اللہ نے دکھا دیا، میرے جیسے گناہ گار کبھی بھی سکون سے زندگی گزارنے کا حق نہیں رکھتے ہیں اور میں نے یہ سوچ بھی کیسے لیا تھا کہ میرا گناہ معافی کے قابل ہے، میں نے یہ سوچ بھی کیسے لیا تھا کہ اللہ نے بچے کی خوشی اس لیے دی ہے کہ مجھے ایک موقع مل جائے۔۔۔۔۔ میں کیسے بھول گئی کہ میں ایک قاتل ہوں"

ڈوبتے دل اور بھری آنکھوں سے اسے اچانک یاد آیا کہ وہ زہر اس نے ابھی پھینکا ہی کہاں تھا۔ وہ تو ابھی تک باورچی خانے میں چھپا کر رکھا ہوا تھا اس نے، اکثر سوچتی رہی، پھینک دے گی پر کوئی موقع نہیں ملا تھا۔

جلدی سے گالوں پر آئے آنسو ہاتھ کی پشت کے ساتھ بے دردی سے رگڑ ڈالے۔ چور نگاہ فرہاد پر ڈالی وہ اسی طرح ساکن بیٹھا تھا۔ جوش میں پلنگ پر سے اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔۔۔۔۔

"مجھے جینے کا کوئی حق نہیں، کسی معصوم کی خوشیوں کی قاتل ہوں میں، کتنے ہی دلوں کے دکھنے کی وجہ ہوں میں،

ایک طرف بہادر کو دھوکا دے رہی ہوں تو دوسری طرف اپنے فرشتہ صفت شوہر کو۔۔۔۔۔"

ذہن مفلوج تھا اور ضمیر کمر پر ہاتھ دھرے اسے باتیں سنارہا تھا۔

"اپنی بہن سے بڑھ کر پیار کرنے والی دوست کو اپنی چچا زاد کو موت کے گھاٹ اتار دینے والی، نامحرم سے محبت کے دعویٰ کرنے والی، یہ کیسے بھول گئی سب میں۔۔۔ اتنی خود غرض اپنی خوشیوں میں یہ کیسے بھول گئی کہ یہ سب کسی کی خوشیوں کو تباہ کرنے کے بعد ملا ہے۔۔۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اب کچن میں موجود تھی، خود کو سزا دینے کا ایسا جوش چڑھا کہ یہ بھول ہی گئی کہ اس کی کوک میں ایک ننھی سی جان ابھی ایک لو تھڑے کی صورت موجود ہے، جسے اس دنیا میں آنے کے لیے اس کے وجود کی اشد ضرورت ہے، جو یہ کھائے گی اس کا سارا اثر اس بے جان لو تھڑے پر اثر انداز ہوگا، اور وہ جس میں ابھی اللہ پاک نے روح پھونکنی تھی کہاں اتنی سکت رکھتا تھا کہ زہر کی تاب لا سکتا۔

اس کا رونا اب سسکیوں سے ہچکیوں میں بدل گیا تھا۔ باوچی خانے میں کھڑی وہ بلکتے ہوئے دودھ کے گلاس میں زہر گھول رہی تھی اور پھر ایک ہی سانس میں گلاس کو منہ سے لگائے وہ پورا گلاس ختم کر چکی تھی۔ زہر آلودہ دودھ لبوں کے کناروں سے نیچے گر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

منہا نے پیشانی پر بے پناہ شکن ابھارے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، زرد چہرے پر آنکھیں کھولنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ تکلیف کے آثار صاف واضح تھے۔

جیسے ہی حواس بحال ہو رہے تھے، ارد گرد سے باتوں کی آوازیں کانوں میں پڑنے لگی تھیں، اس نے دھیرے سے بھاری سوزش زدہ پپوٹے اٹھائے آنکھیں کھولیں تو وہ ہسپتال کے ایک نجی کمرے میں بیڈ پر تہی دامن لیٹی تھی۔

کلائی پر سوئی جلد کے اندر پیوست تھی اور ناف سے لے کر ٹانگوں تک اور پشت میں تکلیف کی ٹیسیں ابھرا بھر کر معدوم ہو رہی تھیں۔ شکم میں عجیب سی ہوک اٹھی اور ذہن کی دیوراں پر بے ہوش ہونے سے پہلے کا منظر واضح ہونے لگا۔

وہ رات کو زہر آلود دودھ پی کر سو گئی تھی، اور پھر صبح بارہ کے قریب ہی پیٹ میں تکلیف کے ایسے مرغولے اٹھنے لگے تھے کہ وہ اونچا اونچا چیخنے پر مجبور ہو گئی اور اب یاد آرہا تھا کہ گاڑی میں شہر کی طرف سفر کے دوران ہی وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔

کچھ قدم کی دوری پر بلقیس کے سامنے ایک لیڈی ڈاکٹر کھڑی اس سے باتوں میں محو تھی، منہانے گردن گھما کر آبرو اچکائے ان دونوں کی طرف دیکھا تو لیڈی ڈاکٹر کی نظر اس پر پڑتے ہی وہ فوراً منہا کی طرف بڑھی۔ "کیسی ہونچے۔۔۔؟" قریب آ کر محبت سے منہا کے سر پھر ہاتھ پھیرتے ہوئے طبیعت دریافت کی منہانے جواب دینے کے بجائے پہلے نگاہ اٹھا کر ان کے بائیں طرف مضطرب کھڑی بلقیس کی طرف دیکھا۔ "بیٹا آپ نے کل کچھ کھایا تھا کیا؟"

ڈاکٹر کے سوال پر منہانے چونک کر خوف سے لرزتے دل کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو بہت ملائم لہجے میں اس سے تفتیش کر رہی تھی۔

"نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں بس رات کا کھانا کھ۔۔۔ کھایا تھا۔۔۔ اور تو کچھ۔۔۔ نہیں۔۔۔" خوف سے لرزتے دل اور خشک ہوتے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے خفیف سی آواز میں جھوٹ بولا۔

سامنے کھڑی لیڈی ڈاکٹر کو تو جیسے اس کی بات پر رتی بھر یقین نہیں آیا تھا۔

"نہیں بیٹے اچھے سے یاد کریں کیا کوئی دوا لی آپ نے؟، مطلب سر میں درد یا کچھ اور محسوس ہو رہا ہو تو آپ نے کوئی دوا لی ہو؟" وہ سوالیہ نگاہیں گاڑے کھڑی تھی

منہا ہونق بنے ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی کل جب زہر پیا تو کہاں پتا تھا جوش میں اٹھایا یہ قدم اس کے بطن کو ہی تہی کر چھوڑے گا۔

اب کی بار کہاں زبان نے ساتھ دیا تھا آہستگی سے جہاں سر کو نفی میں ہلایا وہاں آنکھوں میں بھی موٹے موٹے آنسو تیر گئے تھے۔

"ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔ کھانا ہی کھایا تھا اس نے بس، ہم سب مل کر رات کا کھانا کھاتے ہیں جی، اس کے علاوہ تو ایسا کچھ نہیں کھایا اس نے پھر تو سو گئی تھی یہ" اب کی بار منہا کے بجائے جواب بلقیس نے دیا تھا۔
ڈاکٹر نے منہا سے نگاہیں ہٹائے بلقیس کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں کیوں پر کچھ تو گڑ بڑ ہے بچی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، یہ جان بوجھ کر ہوا ہے، اس نے غلطی سے کھالیا ہے یا پھر کسی نے کچھ کھلایا ہے، جس کی وجہ سے بچہ نہیں بچ سکا۔۔۔۔۔" ڈاکٹر بڑے وثوق سے اپنی بات پر ڈٹی تھی۔
منہا کے چہرے پر سایہ لہرا گیا۔ بلقیس نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورا تو منہا نے تکیے پر دھرا سر آہستگی سے دائیں بائیں تردید میں ہلادیا۔

کچھ باقی نہیں رہا تھا، ایک ہی رات میں زہر اس کی کوک میں پلنے والے ایک ماہ کے نفل کو زائل کر چکا تھا۔
ڈاکٹر اب پھر سے اس سے توجہ ہٹا کر بلقیس سے باتوں میں مشغول ہو چکی تھی۔

دل میں ہوک اور شکم میں ہول اٹھنے لگے، جہاں خود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی وہاں جینے کی خواہش مکمل طور پر دم توڑ چکی تھی، دل کر رہا تھا چیخ چیخ کر رودے مگر یہ وہ راز تھا کہ جو ہما راز تھا اس سے بھی درد نہیں بانٹ سکتی تھی۔

کچھ دور کھڑی لیڈی ڈاکٹر نے اس کی پریشانی میں اضافہ کر دیا تھا وہ بار بار بلقیس کو اس کے حمل زائل ہونے کی وجہ کوئی زہریلی دوا قرار دے رہی تھی۔

منہا کی سانس اٹکنے لگی، اگر کہیں ڈاکٹر نے تقی سے بات کی اور پھر تقی کو معلوم پڑ گیا کہ میں نے زہر کھایا ہے۔
 "اوہ میرے خدا مجھے اس اذیت بھری زندگی سے نجات دے اللہ۔۔۔۔۔" دل جہاں خون کے آنسو رو رہا تھا
 وہاں زندگی جیسی نعمت سے منہ موڑنے کے لیے دعا گو تھا۔

☆☆☆☆☆

منہا نے نقاہت سے گردن کا رخ دائیں جانب موڑا، موم بتی کی زرد روشنی میں نہایا کمرہ، کچھ دور لکڑی کی کرسی پر بیٹھی پریشان حال مالا اور صحن سے آتی جھگڑے کی آوازیں خاموشی کو چیرتی ہوئی اس کے دل اور دماغ پر ہتھوڑے برسائیں۔

لگاتار بہت دن سے زہر کھانے کی باعث وہ وضو خانے میں بے ہوش ہو کر گر گئی تھی اور اس کے بعد آج۔۔۔۔۔
 حویلی کے صحن میں تو جیسے ایک بھونچال آگیا تھا۔ وہ اس وقت بھی بیڈ پر ڈرپ لگائے لیٹی ہوئی تھی۔
 تقی غصے میں بھرا اریب پھپھو پر الزام تراشی کر رہا تھا اور وہ اپنی صفائی میں چیخ رہی تھیں۔ کمرے میں وہ سب کی آوازیں با آسانی سن سکتی تھی۔ مالا اس کے پاس بیٹھی ہاتھ میں پکڑی پنکھی کے ساتھ اسے ہوا دے رہی تھی۔
 اریب نے چیخ چیخ کر پورا حاکم قصر سر پر اٹھار کھا تھا۔

"یہ قدر ہوئی میری اماں۔۔۔۔۔ بول یہ قدر ہے میری کہ آج میرا بھتیجا مجھ پر میرے پوتے کے قتل کا الزام لگائے کھڑا ہے"

اریب گلا پھاڑے چیخ رہی تھی، وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی پر یہ اس وقت کمرے میں لیٹی بے بس وہ ہی جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہی ہیں۔

"پھپھو الزام کی کیا بات کرتی ہیں آپ، میں یہ ثبوت آپ کے سامنے لیے کھڑا ہوں"

تقی کی آواز کا جوش اس سے محبت کا واضح ثبوت تھا، دل خون کے آنسو رو دیا ایسے محبت کرنے والے بھائی کی پیٹھ پیچھے وہ اس کی عزت کو داؤ پر لگائے گھر کے ملازم سے محبت کی دعویٰ دار بنی بیٹھی تھی۔

"یہ کاغذ۔۔۔۔۔ میرے خون سے زیادہ گواہی دے گئے تھے، مجھے کیا پتا یہ کونسا جھوٹ کا پلندہ ہے، منہا میرے سگے بھائی کی اولاد ہے میں کیوں کروں گی منہا کے ساتھ ایسا؟؟؟" اریب نے چیخ کر اپنی صفائی دی

ان کا ایک ایک لفظ سچ تھا جب سے اس کے ماں بننے اور پھر بعد میں منیر پھپھا کی دوسری شادی کا پتہ چلا تھا۔ وہ تو بالکل بدل گئی تھیں اس کی فکر بھی کرتی تھیں اور اب اسے بلا وجہ غصے سے گھورتی بھی نہیں تھیں۔ تقی ان پر الزام تراشی کر رہا تھا اور وہ کمرے میں لیٹی اس سب پر ٹپ رہی تھی۔

"پھپھو آپ نے پھپھو بن کر کب گلے لگایا ہمیں جواب ساس بن کر منہا کو قبول کرتیں، آپ ماں کیوں نہیں لیتیں کہ آپ نے نفرت میں یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے"

تقی تو آج آپے سے باہر تھا

"تقی بس کر بد تمیزی منہ توڑ دوں گا تیرا"

نقیب حاکم کی گرجدار آواز گونجی تو منہا کا دل بھی دہل گیا۔ معاملہ سنگینی اختیار کر تا جا رہا تھا، مالا بھی مضطرب سی کان کھڑے کیے بس سن رہی تھی۔

"نقیب۔۔۔۔۔ اور پڑھا۔۔۔۔۔ بنا اس کو ڈاکٹر۔۔۔۔۔ دیکھ آج کیسے اپنی ماں سے بھی بڑی پھپھی کے سر اتنا بڑا الزام

منڈھ رہا ہے" چوہدری حاکم کی بوڑھی آواز میں لغزش ضرور آچکی تھی لیکن رعب اور دبدبا نہیں کم ہوا تھا۔

"میں اب اس حویلی میں ایک دن نہیں رکوں گی، منیر اٹھیں، ہمیں نہیں رہنا یہاں اب اور یہ۔۔۔۔۔ جو رو کا غلام

یہ رہے یہیں اپنی بیوی کے ساتھ، چاٹے تلوے اپنی بیوی کے اور اپنے پڑھے لکھے سالے کے میں تجھے کبھی نہیں

بخشوں گی یاد رکھنا"

"اف میرے خدا سب کتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے اور میں کتنی تکلیف دے رہی ہوں سب کو، فرہاد کتنا چاہتے ہیں مجھے کہ میرے لیے اپنی ماں کے آگے تن کر کھڑے ہو گئے اور میں۔۔۔ میں کیا کرنے جا رہی تھی"

"نہیں میں اب زہر نہیں کھاؤں گی، میں بہادر کو سمجھاؤں گی اور اسے زہر واپس دے دوں گی کہ بیچ کر پیسے خود رکھ لے اور اب سے مجھے بھول جائے، میں نے رونا کے مرنے کے بعد سے کبھی بھی اس سے محبت نہیں کی تھی۔۔۔۔ اور وہ جو بھی تھا وہ شاید محبت تھی ہی نہیں۔۔۔۔" منہا بے چینی سے لب بھینچے سوچ رہی تھی۔

"اریب غصہ نہ کر، اس کے سر میں، میں جوتے لگاتا ہوں، تو کیوں جائے گی گھر چھوڑ کر، اس کا دماغ درست کرتا ہوں میں"

اب نقیب حاکم کی اریب سے منتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔

”رہنے دو نقیب، بہت عزت کمالی، میں تو اب کبھی نہیں رکوں گی یہاں، منیر چلیں سامان باندھیں“

اریب کی تکلیف دہ آواز پر منہا کا دل کٹ گیا۔۔۔

"اے اللہ بے شک۔۔۔ میں بہت گناہ گار بندی ہوں، پر رب میرے ایک دفعہ معاف کر دے یہ سب نا بگڑے،

اب سے میں زہر نہیں کھاؤں گی۔" دل بری طرح دعا گو تھا۔۔۔

”بیغرت چل مانگ معافی۔۔۔ مانگ معافی اپنی پھپھی سے“ نقیب حاکم اب تقی پر چیخ رہے تھے۔

”جب تک یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی کہ منہا کو زہر دینے والی اریب پھپھو نہیں ہیں میں ان سے معافی نہیں

مانگوں گا“ تقی کے دو ٹوک لہجے میں کی گئی بات پر منہانے زور سے آنکھیں میچ لیں۔۔۔۔

"آہ-ہ-ہ-ہ-ہ جان سے پیارے بھائی میرے۔۔۔۔ اور اگر تجھے یہ پتہ چل جائے کہ وہ زہر تیری بہن خود کھا

رہی ہے۔۔۔" منہا کے دل میں درد کی ٹیسس اٹھنے لگیں

"نقیب یہ ایک چماٹ اس۔۔۔ کمبخت کے منہ پر بھی جڑ دیکھو، یہ بھی گردن تان کر اپنی اماں کے آگے کھڑا ہو گیا، ارے ناس پٹی اس ڈاکٹری کی پڑھائی کا ستیاں ناش جائے، ہمارے زمانے میں بھی یوں بیمار پڑ جاویں تھی بچیاں پہلی بار میں، تو کیا سب کی ساسیں ان کو دوا دیے تھیں "خدیجہ بیگم کی تیکھی آواز پورے صحن میں گونج رہی تھی

"ابھی اسے بیمار ہوئے مہنیہ بھر تو گزرا ہے، چوہی سی جان ہے ناکھاتی ہے سہی سے ناپیتی ہے تو جان کیسے بنے گی، منہ اٹھا کر لے آیا یہ دو پرچے اور اپنے باوا کی ماں جنی پر لگا دیا الزام "خدیجہ بیگم کا لہجہ آخر میں روندھا گیا تھا۔

"اف بی جی کو ایک کے بعد دوسرا غم، دوسری تکلیف، کیا میں اپنوں کو صرف دکھ تکلیف دینے اور موت دینے کے لیے اس دنیا میں آئی ہوں۔۔۔؟؟" دکھ سے لب بھینچے وہ خود پر ملال کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"بی جی بچہ ہے میں سمجھاتی ہوں ابھی معافی مانگے گا" بلقیس کی خوفزدہ سی آواز ابھری۔۔۔

"ہائے۔۔۔ میری بھولی ماں۔۔۔ کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ تجھ سے اپنے دل کی ہر بات کر سکتی۔۔۔ کاش۔۔۔ کوئی تو ایسا ہوتا جس کو اپنی تکلیف بتا سکوں۔۔۔ اتنے سالوں سے یہ بوجھ اٹھائے اٹھائے اب تھک گئی ہوں ماں۔۔۔"

منہا کا دل اور دماغ دونوں پھٹ رہے تھے۔

"منیر۔۔۔ منیر۔۔۔ آجائیں، اب اپنے کپڑے بھی رکھ لیجیے ٹرنک میں "اریب کی کڑک دار آواز کہیں اٹاری کے پاس سے ابھری تھی۔۔۔

"پھپھو۔۔۔ رک جائیں۔۔۔ مت جائیں۔۔۔" بے آواز آنسو ہچکیاں بننے کو بے تاب تھے مالا اب کرسی سے اٹھ کر کمرے کے دروازے میں کھڑی ہو چکی تھی۔

"میری بات سن لو سب غور سے کوئی نہیں جائے گا حویلی سے، تقی کی ہمیشہ سے ہی یہ خصلت ہے، اس کی ڈاکٹری نے دماغ خراب کر رکھا ہے اس کا، اس کی بات میں ایک فیصد بھی صداقت نہیں ہے، اس کو کہو آکر پیر پکڑے اپنی پھپھو کے نہیں تو میں یہ حویلی چھوڑ کر چلا جاتا ہوں، میں جہاں بھی رہوں ڈیرے رہوں یا کہیں بھی پھر پیچھے

سے سر پھاڑ لینا ایک دوسرے کا اور دھکے دینا ایک دوسرے کو۔۔۔۔۔ "چوہدری حاکم کی ہلکی لغزش زدہ آواز حاکم قصر کے صحن میں گونج اٹھی۔۔۔۔۔"

گھر کے سب افراد ایک دوسرے پر چیخ کر چپ ہو چکے تھے اور وہ جو اس سب فساد کی جڑ تھی، کمرے میں لیٹی بے بس تھی۔

کیا کرتی کیا نا کرتی نا اٹھنے کی سکت تھی نا کسی کو بتانے کی، بس زندہ درگور ہونا اس لمحے کا واحد حل لگ رہا تھا۔ بے بسی کے عالم میں بس آنکھوں سے گرتا گرم نمکین سیال، لیٹے ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے کناروں سے بہہ بہہ کر کانوں اور بالوں کو بری طرح تر کر گیا تھا۔

وہ اب زہرنا لینے کا تہیہ کر چکی تھی۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

خیف سی حالت میں وہ کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی۔ زہر کھانا تو اب بیت دن سے بند کر دیا تھا پر ابھی اس کے اثرات ایسے جسم پر اثر انداز ہوئے تھے کہ وہ ہر وقت سستی اور بے کلی محسوس کرتی تھی۔

بلقیس اور نقیب حاکم کو وہ اس بات پر یقین دلانے میں کامیاب ہو چکی تھی کہ وہ اب ٹھیک ہے، وہ خود بھی بس اب ٹھیک ہونا چاہتی تھی۔ ایک تو گھر کی کشیدگی ختم کرنا چاہتی تھی، دوسرا فرہاد سے اتنی محبت ہو چکی تھی کہ اب اس کو کھونے سے ڈر لگنے لگا تھا۔

باہر کافی دیر سے آوازیں گونج رہی تھیں۔ جن میں مالا کی آواز واضح تھی وہ بہت دیر سے ان آوازوں کو نظر انداز کیے ہوئے تھی، لیکن اچانک ایسا لگا جیسے باہر صحن میں بہادر کا نام پکارا جا رہا ہو۔ آہستگی سے پلنگ پر سے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی جب باہر آئی تو جیسے دنگ رہ گئی۔

اب وہ ہونق بنی کھڑی سامنے کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ مالا ہاتھ میں ایک قمیض تھامے سامنے کھڑے بہادر پر چیخ رہی تھی۔ سب گھروالے جمع تھے۔ ہر گزرتا پل جیسے اس کی سانس بند کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی گئی تھیں۔ مالا جو کچھ بول رہی تھی، ناقابل یقین تھا۔ سچ ہے ناحق قتل کبھی نہیں چھپتا، کبھی نہیں۔۔۔۔ اور آج مالا جو کچھ بھی بہادر سے پوچھ رہی تھی، اس کے رنگ اڑا گیا تھا۔

"آخر کو یہ سب مالا کیسے جانتی تھی" ذہن میں اڈتے خیال کے باعث منہا نے خود کے لڑکھڑاتے وجود کو سنبھالنے کی خاطر اٹاری کے ستون کو تھاما۔

"نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ مالا بی بی میں نے فراز نہ آپا کی شادی پر نہ ویلمے پر کسی دن بھی یہ قمیض نہیں پہنی تھی۔ میں نے تو ویلمے کے روز سفید قمیض شلوار پہنی تھی اور یہ تو بعد میں پھٹ گئی تھی۔ ایک دفعہ میں نے یہاں دھلائی کو دی ملی نہیں پھر میں نے لڈن کے ہاتھ پیغام بھی بھیجا تھا ایک دو دفعہ کہ میری قمیض ہے حویلی میں" بہادر نے حیرت سے بھنویں اچکائیے وضاحت دی

وہ سب لوگوں کی طرف نگاہیں گھما گھما کر بے چارگی سے دیکھ رہا تھا۔
منہا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

مالا نے لب بھینچے اور بازو جھٹک کر قمیض اس کے پھر سے سامنے کی
"جھوٹ۔۔۔ بلکل جھوٹ یہی پہنی تھی، تفتی کا یہ جوڑا تم نے ہی لیا تھا، بس اتنا بتاؤ پہلے" مالا اب تنک مزاجی سے سوال بدل کر پوچھ رہی تھی۔

منہا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مالا کی طرف دیکھا۔

"کیا بہادر نے اسے سب بتا دیا ہے سب۔۔۔ اف۔۔۔ ف۔۔۔ میرے خدا یہ کیا ہوا۔۔۔؟" منہا کا دماغ گھوم گیا
"مالا آخر کو یہ سب جانتی کیسے تھی" ذہن میں بس بار بار ایک ہی سوال سر اٹھا رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منہا کا خون خشک ہو رہا تھا۔ وہ تو ابھی موقع ہی تلاش کرنے میں لگی تھی کہ کب موقع ملے اور کب وہ بہادر کو زہر واپس دے اور اسے سب بھول جانے اور کسی کو نابتائے کی منت کرے پر یہاں تو سب ملیا میٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"جی بی بی یہ جوڑا تو مجھے یاد ہے، یہ بہادر نے ہی اٹھایا تھا، کل چار جوڑے تھے جن میں سے نقیب میاں کے دو جوڑے میں نے اور ایک لڈن نے لیا تھا اور چوتھا یہ تقی میاں کا بہادر نے اٹھایا تھا پر ویلیم کے روز تو ر منابی بی کے حادثے کے بعد کسی کو کوئی ہوش ہی نہ رہا کہ دیکھتے کس نے کونسا جوڑا پہنا ہے، پر ہوا کیا ہے بیٹی؟" گامے نے ناک پر عینک درست کرتے ہوئے بات کی تصدیق کر دی اور ساتھ ہی اس سے تفشیش کا سبب پوچھا

مالانے گامے کے سوال کا جواب دینے کے بجائے گھور کر بہادر کی طرف دیکھا، منہا بھی چورنگا ہیں بہادر پر گاڑے کھڑی تھی پر اس وقت بات یہ سمجھ سے باہر تھی آخر کو مالانے سب کیسے جانتی ہے۔

"ہاں یہ جوڑا میں ہی لے کر گیا تھا،۔۔۔ پر۔۔۔ پر ویلیم کے روز یہ نہیں پہنا تھا میں نے" بہادر نے بدحواسی میں مالانے کی بات سے انکار کیا

وہ نفی میں گردن ہلا رہا تھا، مدد طلب نگاہوں سے ایک نگاہ منہا پر ڈالی جو آنکھیں پھاڑے کھڑی اس سے بھی زیادہ حیرت زدہ تھی۔

"میں جانتی ہوں سب سچ کیا تھا، تم یہاں سب کو یہ بتاؤ تم نے ر منا آپا کو چھت سے کیوں دھکا دیا تھا؟" مالانے مٹھیاں بھینچے سوال کیا

منہا کو لگا وہ ابھی یہیں پر ڈھیر ہو جائے گی، دل خوف کے باعث پھٹ کر باہر آنے کو تیار تھا۔

"ر منا آپا کو چھت سے دھکا کیوں دیا تھا؟؟" مالانے بہادر کے سامنے کھڑے ہو کر چیختے ہوئے پھر سے وہی سوال

دہرایا

بہادر نے چونک کر سراو پر اٹھا کر مالا کی طرف دیکھا اور منہا نے بہادر کی طرف

"م۔۔۔ مالا بی بی ک۔۔۔ کیا بات ہے، ہوا کیا ہے؟۔۔۔" بہادر ابھی بے ربط سے الفاظ ہی ادا کر رہا تھا

چوہدری حاکم آگے بڑھے اور مالا کا کندھا جھٹکتے ہوئے اپنی طرف موڑا

"یہ کیا بے تکی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہے۔۔۔ ہوا کیا ہے؟ اتنے سال بعد ر منا کی موت کا ذکر کہاں سے آگیا؟"

چوہدری حاکم نے وہ تمام سوال مالا سے کیے تھے جو اس وقت منہا سمیت یہاں کھڑے تمام نفوس کے ذہنوں میں گردش کر رہے تھے۔

مالا نے چوہدری حاکم کے غصے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے بہادر کی طرف دیکھا۔

"مہ۔۔۔ مالا بی بی یہ آپ کہہ کیا رہی ہیں میں۔۔۔ میں بھلا کیوں دھکا دوں گار منا بی بی کو اور میں تو حویلی کے اندر"

بہادر نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ مالا نے پھر سے بات کاٹی

"شادی کے دنوں میں تمہیں تھی اجازت تم گھوم رہے تھے آرام سے صحن میں، اس لیے جھوٹ بولنا اب بند کر دو

اور بتاؤ صاف صاف سب کو۔۔۔ تم نے میری آپا کو کیوں دھکا دیا اور اب تم کس کو مارنے والے ہو ہم میں سے،

جلدی بتاؤ نہیں تو تمہارا خون پی جاؤں گی میں" مالا متواتر چیخ چیخ کر سوال کر رہی تھی

چوہدری حاکم نے غصے سے نوازش اور نقیب کی طرف دیکھا۔

"بی بی جی۔۔۔ مجھ غریب پر اتنا بڑا الزام مت لگائیں خدا قسم۔۔۔ میں نے ر منا بی بی کو دھکا نہیں دیا تھا" بہادر

ہاتھ جوڑے کھڑا تھا

منہا نے تھوک نگلا، پورا جسم لرز گیا، بازو پر رونگٹے ننھے ننھے پہاڑ صورت ابھر گئے۔

"تم نے ہی دیا ہے اللہ پاک کی جھوٹی قسم مت کھا ذلیل انسان۔۔۔ میری بہن کو کیوں مارا۔۔۔ ا۔۔۔ ا۔۔۔؟ اور اب

کس کی قبر کھود رہا ہے بتا دے مجھے" مالا چیختی ہوئی نوازش اور نقیب کے ہاتھوں سے اپنے بازو چھڑوا رہی تھی

"بہادر تو جاییاں سے، منیر بہادر کو لے کر جا باہر" چوہدری حاکم نے ہاتھ کھڑا کیے رعب سے حکم صادر کیا۔
 "نہیں۔۔۔۔۔ یہ کہیں نہیں جائے گا۔۔۔۔۔ یہ بھاگ جائے گا۔۔۔۔۔ یہ خواب میں
 بھی بھاگ گیا تھا، ابا اس کو مت جانے دو میں سچ کہہ رہی ہوں" چیخ کر مالا کا گلا بیٹھا ہو الگ رہا تھا۔

مالا ایک دم سے چپ ہوئی، چوہدری حاکم نے لڈن، گامے اور بہادر کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا بہادر پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ان کے ساتھ باہر کو بڑھ گیا، منہانے کا نیتے ہاتھوں سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا

"تو اللہ مجھے نہیں بخش رہا۔۔۔ میری پکڑ شروع ہو چکی ہے، اس نے ڈور کھینچ لی ہے" منہا کو سب سننا بند ہو چکا تھا۔
دماغ میں سائیں۔۔۔ سائیں۔۔۔ جھکڑ چلنے لگے تھے۔ سب سے بے پرواہی برتنی، آہستہ۔۔۔ آہستہ۔۔۔ قدم اٹھاتی، وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔



"ٹک۔۔۔ٹک۔۔۔ٹک۔۔۔" دیوار پر لگی گول گھڑی کی چھوٹی سوئی متواتر آواز پیدا کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ ظالم وقت اس ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ سر کے ہی جا رہا تھا۔

دنیا کا وقت تو کلاک کی سوئی کے ساتھ سرک رہا تھا مگر گلاب دیوی ہسپتال کے اس کمرے کا یہ لمحہ تو جیسے وقت کے گزر جانے کے باوجود زمین کے کھونٹے سے زنجیریں ڈالے ٹھہر گیا تھا۔

کمرے میں جلتی موم بتی کی زرد روشنی میں نہائے خاموش کمرے میں اس وقت فقط گھڑی کی سوئی کی ٹک۔۔۔ ٹک سنائی دے رہی تھی۔

مالا اور تقی کی دھڑکن تو فرہاد کو یوں دروازے پر دیکھ کر تھم گئی تھی۔ اس کا انداز صاف بتا رہا تھا، وہ سب کچھ سن چکا ہے۔

تقی کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے، ذہن نے ایک سو اسی کی رفتار سے چند لمحے قبل کی ساری باتوں کو ذہن میں دہر لیا۔

وہ بہادر کا ذکر کر چکے تھے۔۔۔۔۔ پھر زہر کا ذکر کر چکے تھے۔۔۔۔۔ اور منہا کے خود زہر کھانے کا بھی ذکر کر چکے تھے۔۔۔۔۔

"اف۔ف۔ف۔ف۔۔۔۔۔ خدا یا۔۔۔ اس کا مطلب ہے، فرہاد سب سن چکا ہے" تقی کے سینے میں جیسے سانس کی رکاوٹ جیسا کچھ اٹکنے لگا۔

اس نے تو منہا کا یہ راز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فرہاد سے چھپائے رکھنے کا سوچا تھا، چاہے منہا زندہ رہتی یا نارہتی، ہر صورت وہ اپنی بہن کے اس راز کو خفیہ رکھنا چاہتا تھا اور مالا بھی اس میں اس کا ساتھ دینے کو راضی تھی مگر فرہادیوں سب سن لے گا یہ تو سوچا تک نا تھا۔

تین منٹ اسی حالت میں گزر چکے تھے۔ وہ دونوں یونہی دم سادھے صوفے پر بیٹھے تھے اور فرہاد دروازے کے وسط میں ٹٹکی باندھے کھڑا، ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تینوں نفوس ایسے تھے مانو زندہ لاشیں ہوں۔ مالا نے نگاہیں جھکا لیں تھیں تو تقی نے فرہاد سے نگاہیں چرائی تھیں۔ فرہاد بمشکل قدم اٹھاتا ان تک پہنچا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد کمرے میں گھڑی کی ٹک۔۔۔ ٹک۔۔۔ کے ساتھ فرہاد کی آواز گونجی
 "تم۔۔۔۔۔ تم دونوں۔۔۔۔۔ کیسے جانتے ہو یہ سب۔۔۔؟ تم دونوں کو کیسے پتا چلا کہ منہا نے وہ زہر میرے لیے
 نہیں اپنے لیے لیا تھا" متحیر لہجے میں سوال پوچھا۔

فرہاد کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اب ان دونوں کے سر پر کھڑا سوال کر رہا تھا۔ مالا اور
 تقی کو اس سے اس سوال کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اسی لیے چونک کر، ایک ساتھ بھنویں سکیڑے فرہاد کی طرف
 دیکھا جو خود ان کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"مہ۔۔۔ مطلب۔۔۔ کیا تمہاری بات کا۔۔۔۔۔؟، تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" تقی نے لڑکھاتی زبان میں بمشکل
 حیرت ظاہر کی

فرہاد جو ششدر کھڑا تھا اب پیشانی پر ہاتھ دھر چکا تھا۔ پھر تانہوز تیر میں ڈوبے لہجے چند لمحے پہلے والا سوال دہرایا۔
 "مطلب یہ کہ تم دونوں کیسے جانتے ہو کہ منہا زہر کھا رہی تھی اور۔۔۔ بہادر سے اس کا کوئی تعلق تھا؟" فرہاد نے
 گھٹے اور حیرت زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

مالا اور تقی کے سر پر تو جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ گیا۔ وہ دونوں جواب تک فکر سے گھل رہے تھے کہ فرہاد نے سب
 سن لیا ہے اور اب ناجانے کیسار د عمل ظاہر کرے گا، اس کے منہ سے یہ بات عجیب و رطہ حیرت میں مبتلا کر گئی۔
 "ت۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ کیسے جانتے ہو سب۔۔۔؟" تقی کی آنکھیں پھٹنے کی حد تک کھلی تھیں اور لہجہ انتہائی تشویش ناک
 تھا۔

فرہاد جھنجھلا سا گیا، مالا نا سمجھی اور خوف میں گردن گھما گھما کر کبھی فرہاد کی طرف دیکھ رہی تھی تو کبھی تقی کی طرف۔
 فرہاد نے پیشانی پر بھنویں اکٹھی کی تو انگنت بل پڑے جو اس کے اندر کی کشمکش کے غمازی تھے۔
 "مجھے۔۔۔ تو یہ سب منہا نے خود بتایا تھا" فرہاد کی سرگوشی نما آواز میں بلا کا کرب تھا

کمرے کے اس ملگجے سے اندھیرے میں بھی سامنے صوفے پر بیٹھے نفوس اس کے چہرے پر رقم دکھ اور درد کو صاف دیکھ سکتے تھے

☆☆☆☆☆

فرہاد نے تھکے سے انداز میں حویلی کے گیٹ کو دھکیلا اور اندر داخل ہوا، مغرب کی اذان گاؤں کی بڑی مسجد سے گونج رہی تھی، وہ آج معمول کے وقت سے پہلے حویلی آگیا تھا، دل عجیب سی بے چینی کا شکار تھا، اسی لیے وہ شہر سے جلدی نکل آیا تھا۔

جیسے ہی گیٹ سے فاصلہ طے کرتا صحن میں پہنچا تو حاکم قصر میں معمول سے بھی بڑھ کر خاموشی کو محسوس کرتا ایک لمحے کے لیے صحن کے وسط میں رک گیا۔

چہرے کو موڑے بائیں طرف دیکھا، تندور پر تاری بوا کیلی روٹی لگاتی بے حال ہو رہی تھی۔ ابھی تک دسترخوان بھی نہیں بچھایا گیا تھا۔ فرہاد نے دائیں طرف گردن گھمائی، نیم کے درختوں کی اوٹ سے نظر آتے وضو خانے کی تین نشستوں پر پشت کیے خواتین بیٹھیں وضو کر رہی تھیں۔

نماز کے لیے تو اسے بھی جانا ہے یہی سوچ ذہن میں آتے وہ چہرہ سیدھا کرتا اب تیز تیز اٹاری کے زینے چڑھ رہا تھا۔ پہلے وہ نماز پڑھ کر ہی حویلی آتا تھا لیکن آج جلدی آگیا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا، آہستگی سے پردہ سرکا تا کمرے میں داخل ہوا تو سامنے کے منظر پر ٹھٹھک کر رکنا، سامنے پلنگ پر منہاٹا نکلیں نیچے لٹکائے بیٹھی تھی، پتیل کا بڑا گلاس منہ کو لگا تھا اور اس کے بالکل سامنے اس کے گھٹنے کے پاس پلنگ کی چادر پر اخبار کے انگنت چھوٹے چھوٹے چکور ٹکڑے پڑے تھے۔

فرہاد نا سمجھی میں پیشانی پر بل ڈالے آگے بڑھا، آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے منہا اس کی طرف نہیں دیکھ پائی تھی۔ وہ گلاس منہ کو لگائے کچھ پینے میں مگن تھی۔

"ٹن-ن-ن-ن-ن-ٹن-ٹن-ٹن-ن-ن-ن-ن-۔۔۔۔۔" کی آواز کے ساتھ فرش پر لڑھکتا گلاس اب فرہاد کے قدموں میں کچھ دوری پر پڑا تھا۔

مالا کو سب پتا چل چکا تھا، مطلب اب اتنے سالوں بعد رونا کے قتل سے پردہ اٹھنے والا تھا۔ اس بات کے خوف نے اس کے دماغ کو ایسا جکڑا کہ وہ کچھ دن پہلے خود سے کیے گئے جینے کے وعدے کو فراموش کر گئی۔

"منہا۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ پیا ہے؟۔۔۔ یہ کیا ہے؟" فرہاد کاغذ کے ٹکڑے کو سونگھتے ہوئے حیرت سے اس سے استفسار کر رہا تھا جو ہونق بنی بیٹھی تھی۔

فرہاد نے یاس بیٹھ کر اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا

"منہا۔۔۔ میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔۔۔ کیا ہے یہ۔۔۔؟ کیا پیسا ہے تم نے۔۔۔؟ اور ایسے کیوں بیٹھی ہو اب؟" فرہاد کی آواز اب حد درجہ اونچی تھی۔

پوچھنے کے ساتھ ساتھ وہ منہا کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا اور وہ کسی بے جان پتلی کی مانند ہل رہی تھی۔ اس کی اس ہولناک خاموشی کے باعث فرہاد کے چہرے پر خوف اپنے سایے پھیلانے لگا۔

"کچھ بول کیوں نہیں رہی۔۔۔" وہ چیخ پڑا تھا، ذہن جھنجھلا گیا تھا۔

"منہا۔۔۔ خدا کا واسطہ کچھ تو بولو۔۔۔ کیوں پریشان کر رہی ہو مجھے۔۔۔" فرہاد کے لہجے میں اب کی بار حیرت کے ساتھ ساتھ فکر مندی اور خوف بھی تھی۔

منہا کے لب دھیرے سے کپکپائے اور پھر اس نے جھکی پلکیں اٹھائیں۔۔۔۔۔

سرخ۔۔۔ آنکھیں اتنے سالوں سے اکیلے روتے روتے۔۔۔ سہتے سہتے۔۔۔ تھکی ہوئی تھیں۔۔۔ دل و دماغ سب تھک چکے تھے۔ سامنے بیٹھے اس شخص سے اسے بے پناہ محبت ہو چکی تھی، سچی محبت۔۔۔۔۔ پاک محبت۔۔۔۔۔

تڑپ کر آگے ہوئی اور فرہاد کے سینے سے میں چھپ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی اور پھر وہ اس سے کچھ ناچھپا سکی تھی۔

زندگی کے ان آخری لمحوں میں وہ ٹوٹی، بکھرتی۔۔۔ زخموں سے چور، ہچکیوں میں فرہاد کو سب بتاتی چلی گئی۔۔۔ وہ حیرت اور دکھ سے پھیلی آنکھوں کے ساتھ منہا کو تاک رہا تھا جو ہچکیوں میں بھل بھل روتی اس پر حیرت انگیز حقیقت کا انکشاف کر رہی تھی۔

کبھی اس کی قمیض کے کالر کو تھامت تو کبھی گریبان کو ہاتھ میں لیتی وہ بہادر سے لگائی گئی ضد سے لے کر رونا کودھکا دینے تک لفظ لفظ اسے بتا رہی تھی۔

ایسے بتا رہی تھی جیسے کوئی صدیوں کا ترسان انسان ہو اور اس کو جا کر اب زباں ملی ہو۔ فرہاد دم سادھے اسے سن رہا تھا

بھنویں اپنی جگہ سے اٹھ کر پھیلی ہوئی تھیں آنکھوں کی پتلیوں میں حیرت کا سمندر موجزن تھا۔ وہ حقیقت اتنی ناقابل یقین تھی کہ وہ فقط اس وقت ان کو سن ہی سکتا تھا۔ جسم میں اتنی سکت کہاں تھی کہ منہا کے ان آخری لمحوں میں کئے گئے اعتراف پر اس کو کچھ حوصلہ دیتا۔ وہ بلک رہی تھی۔۔۔

"م۔۔۔ مجھے معاف کر دینا۔۔۔ میں سب کے ساتھ کبھی تمہیں بھی کوئی خوشی کا لمحہ نہیں دے سکی، میں صرف غم دے سکتی ہوں کسی کو خوشی نہیں۔۔۔۔" دلگیر اور آنسوؤں سے روندھا لہجہ تھا۔ وہ اپنی گالوں پر بہتے آنسو تک صاف کرنے کی سکت میں نہیں تھی۔ فرہاد کو سارا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھی یہ لڑکی جسے اس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے دل کے جذبات سونپ دیے تھے۔ آج اس کے دل کا خون کر رہی تھی جس کے لیے اسے کسی خنجر کسی بھالے کی ضرورت نہیں تھی اس کے الفاظ اور ان سے آشکار ہوتی حقیقت ہی بہت تھی۔

"مہ۔۔۔ میں تم سے۔۔۔ مو۔۔۔ محبت کرتی ہوں۔۔۔ فرہاد۔۔۔ بہ۔۔۔ بہت محبت" منہا کی نحیف، کانپتی آواز کانوں میں پڑ رہی تھی۔

وہ سامنے پنکھے کی ہوا سے ہلتے پردے کو دیکھ رہا تھا، دماغ میں جیسے کوئی سوئیاں چھو رہا تھا کوئی۔ "میں۔۔۔ بہت محبت کرتی ہوں تم سے۔۔۔ بہت محبت کرتی تھی ہمارے بچے سے۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دینا۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دینا۔۔۔۔۔" وہ ہچکیوں میں اس سے معافیاں مانگ رہی تھی، اپنی غلطیوں اور گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی۔

وہ سفید پڑتے کھچے پٹھوں والے سخت چہرے کے ساتھ مجسم بنا بیٹھا، ہوش و خرد سے بے بہرہ تھا اور پھر اچانک ہی منہا کی اس کے کالر پر سے ہاتھ کی گرفت ختم ہوئی اور وہ مجسم بنے فرہاد کی باہوں میں جھولتی پلنگ پر ایک طرف گر پڑی۔

وہ سکتے کے عالم سے باہر نکل کر جیسے ہی اس کی طرف متوجہ ہوا تو اسے ہوش میں نادیکھ کر گڑبڑا گیا۔

کانپتے ہاتھوں اور پھٹتے دل کے ساتھ اسے باہوں میں بھر کر باہر کی طرف بھاگا۔

بات ہی ایسی تھی ابھی تک ذہن خود اس کو قبول نہیں کر رہا تھا تو کوئی اور کیا کرتا۔

اس کو یوں کمرے سے باہر آتا دیکھ کر سب گھر والے جو دسترخوان پر بیٹھے تھے، اس کی طرف بھاگے تھے۔ گھر میں اچانک افراتفری جیسا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

وہ اٹاری کے زینے اتر تاجب صحن میں داخل ہوا اسی لمحے سامنے بیرونی گیٹ سے تقی بھی گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ فرہاد نے منہا کو صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹا دیا۔ تقی اب منہا پر جھکا ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆

گلاب دیوی ہسپتال کی عمارت رات کے تین بجے بھی گھپ اندھیرے میں ڈوبی تھی ہسپتال کے اس کمرے میں، جہاں ایک زندگی موت سے لڑنے میں مصروف تھی وہاں گھڑی کی ٹک۔۔۔ ٹک۔۔۔ اور میز پر جلتی موم بتی اب آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی۔

ہلکے گلابی رنگ کی موم بتی کا موم نارنجی رنگ کے بھڑکتے شعلے کے باعث کناروں سے پگھل پگھل کر آنسو کے قطرے کی طرح نیچے رکھی چینی پلیٹ پر گر کر سوکھ رہا تھا۔ دیوار سے لگے صوفے پر مالا اور تقی دم سادھے، بھنویں اوپر اٹھائے، آنکھیں پھیلائے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے چھوٹے سے سٹول پر فرہاد بیٹھا تھا۔

دونوں بازوؤں کی کہنیوں کو گھٹنوں پر دھرے اور ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے کر ٹھوڑی کے نیچے رکھے۔ وہ مدھم سی آواز میں اس دن کا سارا قصہ ان کے گوش گزار کر رہا تھا۔

فرہاد کی بھاری آواز خاموش کمرے میں بھنبھناہٹ کی صورت ایک تسلسل لیے گونج رہی تھی۔ سامنے صوفے پر بیٹھے مالا اور تقی دم سادھے اسے سننے میں محو تھے۔

منہا اتنی تکلیف میں رہی گیارہ برس، ان کو اس بات کی بھنک تک نہیں پڑی، کتنے غافل تھے سب کے سب، اس کی خاموشی کو اس کی عادت سمجھ کر چپ ہو گئے تھے۔ کبھی یہ جاننے کی کھوج کرنے کی کوشش ہی نہیں کی وہ اکیلے کمرے میں گھسی کیا سوچتی رہتی تھی۔ وہ اپنے ہی ضمیر سے جنگ کرتی رہتی تھی اور آج وہ فرہاد کو اپنی ساری تکلیفیں سارے پچھتاوے بتا کر خود زندگی اور موت کی کشمکش میں بیڈ پر پر سکون سے لیٹی تھی۔

جو تکلیفیں اور اذیتیں وہ کوئے میں جانے سے پہلے اس کی رگ و پے میں اتار گئی تھی۔ فرہاد نے یہ چھ دن پل پل اس کی ہر تکلیف کو اپنے اندر اترتا ہوا محسوس کیا تھا

اس نے منہا کو جان بوجھ کر دھکا نہیں دیا تھا، جو بھی تھا مگر اس کے پاس یہ غم بانٹنے کو گیارہ سال تک کوئی نہیں تھا۔ وہ کس کو بتاتی، کس سے پوچھتی، کس سے مشورہ لیتی کہ کیا کرے۔

اس لیے پل پل خود اکیلی اس انجانے میں ہو جانے والے گناہ کی آگ میں جلتی رہی اور رفتہ رفتہ یونہی گھلتے ہوئے۔ اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیل چکی تھی۔

فرہاد ساری پیتا سنا کر خاموش ہوا اور گہری سانس لے کر دونوں ہاتھیلوں کو کھول کر ان میں چہرہ چھپالیا۔ کچھ دیر تین نفوس کی موجودگی کے باوجود کمرے میں ہو کا عالم قائم رہا، پھر تقی کی آواز نے کمرے کی خاموشی کو توڑا تو فرہاد نے بھی جھکا چہرہ اوپر اٹھایا۔

تقی اب خفیف اور نادم لہجے میں بہادر کی بتائی ساری باتیں بتا رہا تھا اور پھر مالا کے خواب، رمنہ کے اشارے

تینوں کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ گیارہ سال پہلے ان کو چھوڑ جانی والی کے غم سے زیادہ اس کے دکھ، درد اور تکلیف سے دل پھٹ رہا تھا جو اس وقت دنیا سے غافل آنکھیں موندے لیٹی تھی۔

سب بتانے کے بعد ایک بار سے پھر چند لمحے خاموشی نے نگل لیے۔

تقی نے آہستگی سے گود میں دھرے اپنے ہاتھ اٹھائے اور فرہاد کے سامنے جوڑ دیے۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لغزش نمایاں تھی جو ہر غیرت مند بھائی کے ہاتھ میں بہن کی غلطی کے باعث ہونی چاہیے۔

"فرہاد میری بہن کو معاف کر دو۔۔۔۔۔" گھٹی سی آواز بمشکل حلق سے برآمد ہوئی

"تقی۔۔۔ بھائی۔۔۔" فرہاد نے آنسوؤں سے تر چہرہ چونک کر اٹھایا

تقی کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا اور سر کو آہستگی سے نفی میں ہلایا، تقی تو اس کی سن ہی نہیں رہا تھا۔ بس بھاری غم سے چور آواز میں بولے ہی جا رہا تھا۔

"فرہاد اس سے جب یہ گناہ سرزد ہوا تھا، وہ نادان تھی۔۔۔ وہ خود کو بہت سزا دے چکی ہے اور۔۔۔۔۔ اب شائد۔۔۔" تقی روندھے لہجے میں بات بھی مکمل نہیں کر پایا۔

مالا لب بھینچے آنسو بھاتی تقی کے حالت دیکھ کر بے حال تھی۔

"تقی بھائی۔۔۔ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، کم از کم آپ دونوں کو میری منہا کے لیے محبت پر شک نہیں کرنا چاہیے" بھیگا سالجہ تکلیف سے چور تھا

فرہاد نے ہاتھ کی پشت سے آنکھ کے نیچے لڑھکتا آنسو بے دردی سے پونچھ دیا اور سامنے بیٹھے مالا اور تقی کو پر عزم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے تھوک نگلا۔

"منہا کو کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ اور ہم چاروں اس بات کو یہیں دفن کر دیں گے، حویلی کے بڑوں کے لیے جیسے گیارہ سال تک ر منا کی موت ایک حادثہ تھی وہ حادثہ ہی رہے گی، بہادر کو اس کی بیوی کے ساتھ یہاں سے بہت دور بھیج دیں گے" پر عزم لہجے میں وہ اپنا فیصلہ سنا کر تقی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تقی نے حیرت سے آنکھیں پھیلانے، اس بڑے دل کے مالک کو دیکھا اور جوش سے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور خود سے بھینچ لیا۔

فرہاد نے تقی کے گلے لگی سوالیہ نگاہوں سے مالا کی طرف دیکھا تو اس نے بھی گالوں پر بہتے آنسو صاف کیے اور اثبات میں سر ہلادیا۔

تینوں کے دل دھڑکنے کے ساتھ ساتھ منہا کی زندگی کے لیے خدا سے دعا گو تھے۔

☆☆☆☆☆

عجیب سا سماں تھا، ناسحر تھی، ناشام اور ناہی رات، ناسورج نکلا تھا اور ناہی چاند، ملگجا سا اندھیرا دور تلک چھایا تھا جو آنکھوں پر بھاری پن پیدا کرے ایسا بھاری پن جس میں آنکھیں پوری کھولنے کی کوشش بھی کرو تو نا کھل سکیں۔ یہ گھنا جنگل تھا جہاں اونچے آسمان سے باتیں کرتے موٹے تنے کے درخت آپس میں سر جڑے کھڑے تھے۔ ان سب کی شاخیں زمین پر پھیل کر ایک دوسری کے اوپر نیچے چڑھی ہوئی تھیں، کچھ زمین میں پیوست تھیں اور کچھ اوپر کو ابھری ہوئی تھیں، حد نگاہ انتہائی کم تھی اور گھٹن زدہ جس ایسا کہ سانس لینے میں انتہائی دشواری تھی۔ منہا ان میں سے ہی ایک گھنے درخت کے نیچے بڑے سے پتھر پر اپنے گھٹنوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ پتھر سیاہ کائی میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ ننگے پاؤں اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ناجانے کتنے گھٹنوں سے اس جنگل میں بھٹک رہی تھی۔ اور اب تھک کر اس اونچے سے پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔

وہ کہاں تھی کچھ سمجھ نہیں تھی، وہ یہاں کیوں اور کب سے تھی کچھ پتا نہیں تھا۔ بس ہر سو ویرانی تھی، سناٹا تھا۔

وہ گھٹنوں میں یونہی چہرہ دیے سسک رہی تھی۔ جب اچانک آنے والی بازگشت سے دہل کر چہرہ اوپر اٹھایا۔

"بچاؤ۔۔۔۔۔بچاؤ۔۔۔۔۔" نسوانی آواز میں چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی، کوئی عورت تھی جو مدد طلب کر رہی تھی۔

ہر طرف جھاڑیاں، پتے، اور ٹہنیاں تھیں۔ جگہ جگہ کیچڑ تھا اور وہ ننگے پاؤں بھاگ رہی تھی۔ وہ درخت، پتوں اور جھاڑیوں سے ٹکراتی پاگلوں کی طرح آواز کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

اچانک اس کی نگاہ چند قدم کی دوری پر موجود ایک تالاب پر پڑی جس کے پانی میں سیاہ کائی تیر رہی تھی اور ڈوبتے وجود کا ہاتھ اوپر کو اٹھا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس تالاب میں ڈوبنے سے بچنے کے لیے اب منہا کو ہاتھ ہلارہی تھی۔ منہا بھاگتی ہوئی آگے بڑھی تالاب میں جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر پڑے تھے اور ڈوبنے والی لڑکی تالاب کے وسط میں ڈوبکیاں لگا رہی تھی۔ منہا پتھروں پر پیر دھرتی اس تک پہنچی اور اس کا اوپر کو مدد کے لیے اٹھا ہاتھ تھام لیا۔

منہا کا ہاتھ تھامنے کی دیر تھی کہ وہ لڑکی خود بخود باہر آنے لگی اس کے سیاہ رنگ کے کپڑے پانی سے نچڑ رہے تھے، بال گیلے تھے اور ان سے چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل کر اب ایک پتھر پر منہا کے بلکل سامنے کھڑی ہو چکی تھی۔ منہا خوف سے لرزتے دل کے ساتھ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاک رہی تھی۔ لڑکی نے آہستگی سے ہاتھ اٹھایا اور اپنے گیلے بالوں کو چہرے پر سے ہٹایا، منہا اس کا چہرہ دیکھ کر کانپ گئی۔۔۔

ر مناسفید لٹھے کی مانند چہرہ لیے کھڑی تھی آنکھوں کے گرد گہرے بھورے حلقے تھے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ ر منا کو یوں خود کے سامنے دیکھ کر ساکن رہ گئی۔۔۔ آنکھیں ششدر تھیں تو سانس لینے میں اور دشواری ہوئی خوف سے زبان تالوے سے جا لگی۔

وہ کانپ اٹھی ہاتھ پاؤں جسم سب لرزنے لگا۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

ڈوبتے سورج کی نارنجی اور زرد ملاپ والی روشنی گلاب دیوی ہسپتال کی وسیع عمارت کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔

یہ بو جھل سی سرمئی جس زدہ شام اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں موجود نفس کے دل پر بھی بھاری بوجھ کا موجب بن رہی تھی۔

ہولناک خاموشی میں ڈوبے اس کمرے کی واحد کھڑکی کے آگے لگا سفید پردہ بھی سورج ڈوبنے کی وجہ سے نارنجی رنگ کا ہو رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی زرد اور سرخ شعاعیں کھڑکی کے پردے سے سرچڑھ کر کمرے میں داخل ہونے کی ناکام کوشش میں تھیں، جس کے باعث کمرے میں اب ملگجی سی روشنی تھی۔

مالا دیوار سے لگے لکڑی کے پلنگ پر سو رہی تھی۔ ساری رات بجلی بند ہونے کی وجہ سے اور ان تینوں کی باتوں کی وجہ سے اس کی نیند نہیں پوری ہوئی تھی۔ اس لیے اپنی ہی سیاہ چادر کو پاؤں سے لے کر سر تک تانے وہ بے خبر سو رہی تھی۔

فرہاد سامنے بیڈ پر نیم مردہ لیٹی منہا کے سر اٹھنے سٹول رکھے بیٹھا تھا۔ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں اور چہرہ دکھ اور اداسی میں ڈوبا تھا۔

دل چاہ رہا تھا اسے جھنجھوڑ کر اٹھادے جو یوں ساتویں دن بھی لاغر اور بے سدھ پڑی اس کے دل کو چھلنی کر رہی تھی۔ آہستگی سے ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے لاغر سے پیلاہٹ زدہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ بے جان محسوس ہو رہا تھا۔ فرہاد کے گہرے سانولے ہاتھوں میں منہا کا ہاتھ اور زردی مائل رگ رہا تھا۔ منہا کے ہاتھ کی نیلی رگیں تک واضح ہو رہی تھیں۔

"منہا۔۔۔۔ مجھے چھوڑ کر مت جانا۔۔۔" دل سے ایک ٹیس کے سنگ صدا اٹھی اور سامنے بند آنکھوں والے چہرے سے ٹکرا کر واپس پلٹ آئی

"میں نے تمہیں بہت دعائیں مانگ کر، اماں اور ابا سے لڑ جھگڑ کر پایا ہے۔ تم یوں مجھے سفر کے آغاز میں ہی چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہو؟۔ ابھی تو تمہیں مجھ سے محبت ہوئی ہے اور ابھی تو مجھے اس محبت کے سایے تلے جینا ہے، تمہیں ابھی نہیں جانا ہے۔۔۔۔ سنا تم نے۔۔۔۔؟؟؟" فرہاد نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگائے خاموش صدا دی۔

"تمہیں نہیں جانا ابھی۔۔۔۔ بس اب اٹھ جاؤ۔۔۔۔ ہمیں بہت سی باتیں کرنی ہیں۔۔۔۔ ہمیں پیار کرنا ہے۔۔۔۔ ہمیں ایک ساتھ جینا ہے" وہ بے آواز آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے گرم آنسو منہا کے ہاتھ بھگور رہے تھے۔۔۔

سورج غروب ہو چکا تھا، کمرے کا اندھیرا اب مزید گہرا ہو گیا تھا۔

وہ یونہی اس کے ہاتھ کو عقیدت اور محبت سے اپنی نم آنکھوں کے پپٹوں سے لگائے بیٹھا تھا جب اچانک اس کے ہاتھ میں ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔

فرہاد نے چونک کر اس کے ہاتھ کو آنکھوں سے الگ کیا، ملگجی روشنی میں وہ پوری آنکھیں کھولے اسے حیرت اور زور سے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

منہا کا ہاتھ ہی نہیں پورا جسم کانپ رہا تھا اور پیشانی پر بھنوں کے پاس شکن ابھر کر معدوم ہو رہے تھے۔
"منہا۔۔۔۔۔" فرہاد کی سرگوشی نما آواز ابھری تھی۔

وہ تقریباً بھاگتا ہوا کمرے کے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا اور تیزی سے کمرے میں لگے بلب کے بٹن کو نیچے گرا دیا۔
ٹک۔۔۔۔۔ کی آواز سے کمرہ زرد روشنی میں نہا گیا ہر چیز واضح نظر آنے لگی، منہا کا پورا جسم لغزش میں تھا۔
"مالا۔۔۔۔۔ مالا۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔ دیکھو لگتا ہے منہا کو ہوش آرہا ہے" فرہاد نے گردن موڑ کر چیختے ہوئے مالا کو پکارا۔ خود تیزی سے بوکھلاہٹ میں بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔

مالا اس کے یوں چیخ کر پکارنے پر ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور پھر جیسے ہی ایک سکینڈ کے ہزارویں حصے میں حواس بحال ہوئے، جھٹکا کھا کر پلنگ پر سے اٹھی۔

وہ ننگے پاؤں منہا کے بیڈ کی طرف بھاگی جہاں فرہاد پہلے ہی خوشی اور حیرت کے ملے جلے اثرات لیے کھڑا تھا۔
منہا کا کانپنا اب اور تیزی اختیار کر تا جا رہا تھا۔ اس کا جسم اب ہلکے سے جھٹکے کھانے لگا تھا۔ فرہاد گھبرا کر اس پر جھکا۔ وہ بے سدھ آنکھیں موندے ہوئے تھی مگر جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔

"مہ۔۔۔۔۔ مہ۔۔۔۔۔ مالا میں۔۔۔۔۔" تقی کو بلا کر لاتا ہوں تم خیال رکھو اس کا "فرہاد نے گھبرائی سی آواز میں پاس ششدر کھڑی مالا سے کہا

ر مناب اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے تالاب میں موجود پتھروں پر یاوں رکھتی تالاب سے باہر جارہی تھی

"ر منا۔۔ کہ۔۔ کہاں۔۔۔ جارہی ہو؟ مجھے اکیلے مت چھوڑو۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے یہاں۔۔۔" منہا نے گھبرائی کاپتی سی آواز میں اسے عقب سے پکارا

وہ چپ چاپ تالاب سے باہر نکل رہی تھی۔ منہا نے بھی تیزی سے قدم اس کے پیچھے بڑھا دیے۔ ر مناب تالاب سے باہر نکل کر ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو چکی تھی۔

منہا تیز تیز قدم اٹھاتی ہانپتی ہوئی اس تک پہنچی۔ خوف سے ارد گرد دیکھا

"رم۔۔۔ ر منا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کون سی جگہ ہے۔۔۔ میں کیا مر گئی ہوں۔۔۔" منہا کا سانس پھول رہا تھا۔

خوف سے آواز اور جسم دونوں کانپ رہے تھے، ر منا نے گہری سانس لی اور چہرے کا رخ اس کی طرف موڑا

"یہ تمہارا دماغ ہے منہا۔۔۔ اور۔۔۔ میں گیارہ سالوں سے اس میں قید ہوں۔۔۔ تمہاری منتظر تھی۔۔۔ کہ تم کس دن آؤ گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کے بنائے گئے تالاب سے باہر نکالو گی" ر منا ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

منہا حیرت زدہ کھڑی اس کی عجیب سی باتیں سن رہی تھی۔۔۔ اچانک ذہن میں گیارہ سالوں کے دکھ تکلیف تمام مناظر پردوں سے ٹکرانے لگے۔

"رم۔۔۔ ر منا۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔ مجھے معاف کر دو میں پچھلے گیارہ سالوں سے تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی

۔ اللہ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔" منہا ٹرپ کر اس کے قریب ہوئی کچھ دیر پہلے والا خوف ایک دم سے زائل ہو گیا تھا۔

"کس۔۔۔ بات کی معافی منہا؟" ر منا نے میٹھے سے حیرت زدہ لہجے میں بھنویں سکڑے پوچھا۔

"ت۔۔۔ تمہیں جو دھکا دیا تھا چھت سے۔۔۔ اور وہ تمہاری بات نہیں مانی تھی۔۔۔ مجھے معاف کر دو ر منا۔۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتی تھی۔۔۔ مجھے معاف کر دو" منہا بلکنے لگی تھی۔۔۔۔۔

آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔

"تم نے مجھے دھکا دیا تھا۔۔۔ لیکن میری موت اللہ کی رضا سے آئی تھی اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ تم نے مجھے مارنے کی غرض سے دھکا نہیں دیا تھا۔۔۔" ر منا متوازن اور پرسکون لہجے میں بول رہی تھی۔

منہا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کے کپڑے اب سیاہ سے سفید ہو چکے تھے، سر پر دوپٹہ تھا اور ناک کے پاس اب خون کی لکیر بھی موجود نہیں تھی۔

"موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس نے ہر وقت مقرر کر رکھا ہے، اس دنیا میں آنے کا بھی، جانے کا بھی، جو ہونا ہے۔۔۔۔ وہ ہونا ہے پر جب کوئی اس کے ہونے میں اپنی مرضی شامل کرے یہ گناہ ہے۔۔۔ حرام ہے، میں اپنے مقرر وقت پر اس دنیا سے گئی میری عمر اللہ پاک نے اتنی ہی لکھ رکھی تھی۔ مجھے اتنا ہی جینا تھا" ر منا آہستہ آہستہ متوازن لہجے میں بولتی اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

منہا حیرت سے اسے سن اور دیکھ رہی تھی۔ ر منا کے ہاتھوں پر اب سفید رنگ کے جالی کے دستانے آچکے تھے۔ وہ روشن ہو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ گھنے جنگل میں بھی روشنی پھیلنے لگی تھی۔

"تم اپنی زندگی جان بوجھ کر ختم کر رہی ہو، اللہ کے مقرر وقت سے بغاوت کرنے جا رہی ہو، زندگی اس کی دی ہوئی نعمت ہے اور اس نعمت سے محروم کرنے کا اختیار صرف اس کے پاس ہے تم یہ اختیار اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی ناراضگی کی مر تکب ہو رہی ہو" ر منا کی آواز اس کی باتیں اس کے تڑپتے دل کو سکون بخش رہی تھیں۔

"تم اتنے سالوں سے جو میرے لیے اتنا روتی رہی ہو، مجھے یاد کر کے خود کو اذیت دیتی رہی ہو اس سے مجھے تکلیف ہوتی رہی ہے۔ اسی وجہ سے میں برسوں سے یہاں قید ہوں" اب کی بار ر منا کے لہجے میں درد تھا۔

روشنی مزید پھیل گئی تھی۔ آسمان نظر آنے لگا تھا۔ آسمان سے اب سفید رنگ کی بگھی نیچے اتر رہی تھی۔

منہا حیرت سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بگھی اب زمین پر کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ سفید رنگ کا گھوڑا

آہستہ آہستہ اپنی گردن ہلا رہا تھا، جس کے باعث اس کی گردن پر ملائم بال ہل رہے تھے

رمنانے قدم بگھی کی طرف بڑھا دیے، منہا چونک کر اس کے پیچھے لپکی۔۔

"کہ۔۔۔ کہاں جا رہی۔۔ ہو ر منا؟" خوف سے لرزتی آواز میں سوال کیا وہ اس کو یوں چھوڑ کر کہاں جا رہی تھی۔
ر منا ایک دم سے رکی اور پلٹی

"اوپر۔۔۔ اوپر جا رہی ہوں، آسمان کے پار۔۔۔" مسکرا کر جواب دیا

قدم پھر سے آگے بڑھا دیے

"مجھے ساتھ لے کر جاؤ۔۔۔ تم مجھے لینے آئی ہونا۔۔۔؟" منہانے اس کے ہمقدم ہو کر پھولی سانسوں میں سوال کیا
وہ پھر سے رکی۔۔۔ منہا اب بالکل اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"نہیں۔۔۔ تمہیں نہیں جانا میرے ساتھ۔۔۔ تمہیں وہاں جانا ہے" رمنانے اس کا کندھا پکڑا اور رخ موڑ دیا۔
سامنے سورج پوری تمازت سے چمک رہا تھا، سارے درخت غائب ہو گئے تھے۔۔ زمین ایک چٹیل شفاف میدان بن گئی تھی۔ جس اور گھٹن ختم ہو چکی تھی۔ اسے سانس لینے میں اب دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

سامنے کا منظر اس قدر حسین تھا کہ وہ ٹپکی باندھے اسے دیکھے گئی۔۔۔ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور وسط میں چمکتا
سورج پیلی، نارنجی روشنی بکھیر رہا تھا۔ لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔۔۔
منہانے ایک دم سے پلٹ کر پیچھے دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے رمناکھڑی تھی اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ منہانے حیرت
سے ارد گرد دیکھا۔

"رمنانے۔۔۔ رمنانے۔۔۔ کہاں گئی تم۔۔۔" وہ اونچی آواز میں پکار رہی تھی۔

"منہا۔۔۔ منہا۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔"

"منہا۔۔۔ منہا۔۔۔ سن رہی ہو، آنکھیں کھولو۔۔۔" ارد گرد سے مدھم۔۔۔ مدھم مختلف آوازوں کی بازگشت
گو نجنے لگی تھیں۔

بہت سی آوازیں اس کا نام پکار رہی تھیں اور آنکھیں کھولنے کا کہہ رہی تھیں۔ منہا نے ارد گرد گھوم کر دیکھا سارا منظر بدل چکا تھا، ناواہاں کیچڑ تھا، ناخوناک موٹے تنوں اور بھیانک جڑوں والے درخت اور ناہی وہ گندہ بد بودار تالاب تھا۔

وہ ایک ساحل سمندر تھا اور ارد گرد ناریل کے درخت تھے۔ اس کے کپڑے چتھڑوں سے تبدیل ہو کر گہرے نیلے رنگ کی لمبی پاؤں تک آتی پوشاک میں تبدیل ہو چکے تھے۔ رمناب وہاں موجود نہیں تھی۔ مسحور کن ہوا چلنے لگی تھی۔ ہلکے نیلے پانی والے سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہریں ساحل سے ٹکرا کر ہلکے سلیٹی رنگ کی ریت کو گیلّا کرتے ہوئے پیچھے جارہی تھیں۔ سورج پوری آب و تاب سے چمکنے کے باوجود ٹھنڈا تھا۔ منہا نے گہری سانس اند کو انڈیلی اور اپنے دونوں بازو پورے لمبائی کے رخ خلا میں کھول دیے، دل پر سکون تھا ایسے جیسے کسی نے گیارہ سالوں سے ناسور بنے زخموں پر مر حم رکھ دیا ہو۔

اس نے رمناب کو آنسوؤں کے تالاب میں ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔ وہ اس سے ناراض نہیں تھی اور اسے سمجھا گئی تھی کہ وہ خود پر ظلم کر رہی ہے اور اللہ کی ناراضگی کا سبب بن رہی ہے۔

اس نے کیسے صرف ایک غلطی اور ایک انسان کے لیے اور ایک گناہ کے بعد ہی خود کو اتنا غیر اہم سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کو ختم کر رہی تھی۔ وہ زندگی جو ایک نعمت تھی جو اسے اللہ نے عطا کی تھی۔ وہ اللہ جس نے ہمیں پیدا کیا، ہم اہم تھے تو ہی ہزاروں نطفوں کی دوڑ میں اس نے ہمیں فتح یاب کیا، ایک گوشت کے لو تھڑے سے ایک جسم، ایک وجود بنا دیا اور پھر اس جسم میں روح پھونک کر اس دنیا میں بھیج دیا۔

وہی ہے ہماری ہر سانس پر اختیار رکھنے والا اور ہر سانس کا مالک ہے، ہم صرف سوچ سکتے ہیں، کچھ بھی چاہ سکتے ہیں، لیکن ہونا کیا ہے یہ اختیار اس مالک کے ہاتھ میں ہے جو اس کل کائنات کا مالک ہے۔

جو ہونا ہے اس کی مرضی سے ہونا ہے اچھا یا برا، ہم ناتو ہونے سے پہلے جان سکتے ہیں کہ کیا ہونے والا ہے، ناکچھ بھی ہونے سے بدل سکتے ہیں اور نا ہونے کے بعد وقت کو واپس لاسکتے ہیں۔۔۔۔۔

ہاں پر جو ہو گیا اس پر راضی ہو کر اسے قبول کرنا اور اس ذات سے اپنی خطاؤں کی توبہ کرنا یہ ہمارے اختیار میں ہے، ناکہ خود کے ہی خدا بن کر، خود کو ہی سزا سنا کر، خود کو ہی سزا دیتے پھیریں۔ اس جان پر ظلم کریں جو ہماری ہے ہی نہیں اس کی دی ہوئی نعمت ہے۔

"میں کیا سوچ کر خود کی سزا تجویز کر رہی تھی، کیا میں اپنے جسم اپنے جود کی مالک تھی نہیں یہ وجود ہر سانس سب پر اس ایک اللہ کا اختیار ہے۔ وہ مہربان ہے میں نے کیسے سوچ لیا تھا کہ قتل خطا وہ معاف نہیں کرے گا۔ میں ایک گناہ کی اذیت اور ندامت سے بچنے کی خاطر دوسرا کبیرہ گناہ سرزد کرنے جا رہی تھی۔" ذہن مثبت سوچوں سے بھرنے لگا تھا۔

سامنے کا منظر غائب ہو گیا تھا، اچانک احساس ہوا، وہ کسی بستر پر لیٹی ہے۔ آہستگی سے آنکھیں کھولیں، دھندلہ منظر آہستہ آہستہ واضح ہونے لگا۔

"منہا۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔" یہ محبت بھری آواز فرہاد کی تھی۔

اس نے دھیرے سے بھاری ہوتے پوٹے اٹھا دیے تھے۔ آنکھوں میں ہلکی سی چیچپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ جس کے باعث آنکھیں بمشکل کھل رہی تھیں۔

"منہا۔۔۔ ا۔۔۔ ا۔۔۔ ا۔۔۔ اللہ۔۔۔۔۔ تیرا شکر ہے۔۔۔۔۔"

اس کے آنکھیں کھولتے ہی، کتنی ساری پر جوش آوازیں ایک ساتھ اس کے آس پاس سے ابھری تھیں۔ وہ آدھی آنکھیں کھول چکی تھی اور سامنے دیکھ رہی تھی۔

تقی، فرہاد، مالا، نقیب حاکم سب اس کے بیڈ کے ارد گرد غم آنکھیں اور لبوں پر جاندار مسکراہٹ سجائے کھڑے تھے۔ سب کے چہروں پر اس کے لیے بے پناہ محبت تھی، وہی محبت جو کچھ دیر پہلے رمنا کے چہرے سے جھلک رہی تھی جب وہ اسے سب سمجھا رہی تھی۔ ان سب کے پیچھے کچھ انجان چہرے بھی تھے سفید کوٹ میں ملبوس ڈاکٹرز تھے کافی سارے۔

وہ خوفناک جنگل، وہ گھٹن جس میں وہ کچھ دیر پہلے اکیلی بھٹک رہی تھی۔۔۔ سب زندگی کی اور اپنوں کی اہمیت باخوبی سمجھا گیا تھا۔

[illegible]

"اللہ تیرا شکر ہے۔۔۔ تو نے مجھے توبہ کی مہلت دی، بے شک تو ہر خطا کے بعد مہلت دیتا ہے، اور مجھے یقین ہے میری توبہ قبول ہوگی۔۔۔" دل نے پر سکون ہو کر اسے پکارا جو شہہ رگ سے بھی قریب ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گلاب دیوی ہسپتال کی عمارت چمکتے سورج کے نیچے پوری شان سے کھڑی تھی، جس حد سے زیادہ تھا کہ اس بھری دوپہر میں سڑک پر اکا دو کا ذی روح دکھائی دے رہے تھے۔

ہسپتال کی لمبی راہداری میں دائیں بائیں بنے کمروں میں سے اس کمرے کا ماحول آج پچھلے آٹھ دنوں کی نسبت یکسر مختلف تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

منہابیڈ کے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اور ایک طرف فرہاد کرسی پر براجمان ہاتھ میں باؤل تھا مے بیٹھا تھا جس میں گرم سوپ ہلکی سی بھاپ اڑا رہا تھا۔ مالا ایک طرف بیٹھی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی محبت سے فرہاد نے اسے سہارا دے کر بیٹھایا تھا۔

منہا کو ہوش میں آئے آج دوسرا دن تھا، اس کا جسم ابھی نقاہت کا شکار تھا جس کے باعث سہارے کے بنا بیٹھنا اور ٹھوس غذا ابھی نہیں کھا سکتی تھی۔

وہ فرہاد سے نگاہیں نہیں ملارہی تھی۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے ہسپتال کا ہی ہلکے نیلے رنگ کا گاؤن زیب تن کیے وہ زردہ چہرے کے ساتھ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔

فرہاد نے سوپ کا بھرا چمچ اس کی طرف بڑھایا، منہا نے دھیرے سے جھکی نگاہوں سمیت منہ کھولا، چاندی رنگ چمچ جو سوپ سے بھرا تھا اس کے منہ کے اندر گیا۔

مالا نے دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ دو دن کے بعد اب جا کر ان دونوں کو اکیلے موقع ملا تھا، اسی سوچ کے باعث وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

خوشخبری

اگر آپ لکھ سکتے ہیں اور اپنے اندر کے لکھاری کو باہر لانا چاہتے ہیں تو لکھاری آن لائن میگزین آپ کو اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے بہت اچھا پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔ لکھاری آن لائن میگزین کا حصہ بنئے اور آج ہی اپنی تحریر (افسانہ، ناول، ناولٹ، کالم، مضامین، شاعری) اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ آپ کی کوئی بھی تحریر ضائع نہیں کی جائے گی اور ایک ہفتے کے اندر ہمارے سب ویب بلاگز (ویب سائٹس) اور سوشل میڈیا گروپس اور پیجز پر پبلش کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے ابھی رابطہ کریں۔

Wats app No :- 03335586927

Email address :- aatish2kx@gmail.com

Facebook ID :- www.facebook.com/aatish2k11

Facebook Group :- FAMOUS URDU NOVELS AND DIGEST

SEARCH AND REQUEST FOR NOVELS, NOVELS DISCUSSION

دروازہ بند ہونے کے آواز پر فرہاد نے دھیرے سے گردن کو خم دے کر پیچھے دیکھا اور پھر منہا کی طرف متوجہ ہوا جو ہنوز نگاہیں جھکائے ہوئے تھی۔

"ادھر میری طرف دیکھو۔۔۔" فرہاد نے ملائم سے لہجے میں پکارا۔

خاموش کمرے میں اس کی آواز کانوں سی سیدھی دل میں اتری، منہانے نگاہیں تب بھی نہیں اٹھائیں وہ کیسے نگاہیں اٹھا دیتی۔ ہمت ہی نہیں تھی۔ سامنے بیٹھے اس شخص سے کیسے نگاہیں ملاتی۔ فرہاد نے ہاتھ میں پکڑا باول ایک طرف رکھا۔

وہ گہری سانس باہر انڈیلتا کر سی بیڈ کے مزید قریب کرنے کے بعد اس کے اور اپنے بیچ کا فاصلہ کم کر چکا تھا، لبوں کو ایک دوسرے میں سختی سے پیوست کیے وہ اب شائد رو دینے کو تھی۔

فرہاد نے اس کا لاغر سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ انتہائی نرم اور اپنائیت بھرا لمس تھا جس میں گزرے دنوں کا کوئی شکوہ گلا شامل نہیں تھا۔

لمس کی حدت نے ابھی سکون دیا ہی تھا کہ فرہاد کی آواز نے گونج کر خاموشی کو ختم کیا۔

"جو خطا تم سے ہوئی جوانی میں اگر مجھ سے ہوئی ہوتی تو۔۔۔۔۔" گھمبیر لہجہ مگر آواز حد درجہ آہستہ اور شائستہ تھی۔

منہانے پٹ سے پلکیں اوپر اٹھائیں اور اس کی طرف دیکھا جو چہرے پر بھی ملائمت سجائے بیٹھا اس کے جواب کا منتظر تھا۔

"بولونا۔۔۔ اگر۔۔۔ مجھے ایسے کسی کے لیے کچھ محسوسات آتیں اور میں کچھ عرصہ اس لڑکی کے چکر میں رہتا مگر

تم سے شادی ہو جاتی، پھر ایک دن تم پر یہ حقیقت کھلتی تو تم کیا کرتی۔۔۔؟" وہ سوال کو تفصیل سے دہرا گیا تھا۔

منہانے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھنویں اٹھائے، اسے جواب دینے کا اشارہ کر رہا تھا۔

[illegible]

"کچھ بھی نہیں کرتی۔۔۔۔۔ تھوڑا۔۔۔۔۔ سنا ناراض ہوتی شائد۔۔۔۔۔ لڑتی۔۔۔۔۔ جھگڑتی۔۔۔۔۔" منہا

"اور تمہیں پتا ہے میں یہ سب بھی نہیں کروں گا۔۔۔" فرہاد نے اچک کر اس کی بات کاٹ دی

"ہاں۔۔۔ میں اتنا بھی نہیں کروں گا، تا تو تم سے ناراض ہوں گا۔۔۔" ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کی

سوال کیا۔

تھی وہ کہ سب کچھ جان لینے کے باوجود سامنے بیٹھے شخص کی محبت میں رتی بھر بھی کمی نہیں آئی تھی۔

"کیونکہ میں تم سے زیادہ محبت کرتا ہوں، تم مجھ سے اتنی محبت کر ہی نہیں سکتی تھی" خفیف لہجہ تھا

وہ پورے وثوق سے اپنی بات اپنی محبت اسے باور کر گیا تھا۔

"تم نے جو کچھ کیا جذبات کی پہلی سیڑھی پر کیا، تب ہم سب ہی نادان ہوتے ہیں اور اکثر اوقات اچھے برے کی اتنی پرکھ نہیں کر سکتے، تب لگتا ہے سب کچھ بس یہ ہے "فرہاد نے گہری سانس لی۔

وہ سانس روکے سن رہی تھی۔ اس کی آواز کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر اعصابوں کو تسکین بخش رہی تھی۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا تھا۔۔۔۔۔، کرتا ہوں۔۔۔۔۔ اور کرتا رہوں گا" گھمبیر محبت میں ڈوبا لہجہ تھا۔

ہاتھوں کی گرفت بھی منہا کے ہاتھوں پر منہ سے نکلے لفظوں کے ساتھ مزید مضبوط ہو رہی تھی اور وہ تو اب نم آنکھوں سے سامنے بیٹھے اس مہربان کو دیکھ رہی تھی جو اس وقت اسے پوری دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تر تھا۔

"اور قسمت دیکھو کیسی میری کہ جس دن میری محبت نے مجھ سے محبت کا اظہار کیا، ساتھ ہی کو ما میں چلی گئی "فرہاد نے لہجہ ایک دم سے خوشگوار کیا

وہ تاہنوز اسی طرح بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی جبکہ وہ اب مسکرا رہا تھا۔

"بتاؤ ایسے اظہار کرتے ہیں کیا۔۔۔۔؟، مجھے دنیا کی سب سے بڑی خوشی دیتے ساتھ ہی سب سے بڑا دکھ دینے جا رہی تھی "فرہاد نے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

بھنویں اکٹھی تھیں اور آنکھیں چمک رہی تھیں، منہا اسی طرح مجسم بیٹھی تھی۔

"اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پھر سے اظہار کرنا ہے تمہیں "شرارتی لہجے میں کہتے ہوئے بھنویں اچکائیں

منہا ایک دم سے شرما کر سر جھکا گئی، لب مسکرا دیے، فرہاد کا انداز ہی ایسا تھا منہا مسکرائے بنا نہیں رہ سکی۔ اس کو مسکراتا دیکھ کر فرہاد کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

"سوپ پلا دیں اب ٹھنڈا کر دیا ہے "منہا نے نم آنکھوں کو پٹپٹاتے ہوئے مسکرا کر رعب سے کہا۔

"آہاں۔۔۔ اتنا رعب۔۔۔۔۔ "فرہاد اس کے اس محبت بھرے انداز پر سرشار ہوا۔

وہ منہ پر ہاتھ رکھے لجاے انداز میں ہنسی تو وہ اس کا ساتھ دیے بنا نہیں رہ سکا۔



گہرے بھورے رنگ کا دروازہ ہلکا سا کھلا تھا اور کمرے میں کھڑے تینوں نفوس کے درمیان ابھی ابھی گہری خاموشی چھائی تھی۔

یہ گلاب دیوی ہسپتال میں بلال کا کمرہ تھا جہاں اس وقت تقی سفید قمیض شلوار میں ملبوس، سلیقے سے ایک طرف مانگ بنائے، نکھر اس، حیرت اور خوشی کے ملے جلے اثرات چہرے پر سجائے کھڑا تھا۔ وہ یونہی حیرت زدہ کبھی اپنے بالکل سامنے کھڑے بلال اور کبھی شیریں کو دیکھ رہا تھا۔

شیریں مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں تھامے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ سجائے کھڑی تھی اور ایسا ہی کچھ حال اس کے برابر میں کھڑے بلال کا تھا، فرق صرف اتنا تھا وہ شیریں کی طرح شائستگی سے نہیں مسکرا رہا تھا بلکہ اس کی بتیسی باہر تھی۔

بات ہی ایسی تھی جس میں تقی کا یوں حیران ہونا بنتا تھا۔ ان دونوں کی نسبت طے ہو چکی تھی اور کچھ ماہ بعد ہی شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی تھی۔

تقی مسکراتے ہوئے حیرت سے باہر آیا اور پاس کھڑے بلال کو پر جوش انداز میں گلے لگایا۔ فرط محبت سے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر الگ ہوا اور خوشی سے دونوں کی طرف دیکھا۔

"مبارک ہو دونوں کو بڑی خوشی کی خبر ہے یہ تو۔۔۔۔۔ میں بہت خوش ہوں تم دونوں کے لیے" تقی نے ہنوز گہری مسکراہٹ سجائے خوش کن لہجے میں اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

مٹھائی کے ڈبے میں ہاتھ ڈالا اور گلاب جامن اٹھا کر منہ میں رکھی۔ شیریں کا یہ قدم اس کے اندر سر اٹھاتی ہلکی پھلکی خلش ختم کر گیا تھا جو کبھی شریں کے لیے دل میں آتی تھی، جب بلال اکثر اسے بتاتا تھا کہ وہ شادی نہیں کر رہی ہے۔

"صرف خوش ہی نہیں ہونا ہے جناب، آپ کو شادی پر بھی آنا ہے۔۔" بلال نے مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے فوراً ٹوکا

شیریں نے بھی اس کی بات کی تائید کے طور پر مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور پر جوش انداز میں انگلی ہوا میں اٹھائی

"اور ہاں۔۔۔ اکیلے نہیں مالا کو ساتھ لانا ہے۔۔۔" شیریں نے محبت سے تنبیہ کیا۔

جب سے دل سے تقی کے لیے محبت کی جگہ پوری طرح بلال نے لی تھی، اسے مالا کے ساتھ اپنائیت محسوس ہونے لگی تھی۔ جب وہ منہا کے معانے کے لیے کمرے میں جاتی تھی وہاں مالا سے ٹکراؤ ضرور ہوتا تھا۔

"ان شاء اللہ ضرور ضرور۔۔۔" تقی نے سر ہلاتے ہوئے خوشی سے حامی بھری۔

شیریں نے مٹھائی کا ڈبہ میز پر رکھا تو اچانک تقی کو مٹھائی کا پورا ڈبہ دیکھ کر مالا یاد آگئی۔ کتنے دن سے وہ منہا اور اس کی پریشانی میں گھلتی اپنے شوق کو بھولے ہوئے تھے۔

حویلی میں تو وہ گاہے بگاہے اس کے لیے شہر سے مٹھائی لاتا رہتا تھا پر یہاں تو دس دن ہو گئے تھے نا اس نے مٹھائی کی فرمائش کی تھی اور نا تقی کو ہی اس پریشانی میں خیال رہا۔

"اچھا۔۔۔ سنو یہ مٹھائی کا ڈبہ دو گی مجھے" تقی نے نجل سے لہجے میں انوکھی فرمائش کر ڈالی

شیریں اور بلال نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا، بات ہی عجیب تھی پر وہ دل کے ہاتھوں مجبور مسکراہٹ دبائے آنکھوں میں چمک لیے کھڑا تھا۔

منہا کی پریشانی کے بادل جب سے چھٹے تھے اور اس کو فرہاد کے ساتھ خوش دیکھ کر وہ پر سکون ہو گیا تھا۔ تب سے ہی مالا کے اندر موجود گم صم سی تبدیلی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہتی تھی جیسے کوئی بات ہو جو اس سے چھپا رہی ہو۔

تقی کے یوں مٹھائی مانگنے اور شرمانے پر شیریں اور بلال الجھن کا شکار تھے۔ تقی نے ان کے یوں دیکھنے پر خفیف سا قہقہہ لگا کر کندھے اچکائے

"یار۔۔ کیا کروں سمجھا کر ونا، وہ تم لوگوں کی بھابھی کو بہت پسند ہے" لجاجت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اپنی اس فرمائش کا جواز بتایا۔

اس کا بتانے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ شیریں اور بلال ایک ساتھ قہقہہ لگائے۔ شیریں نے مسکراتے ہوئے مٹھائی کا ڈبہ اٹھا کر تقی کی طرف بڑھا دیا۔

☆☆☆☆☆☆

مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں تھامے وہ جیسے ہی۔ کمرے میں داخل ہوا سب سے پہلی نگاہ سامنے منہا کے بیڈ کی طرف اٹھی، وہ پر سکون سو رہی تھی۔

ان تین دنوں میں وہ بہت زیادہ بہتری کی طرف آچکی تھی۔ اس کی اتنی جلدی بہتری کی طرف لوٹنے میں اس کی اپنی چاہت تھی وہ بہت خوش تھی۔

ان تینوں نے مل کر اس سے بات کر لی تھی کہ وہ چاروں اس راز کو یہیں دفن کر کے جائیں گے اور کبھی اپنے بڑوں کو ان سب باتوں کی بھنک نہیں پڑنے دیں گے۔

تقی نے آہستگی سے بے آواز دروازے کے کواڑ بند کیے جن کی آواز فرہاد ہی سن پایا، وہ سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے اخبار پڑھ رہا تھا اور مالا پلنگ پر کھوئی کھوئی لیٹی تھی وہ خیالوں میں اتنی مگن تھی کہ دروازے کی آواز پر بھی باہر نہ آئی۔

تقی کے کمرے میں داخل ہونے کی دیر تھی کہ فرہاد تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ کافی دیر سے اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

تقی مٹھائی کا ڈبہ تھامے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا پلنگ کے پاس آیا جہاں مالا لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ سیاہ رنگ کے جوڑے میں منہ پھلائے تیوری چڑھائے پتا نہیں وہ دماغ میں کیا جنگ لڑ رہی تھی۔ تقی کو یوں سامنے دیکھ کر آہستگی سے اٹھ بیٹھی۔ لیٹنے کی وجہ سے چوٹی کے ارد گرد سے اور درمیان میں نکالی مانگ سے بالوں کی لٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ گلابی گال خفگی سے پہلے ہی سرخ تھے اب اس کو دیکھ کر مزید پھول گئے تھے۔

"یہ لو مٹھائی کھاؤ" تقی نے چمکتے ہوئے کہا اور ڈبہ کھول کر اس کے سامنے کیا۔

وہ جو بے دل سی بیٹھی تھی، مٹھائی کو دیکھ کر آنکھیں چمک گئیں، کچھ دیر پہلے چہرے پر چھائی اداسی فوراً ہوا ہوئی، جوش سے مٹھائی کے ڈبے کے طرف ہاتھ بڑھایا، جیسے ہی گلاب جامن اٹھانے لگی تقی نے ڈبہ بند کر کے پیچھے کر لیا۔ مالانے چونک کر چند ہی آنکھوں سے تقی کی طرف دیکھا۔

"پہلے جو پوچھوں گا اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو پھر ملے گی مٹھائی" تقی نے رعب سے دو ٹوک لہجے میں شرط رکھی۔

مالا کا کھلا منہ ایک دم سے بند ہوا اور مٹھائی اٹھانے کے لیے تانی ہوئی بازو اکٹھی کی اور خفگی سے گود میں دھری، تقی گہری کھوجتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اس چھوٹے سے دماغ میں جو کچھڑی پک رہی ہے، صاف صاف بتاؤ مجھے کیونکہ اب تو منہا کی بھی کوئی پریشانی نہیں ہے پھر تم کیوں ایسے چپ چپ ہو" تقی اب سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

مالانے گڑبڑا کر نفی میں بلا جواز ہی سر ہلادیا، تقی نے آنکھوں کو مزید سکڑ کر بھنویں اکٹھی کیں آنکھوں میں اس کے لیے بے پناہ فکر تھی۔

"ریاضی کے کلیے نہیں پوچھ لیے جو یوں سر ہلا رہی ہو، کہانا صاف صاف۔۔۔۔۔" اب کی بار لہجہ اور سخت تھا۔

مالا کو ریاضی کے کلیے والی بات نے ایسا تپایا کہ دانت پیس کر سر اٹھایا

"آپ۔۔۔ مجھ سے پیار نہیں کرتے ہیں" روہان سے لہجے میں شکوہ بمشکل حلق سے برآمد ہوا۔

شکوہ کرتے ہی سر پھر جھکا لیا، چہرہ اتر اتر ہوا تھا جبکہ سامنے بیٹھے تقی کا منہ حیرت سے وا ہوا۔۔۔ اور پھر اس کی بات سمجھ آتے ہی پوری بتیس دانت دکھنے والی ہنسی آئی۔

"اچھا۔۔۔ تو تمہیں۔۔۔ یہ بات آج شادی کے چار ماہ بعد مجھے باپ بنانے کے بعد پتا چلی" تقی نے اس کی بیوقوفی پر بمشکل ہنسی چھپاتے ہوئے کہا۔

"نہیں شیریں کو دیکھ کر پتا چلی" وہ ترکی بات کی جواب دے بیٹھی تھی

ایک لمحے کے لیے تقی کی ہنسی کو بریک لگی اب مالا بات کر کے گود میں دھرے ہاتھ مڑوڑ رہی تھی۔

"ادھر دیکھو میری طرف۔۔۔" تقی نے محبت سے گہری نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے حکم صادر کیا

وہ ہنوز خفگی سے چہرہ پھلائے اس کی طرف دیکھنے سے انکاری تھی۔ تقی نے گود میں دھرے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور بازو کا ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"ادھر دیکھو۔۔۔" مصنوعی رعب دار آواز

بازو کو ایسا جھٹکا پڑا کہ گڑیا کی طرح پٹ سے آنکھیں اٹھا کر تقی کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

"ہاں۔۔۔ اب بتاؤ۔۔۔ میں پیار تم سے نہیں کرتا، اور پتا شیریں کو دیکھ کر چلا، ہو کیا گیا ہے میری کم عقل بیوی کو؟

"خفیف سا میٹھا لہجہ تھا اور گہری آنکھیں محبت سے تاک رہی تھیں

"آپ۔۔۔ شیریں سے محبت کرتے تھے نا، اور اسی لیے مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے" خفا سے لہجے میں

آنکھوں میں آنکھیں ڈالے شکوہ کر ڈالا

"ویسے ایسا کچھ بھی نہیں تھا یہ تمہارے چھوٹے سے خالی ڈھکن میں آنے والا فطور ہے لیکن اگر ایسا ہوتا بھی تو اب

تو تم میری بیوی ہونا" تقی نے اس کے چہرے پر نگاہیں گھمائے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا

"بیوی ہوں محبت تو نہیں نا آپکو مجھ سے" خفگی ہنوز قائم تھی
 "اچھا تو جو سب ہے وہ کیا ہے پھر ہمارے بیچ" تقی نے بھنویں اچکائے سوال کیا
 "وہ تو بس اب آپ کی مجبوری ہے۔۔۔۔" نگاہیں جھکا کر اپنے گود میں دھرے ہاتھ پر گاڑ دیں
 "تمہیں ایک بات بتاؤں آج۔۔۔" تقی نے آہستگی سے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
 مالانے نگاہیں نہیں اٹھائیں۔۔۔۔۔

"تمہیں پتا ہے محبت تو کبھی مجھے رونا سے بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔ صرف ہمارا رشتہ طے تھا تو ایک اپنائیت تھی اس
 سے، پھر یونیورسٹی میں شیریں کیا اور بہت سی لڑکیاں مجھ سے محبت کرتی تھیں" سنجیدگی میں بات کرتے کرتے
 اچانک شرارت سو جھی
 مالانے چونک کر اوپر دیکھا، اسے پتا تھا بہت سی لڑکیوں والے الفاظ پر وہ یونہی دیکھے گی پر اس کا دیکھنا کچھ ایسا تھا کہ
 بے اختیار کھکھلا اٹھا جبکہ وہ دانت پیستی اس کے دل میں اتر گئی۔
 نہیں جانتا تھا وہ اتنی محبت کرتی ہے اس سے، اس کا یہ شکی سا روپ ایک مکمل بیوی کا روپ لگا۔
 "پر۔۔۔ مابدولت نے کبھی کسی کو اپنے دل تک رسائی نہیں دی، پر نجانے یہ چھوٹی، نکمی لڑکی نے کیا جادو چلایا کہ پہلی
 بار میں محبت جیسے جذبے سے آشنا ہوا" انداز شوخ سے اچانک سنجیدہ ہوا
 مالاب حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو سفید کرتے میں نکھر اس اس کے دل کی اتھا گہرائیوں میں بسنے
 والا پہلا شخص تھا۔ وہ پہلی دفعہ اپنی محبت کا یوں بھرپور انداز میں اظہار کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور اس کے کتنے ہی
 خواب آج سچ ہو گئے تھے۔ جو اس نے کہانیاں پڑھ پڑھ کر سچائے تھے۔
 "میں نے تم سے پہلے۔۔۔۔۔ کبھی کسی لڑکی کو اس نگاہ سے دیکھا تک نہیں تھا، پہلی دفعہ تمہیں ہی غور سے دیکھا، تم
 سے ہی محبت ہوئی اور بہت ہے۔۔۔۔۔" تقی کا لہجہ اب جذبات کی سچائی کا غماز تھا۔

وہ سرشار تھی مسکرا رہی تھی۔۔۔۔

"اب یقین آ گیا ہے میری اکلوتی بیوی کو کہ وہ ہی میری اکلوتی محبت ہے" تقی نے ہنستے ہوئے پوچھا
مالا نے گلال چہرے کے ساتھ سر ہلا دیا پتا نہیں کیوں پرندامت سی ہوئی کہ کیوں تقی پر شک کیا۔
"یہ لو مٹھائی کھاؤ شیریں نے دی ہے" تقی نے اب رخ موڑے ڈبہ اٹھایا۔

وہ جو مسکرا رہی تھی ایک دم سے مسکراہٹ پھر سے غائب ہوئی اور گھور کر پھر سے تقی کو دیکھا تھوڑی دیر پہلے والی
ندامت بھک سے اڑی۔ جبکہ تقی اس کے اس انداز پر پھر ناختم ہونے والا قہقہہ لگا گیا۔
"سکون سے کھاؤ۔۔۔ اس کی شادی طے ہوئی ہے اس کی مٹھائی ہے" تقی نے بمشکل ہنسی میں ہی بات مکمل کی
گلاب جامن اٹھا کر اس کے منہ کی طرف بڑھائی جو پھر سے خوش ہو کر کھانے کے لیے منہ کھول چکی تھی۔
گلاب جامن کھاتے ہی جھپٹ کر تقی کے ہاتھ سے ڈبہ بھی لے لیا جس پر دونوں کھکھلا دیے۔ ان کے قہقہے پر منہا
آنکھیں موندے پر سکون مسکرا دی۔۔۔۔۔

تقی کے محبت کے اظہار پر اس کا دل مالا سے بھی زیادہ پر سکون ہوا۔

☆☆☆☆☆

یہ حویلی کی چھت سے ملتی جلتی چھت تھی جو حویلی کی چھت سے زیادہ کشادہ اور صاف تھی۔ مالا اس چھت کے
وسط میں کھڑی تھی جہاں بالکل سامنے آسمان پر قوس قزح آنکھوں کو خیرہ کر دینے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔
وہ یونہی یک ٹک آنکھیں کھولے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی جب اچانک اس قوس قزح میں کوئی پھولوں کا
جھولا جھلاتا دکھائی دیا۔

مالا مزید حیرت سے آنکھیں چند ہی کیے غور کرنے لگی۔ جھولا لینے والی کوئی لڑکی تھی جس نے سفید رنگ کی گھٹنوں
تک آتی ریشمی فرائک پہن رکھی تھی۔

اچانک جھولانچے چھت کی طرف آنے لگا اور پھر ایک دم سے جھولالینے والی چھت پر اتر گئی۔ سفید سی دھند چھٹی تو سامنے ر مناکھڑی تھی۔ سفید چاند سی چمکتی فراک سر پر نماز صورت باندھا سفید سکارف شفاف چہرہ گلابی لب۔ وہ ہاتھ میں سنہری رنگ کی ٹوکری تھامے ہوئی تھی۔

مالا نے حیرت سے سامنے کھڑی ر منا کی طرف دیکھا۔ وہ آج کتنے دنوں بعد اسے خواب میں نظر آئی تھی۔ سفید رنگ کی خوبصورت پوشاک میں وہ کھل رہی تھی۔ اور اب آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مالا کے پاس آگئی تھی۔ اس کا مسکراتا چہرہ مالا کو سکون دے گیا۔

"آپا۔۔۔ تم کتنی پیاری لگ رہی ہو" مالا کی تحیر میں ڈوبی آواز ابھری
ر منا اور گہرا مسکرا دی۔۔۔ مالا بے ساختہ آگے بڑھی

"آپا۔۔۔ اب تو تم خوش ہونا۔۔۔ منہا آپا کو بچالیا میں نے" مالا نے ملائم سے لہجے میں استفسار کیا
ر منا نے مسکراتے ہوئے سر کو آہستگی سے اثبات میں جنبش دی اور پھر سنہری ٹوکری مالا کی طرف بڑھادی۔ مالا نے تحیر سے آنکھیں پھیلائے ٹوکری کو تھاما۔ اور پر تجسس اس میں جھانکا
ٹوکری کے اندر ایک خوبصورت آم رکھا ہوا تھا۔ گہرے پیلے رنگ کا آم انتہائی خوبصورت تھا۔ مالا نے چہک کر سر اوپر اٹھایا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

پٹ سے اس کی آنکھ کھلی۔۔۔ وہ اپنے بستر پر تقی کے برابر لیٹی تھی کل رات ہی وہ لوگ حویلی واپس آئے تھے اور آج ر منا اس کے خواب میں آگئی تھی، مگر اس بار کے خواب نے اسے ڈرایا نہیں تھا۔
وہ پر سکون ہو گئی تھی آہستگی سے تقی کے قریب ہوئی اور بازو اس کے گرد حائل کرتی پر سکون آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆☆☆☆

دنیا پور کے سٹیشن سے نکلتی ٹرین سست روی سے پڑی پر دوڑتی شہر کو پیچھے چھوڑ رہی تھی۔

وہ اس شہر کے گاؤں میں جہاں اتنے برس کی یادیں چھوڑ جا رہے تھے۔ وہاں بہادر کی ماں کی آخری آرام گاہ کو بھی الوداع کہہ آئے تھے۔

اس رات مالا اور تقی کے جانے کے بعد ہی بہادر کے گھر میں ایسا بھونچال آیا کہ ان کے کچے مکان کی دیواریں بھی کانپ اٹھیں۔

بہادر کے کمرے میں بند ہو جانے پر اس کی بوڑھی ماں یہ ساری حقیقت اور اس کا انجام سوچ کر ایسی دل برداشتہ ہوئی کہ اس دنیا سے ہی چل بسی، باپ تو پہلے ہی ناتواں تھا، اب بیوی کے یوں اچانک جانے کا غم اسے نڈھال کر گیا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بہادر نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ سفر کی شروعات میں ہی وہ اختتام جیسا تھا کا ہوا لگ رہا تھا۔ شکن آلودہ کپڑے، بکھرے بال وہ بے حال حلیے میں تھا۔

ٹرین کے متواتر جھٹکوں سے سردائیں بائیں ہل رہا تھا۔ آنکھیں ہلکی سی نمی لیے ہوئے تھیں مگر ذہن آج بہت دن بعد پر سکون تھا۔ ذہن کے پردوں پر پرسوں رات کا منظر گھوم گیا۔

تقی اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا اور وہ سر جھکائے ہر سزا کو قبول کرنے کے لیے کھڑا تھا۔ تقی کے چہرے پر کوئی اضطراب اور غصہ نہیں تھا۔

اور پھر خاموشی کے چند وحشت زدہ پلوں کے بعد اس نے بہادر کو اس کی سزا سنادی تھی۔۔

"جہاں غلطی منہا کی تھی وہاں تمھاری بھی تھی۔۔۔۔۔ پر میں اتنا خود غرض نہیں کہ اپنی بہن کو معاف کر دوں اور تمہیں سولی پر چڑھا دوں۔۔۔، تم چلے جاؤ یہاں سے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ فرہاد کا تم سے کبھی سامنا بھی ہو، میں تو بھائی ہوں مگر وہ شوہر ہے" تنقی کے کہے الفاظ کانوں میں اب بھی گونج رہے تھے۔

اس کے لیے تو اتنا ہی بہت تھا کہ منہا زندہ تھی، جب سے سکینہ کی زبانی اسے یہ سچائی پتہ چلی تھی کہ وہ زہر منہا نے

فرہاد کے لیے نہیں خود کے لیے منگوایا تھا۔۔۔ وہ خود کو معاف نہیں کر پارہا تھا۔ کیا وہ اپنی ہی محبت کا خون کرنے جا رہا تھا۔ اپنے کیے پر توند امت اس رات سے ہی شروع ہو چکی تھی، جب مالانے آکر گریبان تھام لیا تھا مگر منہا کے اٹھائے قدم نے تو اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

مگر اب وہ اسے لے کر پرسکون تھا۔ انجام تو وہی تھا جو ہونا تھا، پر دل سے یہ پھانس بھی نکل گئی کہ منہا اس سے محبت کا دم بھرتی ہے۔ وہ تو کب سے اسے بھول چکی تھی۔ لڑکپن میں ہوئی ایک غلطی سمجھ کر اور اب اسے بھی اپنی غلطیاں سدھارنی تھی۔

اپنی بیوی جس کو نکاح میں رکھ کر بھی وہ اس کا حق اور محبت نادے کر اللہ کی ناراضگی کما رہا تھا۔ اب وقت آگیا تھا وہ اپنے تمام بگڑے ہوئے کام سنوار لیتا۔

کچھ فاصلے پر اس کی بیوی سیاہ برقعے میں لپیٹی، ایک گٹھڑی کی طرح بیٹھی تھی۔ وہ یتیم اور غریب تھی شوہر کی بیوفائی کی سچائی جان لینے کے بعد بھی وہ مسکین کہاں جاتی اسے چھوڑ کر، مگر اب اسے بھی سکون تھا۔ وہ اس گاؤں سے دور جا رہے تھے، مطلب منہا سے اور اس کی پرچھائی سے بھی دور تو دل میں امید جاگ اٹھی تھی کہ اب وہ بہادر کے دل میں اپنی محبت جگا ہی لے گی۔

تقی نے ان کو اتنی رقم دے دی تھی کہ وہ کہیں بھی جا کر آسانی سے اپنا خرچ اٹھاتے ہوئے کوئی کام شروع کر سکتے تھے، لیکن بہادر کے باپ نے اپنے ابائی شہر پشاور اپنے بھائیوں کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے یہ یقین تھا کہ اس کے بھائی اس کو ضرور قبول کر لیں گے۔

☆☆☆☆☆

تقی ہاتھ میں سرسوں کے تیل کی بوتل تھا مے کمرے سے باہر آیا، آج جمعہ کا دن تھا اور جمعہ کے دن غسل سے پہلے وہ سرسوں کے تیل سے لازمی سر کی مالش کرواتا تھا۔ شادی سے پہلے بلقیس کرتی تھی اور اب مالایہ فریضہ انجام

دیتی تھی۔

نیلے رنگ کی آدھی آستین والی ٹی شرٹ کے نیچے ڈھیلے سے کپڑے کی سیاہ پینٹ زیب تن کیے اور بکھرے سے بالو کی چند لٹیں ماتھے پر گرائے اب وہ کمرے کے دروازے سے آگے بڑھ رہا تھا۔

اٹاری میں تخت کے اوپر پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا، خدیجہ بیگم گاؤتکی سے ٹیک لگائے تخت پر نیم دراز تھیں، جبکہ پاس بیٹھی اریب پان دان کھولے بیٹھی تھیں۔ سامنے صحن میں نیم کے درخت کے نیچے غزالہ اور تاری بوا چارپائی پر سبزی کے تھال لیے بیٹھی تھیں۔

ان سب کو لاہور سے واپس آئے دو ہفتے ہو چکے تھے، منہا اب بالکل ٹھیک تھی۔ بہادر اپنے خاندان کے ساتھ چپ چاپ پشاور جا چکا تھا۔ اریب بیگم اب بھی تقی اور فرہاد سے کچھی کچھی رہتی تھیں۔

بارہا کوشش کے باوجود اور اپنے لگائے گئے الزام پر پشیمان ہونے پر بھی وہ اریب سے معافی نہیں مانگ سکے تھے۔ ہاں البتہ لاہور سے واپس آکر تقی نے سب کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ غلط تھا۔ منہا کو کوئی زہر نہیں دیا گیا تھا بلکہ وہاں کے بڑے ڈاکٹر نے منہا کا اچھی طرح معائنہ کیا ہے اور اسے معدے کی کوئی بیماری تھی جس کی وجہ سے یہ سب ہوا اور اب وہ تندرست ہے۔

تقی مالا کو ہی دیکھنے کے لیے باہر اٹاری کے ستون کے پاس کھڑا رد گرد نگاہیں گھما رہا تھا۔ جب عقب سے خدیجہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

"کس کو ڈھونڈے ہے۔۔۔۔۔، مالا تو سکینہ کے ساتھ ابھی ابھی نکلی ہے، درزن کی طرف گئی ہیں دونوں شاید، کچھ کپڑے سلوانے دینے کو" خدیجہ بیگم نے ہاتھ میں پکڑا پان منہ میں رکھتے ہوئے اسے مالا کے حویلی میں ناہونے کی خبر دی۔

تقی اب رخ موڑے تخت کی طرف دیکھ رہا تھا، اریب بیگم ہنوز اسی انداز میں اس سے لا پرواہی برتے خفا سا چہرہ

لیے بیٹھی تھی۔ وہ اب بھی تقی اور فرہاد کی طرف دیکھتی تک نہیں تھی۔

"بلقیس۔۔۔ اری۔ی۔ی۔ی۔او۔و۔۔۔ بلقیس۔۔۔ تقی کے سر پر تیل لگا دیجیو۔۔۔ جمعہ کا وقت نکلے

جاوے ہے، مواکب سے تیل پکڑے کھڑا ہے "خدیجہ بیگم نے وہیں بیٹھے گھٹنے پر ہاتھ دھرے ہانک لگائی۔

تقی نے کن اکھیوں سے اریب کی طرف دیکھا جواب دوسرا پاں بنانے میں مگن تھی اور نگاہیں خفا سے چہرے پر جھکائے ہوئی تھی۔

تقی نے آہستگی سے چند قدم آگے بڑھائے، پاس پڑا موڑھا کھینچا اور تخت کے پاس اریب کے بالکل سامنے کر دیا۔ وہ جیسے ہی موڑھے کو سیدھا کر کے اریب کے پاؤں کے پاس بیٹھا اریب نے چونک کر دیکھا۔

"پھپھو آپ ہی لگا دیں میرے بالوں میں تیل "بڑی اپنائیت سے کہا

اریب جو پہلے ہی اس کے یوں بیٹھنے پر چونکی تھی، اب اس کے یوں اپنائیت سے تیل لگانے کی فرمائش پر مزید دم بخود ہوئے اس کی پشت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

تقی یوں ہی اس کی طرف پشت کیے ہاتھ میں تیل کی بوتل تھامے بیٹھا تھا۔

اریب اب ہونق بنی کبھی خدیجہ بیگم اور کبھی تیل کی بوتل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خدیجہ بیگم بھی تقی کے اس رویے پر اریب ہی کی طرح حیرت زدہ بیٹھی تھیں۔

ادھر سے بلقیس اپنے کمرے سے باہر نکلی اور دوسری طرف چند سکینڈ کے وقفے سے فرہاد اور منہا بھی ہنستے ہوئے ایک ساتھ اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ منہا نے ہاتھ میں فرہاد کے کپڑے پکڑے ہوئے تھے، جنہیں شاید وہ استری کرنے کی غرض سے باہر لائی تھی۔

اب سب سامنے تخت کے منظر کو دم سادھے دیکھ رہے تھے، جہاں تقی اتنے دنوں کے بعد اریب سے بات کر رہا تھا۔ اریب نے خفگی سے تیل کی بوتل کو دیکھا اور پھر نگاہ بلقیس پر پڑی

"وہ۔۔۔ آگئی ہے تمہاری ماں۔۔۔ چل اٹھ اسی سے لگوا تیل" خفگی بھرا اکھڑا سا لہجہ تھا۔
 تقی نے ایک سرسری نگاہ سامنے کمرے کے دروازے میں کھڑی بلقیس پر ڈالی اور پھر چہرہ سیدھا کر لیا۔
 "نہیں پھپھو اب تو آپ کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔ اب آپ ہی لگا دیں" تقی نے مسکراتے ہوئے محبت سے اصرار کیا۔

اریب نے چونک کر پھر سے سب کی طرف دیکھا، جہاں اب سب کے چہروں پر تقی کے اس انداز پر مدہم سی مسکان ابھرنے لگی۔ دور درخت کے نیچے بیٹھی غزالہ بھی سبزی کے تھال کو وہیں چارپائی پر دھر کر اب تجسس آنکھوں میں سجائے اٹاری کی طرف آرہی تھی۔

"نہیں میں کیوں لگاؤں، کیا پتا تو الزام لگا دے۔۔۔ کہ پھپھو نے تیل میں زہر ملا کر میرے بالوں میں لگا دیا" دلخراش لہجے میں شکوہ کیا۔

اریب کی آواز میں خفگی کے ساتھ ساتھ بھرپور غصہ بھی جھلک رہا تھا۔ تقی نے محبت سے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور اریب کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پھپھو آپ کبھی ایسا کر ہی نہیں سکتیں، چلیں اب غصہ چھوڑیں، لگا دیں تیل جلدی سے" اپنائیت سے بھرپور ہلکی سی ندامت میں گھلا لہجہ تھا۔

تقی نے اریب کا ہاتھ محبت سے پکڑ کر زبردستی اپنے سر پر دھر دیا، وہ چند سکینڈ تو ماتھے پر شکن نمودار کیے اس کی پشت کو گھورتی رہیں۔ اور باقی سب بھی دم سادھے اب اریب کے جوابی رد عمل کے منتظر تھے۔

تقی متواتر اریب کا ہاتھ تھامے اس کے ہاتھ کھینچنے کی کوشش کو ناکام بنائے ہوا تھا۔
 "پھپھو۔۔۔ لگا دیں نا۔۔۔ ہاتھ نہیں چھوٹے گا چاہے جتنی بھی کوشش کر لیں" تقی نے بچوں جیسی ضد میں اریب کو اپنے ارادے سے باخبر کیا۔

تقی نے فوراً پلٹ کر اریب کا ہاتھ تھام لیا۔

"شکریہ پھپھو۔۔" اریب کے ہاتھ پر بوسہ دے کر محبت سے کہا۔

وہ گردن اکڑاتے ہوئے فاتحانہ انداز میں مسکرا دیں۔ جیسے ہی تقی اپنی جگہ سے اٹھا فوراً ہی فرہاد تیل کی بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر اسی جگہ پر اریب کے آگے بیٹھ گیا۔

"امی۔۔۔ میرے بھی لگا دیں سر میں تیل" فرہاد نے بھی شرارت اور محبت سے ملے جلے لہجے میں فرمائش کر ڈالی۔ ارد گرد کھڑے سب مکین کھکھلا کر ہنس پڑے جبکہ اریب جو خفگی سے اٹھنے لگی تھی، فرہاد نے ان کے دونوں بازو اپنے گلے میں ڈال لیے۔

اریب کچھ دیر تو غصے سے بازو چھڑواتی رہی پھر ایک دم سے اس کے سر کو پیچھے کیے ماتھے پر دیوانہ وار بوسے دینے لگی۔

آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ایسا محبت بھرا منظر وہاں کھڑے ہر نفوس کی آنکھ کے کونے نم کر گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

تقی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا ہلکے گرے رنگ کا کرتا شلوار پہنے وہ ابھی باہر برآمدوں سے لوٹا تھا جہاں وہ چوہدری حاکم کے ساتھ لمبر داری کے معاملات دیکھنے کے بعد کمرے میں آیا تھا۔

سب سے پہلے نگاہ مالا پر پڑی جو حسب معمول میز پر کتاب میں سر دیے بیٹھی تھی اور چھ ماہ کا مازن تقی ننھے ننھے سفید ہاتھ پاؤں پسارے پلنگ پر گہری نیند سو رہا تھا۔

مالا نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر لیے تھے اور اب میڈیکل کی پڑھائی میں دن رات جتنی تھی، ڈاکٹر بننا تو جیسے اس نے اپنا خواب بنالیا تھا۔ دن میں کالج اور رات میں تقی سے پڑھتی تھی۔

تقی لا پر واہی سے مالا کے قریب سے گزر تا پلنگ پر آچکا تھا جہاں سفید رنگ کے تقی کی ہی پر چھائی لیے روئی کے گالے کی طرح نرم و نازک سے چھوٹے چوہدری گہری نیند میں مسکرا رہے تھے۔

تقی کو ہمیشہ کی طرح اس کی اس ادا پر بے پناہ پیار آیا اور وہ بے ساختہ بیڈ پر بیٹھ کر کہنی کے بل اس پر جھکتا اس کے گالوں پر بوسے دینے لگا۔ مالانے گھورتے ہوئے قلم کو کتاب پر پٹھا۔ سرخ رنگ کے قمیض شلوار میں اس کے گال بھی سرخ ہو رہے تھے۔

"تقی۔۔۔ اب اگر یہ اٹھانا تو آپ سنبھالیں گے اسے، میں پہلے ہی بتا رہی ہوں" مالانے دانت پیستے ہوئے خبردار کیا تقی نے مالانے کی بات ان سنی کی اور مسکراتے ہوئے مازن کے ماتھے پر لب رکھ دیے وہ جو مسکرا رہا تھا، مسکراہٹ اور گہری ہوئی اور ننھا سا ہاتھ اوپر اٹھا۔

"تقی۔۔۔ ی۔ی۔ی۔ی۔۔۔" مالانے دانت پیس کر آواز کو زبردستی مدھم رکھتی چیخ پڑی جھنجلا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور پلنگ کے پاس آکر مازن پر جھکے تقی کے کندھے کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا۔ "آپ کو ایک دفعہ کی کہی ہوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی کیا؟ اٹھ گیا تو کہاں پڑھنے دے گا مجھے، رات کو تو اماں بھی نہیں سنبھالیں گی اسے" ماتھے پر شکن سجائے چڑ کر کہا

تقی نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا ہاتھ تھامے ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ "چلو ٹھیک ہے پھر یہ نہیں تو تم سہی" شریر سے لہجے میں کہتے ہوئے اسے قریب کیا۔

مالا بھرپور غصہ میں ہی ہنس دی اور لجائے سے انداز میں کلائی ایک جھٹکے سے چھڑوائی "ہاں۔۔۔ اور پڑھے گا کون۔۔۔ اس کے ڈاکٹر ابا" شرمیلی سی مسکراہٹ کو دبایا

تقی اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا، گہری شرارت بھری نگاہوں سے گھورتے ہوئے چہرہ قریب کیا "چلو کیا یاد کرو گی آج کی چھٹی دیتا ہوں تمہیں۔۔۔" باہیں کھولے بڑے فخر سے کہا اور آنکھ کو شرارت سے دبایا "نہیں۔۔۔ جی۔۔۔ اپنا احسان اپنے پاس رکھیں اور چائے۔۔۔ وہ نہیں لائے آج" مالانے کمر پر دونوں ہاتھ دھر کر رعب سے کہا۔

ایک دن مالا اور ایک دن وہ مالا کے لیے چائے بنا کر لاتا تھا اور آج بھی بنا چائے ہی کمرے میں آچکا تھا۔
 "تم دن بہ دن بد تمیز نہیں ہوتی جارہی۔۔۔۔۔ چائے کیوں بنواتی ہو مجھ سے" تقی نے اسی کے انداز میں کمر پر ہاتھ دھرے شکوہ کیا

بھنویں اکٹھی کیے وہ مصنوعی غصہ دکھا رہا تھا۔ مالا نے شرارت سے ناک چڑھائی۔
 "میں شروع سے ہی بد تمیز ہوں، البتہ آپ دن بدن خراب ہوتے جارہے ہیں" ترکی بات کی جواب دیا
 تقی نے بے ساختہ قبضہ لگایا

"او۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔ خراب۔۔۔۔۔ بتاتا ہوں" تقی نے شرارت سے لب بھینچے اور قدم آگے بڑھائے۔
 ہنستے ہوئے پھر سے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی وہ بدک کر پیچھے ہوئی۔ تقی نے ایک ہی جست میں اس کا ہاتھ تھام کر قریب کیا جواب کھکھلاتے ہوئے تقی کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔
 "آویں۔۔۔۔۔ س۔۔۔۔۔ س۔۔۔۔۔ اہ۔۔۔۔۔ اہ۔۔۔۔۔ اہ۔۔۔۔۔" مازن کی چیختی ہوئی باریک سی رونے کی آواز پورے کمرے میں گونج اٹھی۔ وہ فوراً سے ایک دوسرے سے الگ ہوئے
 "دیکھا اٹھا دیا نا۔۔۔" مالا جو مسکرا رہی تھی اب تیوری چڑھائی اور غصے سے کہا۔
 تقی نے حیرت سے اس کے الزام پر منہ کھولا
 "او۔۔۔۔۔ میں نے کب اٹھایا بھئی میں تو یہاں کھڑا ہوں تمہارے سامنے کیا اندھی ہو تم" تقی نے ہاتھ ہوا میں اٹھائے اپنی صفائی پیش کی

"اور پھر کیا میں نے اٹھایا ہے، اتنی دفعہ کہا ہے سوتے ہوئے کو پیار مت کیا کریں پر نہیں۔۔۔۔۔ میں تو پاگل ہوں نا
 ۔۔۔۔۔" وہ غصے میں بڑبڑاتی اب پلنگ کی طرف بڑھ رہی تھی۔
 تقی کمر پر ہاتھ دھرے لب بھینچے مڑا۔۔۔

"مالا الزام ہے یہ۔۔۔ سراسر الزام میں ادھر کھڑا ہوں میں نے کب اٹھایا اسے" انگلی اٹھائے صفائی پیش کی وہ مازن کو اپنے کندھے کے ساتھ لگائے تھپک رہی تھی جس کا باج کسی صورت نہیں بند ہو رہا تھا۔ گھور کر تفتی کی طرف دیکھا اور بار بار مازن کو تھپکا وہ چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مالا جھنجلا گئی۔

"اب لیں چپ کرائیں اسے۔۔۔" جھنجلا کر کہا

مازن غصے سے تفتی کی طرف بڑھایا، تفتی نے ناک پھلا کر دیکھا

"جان ہی چھڑاتی ہو۔۔۔ ویسے اتنا پیار تھا بچوں سے اب سارا دن چچی سنبھالتی ہیں اور رات کو میں" تفتی نے تیوری چڑھائے شکوہ کیا

"ارے۔۔۔ واہ۔۔۔ یہ اچھی کہی۔۔۔ آپ سارا دن گھر ہوتے ہیں کیا۔۔۔؟" مالا غصے میں دانت پیستی اب

مازن کو پھر سے گلے لگا چکی تھی جس کی ریں ریں کسی صورت نہیں بند ہو رہی تھی۔

"نہیں ہوتا گھر، پھر بھی پتا تو ہے نا۔۔۔ چچی سنبھالتی ہیں سارا دن" تفتی نے اس کی بات کی پھر سے نفی کی

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں تو جھک مارتی ہوں نا سارا دن" مالا روہانسی ہوئی

اس کے یوں رونے والی صورت بنانے پر تفتی نے جھٹ ہتھیار پھینکے۔

"میں نے کب کہا جھک مارتی ہو۔۔۔ اچھا اب تم تو نارونا شروع کرنا، دونوں کو کیسے چپ کرواؤں گا" تفتی نے اس

کے رونے جیسی صورت پر ہنسی دبائی

اس کے ہاتھ سے مازن کو پکڑا تو وہ جھٹ سے آنسو صاف کرتی میز کی طرف بڑھ گئی۔۔۔

"اس کو فوارے کے پاس لے جائیں وہاں بڑا خوش ہوتا ہے، میرا ٹیسٹ ہے صبح میں پڑھ لوں تھوڑا" شرارت سے

نچلا لب دانتوں میں دبائے آنکھیں سکڑ کر کہا

کرسی پر بیٹھ کر سر جھٹ سے کتاب پر جھکا لیا۔

تقی نے ناک پھلائے گھور کر دیکھا اور پھر باجے کی طرح روتے مازن کو کندھے سے لگائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا پھر مزے سے کتاب بند کیے پلنگ پر آکر لیٹ گئی۔۔۔ چائے کے بنا کہاں پڑھا جانا تھا۔

ہنستے ہوئے آنکھیں موند لیں۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

سفید شفاف اور تازہ رنگ و روغن میں لپٹی حاکم ہسپتال کی عمارت پوری شان سے گاؤں کی مین سڑک پر کھڑی تھی۔ پورا ہسپتال جدید طرز کے سہولیات پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی اور اوپر بڑی سی سفید لوہے کی پلیٹ پر سرخ اور سیاہ رنگ میں حاکم ہسپتال لکھا گیا تھا۔

ہسپتال کی یہ کشادہ عمارت ایسی تھی کہ کوئی بھی دیکھے تو پل بھر کو تو نگاہ یقین ناکر پائے کے کہ یہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں تعمیر کیا گیا ہسپتال ہے۔ بیرونی گیٹ سے لے کر ہسپتال کے اندرونی حصے تک کو انتہائی دیدہ زیب اور ہر طرح کی جدید طبی سہولیات کو مد نظر رکھ کر بنا گیا تھا۔

تقی نے جدید طبی آلات اور ہر طرح کی سہولت کے لیے پانی کی طرح پیسہ بہا دیا تھا۔ یہ اس کا خواب تھا جو آج پورے دو سال بعد پورا ہوا تھا اور آج حاکم قصر کے مکیں اس اعلیٰ شان ہسپتال کے سامنے کھڑے تھے جسے دیکھنے کے لیے دور دور گاؤں سے بھی لوگ جمع تھے۔

آج حاکم ہسپتال کے افتتاح کا دن تھا۔ سارا مجمع ہسپتال کے بیرونی گیٹ کے آگے جمع تھا۔ چوہدری حاکم سفید کلف لگے اکڑے قمیض شلوار کے ساتھ پگ پہنے ہوئے تھے۔ وہ بہت نحیف ہونے کے باوجود آج ہشاش بشاش کھڑے تھے۔ انہیں اب اٹھنے بیٹھنے میں کافی تکلیف ہوتی تھی۔ سہارے کے بنا چلنا مشکل ہو جاتا تھا پچھلے سال خدیجہ بیگم کے اس دنیا سے چل بسنے کے بعد سے وہ بھی بہت ناتواں ہو گئے تھے۔ نقیب حاکم اور نوازش حاکم نے انہیں دائیں

بائیں سے تھام رکھا تھا۔

چوہدری حاکم جو شروع سے ہی تقی کی تعلیم اور ڈاکٹر بننے کے مخالف رہے تھے۔ آج انگنت لوگوں کی آنکھوں میں عزت کی چمک دیکھتے ہوئے ناصر ف حیران تھے بلکہ فخر سے سر بھی اٹھ گیا تھا۔

لوگوں کی اتنی زیادہ مبارک باد وصول کرنے کے بعد ان کے اندر کچھ ایسا احساس جاگ گیا تھا، جیسے وہ اپنی ہی عمر میں کتنے برس پیچھے چلے گئے ہوں۔ آہستگی سے ہاتھ کے اشارے سے نقیب اور نوازش کو سہارا دینے سے منع کر دیا۔

تقی کی پورے گاؤں میں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے تمام گاؤں میں بہت عزت بن گئی تھی۔ وہ لوگوں کے دلوں میں ایسا گھر کر چکا تھا کہ اس دفعہ کے انتخابات میں اس کے مخالف کو بہت بری شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

یہ سب اس کی نیک سیرت، اس کی تعلیم اور غریبوں کو مفت جدید علاج کی سہولیات فراہم کرنے کی بدولت تھا۔ چوہدری حاکم کو آج اچھی طرح سمجھ آ گیا تھا کہ تقی کی تعلیم سے ان کی جدی پشتی عزت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی البتہ انہوں نے مزید عزت کمائی تھی۔

وہ فخر سے گردن اٹھائے آج اپنے نام کے ہسپتال کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے پوتے نے ان کے نام کو جاوداں کر دیا تھا یہ نام اب ان کی حیات تک کا محتاج نہیں رہا تھا بلکہ امر ہو گیا تھا۔

تقی بڑے مؤدب انداز میں ان کو ہسپتال کے آگے لگے سرخ ربن کو کاٹنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ بالکل انہی کی طرح سفید کرتا قمیض پہنے وہ اپنے دادا کی ہی پر چھائی تھا خوب رو، رعب دار اور تعلیم کی روشنی اس کے چہرے کو روشن کیے ہوئے تھی۔ مختلف اخبارات کے صحافی تصویریں لے رہے تھے۔ چوہدری حاکم یک ٹک محبت سے تقی کو دیکھ رہے تھے۔

"داجی۔۔۔۔۔ ربن۔۔۔۔۔ کاٹے۔۔۔۔۔" تقی نے شائستگی سے مسکراتے ہوئے قینچی چوہدری حاکم کے آگے کی۔

انہوں نے ایک نگاہ ہتھیلی پر رکھی قینچی پر ڈالی اور پھر والہانہ انداز میں قینچی پکڑنے کے بجائے اس کا بازو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

آج کتنے سالوں کے بعد وہ تقی کو یوں اپنے سیرنے سے لگائے ہوئے تھے۔ جب سے تقی نے ڈاکٹری پڑھنے کی ضد لگائی تھی تب سے ان کا رویہ تقی کے ساتھ سخت ہو گیا تھا۔ لیکن آج نا صرف تمام گلے شکوے چھٹ گئے تھے بلکہ ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

چند لمحے یو نہی اسے اپنے ساتھ چمٹائے رکھنے کے بعد محبت اور جوش سے سرخ چہرہ لیے پیچھے ہوئے اور اس کے دونوں کندھے تھام لیے۔

"تو میرا غرور ہے۔۔۔ پتر شاباش۔۔۔ شاباش۔۔۔" پر جوش لہجے میں اس کے کندھوں کو جکڑتے ہوئے کہا۔

تقی کی مبہم سی مسکان اور گہری ہوئی وہ جیت گیا تھا۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کو وہ ہر جماعت میں میں اول آنے کے بعد چوہدی حاکم کے منہ سے سنا چاہتا تھا۔

اب ان کی اگلی نسلیں داجی کی خوشی سے پڑھیں گی۔ بڑوں کی رضا سے پڑھیں گی، چوری چھپ کر یا ان کی ناراضگی مول لے کر نہیں۔ اب وہ مالا کے ڈاکٹر بننے سے بھی خفا نہیں ہوں گے۔۔۔ منیر پھپھا کے دونوں بچوں کو بھی وہ اور فرہاد پڑھا رہے تھے۔ گو کہ اریب نے ان کو قبول نہیں کیا تھا مگر وہ حویلی میں سب سے گھل مل گئے تھے۔ سرخ رنگ کا ربن جیسے ہی کٹار بن کی دائیں بائیں جھولتی لڑیوں کے ساتھ ہی تالیوں کی آواز گونج اٹھی۔۔۔ ہجوم میں کھڑے سب کے چہرے سرشار تھے۔

سورج ہسپتال کی عمارت پر جی جان سے چمک رہا تھا۔ حاکم ہسپتال ڈاکٹر تقی نقیب کا خواب تھا۔ ایسے ہی خواب اگر تمام پوتے اور بیٹے دیکھیں اور اپنے خواب کے لیے جی جان لگا دیں تو کتنے ہی داجی اور والدین کے نام جاوداں ہو

جائیں۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆

یہ جدید طرز کا کمرہ تھا جس کے سفید ماربل لگے فرش پر ایک طرف نفیس صوفے لگے تھے۔ خوبصورت اور بیش قیمت فرنیچر اور سجاوٹ کی چیزوں سے لیس یہ بڑا سا حال نما کمرہ تھا۔

حویلی میں جو ترمیم ہوئی تھی اس میں ماربل کا فرش، جدید فرنیچر اور یہ بڑے ہال نما کمرے کا اضافہ ہو گیا تھا۔ چوہدری حاکم کے گزر جانے کے بعد تقی نے حویلی کا نقشہ کافی حد تک جدید طرز میں تبدیل کر لیا تھا۔

حاکم ہسپتال میں اب مالا بھی اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر کے طور پر خدمات سرانجام دیتی تھی۔ فرہاد منہا کو لے کر شہر میں منتقل ہو چکا تھا، جہاں منیر پچھلا کی وفات کے بعد اریب بھی ان کے ساتھ وہیں مقیم تھی۔

اس بڑے سے ہال میں ایک طرف لگے جدید کاؤچ پر غزالہ بلقیس کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی اور چند قدم کے فاصلے پر صوفے پر تقی اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔ سفید قمیض شلوار میں ملبوس، وہی خوب روچہ بس چہرے پر ایک عدد عینک کا اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک دم سے شور برپا ہوا جیسے کئی بھونچال آگیا ہو۔۔۔ اچانک کی چیخ و پکار کے ساتھ اس شور پر تینوں نفوس نے ایک ساتھ سر اوپر اٹھایا۔

مالا پاگلوں کی طرح بھاگتی ہوئی آرہی تھی اور اس کے آگے سات سالہ مازن اور چار سالہ روشن ہنستے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

مالا کا چہرہ غصے سے لال تھا اور سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ ہلکے سے پیچ رنگ کے کرتے اور شلوار میں وہ گلابی رنگت لیے ہوئے تھی جسم اب زیادہ بھرا بھرا تھا مگر خوبصورتی کے ساتھ شخصیت کا نکھار چار چاند لگا رہا تھا۔

"مازن۔۔۔ رک جائے۔۔۔ روشن رک جائے فوراً۔۔۔ ماما اور نربو تمہ آف یو لاسٹ ٹائم۔۔۔" مالا نے انگلی کھڑی

کرتے ہوئے دونوں کو خبردار کیا۔

مازن بھاگتا ہوا سامنے بیٹھی غزالہ کی گود میں دبک گیا۔ اور روشن بلقیس کی گود میں، مالا اب جھپٹنے کے انداز میں مازن پر لپکی۔

تقی ایک جست میں اٹھا اور لپک کر مالا کا ہاتھ تھام لیا جو اب مازن کو بس مارنے کو ہی تیار تھی۔ مازن اور روشن انتہا کے شرارتی بچے تھے جو اسے یہ بھولنے پر مجبور کر دیتے تھے کہ وہ اب ایک ڈاکٹر ہے۔

"تقی چھوڑیں مجھے میں کہہ رہی ہوں۔۔۔" مالانے چیختے ہوئے کہا تقی اس کی کمر کے گرد بازو حائل کیے ہنس رہا تھا اور بلقیس اور غزالہ بھی مازن اور روشن کے ساتھ ہنس رہی تھیں۔

"اماں، تائی اماں۔۔۔ چھوڑ دیں ان دونوں کو بہت تنگ کیا ہوا ہے مجھے، جائیں ذرا بچن کا حال دیکھیں کیا کیا ہے دونوں نے، چینی کا پورا ڈبہ الٹا دیا ہے" مالارو ہانسی ہوئی۔

بلقیس اور غزالہ بچوں کو اپنے ساتھ لپٹا رہی تھیں اور تقی اس کو آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔

"تو کیا ہوا مالانے بچے ہیں۔۔۔" غزالہ نے گھورتے ہوئے کہا اور بغل میں لیے مازن کا ماتھا چوم لیا

"خبردار اگر میرے پوتوں کو ہاتھ بھی لگایا" بلقیس نے مصنوعی گھور کر مالا کو تنبیہ کیا۔

"تائی اماں۔۔۔ منہا آپا کی بیٹی دیکھی ہے کتنی سلجھی ہے اور یہ دونوں پتا نہیں کس پر چلے گئے۔۔۔" مالانے دانت

پیسے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ کہا

بلقیس، تقی اور غزالہ نے فوراً ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک ناختم ہونے والا قہقوں کا طوفان تھا۔ اور مالا

کمر پر ہاتھ رکھے تلملارہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

سن 2020

شیشے کی میز کے سامنے بیٹھا بائیس سالہ خوبو لڑکا مسلسل ہنس رہا تھا۔ اور شیشے کے میز کے دوسرے پار بیٹھی خاتون چمکتی فتح یاب آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جی پھر۔۔۔ بتائے۔۔۔ کیا کہتے ہیں آپ۔۔۔ اور میں تو حیران ہوں کہ آپ آگئے۔۔۔ موٹلی پیشینٹ تو بھول ہی جاتے ہیں" خاتون نے ہنستے ہوئے کہا

"میم آتا کیسے نا آپ نے میری زندگی بدل دی اور دو سال پہلے والی میری ساری حرکتیں آج مجھے حماقت لگ رہی ہیں" لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا

سامنے بیٹھی خاتون نے لب بھینچ لیے۔۔۔

"میں اس وقت بھی جانتی تھی لیکن آپ اس وقت یہ بات سمجھ نہیں سکتے تھے اس لیے دو سال بعد کا وقت دیا تھا۔" خاتون نے مسکراتے ہوئے یاد دلایا

اور لڑکا سر جھکا کر گہری مسکراہٹ کے ساتھ دو سال پہلے کی ملاقات یاد کر گیا۔

☆☆☆☆☆☆

سن 2018.....

شفاف شیشے کی میز کے بالکل سامنے بیٹھا یہ بیس سالہ لڑکا اپنے ہاتھوں پر نگاہیں جمائے ہوا تھا۔ سرخ رنگ کی ٹی شرٹ، گلے میں چین، بکھرے لمبے سے بال، آنکھوں کے گرد سیاہ گہرے حلقے۔ وہ صدیوں کا بیمار لگ رہا تھا جدید فرنیچر سے لیس کمرہ گہری خاموشی میں ڈوبا تھا۔ سفید چمکتی ٹائلز، بیش قیمت سجاوٹی گلدان، دیوار سے لگا کاؤچ اور کمرے کے تقریباً وسط میں شیشے کا بڑا سا میز جس کے ایک طرف گھومنے والی کرسی اور دوسری طرف جدید طرز کی تین کرسیاں تھیں جن میں سے ایک پر اس وقت وہ بیس سال کا لڑکا بیٹھا تھا۔

شیشے کے بنے اس لمبے چوڑے میز کے دوسری طرف لڑکے کے بالکل سامنے بیٹھی انتہائی پروقار خاتون نفیس چشمے

کی اوٹ سے بغور گہری نگاہیں سامنے بیٹھے لڑکے پر گاڑے ہوئے تھی۔

کمرے کے بائیں طرف نفاست سے جدید طرز کے نیلی اور سفید دھاری والے وال پیپر پر میں لیٹی دیوار پر لگی سیاہ رنگ کی گھڑی کی ٹک ٹک کمرے کی خاموشی میں خفیف سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

خاتون نے گہری سانس باہر اندلی اور گھومتی کرسی کو تھوڑا سا آگے کھسکاتے ہوئے اپنے بازو کہنیوں تک میز پر ٹکا دیے۔

"کتنے سال سے تھی دوستی اس لڑکی سے تمہاری؟۔۔۔" خاتون نے شائستگی سے حد درجہ متوازن لہجے میں سامنے بیٹھے لڑکے سے سوال کیا۔

لڑکے کے جھکے سر میں ہلکی سی جنبش ہوئی مگر اس نے چہرہ نہیں اٹھایا۔ پھر کچھ دیر ہتھیلیوں پر ہی نظر جمائے رکھنے کے بعد گویا ہوا

"دو سال سے جانتے تھے ہم دونوں ایک دوسرے کو" گھٹی سی آواز تھی جو کمرے کی خاموشی کے باعث آسانی سے سنائی دے گئی تھی۔

"ہم۔م۔م۔ اچھا وہ لڑکی آپ کو دو سال سے جانتی تھی۔۔۔" خاتون ایک دم سے پیچھے ہوئی اور کرسی کو جھلاتے ہوئے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں ملایا۔

"جانتی ہی نہیں۔۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ وہ۔۔۔ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی" لڑکے نے فوراً خاتون کی بات کو اچک لیا اور سر اوپر اٹھائے درستگی کی۔

"اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ جانتی نہیں۔۔۔ محبت کرتی تھی۔۔۔ تو۔۔۔ وہ۔۔۔ جو سامنے اس شیشے کے پار بیٹھی ہیں۔ وہ تمہیں کب سے جانتی اور محبت کرتی ہیں؟۔۔۔" خاتون نے ملائم سے لہجے میں پوچھتے ہوئے ہاتھ سے دائیں طرف اشارہ کیا۔

شیشے کے بنی دیوار کے پار چالیس سال کے لگ بھگ عمر کی خاتون مضطرب سی بیٹھی تھی۔ آنکھیں نمی کا شکار تھیں اور ان کی سوزش بتا رہی تھی کہ وہ لگاتار بہت دن سے روتی رہی ہے۔

لڑکا اس سوال پر جیسے مجسم ہو گیا اور اب شیشے سے پار اس خاتون کو دیکھ رہا تھا جو اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔
 "میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے، یہ خاتون آپ کو کب سے جانتی ہیں اور محبت کرتی ہیں۔" سامنے بیٹھی خاتون نے پھر سے سوال دہرائے لہجہ حد درجہ ملائم اور شائستہ تھا۔

"بہ۔۔۔ بیس سال سے۔۔۔ میں بیس سال کا ہوں تو۔۔۔ تو بیس سال ہوئے" لڑکے کی زبان لڑکھرائی۔
 "ہم۔ م۔ م بیس سال اور دو سال۔۔۔ کافی فرق ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔" خاتون نے لب باہر نکالے استہزائیہ پوچھا جبکہ وہ اب بھی کرسی پر جھول رہی تھی۔

"ڈاکٹر۔۔۔ لیکن میں ہمارے بہت محبت کرتا ہوں بہت زیادہ میں جانتا ہوں وہ بھی بہت کرتی تھی۔۔۔ پھر اس نے بیوفائی کیوں کی مجھ سے۔۔۔ وہ نہیں کر سکتی ایسا میرے ساتھ" لڑکا مضطرب سے لہجے میں بات کرتے ہوئے سر کو دائیں بائیں ہلاتا تھا۔

"دو سال کی محبت کے بعد بیوفائی پر آپ خود کو ختم کر رہے تھے۔۔۔ تو وہ جو سامنے بیٹھی ہے اس کی بیس سال کی محبت۔۔۔ وہ کہاں گئی؟؟" سامنے بیٹھی ڈاکٹر نے متوازن مگر دو ٹوک لہجے میں سوال کیا۔
 لڑکا مجسم بن گیا تھا اور اب شیشے کی بنی دیوار کے پار بیٹھی اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا جو بار بار آنسو پونچھ رہی تھی۔ کچھ پل یونہی خاموشی نگل گئی۔ پھر سامنے بیٹھی خاتون کی آواز گونجی۔

"اللہ انسان سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔۔۔ یقین اور ایمان ہے اس بات پر؟" ڈاکٹر خاتون نے گہری نگاہیں جمائے سوال کیا

لڑکے نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا

"کبھی سوچا۔۔ اللہ کی محبت کے لیے ماں کی ہی محبت کی مثال کیوں دی گئی ہے؟" خاتون نے بڑے وثوق سے پوچھا
لڑکا کا سر نفی میں ہلا گیا۔۔

"کیونکہ ماں جیسی بے لوث محبت کوئی نہیں کر سکتا، تم اس لڑکی کی دو سال کی محبت پر اس ماں کی محبت کو قربان کر
رہے تھے۔۔ خود کشی کرتے ہوئے ایک دفعہ بھی سوچا کہ اس لڑکی پر تو اس کا رتی بھرا اثر نہیں ہو گا۔۔ زیادہ
سے زیادہ چار دن اس رہے گی اور بس پھر اپنی زندگی میں مگن ہو جائے گی۔۔ مگر یہ جو عورت باہر بیٹھی ہے،
تمہارے جانے کے بعد کیسے زندہ رہتی دیکھو اس کی طرف۔۔" ڈاکٹر خاتون نے ہلکے سے سخت لہجے میں کہا اور
اشارہ پھر سے شیشے کی دیوار کی طرف کیا۔

لڑکے نے سر جھکا لیا۔۔ اور پھر ایک دم سے سر اٹھایا

"ڈاکٹر میں نہیں جی سکتا اس کے بنا۔۔ میں مر جاؤں گا۔۔ میں نہیں رہ سکتا" اس کی روندھائی بھاری آواز
پورے کمرے میں گونج گئی

خاتون نے مبہم سی مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔۔۔

"ٹھیک ہے۔۔ میں مانتی ہوں تم بہت محبت کرتے ہو اس سے، مگر میں چاہتی ہوں اسے ثابت کرنے کے لیے تم
دو سال کی شرط رکھو میرے ساتھ بلکہ ایک کانٹریکٹ۔۔ سائن کرو" خاتون نے جلدی سے سامنے پڑا رائٹنگ پیڈ
اور قلم لڑکے کی طرف بڑھایا

لڑکا اب حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ خاتون نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔۔

"اس کانٹریکٹ میں تم یہ لکھو گے کہ تم دو سال تک خود کشی کی کوشش نہیں کرو گے اور دو سال کے بعد تم مجھے
یہاں میرے کیمپن میں ملنے آؤ گے اور پھر آکر بتاؤ گے کہ تم اب کتنی محبت کرتے ہو اس لڑکی سے۔۔" خاتون
مسکراہٹ سجائے کر سی پر جھولتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

لڑکے نے لب بھینچے اور رائٹنگ پیڈ پر قلم چلانے لگا لکھنے کے بعد سر اوپر اٹھایا۔

"گڈ۔۔۔ اب آپ اس کانٹریکٹ کے مطابق اگلے دو سال تک خود کشی کی کوشش نہیں کر سکتے، کیونکہ دو سال بعد میرے سامنے بیٹھ کر آپ کو کہنا ہے کہ ہاں میں آج بھی اس لڑکی سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں، اور پھر میں خوشی سے آپ کو خود کشی کی اجازت دے دوں گی" خاتون نے مسکرا کر کہا

لڑکا خاموش سا کن رہا۔

"اب آپ جائے اور اپنی ماما کو کمرے میں بھیج دیجیے"

خاتون نے مسکرا کر حکم دیا

لڑکا اٹھا اور سر جھکائے مریل سے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ شیشے کے پار وہ اپنی ماں کو اندر جانے کے اشارہ کرتا خود اسی طرح شکست خوردہ سا سر جھکا کر اپنی ماں والی جگہ پر ہی بیٹھ گیا۔

باہر بیٹھی لڑکے کی ماں دروازے کو دھکیلاتی ہلکی سی چرچر اہٹ کی آواز کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور ڈاکٹر کے اشارہ کرتے ہی سامنے کر سی پر براجمان ہوئی۔

ڈاکٹر نے چند لمحے کے توقف کے بعد لب کھولے۔۔۔

"مسز احمر۔۔۔ سعد بہت جزباتی بچہ ہے ایسے بچے ہمیشہ ہر جڑبے کی انتہا تک جاتے ہیں، ایسے بچوں کو لگتا ہے کوئی انہیں سمجھتا نہیں ہے، سب انہیں فقط سمجھاتے ہیں۔۔۔" ڈاکٹر بڑے دھیمے لہجے میں سامنے بیٹھی لڑکے کی ماں کو سمجھا رہی تھی۔

"آپ کو اپنے بیٹے کے قریب آنا ہے بہت قریب اس کی دوست بن جائیے۔۔۔ اس کی باتیں سنیں۔۔۔ اس کی تعریف کریں۔۔۔ اس سمجھانا چھوڑ دیں بلکہ اسے سمجھنا شروع کریں، وہ اگر کہتا ہے کہ وہ اس لڑکی سے بہت محبت کرتا ہے اور غم زدہ ہے کہ اس نے چھوڑ دیا تو آپ بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کے غم میں پہلے آنسو بہائیے اسے

منہا نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلادیا سامنے میز پر پڑی شیلڈ پر نام چمک رہا تھا۔
 ماہر نفسیات ڈاکٹر منہا نقیب



ختم سند